خواتین ڈائجسٹ

اکتوبر 2012

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 600 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 6000 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اُردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیرہ

کہی سنی

خواتین ڈائجسٹ کا اکتوبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

کائنات کی عظیم ترین ہستی جس کے ذکر کو خالقِ حقیقی نے رفعت و بلندی عطا کی، وہ ذاتِ پاک جس کی زندگی کا ہر گوشہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ، روشن اور منور ہے، جس نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو جہالت کے اندھیروں سے نکال کر ہدایت کی روشنی بخشی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بننے والی شرانگیز اور گستاخانہ فلم نے تمام دُنیا کے مسلمانوں کو سراپا احتجاج بنا دیا ہے۔ مصر سے آغاز ہونے والے اس احتجاج کا سلسلہ پوری دُنیا میں پھیل رہا ہے اور دُنیا بھر کے مسلمان اس پر احتجاج کر رہے ہیں۔ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حرمتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر پوری مسلمان قوم متحد نظر آئی۔ ہر طبقے، ہر فرقے اور ہر مکتبِ فکر کے لوگ میدان میں نکل آئے۔ وطنِ عزیز کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں بھی مظاہرے کیے گئے اور تا حال احتجاج کا یہ سلسلہ جاری ہے

کچھ شہروں میں ان مظاہروں میں تشدد کا عنصر بھی شامل ہوا۔ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مظاہروں میں سرکاری اور نجی املاک کا نقصان اور قیمتی انسانی جانوں کا زیاں حد درجہ افسوس ناک اور اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی ہے۔ کوئی بھی مسلمان اور محبِ وطن اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ یہ ان لوگوں کی سازش ہے جو دُنیا کے سامنے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان اجڈ، وحشی اور ظالم ہیں۔

اس مسئلے کے حل کے لیے مسلمان علماء اور مقتدر حکمرانوں کو ایک سنجیدہ لائحہ عمل طے کرنے کی ضرورت ہے۔ اس فلم پر پابندی لگائی جائے بلکہ ایسی قانون سازی کی جائے کہ آزادیٔ اظہار کے نام پر آئندہ کسی گستاخ، سیاہ بخت، ملعون کو اس کی جرأت نہ ہو۔

محمود بابر فیصل (ذوالقرنین)

محمود بابر فیصل کو قدرت نے بڑی فیاضی سے نوازا تھا۔ دیدہ زیب شخصیت کے ساتھ ذہانت، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کی خوبیوں سے بھی مزین تھے۔ ان کے چاہنے والے، دوست احباب ایک طویل مدت گزر جانے کے باوجود انہیں بھول نہیں پاتے ہیں۔

25۔ اکتوبر کو ان کی برسی کے موقع پر دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

عید نمبر،

نومبر کا شمارہ عید نمبر ہوگا۔ مصنفین سے درخواست ہے کہ اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ شاملِ اشاعت ہو سکیں۔

اس شمارے میں،

- فرحت اشتیاق کا مکمل ناول۔ جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو، ، نگہت سیما کا مکمل ناول۔ زمین کے آنسو،
- عفت سحر طاہر کا مکمل ناول۔ میرے ہمدم، میرے دوست، ، سمیرا حمید کا ناولٹ۔ چلو جانے دو،
- راشدہ رفعت، عنیقہ محمد بیگ، عظمیٰ افتخار، تہمینہ چودھری، ملیحہ صدیقی اور عنبرین اعجاز کے افسانے،
- نگہت عبداللہ اور عنیزہ سید کے ناول، ، ذہین اور منفرد ڈرامانگار فصیح باری خان سے ملاقات،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی اُلجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے سے نوازیے گا۔ آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دینِ اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امتِ مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگانِ دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

پڑوسی سے سلوک

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مجھے جبریل علیہ السلام پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی ہمیشہ تاکید کرتے رہے۔ حتیٰ کہ میں گمان کرنے لگا کہ وہ اسے وراثت میں بھی شریک ٹھہرا دیں گے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مرضی سے کوئی شرعی حکم جاری نہیں کرتے تھے بلکہ وحی کے ذریعے سے جو حکم نازل ہوتا تھا، اس پر عمل کرتے اور کرواتے تھے۔

2۔ وراثت کے قوانین نصوص پر مبنی ہیں۔ ان میں قیاس نہیں چلتا۔

3۔ پڑوسی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ حسن سلوک کا خیال رکھنا چاہیے۔

مہمان کا حق

حضرت ابو شریح خزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔ اور اس کی (واجب) مہمانی ایک دن، رات ہے۔ مہمان کے لیے اپنے دوست (میزبان) کے ہاں (اتنا عرصہ) ٹھہرے رہنا جائز نہیں کہ وہ (میزبان) تنگی محسوس کرے۔ مہمانی (کی مسنون حد) تین دن تک ہے۔ تین دن کے بعد وہ جو کچھ اس پر خرچ کرتا ہے، وہ صدقہ ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ ایک دن، رات تک مہمان کی خاطر تواضع کرنا ضروری ہے، تاہم یہ تکلف اپنی استطاعت کے مطابق ہی کرنا چاہیے۔

2۔ دوسرے اور تیسرے دن بھی مہمان کو کھانا کھلانا اور گھر میں ٹھہرانا اس کا حق ہے۔

3۔ مہمان کو چاہیے کہ تین دن سے زیادہ میزبان کے ہاں نہ ٹھہرے' البتہ اگر میزبان قریبی تعلق یا دوستی کی وجہ سے زیادہ ٹھہرنے میں تکلیف محسوس نہ کرے یا مزید ٹھہرنے کی خواہش کا اظہار کرے تو زیادہ ٹھہرنا بھی درست ہے۔

4۔ تین دن سے زیادہ کسی کے ہاں مہمان بن کر کھانا اور ٹھہرنا اس طرح ہے' جیسے صدقہ کھانا اور خوشحال آدمی صدقہ کھانا پسند نہیں کرتا۔

حضرت ابوکریمہ مقدام (بن معدی کرب) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مہمان کی ایک رات (مہمان نوازی کرنا) واجب ہے۔ اگر مہمان صبح تک اس کے گھر رہا (اور اس نے مہمانی نہ کی) تو یہ اس (صاحب خانہ) پر قرض ہے۔ مہمان چاہے تو اس کا مطالبہ (کرکے وصول) کرلے' چاہے تو چھوڑ دے۔"

یتیم کا حق

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے اللہ! میں (لوگوں کو) دو کمزوروں' یتیم اور عورت کی حق تلفی کرنا (تاکید کے ساتھ) حرام ٹھہراتا ہوں۔"

فوائد و مسائل :

1۔ یتیم اپنی ضروریات کے سلسلے میں اپنے سرپرست کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ اس سے اس طرح مطالبہ نہیں کرسکتا' جس طرح بچہ اپنے باپ سے ضد کرکے یا ناز کے ساتھ اپنی بات منوالیتا ہے' اس لیے ضروری ہے کہ یتیم کی ضروریات اس کے مطالبے کے بغیر پوری کی جائیں۔

2۔ عورت اخلاقی' قانونی اور شرعی طور پر اپنے خاوند کے ماتحت ہے۔ اگر خاوند اس کے حقوق پوری طرح ادا نہ کرے۔ اس کے باوجود وہ اپنے بچوں کی محبت کی وجہ سے یا خاوند سے محبت کی وجہ سے اس گھر میں رہنے پر مجبور ہو تو خاوند کو چاہیے کہ اس کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے' بلکہ اس کے حقوق بہتر انداز سے ادا کرے۔

بہترین گھر

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مسلمانوں میں بہترین گھر وہ ہے' جس گھر میں کوئی یتیم (زیر کفالت) ہو اور اس سے اچھا سلوک کیا جائے اور مسلمانوں میں سب سے برا گھر وہ ہے۔ جس میں کوئی یتیم (زیر کفالت) ہو اور اس سے برا سلوک کیا جائے۔"

راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا

حضرت ابوبرزہ فضلہ بن عبید اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا میں نے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کوئی عمل بتائیے' جس سے مجھے فائدہ ہو۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مسلمانوں کے راستے سے تکلیف دینے والی چیز کو ہٹا دیا کرو۔"

فوائد و مسائل :

1۔ دنیا کے کسی جائز کام میں فائدہ پہنچانے والے مسلمان کو آخرت میں فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

2۔ اللہ کی رضا کے لیے رفاہ عامہ کا کوئی کام کرنا عظیم نیکی ہے۔

جنت مل گئی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک درخت کی ٹہنی راستے میں تھی۔ اس سے لوگوں کو تکلیف ہوتی تھی۔ ایک آدمی نے اسے ہٹا دیا تو اسے جنت میں داخل کردیا گیا۔"

فوائد و مسائل :

1۔ لوگوں کو تکلیف اور نقصان سے بچانا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔

2۔ عوام کو فائدہ پہنچانے والا معمولی عمل بھی جنت میں داخلے کا باعث بن سکتا ہے۔

3۔ ناجائز تجاوزات کے ذریعے سے راستہ تنگ کرنا یا بند کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ عام طور پر شادی بیاہ کے موقعوں پر راستہ بند کرکے تقریب کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہ اللہ کے غضب کا باعث ہے۔

4۔ کوڑا کرکٹ راستے میں پھینکنا' یا وہاں قضائے حاجت کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ سایہ دار درخت کے نیچے جہاں لوگ بیٹھتے ہوں اور راستے میں پیشاب پاخانہ کرنے والے پر لعنت پڑتی ہے۔

اچھے' برے اعمال

حضرت ابوذر (جندب بن جنادہ غفاری) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میرے سامنے میری امت اپنے اچھے اور برے اعمال کے ساتھ پیش کی گئی۔ میں نے اس کے اچھے اعمال میں راستے سے تکلیف دہ چیز (پتھر' کانٹا وغیرہ) ہٹانا بھی پایا اور اس کے برے اعمال میں وہ تھوک پایا' جو مسجد میں (تھوکا گیا) ہو اور اس پر مٹی نہ ڈالی گئی ہو۔"

فوائد و مسائل :

1۔ ہر وہ عمل نیکی ہے' جس سے لوگوں کو فائدہ ہو یا نقصان سے بچاؤ ہو (بشرطیکہ وہ شریعت کے کسی خاص حکم کے خلاف نہ ہو) اور ہر وہ عمل برائی ہے' جو اس کے برعکس ہو۔

2۔ کسی نیکی کو معمولی سمجھ کر ترک نہیں کرنا چاہیے اور کسی برائی کو معمولی سمجھ کر اس کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔

3۔ مسجد کی صفائی کا اہتمام زیادہ ہونا چاہیے۔

4۔ اس زمانے میں فرش کچا ہوتا تھا' اس لیے بلغم وغیرہ پر مٹی ڈال دینے سے وہ جذب ہو کر ختم ہو جاتا تھا۔ آج کل کے حالات کے مطابق پانی سے صفائی کرنا ضروری ہے۔ اگر تھوکنے کی ضرورت پیش آئے تو وضو کی جگہ جا کر تھوکا جائے یا رومال میں تھوک لیا جائے۔ کراہت ہو تو بعد میں رومال دھو لیا جائے۔

پانی صدقہ کرنے کی فضیلت

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا۔ میں نے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کون سا صدقہ افضل ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"پانی پلانا۔"

فوائد و مسائل :

1۔ پانی پلانا بڑی نیکی ہے' خواہ وہ نلکا لگوانے یا کنواں کھدوانے کی صورت میں ہو یا کولر لگا دیا جائے یا گھڑے میں پانی بھر کر رکھ دیا جائے یا نلکے سے گلاس بھر کر کسی کو لا دیا جائے۔ اپنے اپنے موقع محل کے مطابق یہ سب صورتیں نیکی میں شامل ہیں۔

2۔ جب ضرورت سے زائد پانی موجود ہو تو ضرورت مند کو پانی لینے سے منع کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔

3۔ پانی استعمال کرنے والوں کو چاہیے کہ اسے ضائع نہ کریں' جیسے بعض دفعہ ایک آدمی آدھا گلاس پانی پینا چاہتا ہے تو پہلے گلاس کو دھوتا ہے' خواہ وہ بالکل صاف ہو' پھر گلاس بھر کر پانی لیتا ہے اور آدھا گلاس پی کر باقی گرا دیتا ہے۔ یا وضو کرنے میں اتنا پانی استعمال کرتا ہے جس سے کئی آدمی وضو کرسکتے ہیں۔ یہ اللہ کی نعمت کی ناشکری ہے۔

پانی پلانا

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قیامت کے دن لوگ اور ابن نمیر کی روایت میں ہے۔ جنتی لوگ' صفیں بنائے ہوئے ہوں گے۔ ایک جہنمی ایک (جنتی) آدمی کے پاس سے گزرے گا اور اس سے کہے گا۔ "فلاں صاحب! کیا آپ کو یاد نہیں' جس دن آپ نے پانی مانگا تھا تو میں نے آپ کو ایک

گھونٹ پانی پلایا تھا؟" چنانچہ وہ (اس کا دنیا میں کیا ہوا احسان یاد کر کے) اس کے حق میں شفاعت کر دے گا۔ دوسرا آدمی گزرے گا' وہ کہے گا۔ "کیا آپ کو یاد نہیں' جس دن میں نے آپ کو وضو کے لیے پانی دیا تھا؟" چنانچہ وہ اس کے حق میں شفاعت کر دے گا۔"

ابن نمیر (اپنی روایت میں) بیان کرتے ہیں۔ "وہ کہے گا۔ "فلاں صاحب! کیا آپ کو یاد نہیں' جس دن آپ نے مجھے فلاں فلاں کام کے لیے بھیجا تھا تو میں آپ کے لیے گیا تھا؟" چنانچہ وہ اس کے حق میں شفاعت کر دے گا۔"

جانور کو پانی پلانا

حضرت سراقہ بن جعشم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ایک گم شدہ اونٹ میرے حوض پر آجاتا ہے' جو میں نے اپنے اونٹوں (کو پانی پلانے) کے لیے (بنایا' سنوارا اور) لیپا ہے۔ اگر میں اس (گم شدہ اونٹ) کو پانی پلادوں تو کیا مجھے ثواب ملے گا؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ہاں! حرارت محسوس کرنے والے' جگر رکھنے والے ہر جانور (کو پانی پلانے) میں اجر و ثواب ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ کسی کے پیاسے جانور کو پانی پلانا اور کسی کے بھوکے جانور کو خوراک مہیا کرنا بھی اسی طرح نیکی ہے جس طرح کسی بھوکے پیاسے انسان کو خوراک اور پانی مہیا کرنا۔

2۔ جو جانور کسی کی ملکیت نہیں اس کو پانی پلانا بھی نیکی ہے' جیسے ایک بدکار عورت پیاسے کتے کو پانی پلانے کی وجہ سے بخشی گئی۔

نرمی (سے کام لینے) کا بیان

حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص نرمی سے محروم رہا' وہ (ہر قسم کی) خیر سے محروم رہا۔"

فائدہ :

1۔ سخت طبیعت والا شخص لوگوں کی محبت حاصل نہیں کر سکتا' جس کی وجہ سے وہ بہت سے دنیوی فوائد سے محروم ہو جاتا ہے اور بد اخلاق شخص اللہ کو بھی پسند نہیں' اس لیے وہ آخرت کے فوائد سے بھی محروم رہ جاتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ نرمی کرنے والا ہے' نرمی کو پسند کرتا ہے اور نرمی پر وہ کچھ عطا فرماتا ہے' جو سختی پر عطا نہیں فرماتا۔"

فوائد و مسائل :

1۔ باہمی معاملات میں نرم روی اللہ کو بہت پسند ہے' اس لیے وہ اس پر دنیوی فوائد اور آخرت میں اجر و ثواب عطا فرماتا ہے۔

2۔ دین کے معاملات میں اور حدود کے نفاذ میں نرمی اور مداہنت ایمان کی کمزوری کی علامت ہے۔ ایسے موقع پر دین پر مضبوطی سے قائم رہنا بلندی درجات کا باعث ہے۔

غلاموں سے حسن سلوک کا بیان

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"(غلام) تمہارے بھائی ہیں' جنہیں اللہ نے تمہارے زیردست (ماتحت) بنا دیا ہے' لہٰذا جو کھانا تم کھاتے ہو' اس میں سے انہیں کھلاؤ اور جو (لباس) خود پہنتے ہو' اس میں سے انہیں پہناؤ۔ اور ان کو وہ کام کرنے کا حکم نہ دو' جو ان پر غالب آجائے۔ اور اگر (ضرورت کے تحت) انہیں ایسا حکم دو تو (اس کی انجام دہی میں خود بھی) ان کی مدد کرو۔"

فوائد و مسائل :

1۔ غلام کے حقوق اس قدر زیادہ ہیں کہ وہ آزاد انسان کے بہت قریب ہو جاتا ہے' اس کے علاوہ غلام

کو آزاد کرنے کی بہت ترغیب دی گئی ہے۔

2۔ بہت سی صورتوں میں غلام کو آزاد کرنا مسلمانوں کے لیے یا خود غلام کے لیے تکلیف یا نقصان کا باعث ہو سکتا ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اور تمہارے جو لونڈی غلام مکاتبت (آزادی کا معاہدہ) کرنا چاہیں تو ان سے آزادی کا معاہدہ کر لو' اگر تمہیں ان کے اندر بھلائی معلوم ہو۔"

اس لیے غیر مسلم یا بری عادتوں میں مبتلا غلام کو آزاد کرنے کے بجائے غلام ہی رکھنے میں اس کا اور معاشرے کا فائدہ ہے۔

3۔ غلام کے انسانی حقوق کا خیال رکھنا مالک کا فرض ہے۔

4۔ غلام کے لیے مناسب غذا' مناسب لباس اور رہائش مہیا کرنا آقا کی ذمہ داری ہے۔ اس کے عوض وہ آقا کی خدمت کرے گا اور روزمرہ معاملات میں اس سے تعاون کرے گا۔

5۔ اگر غلام کے ذمے ایسا کام لگایا جائے' جو وہ اکیلا انجام نہ دے سکتا ہو تو مالک کا فرض ہے کہ خود اس کے ساتھ مل کر کام کرے یا اسے مددگار مہیا کرے۔

6۔ گھروں اور دکانوں پر کام کرنے والے ملازم' کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے کارکن غلام نہیں' تاہم وہ حالات کی وجہ سے مالک کی سختی برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔ ان کے حقوق غلاموں سے زیادہ ہیں۔ ان سے ان کی طاقت سے زیادہ کام لینا' کم آرام کا موقع دینا' ان کی عزت نفس مجروح کرنا اور تنخواہ دینے میں بلاوجہ تاخیر کرنا' یہ سب کام حرام ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بری مالکانہ صفات کا حامل جنت میں داخل نہیں ہو گا۔"

(مالک ہونے کے پہلو سے بھی اچھی صفات سے متصف ہونا چاہیے۔) صحابہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ اس امت میں غلام اور یتیم سب قوموں سے زیادہ ہوں گے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

1۔ "ہاں (ہوں گے) لہٰذا ان سے اسی طرح عزت کا رویہ رکھو' جس طرح اپنی اولاد سے عزت کا رویہ رکھتے ہو (انہیں خواہ مخواہ ذلیل نہ کرو) اور انہیں وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو۔"

انہوں نے عرض کیا "دنیا میں کیا چیز ہمیں فائدہ دے سکتی ہے؟"

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"وہ گھوڑا جسے تو اللہ کی راہ میں جنگ کرنے کے لیے باندھ رکھے' تیرا غلام جو تیرے کام آئے۔ اگر وہ نمازی ہو تو وہ تیرا (مسلمان) بھائی ہے۔ (لہٰذا اس کا خیال رکھنا زیادہ ضروری ہے۔)"

سلام عام کرنا

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"رحمان کی عبادت کرو اور سلام عام کرو۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اسلام اللہ سے اور بندوں سے صحیح تعلق قائم کرنے کا نام ہے۔ اللہ سے صحیح تعلق کی بنیاد عقیدہ توحید اور عبادات کے ذریعے سے اس کا اظہار ہے۔ بندوں سے صحیح تعلق قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے ایک آسان کام سب کو سلام کرنا ہے۔

2۔ سلام عام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان کو سلام کیا جائے اور جب بھی ملاقات ہو یا ملاقات کے بعد رخصت ہونا ہو تو سلام کیا جائے۔ اس میں دوست رشتے دار اور اجنبی کے درمیان فرق نہ رکھا جائے۔

3۔ غیر مسلم کو سلام کرنے میں پہل نہ کی جائے لیکن اگر وہ سلام کریں تو انہیں جواب دیا جائے۔

4۔ سلام اتنی بلند آواز سے کرنا چاہیے کہ کم از کم وہ شخص سن لے' جسے سلام کیا گیا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"مکمل باورچی خانہ"

انشاجی

جناب مطبخ مراد آبادی کی یہ کتاب مستطاب ہمارے پاس بغرض ریویو آئی ہے۔ جو صاحب یہ کتاب لائے وہ نمونہ طعام کے طور پر بگھارے بینگنوں کی ایک پتیلی بھی چھوڑ گئے تھے۔ کتاب بھی اچھی نکلی، بینگن بھی۔ قلت گنجائش کی وجہ سے آج ہم فقط کتاب پر ریویو دے رہے ہیں۔ بینگنوں پر پھر کبھی سہی۔ اس سلسلے میں ہم اپنے کرم فرماؤں کو ریویو کی یہ شرط یاد دلانا چاہتے ہیں کہ کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں۔ اور سالن کی دو پتیلیاں۔

اس کتاب میں بہت سی باتیں اور ترکیبیں ایسی ہیں کہ ہر گھر میں معلوم رہنی چاہئیں۔ مثلاً "یہ کہ سالن میں نمک زیادہ ہو جائے تو کیا کیا جائے۔ ایک ترکیب تو اس کتاب کے بموجب یہ ہے کہ اس سالن کو پھینک کر دوبارہ نئے سرے سے سالن پکایا جائے۔ دوسری یہ کہ کوئلے ڈال دیجیے۔ چولہے میں نہیں سالن میں، بعد ازاں نکال کر کھائیے۔ یہاں تھوڑا سا ابہام ہے۔ یہ وضاحت سے لکھنا چاہیے تھا کہ کوئلے نکال کر سالن کھایا جائے یا سالن نکال کر کوئلے نوش جان کیے جائیں۔ ہمارے خیال میں دونوں صورتیں آزمائی جاسکتی ہیں اور پھر جو صورت پسند ہو اختیار کی جاسکتی ہے۔

کھیر پکانے کی ترکیب بھی شامل کتاب ہذا ہے۔ اس کے لیے ایک چرخے، ایک کتے، ایک ڈھول اور ماچس کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ نسخہ امیر خسرو کے زمانے سے آزمودہ چلا آتا ہے۔ لیکن اس میں ماچس کا ذکر نہ ہوتا تھا۔ خدا جانے چرخے کو کیسے جلاتے ہوں گے۔ ٹیڑھی کھیر عام کھیر ہی کی طرح ہوتی ہے۔ فقط اس میں بگلا ڈالنا ہوتا ہے تاکہ حلق میں پھنس سکے۔ اس کتاب میں بعض ترکیبیں ہمیں آسانی کی وجہ سے پسند آئیں۔ مثلاً "بادام کا حلوہ یوں بنایا جاسکتا ہے کہ حلوہ لیجیے اور اس میں بادام چھیل کر ملا دیجیے۔ بادام کا حلوہ تیار ہے۔ بینگن کا اچار ڈالنے کی ترکیب یہ لکھی ہے کہ بینگن لیجیے اور بطریقہ معروف اچار ڈال لیجیے۔

چند اور اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

آلو چھیلنے کی ترکیب

سامان:۔ آلو۔ چھری، پلیٹ، ناول ڈیٹول۔ پٹی۔

آلو لیجیے۔ اسے چھری سے چھیلیے۔ جن صاحبوں کو گھاس چھیلنے کا تجربہ ہے ان کے لیے یہ کچھ مشکل نہیں۔ چھلے ہوئے آلو ایک الگ پلیٹ میں رکھتے جائیے۔ بعض صورتوں میں جہاں چھیلنے والا ناخواندہ ہو، یہ عمل بالعموم یہیں ختم ہو جاتا ہے لیکن ہماری اکثر قارئین پڑھی لکھی ہیں۔ لہٰذا آلو چھیلنے میں جاسوسی ناول یا فلمی پرچے ضرور پڑھتی ہوں گی۔ ڈیٹول ان ہی کے لیے ہے جہاں چرکا لگا، ڈیٹول میں انگلی ڈبوئی اور پٹی باندھ دی۔ ہمارے تجربے کے مطابق ڈیٹول کی ایک چھوٹی شیشی میں آدھ سیر آلو چھیلے جاسکتے ہیں۔ بعض جزرس اور سلیقہ مند خواتین سیر بھر بھی چھیل لیتی ہیں۔ جن بہنوں کو ڈیٹول پسند نہ ہو وہ ٹنکچر یا ایسی ہی کوئی اور دوا استعمال کر سکتی ہیں۔ نتیجہ یکساں رہے گا۔

حلوہ بے دودھ

اس حلوے کی ترکیب نہایت آسان ہے۔ حلوہ پکائیے اور اس میں دودھ نہ ڈالیے۔ نہایت مزیدار حلوہ بے دودھ تیار ہے۔ ورق لگائیے اور چمچے سے کھائیے۔

نہاری

کون ہے جس کے منہ میں نہاری کا لفظ سن کر پانی نہ بھر آئے۔ اس کا رواج دہلی اور لاہور میں زیادہ ہے لیکن دونوں جگہ نسخے میں تھوڑا اختلاف ہے۔ دلی والے نلیاں، پائے، مغز اور بارہ مسالے ڈالتے ہیں جس سے زبان فصیح اور بامحاورہ ہو جاتی ہے۔ پنجاب والے بھوسی، بنولے اور چنے ڈالتے ہیں کہ طب میں مقوی چیزیں مانی گئی ہیں۔ گھوڑے اول الذکر نسخے کو چنداں پسند نہیں کرتے۔ جس میں کچھ دخل صوبائی تعصب کا بھی ہو سکتا ہے لیکن اس تعصب سے دلی والے بھی یکسر خالی نہیں۔ ان کے سامنے دوسرے نسخے کی نہاری رکھی جائے تو رغبت کا اظہار نہیں کرتے۔ بلکہ بعض تو برا بھی مان جاتے ہیں۔

اس بات میں فقط ایک احتیاط لازم ہے۔ کھانے والے سے پوچھ لینا چاہیے کہ وہ آدمی ہے یا گھوڑا۔

لائق مصنف نے سموسہ، بیسن، کریلوں کی کھیر اور تھالی کے بینگن وغیرہ تیار کرنے اور انڈا ابالنے وغیرہ کی ترکیبیں بھی دی ہیں۔ لیکن ہم نے خود مکمل باورچی خانہ کی صرف ایک ترکیب آزمائی ہے۔ وہ ہے روٹی پکانے کی۔ قارئین کرام بھی اسے آزمائیں اور لطف اٹھائیں۔

روٹی

سب سے پہلے آٹا لیجیے.... آٹا آگیا؟ اب اس میں پانی ڈالیے۔ اب اسے گوندھیے گندھ گیا؟ شاباش! اب چولہے کے پاس اکڑوں بیٹھیے.... بیٹھ گئے؟ خوب! اب پیڑا بنائیے۔ جس کی جسامت اس پر موقوف کہ آپ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں یا بنوں کے۔ اب کسی ترکیب سے اسے چپٹا اور گول کر کے توے پر ڈال دیجیے۔ اسی کا نام روٹی ہے۔ اگر یہ کچی رہ جائے تو ٹھیک ورنہ کوئلوں پر ڈال دیجیے تا آنکہ جل جائے۔ اب اسے اٹھا کر رومال سے ڈھک کر ایک طرف رکھ دیجیے اور نوکر کے ذریعے تنور سے پکی پکائی دو روٹیاں منگا کر سالن کے ساتھ کھائیے بڑی مزیدار معلوم ہوں گی۔

مصنف نے دیباچے میں اپنے خاندانی حالات بھی دیے ہیں اور شجرہ بھی منسلک کیا ہے۔ ان کا تعلق ملا دوپیازہ کے گھرانے سے ہے۔ شاعر بھی ہیں۔ بیاہ شادیوں پر ان کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ دیگیں پکانے کے لیے بھی سہرا کہنے کے لیے بھی۔ ہر ترکیب کے بعد مصنف نے اپنے اشعار بھی درج کیے ہیں جن سے دو خصوصیتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ باورچی خانہ کا باورچی خانہ، دیوان کا دیوان۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ذہین اور منفرد ڈراما نگار

فصیح باری خان سے ملاقات

شاہین رشید

کسی بھی ڈرامے کی خواہ وہ سیریل ہو' سوپ یا پھر ٹیلی فلم ۔۔۔ کی کامیابی میں کہانی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ کہانی ہلکی تو سمجھیے کہ سب کچھ فلاپ۔ پھر نہ اداکاری کام آتی ہے اور نہ ہی ڈائریکٹر کی مہارت اور نہ ہی دلکش لوکیشنز۔۔۔ ہمارے یہاں ماشاء اللہ بے شمار رائٹرز ہیں لیکن چند رائٹرز ایسے ہیں جو اپنی تحریروں سے ناظرین کے دل میں اتر جاتے ہیں۔ اور ان ہی کم لوگوں میں ایک نام "فصیح باری خان" کا ہے۔ آج کل آپ ان کے دو سیریلز "محبت جائے بھاڑ میں" اور "قدوسی صاحب کی بیوہ" دیکھ رہے ہیں۔

"کیسے ہیں فصیح باری خان صاحب! اور کن سیریلز پر کام ہو رہا ہے آج کل؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔ ایک اسکرپٹ ہے' جو تقریباً" دو سال سے لکھا ہوا ہے اور عبداللہ کادوانی اب اس پر کام کر رہے ہیں۔ "تار عنکبوت" یہ بڑا مشکل اور ایک تجرباتی قسم کا سیریل ہے اس میں عظمیٰ گیلانی صاحبہ بڑے عرصے کے بعد کام کریں گی اور دوسرا ہے "ساون رت کا سپنا" فی الحال ان پر کام ہو رہا ہے۔"

"آپ کے ڈراموں کے نام بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ جیسے "برنس روڈ کی نیلوفر بھکادا" "محبت جائے بھاڑ میں" وغیرہ۔۔۔ نام کا کتنا اثر ہوتا ہے ناظرین پر؟"

"میرا دل چاہتا ہے کہ نام غیر معمولی ہی ہونے چاہئیں۔ اب آپ پرانے رائٹرز جیسے منٹو یا راجندر سنگھ بیدی ہیں۔ ان کی تحریروں کے نام بھی بڑے منفرد

[illegible] تو مجھے لگتا ہے کہ ناموں کا تھوڑا بہت اثر ضرور ہوتا ہے۔"

"آپ سیریل کم لکھتے ہیں اور ٹیلی فلمز زیادہ۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

"تقریباً" سات سال سے میں سیریل نہیں لکھ رہا تھا۔ سارا دھیان میرا ٹیلی فلمز کی طرف تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میری ہی ٹیلی فلمز کے مکالمے اور کہانی کو بنیاد بنا کر سیریلز لکھنے شروع کر دیے مختلف رائٹرز نے۔ تو میں نے سوچا کہ میری تحریروں پر دوسرے ہاتھ صاف کر رہے ہیں اور سیریلز بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ یہ کام میں خود کیوں نہ کروں تاکہ چوری کا یہ سلسلہ ہی ختم ہو جائے۔ اس لیے اب میں سیریلز پر آگیا ہوں۔۔۔ اگرچہ میں کوئی کمرشل رائٹر نہیں ہوں' لیکن چونکہ اب لوگوں کا سامنا کرنا ہے اس لیے مجھے سیریلز کی طرف بھی آنا پڑے گا۔۔۔"

"آپ کے ڈرامے لوئر کلاس اور مڈل کلاس پہ ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے درمیان رہنے کا تجربہ ہے یا کوئی خاص وجہ ہے؟"

"میں بنیادی طور پر اپنے آپ کو ایک عام انسان سمجھتا ہوں۔ ہماری 90 فیصد آبادی یا اس سے بھی زیادہ اسی طبقے سے وابستہ ہے۔ مجھے اکثر لوگ کہتے ہیں کہ آپ ڈرائنگ روم ڈراما کیوں نہیں لکھتے۔ میری نظر میں ڈرائنگ روم ڈراما لکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے اور میں یہ بھی نہیں کہتا کہ اپر کلاس پہ ڈرامے نہیں لکھنے چاہئیں' لیکن یہ دیکھیں کہ شاید چند ہی ڈرامے ہوں گے جس میں اپر کلاس کی حقیقت بیان کی گئی ہوگی ورنہ ہوتا یہ ہے کہ خوبصورت لڑکیاں' خوبصورت لڑکے اور خوبصورت گھر دکھا دیے جاتے ہیں۔ جبکہ کہانیوں میں کوئی جان نہیں ہوتی' سچ پوچھیں تو میں ایسے ڈرامے دیکھ کر قطعی متاثر نہیں ہوتا اور نہ ہی میرے دل میں یہ خواہش جنم لیتی ہے کہ میں بھی ایسا ہی لکھوں۔۔۔ اس لیے میں جو لکھ رہا ہوں اسی سے مطمئن ہوں کیونکہ میں ان لوگوں کے درمیان اٹھتا بیٹھتا ہوں۔ اس لیے مجھے ان لوگوں کے بارے میں بات کرنا اور لکھنا اچھا لگتا ہے۔ آپ خود دیکھیں ان کے درمیان رہ کر تو آپ کو ان کے چہروں کی اور رویوں کی بہت ورائٹی نظر آئے گی اور ہم جتنا لوگوں کے درمیان اٹھیں گے بیٹھیں گے اتنے ہی ہمیں تجربات حاصل ہوں گے اور یہ ایسے تجربات ہوتے ہیں جو ہمیں کتابیں پڑھ کر حاصل نہیں ہوتے۔ ہمارے رائٹرز کی جو تباہ حالی ہے' وہ اسی وجہ سے ہے کہ وہ کسی کی سنتے نہیں ہیں بلکہ اپنے آپ کو علامہ سمجھتے ہیں ورنہ اگر آپ کسی معمولی شخص کے پاس بیٹھیں گے اور اس کی باتیں سننا اور سمجھنا چاہیں گے تو آپ کو ان گنت پہلو نظر آئیں گے۔"

"آپ کے ڈراموں کے موضوعات کافی بولڈ ہوتے ہیں۔ کبھی سینسر کا پرابلم ہوا؟ کوئی سیریل "ڈبے" کی نذر ہوا؟ کوئی پابندی لگی؟"

"بہت ہوتا ہے ایسا۔۔۔ میں بنیادی طور پر تھیٹر کا رائٹر ہوں اور جب میں نے پہلا کھیل لکھا تھا تو پہلے دن سے جو میری مخالفت اور میری ذات پر تنقید شروع ہوئی' وہ ابھی تک چل رہی ہے اور آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ یہ چینلز کے جو مالکان ہیں ان کو کچھ پتا نہیں ہوتا' انہوں نے نہ تھیٹر کیا ہوا ہوتا ہے نہ پڑھا ہوا ہوتا ہے ان کی سوچ بہت سطحی ہوئی ہوتی ہے۔ غیر ملکی فلمیں دیکھ کر آپ کبھی بھی نہیں سیکھ سکتے اور میں نے دیکھا ہے کہ سینسر کے موقع پر بعض چیزیں ایسی

ہوتی ہیں کہ ہمیں ڈر لگ رہا ہوتا ہے کہ یہ تو بہت بولڈ چیزیں ہیں انہیں تو ہٹا دیا جائے گا لیکن وہ بڑے آرام سے سینسر پاس ہو جاتا ہے اور بعض معمولی باتیں زد میں آجاتی ہیں۔ میرے آن ایئر سیریل "محبت جائے بھاڑ میں" کی پہلی قسط میں ایک سین کافی بولڈ تھا اور جس نے کیا اس نے بھی کافی بولڈ انداز میں کیا تو میں اور میرا ڈائریکٹر تو یہی سمجھ رہے تھے کہ پھنس جائیں گے مگر وہ سین اتنے آرام سے نکل گیا کہ ہم حیران رہ گئے اور وہ سین جو بہت ہی معمولی تھا اور جس کے لیے ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس پر کوئی اعتراض آئے گا' اسی پر اعتراض آگیا۔"

"گزرے رائٹر جیسے منٹو' راجندر سنگھ بیدی' کرشن چندر وغیرہ ان کی کہانیوں اور افسانوں کے موضوعات بھی بہت بولڈ ہوتے تھے تو آپ ان سے متاثر ہیں کیا؟"

"جب میں بہت چھوٹا تھا تو جیسے بچے بچوں کی کہانیاں پڑھتے ہیں۔ اشتیاق احمد وغیرہ کو پڑھتے ہیں تو مجھے بھی شروع سے ہی لٹریچر اپنی طرف کھینچتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میری نانی بہت زیادہ لٹریچر پڑھا کرتی تھیں۔ گھر میں جب میں نے وہ کتابیں دیکھیں تو میں نے یہ کتابیں پڑھنا شروع کر دیں۔ مجھے منٹو کی بولڈ نیس بہت اچھی لگتی تھی۔ مجھے راجندر سنگھ بیدی کی کہانی بہت اچھی لگتی تھی۔ غلام عباس کی کہانیاں بہت خوبصورت ہوتی ہیں اور اگر آپ ٹی وی کی طرف آئیں تو مجھے جس رائٹر کی کردار نگاری سب سے اچھی لگتی تھی وہ بانو قدسیہ تھیں۔ میں ہر اچھے رائٹر سے متاثر ہوں۔ مگر میرے لکھنے کا اپنا انداز ہے۔"

"یوں تو ہر رائٹر ہی عورت کو بنیاد بنا کر کہانی لکھتا ہے لیکن آپ کے ڈرامے کی عورت بہت بولڈ ہوتی ہے۔ ایک فنکارہ نے کہا ہے کہ کوئی عورت بھی اپنے آپ کو اتنا نہیں جانتی ہوگی' جتنا فصیح باری خان جانتے ہیں۔ ایسا ہے؟"

"ایسا نہیں ہے۔۔۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کو ایک منٹ میں جج کر لیتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کسی کے ساتھ سالوں رہے اور اس کو نہ سمجھ سکے۔ ہاں ایک بات کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں ہے کہ خدا نے دنیا کی سب سے پُراسرار اور گہرائی والی چیز بنائی ہے تو وہ "عورت" ہے۔ جتنی گہرائی عورتوں میں ہے' مردوں میں نہیں ہے۔ مرد تو آپ کو یا تو بہت شریف ملیں گے یا بہت ہی کمینے ملیں گے۔ تہہ در تہہ پہلو جو عورت ذات میں ہیں' وہ مردوں میں نہیں ہیں۔"

"اسی لیے تو آپ کے لیے کہا جاتا ہے کہ آپ عورت کو سمجھتے ہیں؟"

"بس کچھ باتوں کا انسان کو الہام ہوتا ہے۔ میں یہ دعوا کبھی بھی نہیں کرتا کہ میں عورت کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ عورت کو سمجھنے والے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔"

"گزرے زمانے میں رائٹر اپنے اطمینان کے لیے کچھ پیغام دینے کے لیے ڈراما لکھتے تھے' اب ایسا لگتا ہے کہ ڈراما بکتا ہے۔ اس کو بارہ مسالہ کی چاٹ بنا کر بیچا جاتا ہے۔۔۔ کیا ایسا ہے؟"

"نہیں ایسا بالکل نہیں ہے۔۔۔ اور میں آپ کو بتاؤں کہ میں وہ واحد رائٹر ہوں جس کی چینل والوں سے یہ ڈیل ہوتی ہے کہ میں جو اسکرپٹ لکھوں گا اس کے بارے میں آپ کچھ نہیں بولیں گے۔ میں کچھ چیزوں میں بہت Rigid (سخت) ہوں اور میں نے رائٹرز کی بھلائی کے لیے ہی کچھ اقدامات کیے تھے مگر مجھے افسوس ہوتا ہے جب رائٹر منشی بن جاتے ہیں لوگوں کے آگے۔ اپنے لیے تو میں بالکل بھی کمپرومائز نہیں کرتا لیکن دیگر لوگوں کے بارے میں آپ کا جو آئیڈیا ہے بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے آپ کے خیالات سے اتفاق ہے۔ یہاں لوگ ایک فارمولا لے کر بیٹھے ہوتے ہیں کہ یہ بھی ہو' یوں بھی ہو۔۔۔ سو اب آج کل یہ ہو رہا ہے کہ سب ایک ہی موضوع پر لکھے جا رہے ہیں۔ جیسے آج کل دو بہنوں کا ٹاپک "اِن" ہے ہر کوئی

اس پر لکھ رہا ہے۔ ایک بہت شریف ہوگی' ایک بہت چالاک۔ ایک بدصورت ہوگی تو ایک بہت ہی خوبصورت ہوگی۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے کا تضاد ہوتی ہیں۔۔۔ ہر دوسرا یا تیسرا ڈراما اس پر چلا آرہا ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔ ڈرامہ سیریل "من جلی" میں دو بہنیں "ملیحہ مدیحہ" دو بہنیں "بڑی آپا" دو بہنیں۔۔۔ اس سے قبل میری "صبح کا ستارہ" بھی دو بہنوں کی کہانی تھی' "میرے خواب ریزہ ریزہ" اور "مات" "میری بہن مایا اور اعتراف" بھی دو بہنوں کی کہانی تھی۔"

"جی! سب میں آپ دیکھیں دو بہنیں چلی آرہی ہیں۔۔۔ صاف بات ہے میں تو اس طرح کے کام پر لعنت بھیجتا ہوں' مجھے تو کبھی کسی نے کہا بھی کہ اس طرح کے موضوع پر سیریل لکھو تو میں تو کبھی نہیں لکھوں گا۔ میں تو اپنے ٹائپ کی چیزیں لکھتا ہوں ۔لوگ سراہتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ہمیشہ ایسا ہو' کل کو میری چیزیں بھی مسترد ہو سکتی ہیں۔"

"ہمارے پرانے رائٹرز' جیسے بانو قدسیہ' اشفاق احمد مرحوم' بجیا' حسینہ معین' امجد اسلام امجد' یونس جاوید اور دیگر معروف رائٹر پس منظر میں چلے گئے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے اور آج کل کے رائٹرز اور پرانے رائٹرز میں کیا فرق ہے؟"

"حسینہ معین کے تو عنقریب جیو سے دو سیریلز آرہے ہیں اور انہوں نے تو ٹی وی کے لیے بہت لکھا ہے' مگر سچی بات یہ ہے کہ جب میں چھوٹا تھا تب بھی اور اب بھی میری سوچ سے ان کی تحریریں میچ نہیں کرتیں جبکہ دوسرے بڑے اچھے اچھے رائٹرز تھے' جیسے حمید کاشمیری' یونس جاوید' منو بھائی' انتظار حسین ۔۔۔ پی ٹی وی کا پرانے دور کا ڈراما بہت اچھا ہوا کرتا تھا۔ میں جب ہم ٹی وی کے اسکرپٹ ڈپارٹمنٹ میں تھا تو کئی پرانے رائٹرز کی تحریریں میرے پاس آئیں لیکن ان کا ڈراما آج کے دور سے میچ نہیں کرتا تھا۔ ان کی کہانی میں ربط نہیں رہا تھا۔ ان کی چیزیں پرانی ہو گئی ہیں۔ اب لمبے لمبے سین کوئی برداشت نہیں کرتا۔۔۔ آج کل بہت اچھے ڈرامے ہو رہے ہیں مگر تنقید برائے تعمیر نہیں بلکہ تنقید برائے تنقید ہو رہی ہے۔ موازنہ کرنے کو کہیں گے تو انہیں کچھ پتا نہیں ہوگا اور ایسا کون کر رہا ہے' وہ جو بڑے بڑے فورم میں بیٹھ کر بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں۔ ہماری پرانی نسل میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے' جن میں کسی کو راستہ دینے یا دکھانے یا گلے لگا کر حوصلہ افزائی کرنے کی عادت نہیں ہے۔ میں تو صاف بات کہوں گا کہ عجیب حسد کرنے والے لوگ موجود ہیں اس فیلڈ میں' بس پرانی یادوں کا ماتم برپا رہتا ہے ان پرانے لوگوں میں' آج کے دور میں بھی آپ نے ڈرامے لکھے ہیں تو پھر آج کے دور لوگوں کو کیوں نہیں جھنجوڑ دیا۔"

"اسٹار پلس کے ڈراموں کو پاکستانی ڈراموں سے آگے دیکھتے ہیں یا پیچھے دیکھتے ہیں؟"

"میں اسٹار پلس کے ڈراموں کو اپنے ڈراموں سے بہت پیچھے دیکھتا ہوں۔ صاف بات تو یہ ہے کہ مجھے اسٹار پلس کے ڈرامے دیکھنے کا کبھی بھی شوق نہیں رہا۔ لیکن ایک بات ہم سب کو مان لینی چاہیے کہ ہمیشہ برائی لوگوں کو متاثر کرتی ہے۔ اچھا لٹریچر اور برا لٹریچر کا موازنہ کریں تو برا لٹریچر زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اچھے لٹریچر کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اب اسٹار پلس کا سحر ٹوٹنا شروع ہو گیا ہے اور ایسی چیزیں ہمارے راستے میں حائل ہوں گی اور ہمیں ان کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ کبھی آپ اوپر ہوں گے تو کبھی کوئی دوسرا ہوگا۔"

"کبھی کسی نے کہا کہ ہمیں دو چار دنوں میں اسکرپٹ لکھ کر دیں؟"

"ہاں۔۔۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں۔۔۔ لیکن میں نہیں لکھتا۔ میں جو یہاں ٹکا ہوں صرف اپنی مرضی کی بنا پر ٹکا ہوا ہوں' مجھے بڑے بڑے چینلز کے مالکان نے بڑی بڑی آفرز کیں۔ پیسوں کی بھی اور دیگر ز بھی۔ لیکن جب تک آپ اندر سے اپنے آپ سے مطمئن نہیں ہوں گے' سب چیزیں بے کار ہیں۔ جس دن مجھے لگا کہ میرے کام میں کوئی ایکسائٹمنٹ نہیں رہی ہے میں اپنا کام چھوڑ دوں گا۔"

"آپ کے خیال میں ڈرامے کہانی کی بنیاد پر چلتے ہیں یا رائٹرز اور ڈائریکٹرز کے نام پر چلتے ہیں؟"

"ڈراما اچھے اسکرپٹ پر چلتا ہے۔ بہت سی مثالیں ایسی ہیں جن سے پتا چلتا کہ وہ اسکرپٹ کی بنیاد پر چلے لیکن اگر اس اسکرپٹ کو اچھے اداکار مل جائیں گے اچھے ڈائریکٹر مل جائیں گے تو پھر اس ڈرامے کو چار چاند لگ جائیں گے۔"

"آپ کے زیادہ تر ڈرامے مظہر معین (ڈائریکٹر) کے ساتھ ہوتے ہیں اور آپ کے ڈرامے میں کچھ مخصوص فنکار بھی ہوتے ہیں۔۔۔ وجہ؟"

"اصل میں مظہر معین میرا محلے دار بھی ہے جوڑی دار بھی ہے اور اتنی ہماری دوستی ہے کہ چائے کی ایک پیالی پہ ہم دو دو گھنٹے بحث کرتے رہتے ہیں۔ مظہر باریکیاں پکڑتا ہے۔ ڈرامے میں اچھے اداکاروں کا ہونا بھی بہت ضروری ہوتا ہے کیونکہ بعض ایک برا اداکار اچھے جملے کی ادائیگی اس طرح کرتا ہے کہ جملے کا سارا تاثر ہی ختم ہو جاتا ہے اور مخصوص اداکار اس لیے ہوتے ہیں کہ ایک تو گروپ بن جاتا ہے اور پھر وہ ہمارے ڈراموں کو سمجھتے بھی ہیں۔۔۔ ہمارے ڈراموں میں جو لوکیشنز ہوتی ہیں اکثر بڑے بڑے آرٹسٹ کام کرنے سے منع کر دیتے ہیں کیونکہ جگہ بھی تنگ ہوتی ہے۔ اے سی بھی نہیں ہوتے۔۔۔ وہ خواہش رکھتے ہیں ہمارے ساتھ کام کرنے کی مگر اچھی اور حسین لوکیشنز کے ساتھ۔"

"اکثریت فنکاروں کی ایسی ہے' جو ڈراموں میں کام تو بڑے شوق سے کرتے ہیں مگر انہیں رائٹرز کے نام نہیں معلوم ہوتے۔ افسوس ہوتا ہے؟"

"بالکل ہوتا ہے۔۔۔ بے چارے رائٹر غریب کو تو کوئی جانتا ہی نہیں ہے۔ اتنے اچھے کرداروں پر بھی رائٹر کو کریڈٹ نہیں ملتا اور فنکار اپنے کالر کھڑے کر رہے ہوتے ہیں کہ ہم نے یہ کر لیا وہ کر لیا۔۔۔ یہ پتا ہی نہیں ہوتا کہ کس کے لکھے پر آپ نے اتنا اچھا پرفارم کیا۔۔۔ چند ہی فنکار ہیں جو رائٹرز کو بھی جانتے ہیں۔۔۔ ورنہ زیادہ تر تو پہلے پیسوں کی بات کرتے ہیں اور ڈائریکٹر سے چونکہ ان کو کام رہتا ہے اس لیے ان کا نام انہیں یاد رہتا ہے۔ رائٹر غریب کا ذکر تو دور دور تک نہیں ہوتا۔"

"پیسوں کے معاملے میں آپ کو کوئی پرابلم ہوتا ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے کہ مجھے معاوضہ اچھا ملتا ہے۔ اگرچہ میں کم کام کرتا ہوں' لیکن معاوضہ میں اچھا لیتا ہوں اور مجھے مل بھی جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بہت سارا برا کام کر کے پیسہ کمانے سے بہتر ہے کہ بندہ کم کرے مگر اچھا کرے۔ بہت سارے لوگ تو مجھے افورڈ بھی نہیں کر سکتے اور جو افورڈ کرتے ہیں۔ ان ہی کے لیے کام بھی کرتا ہوں۔"

"رائٹرز کو یہ شکایت ہے کہ ان کے آئیڈیاز چوری ہو جاتے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ پوری پوری کہانیاں چوری ہو جاتی ہیں۔۔۔ تو آپ کے ساتھ ایسا ہوا؟"

مبارک باد

ثمینہ عظمت علی کے قدموں تلے جنت تعمیر ہوئی ہے۔ شادی کے نو سال بعد قدرت نے انہیں اپنی رحمت سے نوازا ہے۔ ان کے آنگن میں ایک ننھی کلی مسکرائی ہے۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے دلی مبارک باد اور ننھی علینہ کے لیے دعائیں۔
اللہ تعالیٰ علینہ کو زندگی میں خوشیاں اور کامیابیاں عطا فرمائے۔ (آمین)

"میرے ساتھ شروع میں ایسا ہوا تھا۔ میری کہانی کو ایک بڑے رائٹر نے لے لیا تھا، مگر پھر اس کے بعد ایسا نہیں ہوا۔ میں اس سلسلے میں بہت محتاط رہتا ہوں۔ نئے رائٹرز کہتے ہیں کہ آپ ہمیں اپنا شاگرد بنالیں۔ بھئی! اس کام میں کون استاد شاگرد ہوتا ہے۔ یہ کوئی ویلڈنگ کا یا موٹر مکینک کا کام تھوڑ رہی ہے"

"ڈرامے کی فیلڈ میں سب سے کمزور شعبہ کون سا ہے اور سب سے طاقت ور کون سا ہے؟"

"سب سے کمزور شعبہ "آڈیو" کا ہے۔ ہمارے ڈراموں کی "آڈیو" اتنی خراب ہوتی ہے کہ حد نہیں۔ یہ چینل والے ڈراموں سے کروڑوں روپے کماتے ہیں مگر ساؤنڈ اتنا خراب ہوتا ہے کہ کیا بتائیں، مائیک بند ہوجاتے ہیں۔ اگر انہوں نے اس جانب توجہ نہ دی تو ہمارا ڈراما سفر (Suffer) کرے گا۔ ڈائیلاگ اکثر شور شرابے میں دب جاتے ہیں طاقت ور شعبہ، مجھے لگتا ہے اب ہماری ڈائریکشن بہت اچھی ہوتی جارہی ہے۔ بہت اچھے اچھے ڈائریکٹر اس فیلڈ میں آگئے ہیں۔"

"لوکیشنز کے سلسلے میں کوئی پرابلم ہوتی ہے؟ کیونکہ بڑے گھروں میں بھی آپ لوگ جاتے ہیں اور بہت چھوٹے گھروں میں بھی۔ مشکل کہاں ہوتی ہے؟"

"اوریجنل لوکیشنز لینے سے بہت آسانیاں ہوگئی ہیں۔ اپر کلاس پہ ڈراما بنانا بہت آسان اس لیے بھی ہے کیونکہ ڈیفنس میں لوگوں نے پورے پورے گھر کرائے پہ دیے ہوئے ہیں۔ انہوں نے سجا کر گھر دیے ہیں۔ خود وہ آتے بھی نہیں ہیں۔ ہر کمرے میں اے سی لگا ہوا ہے۔ آرام سے آتے ہیں شوٹ کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں اور جس لوکیشنز پہ میں کام کرتا ہوں، وہ مشکل ترین لوکیشنز ہوتی ہیں۔ جیسے آپ نے "بہکاوا" میں دیکھی یا اب آپ "محبت جائے بھاڑ میں" دیکھ رہی ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ میرے ڈراموں کے فنکار بھی بہت کو آپریٹو ہیں۔ ریشم کی مثال میں خاص طور پر دینا چاہوں گا۔ وہ بندی فلم میڈیا سے آئی ہے مگر اس میں کوئی نخرہ نہیں ہے۔ گرمی ہے۔ پنکھے نہیں ہیں مگر وہ بڑے سکون اور حوصلے کے ساتھ سارے کام کررہی ہوتی ہے۔ اسی طرح ماریہ واسطی کے لیے کہا جاتا ہے کہ بڑے نخرے ہیں مگر میرے ساتھ کام کرنے کے مجھے کوئی نخرے والی بات نظر نہیں آئی۔"

"اب اپنے بارے میں کچھ بتائیں آپ؟ پہلی تحریر کس عمر میں چھپی؟"

"میں 18 مارچ 1971ء کو کراچی میں پیدا ہوا۔ بہن بھائیوں میں میرا نمبر پانچواں ہے۔ میری شادی بہت کم عمری میں ہوئی، اس لیے چل نہ سکی۔ میں نے اردو ادب میں 'ماسٹرز کیا ہے اور جناب پہلی تحریر جب میں آٹھ سال کا تھا تب چھپی تھی اور تحریر کا نام تھا "کوے کا راز" اور یہ بڑوں کے میگزین میں شائع ہوئی تھی۔ یہ افسانہ تھا۔ کسی کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ میں نے لکھا ہے۔"

"ٹی وی پر پہلے پہل کیا کیا؟"

"ٹی وی پہ سب سے پہلے میں نے "میگزین شوز" کیے تھے عبید خان کے ساتھ میں نے لالی ووڈ ٹاپ ٹین، باکس آفس ٹائپ جیسے بہت پروگرام کیے اور پہلا ڈراما عاطف حسین کے ساتھ کیا "جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا" لیکن جو آن ایر گیا تھا وہ "جادو" تھا، جو یاسر نواز کا بھی بحیثیت ڈائریکٹر پہلا ڈراما تھا اور دلچسپ بات بتاؤں کہ یاسر کا پہلا ڈراما میرے ساتھ تھا، عاطف حسین کا بھی پہلا ڈراما میرے ساتھ تھا۔ احمد کامران اور مظہر معین کا پہلا ڈراما بھی میرے ساتھ تھا۔"

"گویا آج کے بہترین ڈائریکٹر آپ کی دریافت ہیں؟"

"بس! اللہ جسے عزت دے دے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے فصیح باری خان سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

☆

باتیں عروۃ الوثقیٰ سے

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"عروۃ الوثقیٰ۔"

2 "نام کا مطلب؟"
"ایمان کی مضبوط گرفت۔"

3 "نک نیم؟"
"میرا کوئی نک نیم نہیں ہے' لیکن میری مما مجھے "پری" کہتی ہیں۔"

4 "تاریخ پیدائش / شہر؟"
"2 جولائی 1991ء / کراچی۔"

5 "ستارہ / قد بغیر ہیل کے؟"
"کینسر / 5 فٹ 6 انچ۔"

6 "تعلیمی قابلیت؟"
"گریجویشن کر رہی ہوں / کراچی یونیورسٹی سے۔"

7 "بہن بھائی / آپ کا نمبر؟"
"دو بہنیں اور ایک بھائی۔ میں گھر میں بڑی ہوں۔"

8 "شادی؟"
"دیکھیں کب ہوتی ہے۔"

9 "پسند یا ارینج؟"
"والدین کی پسند کو ترجیح دوں گی لیکن لو ہو جائے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔"

10 "پہلا پروگرام / وجہ شہرت؟"
"اے ٹی وی سے ہوسٹنگ کی تھی۔ شہرت کراچی آنے کے بعد ملی' جب میں نے اے آر وائی پہ بحیثیت "وی جے" کام کیا۔"

11 "ڈراما جو وجہ شہرت بنا؟"
"میری لاڈلی اور اس کی ریٹنگ بہت زیادہ تھی۔"

12 "شوبز میں آمد؟"
"تھیٹر کرتی تھی اسلام آباد میں' پھر اے آر وائی والوں نے کراچی بلایا "وی جے" کے لیے تو بس! پھر یہاں سے سلسلہ چل پڑا۔"

13 "پہلی کمائی / کیا کیا تھا؟"
"تھیٹر سے کمائے تھے دس ہزار اور بہت خوشی ہوئی تھی اور اماں کو دے دیے تھے۔"

14 "سال کے کس دن کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے؟"
"اپنی برتھ ڈے کا۔"

15 "پاکستان کے کس شہر میں گھر بنانے کی خواہش ہے؟"
"الحمد اللہ! اسلام آباد میں ہے اپنا گھر اور اسلام آباد میں ہی ایک اور گھر زیر تعمیر ہے۔"

16 "کس ملک کی شہریت لینے کی خواہش ہے؟"
"کسی کی بھی نہیں۔ پاکستان مجھے بہت پسند ہے۔"

17 "کوئی تحفہ جسے پا کر بہت خوشی ہوئی ہو؟"
"مما ہی دیتی رہتی ہیں چھوٹی موٹی چیزیں۔"

18 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"
"بس اس حد تک ہے کہ لوگوں کو اپ ڈیٹ کر دوں کہ میں کیا کر رہی ہوں۔"

19 "سمندر کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟"
"سمندر کو دیکھ کر مجھے بڑی انرجی ملتی ہے۔ لگتا ہے کہ سمندر کے ساتھ میرا کچھ کنکشن ہے۔"

20 "مطالعہ ضروری ہے یا وقت گزاری؟"
"مطالعہ بہت ضروری ہے۔ اگرچہ وقت کم ملتا ہے' مگر کرتی ضرور ہوں۔"

21 "پاکستان کی کوئی اچھی بات اور کوئی بری؟"
"پاکستان کی ہر بات اچھی ہے' سوائے بجلی کی لوڈشیڈنگ کے۔"

22 "باہر کے معاشرے کی کوئی اچھی بات اور بری؟"
"ایک اچھی بات یہ ہے کہ وہاں سینس آف فریڈم ہے۔ آپ کچھ بھی پہن کر چلی جائیں۔ کوئی آپ کو حیرت سے نہیں دیکھے گا اور بری کہ لوگ اپنے آپ کو صاف نہیں رکھتے۔"

23 "آپ کی شخصیت کی کمزوری اور طاقت؟"
"میں لوگوں کے ساتھ بہت فینز ہوں۔ یہ میری کمزوری ہے' کیونکہ مجھے محبت کا جواب محبت سے نہیں ملتا..... اور میری طاقت میری فیملی ہے۔"

24 "کس قسم کے رویے دکھ کا باعث بنتے ہیں؟"
"ان لوگوں کے رویوں پر دکھ ہوتا ہے' جو دوسروں کو آگے بڑھنے نہیں دیتے اور Arrogant (مغرور) رویّے بھی دکھ کا باعث بنتے ہیں۔"

25 "غیر ملکی رسم و رواج میں کون سی رسم پسند ہے؟"
"مجھے ہر کلچر ہی بہت اچھا لگتا ہے۔ جتنے بھی غیر ملکی دوست ہیں' ان کے ساتھ ان کے کلچر کو انجوائے کرتی ہوں۔"

26 "کوئی تاریخی شخصیت جس سے ملنے کی خواہش ہو؟"
"بہت ساری ہیں۔ جیسے لیڈی ڈیانا ہیں اور اس طرح کی

دوسری شخصیات۔"

27 "کبھی ہجوم میں اکیلا پن محسوس کیا؟"

"بہت بار ایسا ہوتا ہے۔ اگر ہم لوگوں جیسے ہو جائیں تو شاید اکیلا پن محسوس نہ ہو۔ لیکن میں ذرا دیگر لوگوں سے مختلف ہوں۔"

28 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"

"کچھ پینے کو دل چاہتا ہے جیسے لسی۔ میری اماں لسی بہت مزے کی بناتی ہیں۔"

29 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"

"ہر کونے میں..... گھر آکر بہت سکون ملتا ہے۔"

30 "کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"

"امی کے ہاتھ کا۔"

31 "ناشتا جو شوق سے کرتی ہو؟"

"بھوی ناشتا نہیں کرتی۔ ناشتے میں کچھ نہ کچھ پی لیتی ہوں۔ لسی ہو گئی یا ایپل جوس وغیرہ۔"

32 "اپنے مسائل کس سے شیئر کرتی ہیں؟"

"اپنی مما سے۔"

33 "زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟"

"مجھے گانے کا بہت شوق ہے اس کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے میرے اپنے ذاتی شوق کے لیے وقت نہیں نکلتا۔"

34 "پہلی مرتبہ نیا پین استعمال کرتی ہیں تو کیا لکھتی ہیں؟"

"میں سیڑھیاں بناتی ہوں۔"

35 "دل کب ٹوٹتا ہے؟"

"وقت، حالات اور مختلف سچویشنز پر منحصر ہے اور توقعات ٹوٹنے پر۔"

36 "کیا بات بہت جذباتی کر دیتی ہے؟"

"آج کل تو جب مما شادی کی بات کرتی ہیں تو جذباتی ہو جاتی ہوں کہ پتا نہیں، آگے چل کر کیا ہوگا۔"

37 "ملک میں کون سی تبدیلی بہت ضروری ہے؟"

"ملک میں بجلی کی بحالی بہت ضروری ہے اور گورنمنٹ تبدیل ہو جائے۔"

38 "کیا اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟"

"فوراً" کر لیتی ہوں۔ حالانکہ میرے دوست کہتے ہیں کہ اتنا زیادہ سوری نہ کہا کرو۔"

39 "پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟"

"کوئی ایسا طریقہ ہو کہ یہ ملک بھی ترقی کرے۔"

40 "کن چیزوں کے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"

"میرے ہینڈ بیگ میں والٹ بہت ضروری ہے، کیونکہ میں شاپنگ بہت کرتی ہوں۔ پرفیوم، موبائل فون، گلاسز اور ہیڈ فون۔"

41 "تنہائی میں کس سے ہم کلام ہوتی ہیں؟"

"اپنے رب سے۔"

42 "اپنا موبائل نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کر چکی ہیں؟"

"ایک ہی بار۔ پانچ چھ سال سے ایک ہی نمبر ہے۔"

43 "سفر کے لیے بہترین سواری؟"

"ہوائی جہاز۔"

44 "کن چیزوں پر بہت خرچ کرتی ہیں؟"

"اپنے گھر والوں پہ بہت خرچ کرتی ہوں۔"

45 "ایک کردار جو آپ کرنا چاہتی ہیں؟"

"گاؤں کی ایک ایسی لڑکی، جس کے پاؤں میں چپل نہیں ہے، چہرہ میک اپ سے عاری ہے۔ ایک اچھی شوخ و چنچل سی لڑکی، جس میں بہت انرجی ہے۔"

46 "اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟"

"اچھی عادت تو یہ ہے کہ نخرہ نہیں ہے مجھ میں اور یہ کہ کب جاگنا ہے، کب سونا ہے، کتنے گلاس پانی پینا ہے۔ اس بات کا بہت خیال رہتا ہے مجھے اور یہی بری عادت بھی ہے۔"

47 "دھوکا اپنے دیتے ہیں یا پرائے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی۔ لیکن کسی پرائے کو اتنا قریب نہ آنے دیں کہ کوئی مشکل ہو۔"

48 "کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش! یہ ہمارا ہوتا؟"

"کسی ملک کے لیے نہیں۔ اپنا ملک بہت اچھا ہے۔"

49 "لوگ آپ سے مل کر پہلا جملہ کیا بولتے ہیں؟"

"عموماً" لوگوں کو لگتا ہے کہ میں غصے والی لڑکی ہوں۔ اس

لیے صرف سلام دعا ہی ہوتی ہے۔ میں خاموش رہتی ہوں۔"

50 "اگر آپ اس ملک کی صدر ہوتیں تو؟"

"تو بہت کچھ کرتی، کیونکہ سارا نظام ہی درہم برہم ہے۔

51 "خدا کی حسین تخلیق؟"

"عورت۔"

52 "کیا محبت ایک بار ہوتی ہے؟"

"مجھے تو پتا نہیں ہے کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ اس لیے کیا بتاؤں۔"

53 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہیں؟"

"میں کبھی دس، بیس روپے نہیں دیتی اور نہ ہی روڈ پر چلنے والے بھکاریوں کو دیتی ہوں۔ مستحق لوگوں کو دیتی ہوں اور اچھا خاصا دے دیتی ہوں۔"

54 "شہرت کیسی لگتی ہے؟"

"بہت اچھی لگتی ہے۔ مگر اس کے چلے جانے کا ڈر بھی لگتا ہے۔"

55 "کوئی لڑکا اگر مسلسل گھورے تو؟"

"تو میں اسے کہہ دیتی ہوں کہ بھئی! کیا مسئلہ ہے۔"

56 "بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے لڑکے یا لڑکیاں؟"

"میرے خیال میں یہ اس بات پر منحصر ہے کہ انسان کیسا ہے۔"

57 "اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتی ہیں؟"

"اپنی سوچ کو کم کرنا چاہتی ہوں، کیونکہ میں سوچتی بہت ہوں۔ دوسری یہ کہ میں کبھی بھی اپنے آپ کو "بہترین" نہیں سمجھتی۔ جبکہ انسان کو اپنے آپ کو بھی اچھا سمجھنا چاہیے۔"

58 "موت سے ڈر لگتا ہے؟"

"بہت زیادہ۔"

59 "جھوٹ آسانی سے بول لیتی ہیں؟"

"نہیں! اور کوشش بھی کرتی ہوں کہ نہ بولوں۔"

60 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

"ٹیلی فون اور موبائل۔"

62 "اگر موبائل فون نہ ہوتا تو؟"

"تو بڑی مشکل ہو جاتی۔ خط لکھنے پڑتے اور انتظار کرتے۔"

64 "شوبز کی بڑی برائی؟"

"کوئی برائی نظر تو نہیں آرہی۔ بس! یہ دعا کرتی ہوں کہ جو شہرت ملی ہے، برقرار بھی رہے۔"

65 "چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟"

"سو سو کر یا کچھ پلاننگ کر کے..... ویسے چھٹی کے دن کوئی اہم کام نہیں کر سکتے کہ بینک وغیرہ بند ہوتے ہیں۔"

66 "کون سا تہوار شوق سے مناتی ہیں؟"

"عید ہی ہے۔"

67 "اپنی شخصیت میں کیا چیز پسند ہے؟"

"میرے خیال میں اللہ تعالیٰ نے مکمل بنایا ہے، اس لیے اپنا آپ اچھا لگتا ہے۔"

68 "پہلی ملاقات میں شخصیت میں کیا دیکھتی ہیں؟"

"کتنا نرم گو ہے۔ کتنا منکسر المزاج ہے۔"

"اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"ڈرتی ہوں اس وقت سے، اس لیے اس شہرت کے نشے کو سر پر سوار نہیں کرتی۔"

☆

عنیزہ سیّد

جنوں کو گرمائے ستم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے "سید پور کلچرل شو" میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ

بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں فلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ فلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئلے سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی فلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مولوی سراج اور آپا رابعہ قصبے میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویں جماعت کی طالبہ بے حد ذہین ہے۔ مولوی سراج اور آپا رابعہ کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کی بیٹی سائنس پڑھ رہی ہے۔

ایک رات سارہ نے رکی کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ سرکس میں کام کرتا تھا۔ رکی اپنے فن کا ماہر جوکر تھا۔

ماہ نور اور شاہ بانو "سید پور کلچرل شو" میں گئیں تو وہاں انہیں ایک کمہار نظر آیا۔ وہ گیلی مٹی کو بہت مہارت سے دیدہ زیب برتنوں کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ ماہ نور کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اسے اس پر اسی شخص کا گمان ہوا جو اسے ہر میلے میں مختلف روپ میں نظر آتا رہا تھا۔

سارہ، ماہ نور سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ اس کا رویہ بہت روکھا اور خشک تھا۔

واپسی پر گاڑی میں ماہ نور نے سعد سے اعتراف کیا کہ وہ اب تک جتنا سعد کو جان پائی ہے، سعد اس کی نظر میں ایک قابل رشک انسان ہے، سعد نے اسے سارہ کے متعلق بتایا وہ سرکس دیکھنے گیا تھا۔ سارہ خان بلندی سے نیچے گری تھی۔ اس نے اس کی ہڈیاں ٹوٹتے اور خون بکھرتے دیکھا تھا، وہ وہاں سے واپس آگیا لیکن سارہ خان کے لیے بے چین رہا۔ وہ دوبارہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اس سے ملنے پہنچا تو وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور زخم زخم جسم کے ساتھ ایک چھولداری میں پڑی موت کی منتظر تھی۔ اس کے زخموں پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔ سعد اس کو وہاں سے لایا اور اس کا علاج کرایا اور پھر اسے فلیٹ میں منتقل کیا۔

کھاری نے آپا رابعہ سے نماز یاد کرلی تھی اور بہت خوش تھا۔ سارہ خان نے پہلی بار سوچا سعد سے اس کا تعلق صرف ترس اور ہمدردی کا ہے اسے اپنا ماضی یاد آرہا تھا۔ جہاں جاپانی نقش و نگار والا رکی تھا۔ جس کی جاپانی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس کا باپ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ پھوپھی کے حوالے کرگیا تھا۔ باپ نے دوسری شادی کرلی تو سوتیلی ماں کے مظالم سے تنگ آکر وہ گھر سے بھاگ گیا اور قسمت اسے سرکس میں لے آئی۔

آپا رابعہ نے مولوی سراج کو بتایا کہ اسکول والوں نے سعدیہ کی پیدائش کی پرچی مانگی ہے تو وہ پریشان ہوگئے۔

ماہ نور، سارہ سے ملنے آئی اور اس نے سارہ کو بتایا کہ اس کی سعد سے صرف چند دن پہلے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ سن کر سارہ کا رویہ اس کے ساتھ بدل گیا۔

سعد نے اپنی بہن نادیہ سے اسکائپ پر بات کی۔ وہ فن لینڈ میں بہت مشقت بھری زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں کا شوہر اس پر بری نظر رکھ رہا تھا۔ اس لیے وہ فن لینڈ آگئی۔

جیناں بھکارن نے ایک بچہ اغوا کیا لیکن پولیس نے اس سے بچہ برآمد کرلیا۔

ماہ نور کی سعد سے ملاقات ہوئی تو وہ اسے اختر کے پاس لے گیا۔ اختر نے ماہ نور کو دیکھ کر سعد سے کہا "یا تو زن یا من پالو" ایک کی قربانی دینی پڑے گی۔

اس نے ماہ نور سے کہا بی بی آپ کا دل بہت صاف ہے اور زندگی بہت پرسکون ہے لیکن آگے آپ کے لیے بہت مشکلیں ہیں۔

قسط نمبر 2

"مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش ہے جہاں میرا دل لگ جائے۔" سعد کہہ رہا تھا "چاہے کچھ دیر کے لیے سہی مگر کہیں لگے تو۔" اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"ہوں!" ماہ نور نے ایسے سر ہلایا جیسے بغیر کسی تفصیل کے سعد کی بات پوری طرح سمجھ گئی ہو۔

"تو کیا تمہیں ابھی تک ایسی کوئی جگہ نہیں ملی؟" اس نے پوچھا۔

"شاید نہیں۔" سعد نے گاڑی کے وائپر زبند کرتے ہوئے کہا۔

"شاید؟" ماہ نور نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں!" سعد نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کے سر ہلایا۔ "میں مختلف جگہوں پر اسی لیے جاتا ہوں کہ شاید کہیں میرا دل لگ جائے، مگر کسی جگہ پر اگر میرا دل لگتا بھی ہے تو کچھ دن بعد اوبھ جاتا ہے۔"

"ہوں!" ماہ نور نے گہرا سانس لیا اور سعد کی طرف دیکھا۔ "ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

"شاید اس لیے کہ میں ایک کامپلیکس کا شکار ہوں۔" سعد نے دامن کوہ پر گاڑی پارکنگ میں لے جاتے ہوئے کہا۔

"ایک ایک کپ کافی پی لیں، اگر تمہیں برا نہ لگے تو؟" اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"ہاں پی لینی چاہیے۔" ماہ نور نے اس بار بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہا۔

باہر فضا بے حد خوشگوار تھی اور آتی بہار کی مسرت سے سرشار پیڑ، پودوں اور درختوں کے سبز رنگوں کے شیڈز کی تعداد ان گنت تھی۔ سعد اسے اسی اوپن ایر ریستوران میں لے آیا جہاں ان دونوں نے پہلی تفصیلی ملاقات کی تھی۔

"اچھا یہ تو بتاؤ، وہ کامپلیکس کیا ہے، جس کے تم شکار ہو۔" ماہ نور نے کرسی پر بیٹھنے کے بعد پوچھا۔ انہوں نے ایک ایسی ٹیبل کا انتخاب کیا تھا جو نسبتاً "کونے میں تھی۔ چیئر پر بیٹھنے کے بعد ماہ نور نے پوچھا۔

"وہ یہ ہے کہ میری جینز میں چند ایسی خصلتیں موجود ہیں جو میرے موجودہ اسٹیٹس اور ماحول سے میل نہیں کھاتیں۔" سعد نے ہاتھ میں پکڑے کی رنگ میں موجود ایک چابی کی نوک سے ٹیبل پر بچھے کپڑے کی سلوٹیں نکالتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہاری جینز میں موجود خصلتیں تمہارے پیرنٹس کی طرف سے تمہیں ٹرانسفر ہوئی ہیں۔" ماہ نور نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "پھر وہ تمہارے ماحول اور اسٹیٹس سے میل کیسے نہیں کھاتیں۔"

"ہاں ایسا ہی ہے۔" سعد نے سر ہلایا۔ "مگر میرا ماحول اور میرا اسٹیٹس میرے ڈیڈی کا مرہون منت ہے، اور جینز میں موجود یہ چند خصلتیں غالباً "میری ماں سے مجھے ٹرانسفر ہوئی ہیں۔"

"اور تمہاری ماں.....؟" ماہ نور نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میری ماں۔" اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھے۔ "میں نے اپنے ہوش میں انہیں ایک بار بھی نہیں دیکھا۔"

"اوہ....." ماہ نور کے ہونٹ سکڑے "کیا ان کی ڈیتھ ہو چکی ہے؟"

"پتا نہیں۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "مجھے ان کے بارے میں کچھ علم نہیں۔"

"یہ کچھ عجیب سی بات نہیں ہے۔" ماہ نور چونک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ بہت ہی عجیب۔" وہ تلخی سے مسکرایا۔ "میں شاید بہت چھوٹا تھا جب میری ماں کا وجود میری زندگی سے خارج ہوگیا۔" اس نے کہا۔ "جب میں چہرے اور آوازیں پہچاننے کے قابل ہوا، میں نے اپنے گھر میں ایک خاتون کو موجود پایا جس کا رنگ، زبان اور نسل میرے اردگرد موجود لوگوں سے بالکل مختلف تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ اس گھر میں جس میں، میں موجود تھا، وہ ماں تھی ممی..... وہ بہت ینگ تھی، شاید خوب صورت، اسمارٹ اور

طرح دار بھی تھی۔ گھر بھر پر اس کا پورا ہولڈ تھا' ڈیڈی بھی اس کے بے دام کے غلام تھے۔

یہ بے دام کے غلام والی بات اب میرے ذہن میں آتی ہے جو کبھی میں ان دنوں کو یاد کروں تو۔ اس وقت تو ان الفاظ کے نہ ہجے آتے تھے' نہ معنی۔" وہ مسکرایا۔ "پھر ہمارے گھر میں ایک گڑیا سی بچی آگئی' مجھے بتایا گیا کہ وہ میری بہن ہے۔"

ماہ نور نے اس بات کو سنتے ہوئے سعد کے چہرے کے تاثرات جانچنے کی کوشش کی' وہ آنکھیں سیکڑے سامنے موجود مارگلہ کی پہاڑیوں پر شاید اپنے ماضی کی فلم چلتے دیکھ رہا تھا۔

"میں نے چیزوں کو' رشتوں کو اور جذبوں کو اسی طرح قبول کیا جیسے وہ میرے سامنے بیان کیے جاتے رہے۔ لیکن میں ڈیڈی سے بہت زیادہ اٹیچڈ تھا۔ شاید اس لیے کہ میری رگوں میں ان کا خون دوڑتا تھا' وہ خاتون جو گھر میں ممی کا رول پلے کر رہی تھی۔ اسے اس بات سے سخت چڑ تھی کہ ڈیڈی اور میں ایک دوسرے کا سایہ کیوں بنے رہتے ہیں اور کیونکہ ڈیڈی اس کے بے دام کے غلام تھے۔ اس نے ان سے کہہ کر مجھے صرف چھ سال کی عمر میں بورڈنگ بھجوادیا۔"

ماہ نور نے دیکھا اس کی سامنے کے منظر پر جمی آنکھوں میں ہلکی سی نمی جھلملا رہی تھی۔

"میں اس باربی ڈول جیسی گڑیا بچی سے بھی بہت زیادہ اٹیچڈ تھا۔ مجھے اس سے بھی الگ کردیا گیا۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"بورڈنگ کے وہ ابتدائی دن بہت سرد اور ظالم تھے' مگر میں ایک بات سمجھ گیا تھا کہ مجھے وہ دن اسی طرح گزارنے تھے جیسے وہ ایک کے بعد ایک میرے سامنے آتے جارہے تھے۔ ان سے فرار ممکن نہیں تھا' کیونکہ بورڈنگ کے لیے روانہ ہونے سے پہلے جب میں چاروں ہاتھ پاؤں چلاتا مچل رہا تھا کہ مجھے بورڈنگ نہیں جانا تو ڈیڈی نے میرے کان میں ایک بات کہی۔"

اس نے ذرا توقف کیا۔ ماہ نور نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"انہوں نے کہا کہ ماں یعنی ایک مدر لی فگر' کی جو بات نہیں مانتا وہ کبھی زندگی میں کچھ نہیں حاصل کرسکتا۔"

"عووو!" ماہ نور کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"میں زندگی میں بہت کچھ حاصل کرنے کی خاطر ڈیڈی کی یہ بات مان کر بورڈنگ چلا گیا۔"

"اس لیے کہ تم اپنے ڈیڈی سے اتنے اٹیچڈ تھے کہ ان کی کہی ہر بات تمہارے لیے قول زریں کی حیثیت رکھتی تھی۔" ماہ نور کی زبان بے اختیار پھسلی تھی۔

"طنز کرنے کی نہیں ہو رہی۔" سعد نے تنبیہہ کی اور مسکرا دیا۔ "بات یہ ہے کہ ایک چھ سال کے بچے کو دل کی تسلی کے لیے ہی سہی' ایک جذباتی سہارا درکار ہوتا ہے اور میرے لیے وہ جذباتی سہارا ڈیڈی ہی تھے۔ لہٰذا ان کی کہی بات کو قول زریں سمجھنا ہی میرا آخری چارا تھا۔"

"اچھا... پھر آگے چلو۔" ماہ نور نے کافی کے کپ پر ہاتھ کی انگلیاں جما کر اس کی حدت کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"اس سے آگے کیا ہوسکتا تھا۔" سعد نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "اس سے آگے ہی تو یہ ہوا کہ بہت سارے لوگوں میں بھی میرا دل لگنا ممکن نہیں رہا۔ میں نے بورڈنگ میں پہلے دو سال روتے دھوتے گزارے' تیسرے سال میں مدر لی فگر' جس کی بات نہ ماننے پر میں زندگی میں سب کچھ ہار سکتا تھا۔ ڈیڈی کو چھوڑ کر اپنے

دیس چلی گئی۔"

"کیوں؟" ماہ نور نے بے ساختہ پوچھا۔

"اسے پتا چلا تھا' وہ ڈیڈی جیسے شخص کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔"

"اوہ میرے اللہ!" ماہ نور نے کپ میز پر رکھ دیا۔ "اور وہ جو چھوٹی سی گڑیا تھی۔ اس کا کیا ہوا؟"

"وہ بے چاری بھی میری طرح ماں کی شکل و صورت سے نا آشنا اس گھر میں ایک فلپائنی آیا کی آغوش میں پلنے لگی۔"

"کیوں بھئی؟" ماہ نور کے لہجے میں احتجاج تھا۔ "اس کی ماں اسے اپنے ساتھ لے کر کیوں نہیں گئی؟"

"اس لیے کہ اسے ڈیڈی سے متعلق ہر چیز سے نفرت ہوگئی تھی۔" سعد عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

"تمہارے ڈیڈی۔" ماہ نور نے ناک سیکڑی۔ "معاف کرنا کچھ عجیب سی شخصیت لگتے ہیں' جن کا دو میں سے ایک بھی بیوی کے ساتھ گزارا نہیں ہوا۔"

"شاید ایسا ہی ہے۔" سعد نے سر ہلایا۔

"پھر کیا ہوا؟" ماہ نور کے لہجے میں تجسس کی آمیزش جھلکنے لگی۔

"پھر وہ گڑیا بھی جب تھوڑی بڑی ہوئی اسے کانونٹ بھیج دیا گیا۔ وہ بھی بورڈنگ کی نذر ہوگئی۔" سعد کے چہرے پر ایک بار پھر تلخی ابھری۔ "میری طرح وہ بھی ایسی طویل چھٹیوں کے انتظار میں دن گزارنے لگی جب گھر کے مزے جی بھر کے لوٹے جاسکتے تھے' جب ہم دونوں اکٹھے ہوتے تھے اور ہماری دلچسپیاں ایک سی ہوتی تھیں۔"

"اوہ گڈ!" ماہ نور مسکرائی۔ "شکر ہے اس کہانی میں کوئی لائٹ موڈ بھی آیا۔"

"فکر نہیں کرو' لائٹ موڑ ابھی ہوا' ہوا چاہتا ہے۔" سعد نے فوراً" تردید کی۔

"وہ کیسے؟" ماہ نور کو مایوسی ہوئی۔

"وہ ایسے کہ جب وہ گڑیا تیرہ سال کی ہوئی' مدر لی فگر اچانک آن وارد ہوئی اور اس نے دعوا کیا کہ وہ اپنی بیٹی کو لے کر ہی جائے گی۔"

"کیوں اس کو اچانک بیٹی کی یاد کیوں آگئی؟"

"پتا نہیں ــــ مگر اس کا ارادہ پکا تھا اور وہ اس بے چاری کو زبردستی اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب بھی ہوگئی۔"

"تمہارے عجیب و غریب والد نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔"

"کی تھی' مگر اس خاتون نے ایک ایسی بات کردی کہ والد صاحب اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔"

"ہیں۔" ماہ نور نے کہا۔ "وہ کیا بات تھی؟"

"اس نے کہا کہ وہ بچی ڈیڈی کی تھی ہی نہیں۔ وہ ان خاتون کے کسی اور صاحب سے تعلق کا نتیجہ تھی۔"

"اوہ مائی گاڈ!" ماہ نور کو جیسے بری طرح شاک لگا۔ "کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے؟" وہ آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

"ہاں ایسا بھی ہوسکتا ہے' بلکہ اس سے زیادہ بھی ہوسکتا ہے۔" سعد اس کی حیرت پر مسکرایا۔

"استغفار!" ماہ نور نے بمشکل تھوک نگلا۔ "اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے۔"

"کیا اس کی یہ بات سچ تھی؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ماہ نور نے پوچھا۔ اسے یہ بات ہضم نہیں ہو پا رہی تھی۔

"ڈیڈی کو کچھ لوگوں نے ڈی این اے ٹیسٹ کا مشورہ دیا' مگر وہ نہیں مانے' وہ اتنے طیش میں تھے یا انہیں اتنا طیش دلا دیا گیا تھا کہ وہ چاہتے تھے فی الفور یہ بچی ان کی زندگی سے دور چلی جائے۔"

"سو سیڈ!" ماہ نور نے تاسف سے سر ہلایا۔ اس سارے میں اس بے چاری کا کیا قصور تھا۔ جس کی آئیڈینٹیٹی (شناخت) ہی مشکوک بنادی گئی۔

"ان خاتون نے جھوٹ بولا تھا' وہ بچی ڈیڈی ہی کی بیٹی تھی' یہ ڈیڈی نے کچھ عرصے بعد ہی محسوس کرلیا تھا۔"

"وہ کیسے؟"

"کیونکہ کچھ عرصہ کے بعد ہی ڈیڈی کو اپنی اولاد کی جنیٹک (وراثت میں ملنے والی) خوبیوں اور خامیوں کا انالسس (تجزیہ) کرنے کا مراق ہوگیا اور ان پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ وہ بچی کچھ ایسی جنیٹک خوبیاں رکھتی تھی جو ان سے stem out ہوکر نکلی تھیں۔"

"پھر انہوں نے یہ محسوس کرلینے کے بعد بچی کو دوبارہ اپنی تحویل میں لینے کی کوشش نہیں کی؟"

"نہیں۔" سعد تلخی سے مسکرایا۔ "وہ اپنی زندگی کے اس چیپٹر سے بالکل بے زار ہوچکے تھے۔ انہوں نے بچی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔"

"اوہ!" ماہ نور کو ایک مرتبہ پھر مایوسی ہوئی۔ "پھر اب وہ بچی کہاں ہے' کس حال میں ہے' اس کی identity (شناخت) کیا ہے' کچھ جانتے ہو اس کے بارے میں؟"

"ہاں۔ جانتا ہوں۔" سعد نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کیا۔۔۔؟"

"ڈیڈی نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔ اس کی Identity پر' کیونکہ وہ نادیہ بلال کی آئی ڈی کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے' اس کے پاسپورٹ پر' اس کے تمام ڈاکیومنٹس پر ولدیت کے خانے میں ڈیڈی کا نام درج ہے۔ شاید ڈیڈی اسے اتنی ہی قبولیت دے سکتے تھے۔"

"اب کہاں ہے وہ؟"

"وہ کوئی بہت اچھی زندگی نہیں گزار رہی' اس کی ماں نے اسے اپنے نئے شوہر' نئے بچوں' نئے گھر اور نئی زندگی سے کک آؤٹ کردیا ہے۔ وہ سیلف سپورٹ اور چند وظائف کے ساتھ ایک بہت چھوٹے سے ملک میں انتہائی تکلیف دہ موسم کا مقابلہ کرتی تعلیم حاصل کررہی ہے۔ اسے بغیر کسی سہارے' رشتے اور تعلق کے احساس کے بغیر اپنی زندگی گزارنی پڑ رہی ہے۔" سعد نے سر جھکا کر کہا۔

"کبھی کبھی انسان کو ایسی زندگی بھی گزارنا پڑتی ہے' جو اگر اس کو چوائس کا حق دیا جائے تو وہ کبھی انتخاب نہ کرے۔" سعد نے افسردگی سے کہا۔

"کیسی عجیب سی زندگی' الجھنیں ہی الجھنیں۔" ماہ نور بے مزا ہوگئی۔

"مگر یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمہارا دل کیوں نہیں لگتا؟" پھر اسے اصل بات یاد آئی۔

"یہ الجھنیں دیکھ کر بھی پوچھ رہی ہو۔" سعد ہنسا۔ "ڈیڈی کو جب سے یہ مراق ہوا ہے کہ اپنی اولاد کی جنیٹک خوبیاں اور خامیاں پرکھیں انہیں اندازہ ہوتا رہا ہے کہ مجھ میں اپنی والدہ کی جینز کا اثر بدرجہ اتم پایا جاتا ہے کیونکہ میری والدہ جنہیں میں نے دیکھا بھی نہیں کسی گانے بجانے والی فیملی سے تعلق رکھتی تھیں۔

کبھی ان کو یاد آتا ہے کہ میرے مادرانہ آباؤ اجداد جو تھے۔ ان میں سے ایک نسل گاتی بجاتی تھی' ایک کمہار تھی' ایک ترکھان تھی' کچھ خانہ بدوش تھے اور اکثر پیر فقیر اور یہ ساری جو صلاحیتیں ہیں مجھے منتقل ہوگئی ہیں۔"

"تمہارے ڈیڈی ہیں کیا چیز؟" ماہ نور کو سخت چڑ محسوس ہوئی۔ "اگر وہ اتنا ظالمانہ تجزیہ کرتے ہیں تمہاری والدہ کی فیملی کا تو کبھی ان سے پوچھو' انہوں نے تمہاری والدہ سے شادی ہی کیوں کی تھی؟"

"ہم براہ راست سوالوں' جوابوں میں نہیں پڑتے۔" سعد نے مسکرا کر کہا۔ "ہم ایک دوسرے کے بارے میں

قیاسے اور اندازے لگا کر آگے بڑھتے ہیں' ایک دوسرے کی باڈی لینگویج کو جج کرتے ہیں اور بالواسطہ الفاظ کے داؤ پیچ آزما کر ایک دوسرے کو چت کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔"

"یہ کیوں؟"

"یہ عجیب سا رشتہ خود بخود ہم دونوں کے درمیان بن گیا ہے۔ ڈیڈی مجھ سے اس بات پر نظر چُراتے ہیں کہ کہیں میں اپنی ماں کے بارے میں وہ سوال نہ کر ڈالوں جو تم نے کیا' اور میں اس بات سے کہ کہیں ایسے کسی سوال کے جواب میں مجھے کسی ناقابل برداشت حقیقت کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے۔

لیکن ان ساری حقیقتوں اور واقعات نے میرے مزاج کو بنایا کم بگاڑا زیادہ ہے۔ میں جہاں ہوتا ہوں خود کو وہاں اجنبی محسوس کرتا ہوں' مجھے وہاں سے تعلق محسوس نہیں ہوتا' میں بہت سی جگہوں پر وہاں کے ماحول میں ڈھلنے کی کوشش محض اس لیے کرتا ہوں کہ شاید کوئی جگہ مجھے خود میں سما لے' میں کہیں خود کو جذب ہوتا محسوس کرلوں' مگر ایسا نہیں ہوتا' ابھی تک ایسا نہیں ہوا۔ میں سرگرداں ہوں' تلاش میں ہوں۔ شاید۔۔۔ کبھی کہیں ایسا ہوجائے۔"

ماہ نور نے نظریں اٹھا کر اس ۔۔۔ کو غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔

"مگر اس تلاش میں یہ ضرور ہوا کہ مجھے مختلف لوگوں کو جاننے اور سمجھنے کا موقع مل گیا۔" وہ ایک لمبا سانس لینے کے بعد گویا ہوا "اور یہ مشغلہ مجھے اتنا اچھا لگا کہ مجھے اس کا چسکہ پڑ گیا اور میں اب دانستہ زندگی کی روٹین سے چند دنوں کا آف لے کر اپنا شوق پورا کرتا رہتا ہوں۔" وہ مسکرایا۔

ماہ نور کے ذہن میں موجود کئی گتھیاں جیسے ایک دم سلجھ گئیں۔

"ابھی بھی میں نے آف لیا ہوا ہے۔" اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ "جب ہی تو کہہ رہا تھا کہ دن تیزی سے گزرتے جارہے ہیں۔"

"آف ختم ہوگیا تو کیا کرو گے؟" ماہ نور نے کہا۔

"ڈیڈی کی بزنس اسٹیٹ کے معاملات میں غرق ہوجاؤں گا اور کیا۔" وہ ہنسا۔

"تمہارے ڈیڈی۔" ماہ نور نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔ "جن سے تمہارا تعلق عجیب سا ہے۔ جن کے بارے میں تم قیاسے اور اندازے لگا کر آگے بڑھتے ہو' جن کی باڈی لینگویج کو جج کرتے ہو اور جنہیں الفاظ کے داؤ پیچ کے ذریعے چت کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہو۔ ان کی بزنس اسٹیٹ کے معاملات میں غرق ہوجاؤ گے؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں!" وہ ٹیبل سے کی رنگ اور سن گلاسز اٹھاتے ہوئے بولا۔ "اس لیے کہ مجھے ان سے شدید محبت ہے۔"

فضا میں ایک دم سناٹا سا چھا گیا۔ ڈھلتی سہ پہر پر سورج کی عدم موجودگی کے باعث اچانک خنکی کی چادر تن گئی۔

ماہ نور نے پیڑوں کے پتوں کو ہولے ہولے چلتی خوش گوار ہوا کے سنگ آہستگی سے ہلتے دیکھا اور پھر سعد کو مخاطب کیا جو اٹھ کر چند قدم آگے جاچکا تھا۔

"سنو!" اس نے پکارا اور سعد کے چلتے قدم رک گئے۔

"ہوں۔" اس نے گردن موڑ کر پوچھا۔

"کیا یہ سب تم نے پہلے کبھی کسی کے ساتھ شیئر کیا ہے؟"

وہ کچھ دیر یوں ہی گردن موڑے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک لفظ میں جواب دیا "نہیں۔" اور سن گلاسز آنکھوں پر لگا کر دوبارہ آگے چلنے لگا۔

ماہ نور نے ایک لمحے کے لیے رک کر اس کے جواب پر غور کیا اور پھر سر جھکا کر اس کے پیچھے چلنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"آج مولوی صاحب کی بیوی آئی تھی ہماری طرف۔"

صابرہ نے چوہدری سردار کو مطلع کیا۔ چوہدری سردار کبھی کبھار ہی گھر کی طرف آتے تھے۔ ان کا زیادہ تر قیام فارم ہاؤس میں رہتا تھا اور صابرہ کا دل فارم ہاؤس میں کبھی نہیں لگتا تھا۔ انہیں گاؤں کے اندر بنا اپنا گھر جس میں وہ ہمیشہ سے رہتی آئی تھیں بہت اچھا لگتا تھا۔ یہاں گاؤں کی اکثر عورتیں ان کے پاس بلا روک ٹوک جب دل چاہے آسکتی تھیں جبکہ فارم ہاؤس گاؤں سے نسبتاً باہر تھا جہاں جانے کے لیے خصوصی تردد کرنا پڑتا تھا اور اندر داخل ہونے کے لیے کئی طرح کی چیکنگ کے مرحلے سے بھی گزرنا پڑتا تھا۔ صابرہ کو ان دیہاتی خواتین کی سنگت کی عادت سی ہوگئی تھی اسی لیے فارم ہاؤس میں ان کا دل گھبراتا تھا اور وہ ادھر ہی خوش رہتی تھیں۔

"مولوی صاحب کی بیوی تو کبھی ادھر کو نہیں آئی شاید۔" چوہدری سردار نے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے یاد کیا۔

"ہاں سنا تھا بڑی دماغ والی ہے کبھی کم ہی کسی کے گھر جاتی ہے نہ میلاد پڑھتی ہے نہ کبھی کسی کی محفل میں شریک ہوتی ہے۔" صابرہ کے چہرے پر ایک تمسخرانہ سی مسکراہٹ ابھری۔

"تو اب کیسے آگئی ہمارے گھر؟" چوہدری صاحب نے کبھی صابرہ سے ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ مولوی سراج پر کیسا ہاتھ رکھتے تھے۔

"کہہ رہی تھی کہ بیٹی نے نویں کا امتحان دینا ہے اور اسکول والے پیدائش کی پرچی مانگ رہے ہیں داخلہ بھجوانے کے لیے۔" صابرہ نے کہا۔

"تو؟" چوہدری صاحب کا دانت خلال کرتا ہاتھ لحہ بھر کو رکا اور انہوں نے صابرہ کی طرف دیکھا۔

"تو یہ کہ اس کے پاس بچی کی پیدائش کی پرچی نہیں ہے۔ پتا نہیں پیدائش درج نہیں کرائی کہ پرچی گم ہوگئی۔" صابرہ نے سرہلایا۔ "جو بھی ہوا بس پرچی نہیں ہے ان کے پاس اور اس کے بغیر داخلہ نہیں جانا بچی کا۔"

"اوہو تو جہاں بچی کی پیدائش ہوئی تھی وہاں جاکر یونین کونسل میں درخواست دیں۔" چوہدری صاحب نے سیدھا حل بتایا۔

"وہ تو کہہ رہی تھی چوہدری صاحب سے کہیں پرچی بنوادیں۔"

صابرہ کو چوہدری صاحب کا مشورہ ذرا نہ بھایا۔ مولوی صاحب کی مزاج دار بیوی کا کام کرکے اس پر احسان چڑھانے کا خوب موقع ہاتھ آیا تھا۔

"لو چوہدری صاحب کیسے بنوادیں بھئی پرچی؟" چوہدری سردار کو الجھن سی ہوئی۔ "مجھے کیا پتا لڑکی کی پیدائش کہاں اور کب ہوئی تھی۔"

"وہ آپ ان سے پوچھ لیں مولوی صاحب سے۔" صابرہ نے بے نیازی سے کہا۔ "کہہ رہی تھی نہیں تو لڑکی کا سال ضائع ہوجائے گا۔"

"اوہو بھئی۔ لوگوں کو بھی کیسے کیسے کام پڑجاتے ہیں۔" چوہدری صاحب جھنجلا کر بولے۔ "اب یہ کہہ کر کہ لڑکی کا سال ضائع ہوجانا ہے میرے سر پر سوار کرادی بات۔" چوہدری صاحب نے جیب سے سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔

"او ماسٹر جی۔۔۔ ذرا کھاری کو بھیجو مولوی سراج کی طرف بولو لڑکی کے سارے کوائف کاغذ پر لکھ کر بھیجیں۔ ان کی سنو داخلے کا وقت سر پر آیا کھڑا ہے۔ ان کو اب یاد آیا۔ پیدائش کی پرچی بنوانی ہے ابھی۔" چوہدری صاحب

ماسٹر کمال کو ہدایات دیتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"اور ان کو یہ بھی کہہ دو لیٹ فیس کے ساتھ بھی داخلہ بھیجنا پڑا تو بھیجیں گے ضرور۔ بچی کا سال نہیں مرنے دیں گے۔"

"لو میں نے سوچا تھا پرچی بنوا کر میرے ہاتھ میں دیں گے اور میں اس نخرے والی بی بی کو بلا کر چار احسان چڑھا کر اس کے حوالے کروں گی۔" انہوں نے کھاری کو آگے لگا دیا۔" صابرہ نے یہ گفتگو سن کر سوچا اور ناک چڑھائی۔

"ایک تو یہ کم بخت کھاری ہمارے سر پر چڑھا بیٹھا ہے جو گھر کا کام ہے کھاری ہی کرے کوئی اور نہیں کرسکتا۔" انہوں نے سر جھٹکا۔ "پر ہے نگوڑا بڑا شریف اور تابع دار۔" میرے کام تو بھاگ بھاگ کر کرتا ہے ایک بار پیغام بھیجوں دوڑ کر میری طرف آتا ہے دوسرے ہی لمحے انہوں نے محبت سے سوچا "جیتا رہے ہمارے تو ڈیرے کی رونق ہے بھلا مانس۔" انہوں نے سوچا اور چوہدری صاحب سے مخاطب ہوئیں۔

"میں سوچ رہی ہوں۔ لاہور رہ آؤں دو دن۔ فائزہ کا فون آیا تھا کہہ رہی تھی دو تین نئی دکانیں بنی ہیں بڑی بڑی آکر دیکھ لیں۔"

"دکانیں ہالز بیگم صاحبہ شاپنگ مالز۔" چوہدری سردار ہنسے۔

"او آہو۔" وہ جھنجلائیں۔ "وہی ہوں گے اس بار کھاری کو میں نے ساتھ لے کر جانا ہے اسے بڑی پہچان ہوگئی ہے لاہور کے راستوں کی۔"

"نہیں بھئی۔ کھاری نہیں جاسکتا۔ اس کے بغیر یہاں کام نہیں چلتا۔" چوہدری صاحب نے نفی میں سرہلایا۔

"اس دفعہ میں نے بھی کھاری کو ہی لے کر جانا ہے۔ آپ دوسرے بندوں پر کام ڈالیں گے تو انہیں کام چلانے کی عادت پڑے گی نا۔" صابرہ نے بھی جیسے ٹھان لی کہ اپنی مرضی چلائیں گی۔

"چلو جب خیر سے جانے کی تیاری کروگی تو دیکھیں گے۔" چوہدری صاحب نے بحث ختم کی اور اٹھ کر صحن میں چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

"میری زندگی میں تو کوئی اتار چڑھاؤ کبھی آیا ہی نہیں میں جیسی زندگی بچپن سے گزارتی آئی ہوں زندگی ابھی بھی ویسی ہی ہے سادہ اور سیدھی۔ میرے گھر کا ماحول بھی ویسا ہی ہے جیسا بچپن میں میں نے پایا۔ لگی بندھی روٹین ممی اور بابا دونوں جاب کرتے تھے مگر دونوں ہی میرے اور سلمان کے معاملے میں بے حد کیئرنگ رہے ہمیں کیا کرنا چاہیے ہمیں کیا کرنا منع ہے اس کا سبق بچپن سے ہی گھول کر پلا دیا گیا۔ گھر کا ہر فرد دن بھر جہاں بھی رہا مغرب کی اذان کے بعد اسے گھر سے باہر رہنے کے لیے خصوصی اجازت لینا پڑتی تھی اور اب بھی لینی پڑتی ہے۔ میں اور سلمان جو نیا دوست بنائیں اس کی تفصیل سے ممی کو آگاہ کرنا انتہائی ضروری ہے۔ لنچ ہر فرد الگ الگ ٹائم پر لے سکتا ہے۔ مگر ڈنر پر سب کا موجود ہونا ضروری ہے وہی پرانا مقولہ کہ جو فیملی اکٹھے کھانا کھاتی ہے ہمیشہ اکٹھی رہتی ہے پر سختی سے یقین کیا اور کروایا جاتا ہے۔

تم خود سوچو اتنی کیلکولیٹڈ زندگی میں جہاں اتفاقات اور حادثات کا دور دور تک کوئی چانس نہ ہو مجھے اگر ایک ہی شخص مختلف حلیوں اور مختلف Traits کے ساتھ مختلف جگہوں پر نظر آئے گا تو میرے حواس خمسہ کا جواب دے جانا لازمی ہوگا یا نہیں؟" سعد کو ماہ نور سے سنی باتیں یاد آرہی تھیں اس نے انتہائی سادگی سے اپنا تعارف کرایا تھا۔

"مجھے اپنے سردار چاچا سے بہت محبت ہے اور چاچی صابرہ سے بھی ان دونوں کا کوئی بچہ نہیں۔ اس لیے وہ مجھے

اور سلمان کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ مجھے کچھ زیادہ کیونکہ مجھے سلمان کی نسبت گاؤں کا ماحول زیادہ پسند ہے۔ سردار چاچا نے میری خاطر ہی اس بندر والے کو ایکسٹرا پیسے اور گندم کی بوری دے کر گاؤں بلوایا تھا۔ کھاری بے چارہ تو مان ہی گیا تھا کہ وہ بندر والا پہلے والا بندر والا ہی تھا کیونکہ اس کی باندری لولی تھی اور باندر بھینگا۔" یہ بات سناتے ہوئے اس کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا تھا۔

"تمہیں کھاری سے ملنے کا اتفاق ہو تو پتا چلے کہ وہ کتنا معصوم اور بے ریا ہے' جب ہی تو فٹافٹ مان گیا کہ بندر والا وہی تھا۔ کھاری نے ہی میلے والے سائیں سے بات کرنے کا بندوبست کیا تھا۔ بڑا ہی دلچسپ لڑکا ہے کھاری۔" وہ کہہ رہی تھی اور سعد محویت سے اسے دیکھتا رہا تھا۔

"شاید تمہیں علم نہیں کہ تم بھی کتنی معصوم اور بے ریا ہو۔" اس نے کروٹ بدل کر سوچا۔ "اختر تو تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا تا' لیکن دیکھا اس نے تمہارے بارے میں کتنا صحیح تجزیہ پیش کیا' مگر خدا نہ کرے جو اختر کی پیشن گوئیاں بھی تمہارے لیے درست ثابت ہوں۔" دوسرے ہی لمحے اس نے گھبرا کر سوچا۔

اختر کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا' ایک بات سے دوسری پر' ایک موضوع سے دوسرے پر مینڈکوں کی طرح چھلانگیں لگاتا رہتا ہے۔ میں نے برا کیا جو تمہیں اس کے پاس لے گیا۔ اللہ نہ کرے کہ تم جو اتنی سیدھی سادی زندگی گزار رہی ہو' تمہیں کبھی کہیں کسی مشکل سے دوچار ہونا پڑے۔ مجھے تو تمہاری صاف' پرسکون اور ٹھہری ہوئی سیدھی سادی زندگی پر رشک آرہا ہے۔ اللہ نہ کرے جو تمہاری ایسی زندگی کو کسی کی نظر لگے۔"

وہ سوچ رہا تھا اور اس کے تصور میں ماہ نور کے مختلف روپ آرہے تھے۔

گاؤں کے کھلے میدان میں بے ترتیب بالوں اور سادہ سے حلیے میں بھٹہ کھاتی لڑکی جس نے اس سے بندر کا تماشا دکھانے کی درخواست کی تھی اور جو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اپنے بھائی اور کزن کے ساتھ انگریزی زبان میں جو گفتگو وہ کر رہی تھی' اس کا ایک ایک لفظ اس کے سامنے کھڑے بدحلیہ' میلے سے گندے سندے کپڑے پہنے بندر والے کی سمجھ میں آرہا تھا۔

منگو کے میلے میں اس لڑکی نے ہلکے فالسئی اور سفید رنگ کے امتزاج سے بنے پرنٹ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہلکے فالسئی رنگ کے لان کے بڑے دوپٹے کے چاروں طرف سفید لیس لگی تھی اور اس دوپٹے سے اس نے اپنا سر اچھی طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ہلکے نیلے رنگ کا فلاسک تھا اور دوسرے ہاتھ میں دھوپ کا چشمہ' وہ لڑکی جو اس کی آواز کی مٹھاس کا راز جاننا چاہ رہی تھی۔ اس کا حلیہ اسے اب تک نہیں بھولا تھا۔

سید پور میلے میں کمہار کے چاک پر نظر رکھے اس کے ہاتھوں کو دیکھ کر چونکنے والی لڑکی نے تنگ موری کی نیلی جینز پر کھدر کا ہلکا نیلا کرتا پہنا ہوا تھا' جس کے گلے پر ہلکے نیلے رنگ ہی میں کڑھائی ہوئی تھی اور اس نے گہرے اور ہلکے نیلے رنگ کے امتزاج کا اسکارف بھی گلے کے گرد لپیٹا ہوا تھا' اس کے ایک بازو پر گہرا نیلا سویٹر لٹک رہا تھا۔ کمہار نے ایک ہی نظر میں اس کے کینوس کے نیلے رنگ کے جوتوں سے اس کے گندمی بھورے بالوں تک اسے دیکھا بھی تھا اور پہچانا بھی تھا۔ وہ کمہار کو دیکھ کر بوکھلائی تھی اور گھبرا بھی گئی تھی۔ اس کی نظروں میں ایک بے نام سا خوف تھا' وہ اسے بھوت سمجھی تھی یا کوئی بلا جو یوں اس سے ٹکرائی تھی۔ سعد کو لگا وہ عمر بھر ماہ نور کے ان تاثرات کو بھلا نہیں پائے گا جو سید پور کے میلے میں کمہار کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ظاہر ہوئے تھے۔

اور وہ دن جب اس نو آموز آرٹسٹ کی پہلی تصویری نمائش منعقد ہوئی تھی سیاہ ٹراؤزر اور میرون شرٹ' سیاہ آویزے اور سیاہ میرون اسکارف میں پہلی بار سعد نے اسے ڈھنگ اور سلیقے سے تیار ہوئے دیکھا تھا' اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک سجی تھی اور بالوں میں سلیقے سے برش کیا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر وہ فطری اضطراب تھا جو ایک نو آموز آرٹسٹ کے چہرے پر اپنے کام کی پہلی نمائش کے موقع پر ہو سکتا تھا۔ وہ ان اتفاقات کو جھٹلا نہیں سکتا

تھا جو اس لڑکی کا بار بار سامنا کروا رہے تھے۔ اس نے ایک مختصر چکر لگا کر اس کے چار کول اسکیچز کا جائزہ لیا' نو آموزی اور ناپختگی اس کے کام میں صاف اپنی جھلک دکھا رہی تھی' لیکن وہ خود کو اس کا ایک اسکیچ خریدنے کی بات کرنے سے روک نہیں پایا تھا اسے صرف یہ جاننے کی دھن سوار ہو چکی تھی کہ ایک نارمل انسان کے حلیے میں وہ اس کو پہچان سکتی تھی یا نہیں یا پھر شاید وہ اس کے چہرے پر اتری حیرت اور اس کی آنکھوں کی بے یقینی کا ایک بار پھر نظارہ کرنا چاہتا تھا اور وہی ہوا جس کی وہ توقع کر رہا تھا۔

اس کو اس نارمل حلیے میں دیکھ کر بھی وہ پہچان گئی تھی' نا صرف پہچان گئی' بلکہ چکرا کر رہ گئی تھی۔ سعد کو لگا اس آمنے سامنے میں وہ ماہ نور کو پچھلی تمام ملاقاتوں سے زیادہ سمجھ پایا تھا اور اس تعارف میں اسے سب سے زیادہ مزا بھی آیا تھا۔

اس کے بعد وہ اس سے کبھی مل بھی پائے گا یا نہیں۔

اسے اس بات کا خیال بھی آیا تھا۔ کیونکہ ایک ہی طرح کے اتفاقات کا سلسلہ بہت دراز نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اسی شام میوزک فیسٹول کے ہزاروں کے مجمع میں وہ بھی موجود ہو گی اور ایک بار پھر اس کو پہچان لے گی۔ اس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اسی بلیک ٹراؤزر' میرون شرٹ' بلیک اور میرون اسکارف اور میرون اور بلیک پل اوور میں ملبوس وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے پوچھ رہی تھی وہ کون تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر وحشت تھی' آنکھوں میں ہرنی کی سی حیرت اور خوف تھا۔ وہ تماشائی تھی۔ بے خبر تھی کہ اس کی یہ بے خودی اسے تماشا بھی بنا سکتی تھی۔

سعد کو اس کا یہ روپ' اس کے تمام گزشتہ رویوں سے اچھا لگا تھا۔ ایک لمحہ کو اس کا دل چاہا تھا کہ وقت وہیں رک جائے۔ اردگرد سے اٹھتی آوازیں اور چمکتی روشنیاں بند ہو جائیں' وہاں پر صرف وہ اور چیختی چلاتی' سوال کرتی وہ وحشت زدہ لڑکی موجود ہو' مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ اسے اس سے اپنا بازو چھڑانا پڑا تھا۔ مجمع کا دھیان کسی دوسری طرف مبذول کروانا پڑا تھا۔ فوک فیسٹول میں بدیسی گانا گا کر اس نے سب کی توجہ سے وہ منظر ہٹانے کی کوشش کی اور کامیاب رہا تھا۔

"واہ لڑکی! تم بھی خوب ہو' تمہاری حیرت نے مجھ سے کیا' کیا حرکتیں سرزد کروائیں۔" وہ کروٹ بدل کر سیدھا ہوا اور مسکرا دیا۔

"یہ سب سن کر مجھے جو بھی محسوس ہو رہا ہے' وہ نفرت تو ہرگز نہیں ہے۔" پھر اس کی سماعت سے ماہ نور کی آواز ٹکرائی۔

"تمہارے اس جملے نے ہمیں اچھے دوست بنا دیا۔" اس نے دل ہی دل میں ماہ نور کو مخاطب کیا۔ "دیکھا کیسے مجھے تمہارا ہر رنگ' ہر روپ یاد ہے۔"

اور تمہارے یہاں سے چلے جانے کے بعد میں تمہیں بہت مس کروں گا۔ یہ تو ڈن ہے۔" اس نے سوچا۔

"چلو خیر۔ یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ زندگی ملنے اور بچھڑنے کا ہی تو نام ہے۔ تم یہاں رہو یا کسی دوسرے شہر میں میرے کانٹیکٹس کے بہترین دوستوں کی لسٹ میں تمہارا نام تو شامل ہی رہے گا۔" اس نے دائیں طرف کروٹ بدلی اور پھر آنکھیں بند کر کے سو گیا۔

☼ ☼ ☼

"چلو جی مولوی جی! چوہدری صاحب کا سدا (پیغام) آیا ہے جی!" کھاری نے مسجد کے صحن میں بچھی چٹائیوں پر بیٹھے اشخاص سے مخاطب مولوی سراج سرفراز کی گفتگو میں رخنہ ڈالتے ہوئے کہا۔ مولوی سراج سرفراز کے بڑے

سے جتنا میں موجود ننھا سا دل حلق میں آگیا۔

"ہیں جی چوہدری صاحب نے؟" انہوں نے اس کھاری کو عزت دینے کی کوشش کرتے ہوئے سوال کیا جو اس وقت مسجد کا عام نمازی نہیں چوہدری صاحب کا پیغامبر بن کر آیا تھا۔

"ہاں جی' چوہدری صاحب نے بلایا ہے جی۔" کھاری نہ جانے کیوں اس صورت حال پر خوش نظر آرہا تھا۔ یوں جیسے مولوی صاحب کو چوہدری صاحب کا مہمان بننے کا شرف اس کی وجہ سے ملنے والا تھا۔

"پر کھاری بیٹا! جھٹ گزرتا ہے کہ اذان کا وقت ہونے والا ہے۔" مولوی صاحب نے حلق میں اٹکا تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ نہ جانے کیوں انہیں اس بلاوے میں اپنا تبادلہ نظر آنے لگا تھا۔

"او نئیں جی۔" کھاری نے ہاتھ کے اشارے سے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "چوہدری صاب نے ٹیم (ٹائم) دیکھ کے ہی گھلیا (بھیجا) ہے مجھے بولے کھاری پتر عصر توں پہلے پہلے مولوی صاب نوں بلالیا' بڑا ضروری کام ہے۔"

"اچھا جی!" مولوی صاحب نے اپنی سرمہ لگی آنکھیں اپنے مخاطبین سے چراتے ہوئے صورت حال پر غور کیا اور انہیں محسوس ہوا کہ کھاری کی بات مانے بغیر چارہ نہیں۔

"او مولوی جی! جلدی کرو' چوہدری صاب نے فیر لاہور کے لیے نکل جانا ہے۔ ادھر لاہور کے بڑے افسر کے پتر ہوراں کا ولیمہ ہے چوہدری صاب نے وہ اٹینٹ (اٹینڈ) کرنا ہے۔" کھاری نے جلدی کا شور مچا کر مولوی سراج سرفراز کو مزید بوکھلا دیا۔ وہ اپنا صافہ سنبھالتے اٹھے اور سر پر بندھے کپڑے کو کھول کر دوبارہ باندھنے لگے۔

"موٹر سیکل تے آیا آں آپ کو لینے' چوہدری صاب نے کہا تھا کھاری پتر انج واپس آئیں جس طرح الاہما (شکایت) آتا ہے۔"

مولوی صاحب نے اپنا سرخ رنگ کا گھسا ہوا کھسا پاؤں میں پھنسایا اور چلو جی جناب کرتے مسجد کے صحن سے باہر نکل گئے۔

کھاری کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھے بیٹھے مولوی صاحب کو جتنی سورتیں اور دعائیں یاد تھیں سب پڑھ ڈالیں۔

"یا مولا! بڑی مشکل سے ایک مستقل اور مکمل ٹھکانا رہنے کو میسر ہوا ہے۔ لوگ باگ عزت کرتے ہیں' پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا ہے۔ زندگی گزارنے کی چھوٹی موٹی سب ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ بی بی اور بچی کے سر پر عزت کی چھت تنی ہے۔ میرے پیارے مولا اس ٹھکانے سے بے ٹھکانا نہ کرنا' ان بوڑھی ہڈیوں میں اب کسی اور منزل کے راستوں کی خاک چھاننے کا حوصلہ نہیں ہے۔" وہ راستہ بھر دعائیں کرتے آئے تھے۔

کھاری کا موٹر سائیکل فارم ہاؤس کے داخلی راستے پر گیٹ سے اندر کہیں آگے جا کر رکا تھا۔ مولوی صاحب نے فارم ہاؤس کے گیٹ سے آگے کا کوئی منظر ان پانچ' چھ سالوں میں نہیں دیکھا تھا۔ چوہدری صاحب سے بھی اب تک اکا دکا ملاقاتیں گاؤں کے کسی رہائشی کے ایسے جنازے پر ہو جایا کرتی تھیں' جس میں چوہدری صاحب خود شریک ہوتے تھے۔ ہاں مولوی صاحب کے گھر گندم اور دھان کی فصلیں باقاعدگی سے چوہدری صاحب کی طرف سے پہنچ جایا کرتی تھیں۔ گاہے بگاہے' پھل اور سبزی کی سوغاتیں' ایندھن اور گڑ' شکر کے تحفے بھی موصول ہوتے رہتے تھے۔ مولوی صاحب دل ہی دل میں چوہدری صاحب کے مشکور اور ہر نماز کے بعد ان کے اقبال کی بلندی کی دعائیں بھی کرتے رہتے تھے۔ مگر یوں چوہدری صاحب کی طرف سے براہ راست بلاوے کا مقصد مولوی صاحب کے خیال میں تبادلے کے سوا کچھ اور نہیں آرہا تھا۔

کھاری ان کی رہنمائی کرتا' انہیں عمارت کے عقبی حصے میں لے گیا۔ جس کی وسعت دیکھ کر مولوی سراج سرفراز کی سرمہ لگی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ عمارت کا گیٹ دیکھ کر انہیں کبھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اس کا

رقبہ یوں میلوں تک پھیلا ہوگا۔ عقبی حصے میں تاحدِ نظر رنگ برنگ موسمی پھولوں کی بہار تھی۔ وہ گنتی اور رنگوں میں اتنے تھے کہ ایک نظر تو کیا کئی بار دیکھنے پر بھی مولوی سراج ان کا شمار نہیں کرسکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس کی کوشش ہی نہیں کی۔ چوہدری سردار خان اپنے ملازمین سے مصروف گفتگو تھے' جن میں سے کئی پھولوں کو لمبی لمبی شاخوں سمیت کاٹنے اور کئی ان شاخوں کو سلیقے سے سمیٹنے اور باندھنے میں مصروف تھے۔

"سارے پھول شہر جاتے ہیں بکنے کے لیے۔" کھاری نے مولوی صاحب کی حیرت کا احاطہ کرتے ہوئے ان کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے انہیں مطلع کیا۔ مولوی صاحب کو اپنے حال اور مستقبل کی فکر پڑی تھی۔ ان کی بلا سے پھول کہاں جاتے تھے اور کیوں جاتے تھے۔ وہ وہیں کھڑے منتظر نظروں سے چوہدری صاحب کے فارغ ہونے کا انتظار کررہے تھے۔ ملازمین سے گفتگو کرتے ہوئے چوہدری صاحب کی نظر مولوی سراج پر پڑی اور وہ اپنی گفتگو وہیں منقطع کرکے ان کی طرف بڑھے۔

"شاباش ہے بھئی کھاری پتر' نہ مولوی صاحب کو کہیں بٹھایا' نہ مجھے بتایا کہ انہیں لے آئے ہو۔" انہوں نے مولوی صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے کھاری کو سرزنش کی۔

"تشریف رکھو جی مولوی جی!" کھاری نے چوہدری صاحب کی اجازت پاتے ہی مولوی صاحب کو وہیں رکھے موڑھوں میں سے ایک موڑھا پیش کیا۔ چوہدری صاحب بھی وہیں تشریف فرما ہوئے۔

"حکم سرکار!" مولوی صاحب نے دھک دھک کرتے دل کو قابو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"بات کوئی خاص نہیں۔" چوہدری صاحب نے مسکرا کر کہا اور دوبارہ کھاری سے مخاطب ہوئے۔ "او پتر! کوئی لسی' کوئی چائے' کوئی پانی۔۔۔ مہمان کی خاطر تواضع کرنا سیکھو۔"

"او جی بھاڑ میں گئی خاطر تواضع۔ آپ حکم کریں۔ میری جان نہ لے لیجئے گا۔" مولوی سراج کا دل چاہا' وہ یہ بات بلند آواز میں کہہ دیں' مگر صرف سوچ کر ہی رہ گئے۔

"مولوی جی! بی بی صاحب کا پیغام ملا تھا' بچی کے پیدائشی سرٹیفکیٹ کے بارے میں۔" چوہدری صاحب نے بلی کو تھیلے سے نکالتے ہوئے کہا۔

"میں نے کھاری کو بھیجا تھا کہ بچی کے کوائف کاغذ پر لکھوا لائے' لیکن وہ معلومات ادھوری تھیں اور شاید بی بی صاحب کو ٹھیک سے یاد بھی نہیں۔ اس طرح سرٹیفکیٹ نہیں بنتے۔ میں نے سوچا آپ سے خود پوچھ لوں' داخلے جانے میں وقت کم رہ گیا ہے' بچی کا سال نہ ضائع ہو جائے۔"

"اوہ۔۔۔" مولوی صاحب کو محسوس ہوا نہ جانے ان کا کب سے رکا سانس سینے سے خارج ہوا ہو۔ انہوں نے اپنی سوکھی زبان کو کھاری کے پیش کیے شربت سے تر کرتے ہوئے کہا۔

"وہ جی شاید ساہیوال کی پیدائش ہے۔" ان کے ذہن میں ایک شہر کا نام آیا۔

"شاید ساہیوال۔" چودھری صاحب کے لہجے میں تحیر تھا۔ "مولوی جی! کمال ہے آپ کو بچی کی پیدائش کا ضلع بھی ٹھیک سے یاد نہیں' میرا خیال ہے تیرہ' چودہ سال پہلے ہی کی تو بات ہوگی۔"

"مولوی جی' سعدیہ تو کنے ای وڈے نیں (مولوی صاحب سعدیہ سے کتنے ہی بڑے ہیں) شاید اس لیے یاد نہیں۔" قریب کھڑے کھاری نے مولوی صاحب کی مدد کرنے کی عجیب و غریب کوشش کی۔

"او جا اوئے جھلیا' تجھے کیا پتا میں کیا پوچھ رہا ہوں۔" چودھری صاحب نے اسے ڈانٹا۔

"وہ جی ساہیوال ہی کی پیدائش ہے جی۔" مولوی صاحب نے حتمی فیصلہ کرتے ہوئے بتایا۔

"اچھا!" چودھری صاحب نے چند لمحے کے لیے اس بات پر غور کیا "پر مولوی جی آپ ساہیوال سے ادھر کیسے پہنچے؟"

"بس جی روزی روٹی جہاں لکھی ہو' بندہ وہیں پہنچ جاتا ہے۔" مولوی صاحب کو پہلی بار کوئی عقل کا بہانہ سوجھا تھا۔

"تو یونین کونسل میں اندراج نہیں کروایا تھا' مطلب کمیٹی گھر میں؟" چودھری صاحب نے غور سے مولوی صاحب کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"او جی..... اس کے بعد میرا خیال ہے دو ہفتے بعد ہی ہمیں وہ جگہ چھوڑنی پڑی تو اندراج کا خیال نہیں آیا شاید۔" مولوی سراج نے دل میں اللہ تعالیٰ سے کئی سو بار توبہ استغفار کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا!" چودھری صاحب کو کچھ مایوسی ہوئی "یوں تو مولوی جی! کام ٹیڑھا اور مشکل ہو جائے گا۔"

"چودھری صاحب! کاکی سعدیہ بڑی لائق بچی ہے۔ جدھوں دیکھو پڑھتی نظر آتی ہے' دن سے رات تک پڑھتی ہے۔ گھٹ تو گھٹ چوبیس میں سے اٹھارہ گھنٹے تو پڑھتی ہو گی جی' اس کا سال مر گیا تو رو رو پاگل ہو جائے گی۔" ایسے میں کھاری نے گفتگو میں کودنا فرض سمجھا۔ "اس وا داخلہ بھجوا دیو کسی طرح' وچاری کا سال بچ جائے' وہ کہتی ہے۔ اس نے ڈاکٹر بننا ہے۔" کھاری سفارش پر سفارش کرنے لگا تھا۔

"ٹھیک ہے' کرتے ہیں کچھ۔" چودھری صاحب نے کچھ سوچنے کے بعد سر ہلایا۔

"آپ کے بس میں تو بڑا کچھ ہے چودھری جی!" مولوی سراج کے سر سے تبادلے کے خوف کا بھوت اترا تو ان کے لہجے میں سعدیہ والے کام کے لیے خوشامد اتر آئی' "لگے ہاتھوں یہ کام ہو ہی جائے تو کیا بات ہے" انہوں نے سوچا اور مشکور نظروں سے کھاری کی طرف دیکھنے لگے جو ان کی سفارش کر رہا تھا۔

"مولوی جی! ہے تو یہ غلط اور آؤٹ آف دی وے کام۔" چودھری صاحب نے ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے کہا "مگر مجھے بچی کی تعلیم کے لیے لگن اور شوق کا خیال آ رہا ہے۔" انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔ "کام ہو جائے گا لیکن ایک بات یاد رکھیے گا' بندے کو اپنے ہر معاملے میں سیدھا اور سچا ہونا چاہیے۔ کبھی کے چھوٹے چھوٹے ہیر پھیر کسی وقت کے عذاب بھی بن جاتے ہیں۔"

مولوی صاحب نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا "بس جی۔ غلطی ہو گئی جو اندراج نہیں کروایا۔"

"میں یہ نہیں کہہ رہا۔" چودھری صاحب نے کہا۔ "میں جو کہہ رہا ہوں۔ آپ سمجھ رہے ہیں۔"

"اوئے منڈیو۔" پھر انہوں نے کام میں مشغول لڑکوں کو پکارا "مولوی صاحب کے لیے سبزی اور پھل کی ٹوکری تیار کرو' کھاری پتر!" انہوں نے کھاری کی طرف دیکھا "مولوی صاحب کو جلدی پہنچا دے مسجد' انہوں نے عصر کی نماز پڑھانی ہے جا کر۔"

"جی سرکار۔" کھاری نے سر ہلایا۔

"اچھا پھر مولوی صاحب!" چودھری صاحب نے اٹھتے ہوئے مولوی صاحب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "میری کوئی بات بری لگی ہو تو درگزر فرمائیے گا' آپ اللہ کے خادم ہیں' اللہ کی مخلوق کو پانچ مرتبہ اس کی خدمت میں حاضر ہونے کی پکار ڈالتے ہیں۔ آپ کے درجے کو ہم حقیر لوگ نہیں پہنچ سکتے' آپ کا کیا کہا اس خدمت کے عوض ہی معاف ہو جاتا ہے' ہماری پکڑ معمولی سی بات پر بھی ہو سکتی ہے' ہمارے لیے دعا کر دیا کریں بس۔"

چودھری صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے مولوی سراج کے چہرے پر عجیب سی ندامت تھی اور ان سے چاہنے کے باوجود کوئی بات نہ ہو پا رہی تھی' وہ بار بار اپنا چار خانہ والا رومال اپنے چہرے اور آنکھوں پر پھیر رہے تھے جو گھڑی گھڑی نم ہو جاتی تھیں۔ مولوی صاحب اپنے اضطراب کے سبب غور نہیں کر پائے کہ ان کی ایک ایک جنبش کو کوئی بہت غور سے دیکھ رہا تھا اور شاید اس کی وجہ کا اندازہ لگانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

مولوی صاحب کو واپس مسجد تک چھوڑنے کے راستے میں کھاری مکمل طور پر خاموش رہا تھا۔

✻ ✻ ✻

لمبی بریک کے بعد کالج دوبارہ کھلنے میں چند ہی دن باقی رہ گئے تھے اور اب اسے واپس لاہور جانا تھا۔

"ارے میں اتنے دن یہاں کیسے رہ لی۔" ماما کے یاد دلانے پر کہ اگلے پیر سے کالج دوبارہ شروع ہو رہا ہے اسے یاد آیا کہ گنتی کر کے دیکھے' وہ کتنے دن سے گھر سے دور تھی۔

"شاہ بانو کو واپس لاہور گئے بھی ہفتہ ہو گیا اور وہ بیچاری پوچھ پوچھ کر ہلکان ہو رہی ہے کہ آخر میں یہاں کیوں رکی ہوئی ہوں' اب میں اس کو کیا بتاؤں کہ کیوں رکی ہوئی ہوں جبکہ مجھے خود بھی پتا نہیں۔" اس نے فرقان ماموں کے گھر کے لاؤنج کے انٹیریر اتنے دنوں میں پہلی بار غور کرتے ہوئے سوچا۔

"کس کے لیے بھلا؟" اس نے سوچنے کی کوشش کی "اسلام آباد بہت خوب صورت اور ویل پلینڈ ہے اس لیے؟" اس نے پہلی وجہ پر غور کیا۔

ہرگز نہیں۔" پھر خود ہی اس وجہ کو مسترد کر دیا۔

"فرقان ماموں اور رامی کی مہمان داری زبردست تھی۔" دوسری وجہ ذہن میں آئی۔

"ہاں تھوڑی بہت یہ وجہ ہو سکتی ہے۔" اس نے اتفاق کیا۔

"میں یہاں ریلیکس محسوس کر رہی تھی خود کو۔" تیسری وجہ ذہن میں آئی۔

"وہ تو میں گھر میں بھی ہوتی ہوں۔"

"اچھا ہاں' سیارہ خان سے ملاقات جو کرنی تھی۔" اس نے خود کو ایک بڑی وجہ بتائی۔

"وہ تو ہو گئی تھی دو مرتبہ' پھر اس کے بعد کیوں ٹکی ہوئی ہوں میں۔" دل نے سوال کیا

"فلز اظہور سے ملاقات کرنا تھی۔" ایک اور بات ذہن میں آئی۔

"نہیں۔" اس تصور سے اسے جھرجھری سی آ گئی۔

"شاپنگ' سیر' ہوٹلنگ..... آخر کیا؟" وہ وجوہات گنتی اور انہیں مسترد کرتی رہی۔

"میں..... میں ہوں واحد اور بڑی وجہ۔" اس کے ذہن پر چسپاں ایک شبیہ ہر وجہ کے عقب سے جھانک جھانک کر اسے اپنی طرف اشارہ کر کر کے بتا رہی تھی مگر وہ اسے نظر انداز کر کے اگلی وجہ پر غور کرنا شروع کر دیتی۔

"پتا نہیں کیا وجہ ہے۔ جو بھی ہے' اب میں کسی کو یہ بھی نہیں بتا سکتی کہ میرا تو ابھی بھی واپس جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ مگر کیا کروں' جانا تو ہے۔" اس نے منہ بنایا اور اپنا سیل فون اٹھایا۔

"میں اس جمعہ کو واپس جا رہی ہوں۔" اس نے ایک ٹیکسٹ ٹائپ کیا اور میسج بھیج دیا۔

اسکرین پر بنے لفافے کے نشان سے لفافہ اڑ اڑ کر پیغام پہنچنے کی نشاندہی کرتا ہوا غائب ہو گیا' اس کا پیغام موصول کرنے والے تک پہنچ چکا تھا۔

✻ ✻ ✻

ریڈیو پاکستان اپنی کوئی سالگرہ وغیرہ منا رہا ہے غالباً۔" خدیجہ نے نفاست سے سبزیاں کی کاٹتے ہوئے فاطمہ کو مطلع کیا۔

"ایں!" فاطمہ نے ٹی وی اسکرین سے نظر ہٹائی "یہ ریڈیو کی خبر تمہیں کیسے ہو گئی؟"

"تم نے اخبار میں کبھی شوبز نیوز کے علاوہ کچھ اور پڑھا ہو تو تمہیں بھی خبر ہو جائے۔" خدیجہ نے فاطمہ کے چونکنے کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا اخبار میں آئی تھی یہ خبر۔" فاطمہ نے دوبارہ ٹی وی اسکرین کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"ویسے تمہیں کوئی خاص دلچسپی محسوس ہوئی کیا اس خبر میں؟" تھوڑی دیر بعد فاطمہ کو خدیجہ سے پوچھنے کا خیال آیا۔

"ہاں!" خدیجہ نے کٹی ہوئی سبزیوں کو پیالے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں نے سوچا۔ کوشش کروں گی کہ ان پروگرامز کو فالو کروں شاید کہیں بے چاری شہناز کا تذکرہ بھی آجائے۔"

"لو۔" فاطمہ کو گویا خدیجہ کے جواب سے مایوسی ہوئی۔ "شہناز کون سا شہناز بیگم تھی جو اس کا تذکرہ آئے' اکا دکا غزلوں اور گیتوں کے سوا اس نے گایا ہی کیا تھا۔"

"ہاں یہ تو ہے مگر ان دنوں اس کی وہ اکا دکا غزلیں اور گیت صبح اور شام سنوائے ضرور جاتے تھے' ان کے لیے فرمائشی خطوط بھی آتے تھے۔"

"پھر اس کے بعد نہ شہناز رہی نہ شہناز کے گیت" فاطمہ نے ٹی وی بند کرتے ہوئے کہا "ویسے عجیب بات ہے' ریڈیو کے ریکارڈز میں تو وہ گیت ہوں گے ہی۔ شہناز نہ بھی رہے ریکارڈز تو رہے ہوں گے نا محفوظ۔"

"سنا تھا نا کہ اس نے جس چنگیز کی اولاد سے شادی کرلی تھی اس نے جینا حرام کردیا تھا اس کا۔ ریکارڈ بھی جلا دیے ہوں گے جیسے تاتاریوں نے بغداد کے کتب خانے جلا دیے تھے۔" خدیجہ نے کہا اور خود ہی ہنس دیں۔

"اس روز جو رئیسہ کا فون آیا تھا' تم نے محسوس نہیں کیا۔ شہناز کا ذکر جب میں نے کیا مجال ہے' جو ایک لفظ بھی بولی ہو۔" فاطمہ کو یاد آیا۔

"وہ کیوں بولے گی۔" خدیجہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اسے باپ کی پوری جائیداد ہتھیانے کا موقع مل گیا' اس کے لیے تو شہناز کا منظر سے غائب ہونا نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔" وہ آئے روز پورا یورپ ایک کیے دیتی ہے' کہیں کوئی ولا خرید اجاتا ہے' کہیں کیا اس کو کہتے ہیں۔" انہوں نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا "ہاں شاطو۔"

"ہا ہا خدیجہ! تم جیلس ہو رہی ہو۔" فاطمہ نے قہقہہ لگایا۔

"میں کیوں جیلس ہوں گی بھئی۔ ہماری تو گزر گئی' اب ولا میں رہنے والے' شاطوؤں اور پیلسوں میں رہنے والے ہوں یا ہماری طرح ان پرانی کوٹھیوں میں رہنے والے' سب ٹھاٹھ یہاں ہی چھوڑ کر بنجاروں کی طرح لاد چلنے کو ہیں۔"

"ویسے یہ بھی بے حسی کی انتہا ہی ہے کہ جو بے چاری شہناز کی خاندان بھر میں سے کسی نے پلٹ کر خبر تک نہیں لی۔ سب ہی مزے لے لے کر اس کے غائب ہو جانے' چنگیز کی اولاد سے شادی کر لینے اور پھر مارے جانے کی خبریں چسکے لے لے کر ڈسکس کرتے رہے' نہ کسی نے افسوس کا اظہار کیا ڈھنگ سے اور نہ ہی زحمت کی کہ کہیں سے پتا کریں کہ اسے زمین کھا گئی کہ آسمان نگل گیا۔" فاطمہ نے کہا۔

"لو شائستہ بھابھی کے ابا جو منسٹری آف انفارمیشن میں اس وقت کوئی اونچے افسر تھے انہوں نے جب کہا کہ میں کوشش کرتا ہوں اس کا پتا لگانے کی تو آغا جی نے کہا۔ خبردار جس نے شہناز کا پتا لگانے کی کوشش کی' میرا اس سے کوئی تعلق نہیں رہے گا' یہ بھاشن سن کر سب کے سب دبک گئے۔" خدیجہ اٹھ کر باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے بولیں۔

"بھائی زین کا بیٹا رافع ایک بار بتا رہا تھا کہ اس کے ایک دوست کے ہاں ایک تقریب میں جو دو تین مغنیائیں مدعو تھیں۔ ان میں سے ایک پر شہناز کا گمان ہوتا تھا' اس نے پوچھا۔ "آپ کا نام شہناز ہے کیا؟" تو وہ محترمہ غصے سے بولیں۔ "فری ہونے کے لیے نام ہی پوچھا جاتا ہے سب سے پہلے۔" وہ بے چارہ تو مارے شرمندگی کے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ آپا جی آپ مجھے اپنی رشتے کی ایک پھوپھی جیسی لگی ہو۔" فاطمہ نے خدیجہ کے پیچھے باورچی خانے میں آتے ہوئے کہا۔

"ویسے ریڈیو کے نام سے تمہیں اور بہت کچھ یاد نہیں آیا؟" خدیجہ نے فرائی پین میں تیل ڈال کر چولہے پر رکھتے ہوئے مڑ کر فاطمہ کو دیکھا۔

"بہت کچھ۔" فاطمہ نے واٹر ڈسپنسر سے کپ میں گرم پانی نکالتے ہوئے کہا۔ "اردو سروس اور اس کے براڈ کاسٹرز کی جادو اثر آوازیں۔"

"ایس ایم شفیق جس کی آواز پر مرا کرتے تھے ہم۔" خدیجہ نے کٹی سبزیاں گرم تیل میں ڈال کر الٹتے پلٹتے ہوئے کہا۔

"آپ کی فرمائش اور پھر رات کو تعمیل ارشاد۔" فاطمہ نے لقمہ دیا۔

"فوجی بھائیوں کا پروگرام اور ریڈیو جموں کی ہکلی خبریں۔" خدیجہ بے اختیار مسکرائیں۔

"ریڈیو' پھر پی ٹی وی' چوائس محدود تھی اور چارم زیادہ' اب چینلز زیادہ ہوگئے اور چارم ختم۔"

"ویسے بھی اب نہ وہ آوازیں رہی ہیں نا وہ لوگ۔" خدیجہ ناسٹلجک ہو رہی تھیں۔

"خیر' ایسا بھی قحط نہیں پڑ گیا۔" فاطمہ نے گرم پانی میں چاکلیٹ پاؤڈر ملاتے ہوئے اختلاف کیا۔ "پچھلے دنوں خبروں میں کسی فیسٹول میں شریک سنگرز کے کلپس دکھائے جا رہے تھے' ایک دو کی آوازیں تو مجھے بہت ہی میلوڈیس لگیں۔"

"اصل میں آج کل میوزیکل انسٹرومنٹس اتنے بے ہودہ ہوتے ہیں کہ ان کی گونج میں کسی کی آواز کی کوالٹی کا تو اندازہ ہی نہیں ہو پاتا۔" خدیجہ نے کہا اور سبزیوں میں ابلے چاول ملانے لگیں۔

"ماہ نور واپس آئے تو اس سے بہت سی خبریں سننے کو مل جائیں گی' باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔" فاطمہ کو یک دم خیال آیا۔

"ماہ نور تو ڈیرہ ہی جما کر بیٹھ گئی اسلام آباد میں۔" خدیجہ کو بھی یاد آیا۔ اس نے تو کوئی فون بھی نہیں کیا کبھی۔"

"آج کل بچے اپنی ایکٹوٹیز میں مگن ہو کر سب کچھ بھول جاتے ہیں۔" فاطمہ نے کہا' انہیں اچانک ماہ نور شدت سے یاد آنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"او بی بی جی سارے بنیرے' ساریاں دیواراں بھر گئیاں گملیاں (گملے) نال ہون کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔" کھاری نے ہانپتے ہوئے صابرہ سے کہا۔

"تو جو بچ گئے ہیں وہ کیا میرے سر پر رکھے گا۔" صابرہ نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تے ہن میں کدھر رکھاں جی باقی گملے۔" کھاری روہانسا ہو رہا تھا۔

"باورچی خانے کی چھت پر رکھ دے آگے کر کے' کھڑکیوں کے شیڈز پر رکھ دے باقی۔" صابرہ کو یہ ہی جگہ خالی نظر آئی تھی۔

"اللہ کرے زور دی ہنیری (آندھی) آئے تے ٹھا ٹھا کر کے گر جائیں گملے باورچی خانے دی چھت سے۔" کھاری صبح سے اپنے تئیں اس بے کار کام میں لگا ہوا تھا اور سخت جھنجلایا ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ چوہدرانی فارم ہاؤس کی رونق کی ضد میں یہ گملے یہاں رکھوا رہی تھیں اور یہاں ان بے زبان پودوں کا خیال کسی نے نہیں رکھنا تھا۔

"اور یہ جو ہے رضیہ چڑیل' اس کا سر تو ضرور پھٹے' جب گملا اس کے سر پر گرے۔" اس نے رضیہ کو دل ہی دل میں کوسا جو صابرہ کی ملازمہ خاص تھی اور مسلسل کھاری کے سر پر افسرنی کھڑی ہدایات دے رہی تھی۔

"بی بی جی سوکھے پتے نہیں جھاڑے جی کھاری نے۔" رضیہ نے گویا اس کے دل کا کوسنا بھانپ لیا۔ فوراً" ہی شکایتی صدا لگائی۔ کھاری نے جواباً" دانستہ ایک گملا چھت کے بالکل ہی کنارے پر ا لکا دیا۔

"بلی چھلانگ مارے گی تو اس چڑیل کا سر تو ضرور پھٹے گا۔"

"چلو اب پانی کی پھوار بھی مار دے سارے گملوں کو" صابرہ نے صحن میں نکل کر رنگا رنگ پھولوں سے سجے گملوں کی بہار دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"او بی بی جی! آج کل نہیں پھوار مارنے ان کو' کل ماشق نے ان کی گوڈی پانی سب کر دیا تھا' ہن کافی دن ضرورت کوئی نہیں۔" کھاری نے اپنی جھنجھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اچھا پھر ایسا کر' وہ جو بڑے بڑے بنتے ہیں آرڈر پران کا ناپ لے جا اور جا کر دین محمد کو پکڑا آ۔" کھاری صابرہ کے ہاتھ بہت دن بعد آیا تھا' وہ اس سے وہ تمام کام لے لینا چاہتی تھیں جو ہن میں آ رہے تھے۔

"اونا جی نا!" کھاری نے کان میں انگلی سے خارش کرتے ہوئے سر ہلایا "اج نہیں ہونا ہور کوئی کام۔"

"کیوں آج کیا ہے؟" صابرہ نے اسے گھورا۔

"چوہدری صاحب نے کہا تھا' گملے گھر پہنچا کر ریڑھی واپس بھیج دینا اور خود دوڑ کر مولی (مولوی) صاحب کے گھر ان کی بیٹی کی پیدائش کی پرچی پکڑا آنا۔ میں نے اودھر جانا ہے اب۔"

"بن گئی پیدائش کی پرچی؟" صابرہ نے تجسس سے کہا۔

"آہو جی۔ بن گئی' کا ب فارم بنوا دیا چوہدری صاحب نے۔" کھاری نے فخر سے کہا۔ "چوہدری صاحب کی کیا باتاں ہیں' اوناں کو ایکو (ایک) فکر تھی سعدیہ کا سال نہ مارا جائے۔" وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔

"کدھر ہے پرچی۔ دکھا ذرا۔" صابرہ نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے ناک چڑھا کر کہا۔

"یہ لیں جی۔ یہ ہے۔" کھاری نے جیب سے مومی کاغذ میں تہہ کر کے محفوظ کی گئی پرچی نکالی۔

"ہوں۔" صابرہ نے چھیننے کے سے انداز میں اس سے کاغذ لے لیا۔ "کوئی ضرورت نہیں خود جا کر انہیں پرچی پکڑانے کی' ان کو ضرورت ہے۔ خود آکر لے جائیں۔"

کھاری کچھ دیر اس اچانک کارروائی پر ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔

"پر جی چوہدری صاحب نے آکھا تھا۔" اس نے حلق تر کرتے ہوئے کہنے کی کوشش کی۔

"اور جی۔ میں نے ویسے بھی ادھر جانا ہے۔ سبق لین واسطے۔" اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

"تو جاؤ سبق لینے۔" صابرہ نے ناک چڑھا کر کہا۔ "پر پرچی وہ خود آکر لے جائے گی مولوانی۔ پرچی بنوانے کا کہنے بھی تو ادھر آئی تھی۔ اب اس کی ٹانگیں تو نہیں ٹوٹ جائیں گی آتے ہوئے۔"

"پر بی بی جی! بھین جی تو کٹ ودھ (کم کم) ہی کہیں آتے جاتے ہیں۔" کھاری نے ہاری ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں تو آئے نا۔ اپنا کام ہے۔ اس کا' ہم اس کو کھا تو نہیں جائیں گے۔" صابرہ نے تنک کر کہا۔ "کٹ ودھ آتے جاتے ہیں۔" انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے کھاری کے الفاظ دہرائے۔

کھاری نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد سر جھکایا اور تیز قدموں سے چلتا گھر سے باہر نکل گیا۔

"اس کو بڑا برا لگا۔" رضیہ جو یہ ساری گفتگو سن رہی تھی' صابرہ کو طیش دلانے کے لیے بولی۔

"اس کے لیے تو جو چوہدری صاحب نے کہہ دیا' وہی بات آخری ہو گئی' اس لیے برا لگا۔ اس نے چوہدری صاحب کو واپس جا کر اپنی کارکردگی کی رپورٹ جو دینی تھی۔" صابرہ اصل بات سے ناواقف اپنی عقل کے مطابق جو سمجھیں کہتی رہیں۔

☆ ☆ ☆

"یہ ابراہیم ہے۔" سعد نے ماہ نور کو بتایا۔ ماہ نور نے اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھا جو چہرے سے خاصا خوش مزاج اور اپنے سراپے سے خاصا خوش خوراک نظر آ رہا تھا۔

"ابراہیم میرا بچپن کا دوست ہے۔ ہم ہمیشہ ساتھ رہے ہیں اور ایک دوسرے کو اتنی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک کی کوئی بات دوسرے سے پوشیدہ نہیں ہے۔"

"اوہ...... دلچسپ۔" ماہ نور نے کہا۔

"یہ ریسٹورنٹ ابراہیم کا ہے۔" سعد نے ریسٹورنٹ کے انٹیریر پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "اور اس کا افتتاح چند دن پہلے ہی ہوا ہے۔"

"یہ بھی بتاؤ کہ اس کا افتتاح کس نے کیا؟" ابراہیم نے کہا۔

"وہ تم بتا دینا۔" سعد نے اس کی بات ہوا میں اڑاتے ہوئے کہا۔

"ابراہیم کے دو ہی شوق ہیں' کسرت اور کھانا پینا۔" سعد نے زبان دانتوں تلے دبا کر شرارتی نظروں سے ابراہیم کی طرف دیکھا۔ "اسی لیے اس کی روزی روٹی ایک عدد جم اور اب اس ایک عدد ریسٹورنٹ پر چل رہی ہے۔"

ابراہیم نے اسے گھور کر دیکھا۔

"آج ہم دونوں یہاں ابراہیم کی طرف سے انوائیٹڈ ہیں۔" سعد نے شرارت سے ابراہیم کی طرف دیکھا۔

"دراصل سعد کو نا۔" جواباً" ابراہیم نے دوسری ٹیبل سے ایک کرسی گھسیٹی اور ان کے سامنے بیٹھ گیا "مفتے اڑانے کا شوق ہے۔" اس نے کن اکھیوں سے سعد کو دیکھا جو ہونٹوں پر ہاتھ رکھے اس کے جوابی حملے کا منتظر تھا۔

"جم کی ممبر شپ لیتا ہے نہ فیس بھرتا ہے۔" ابراہیم نے انگلی پر گنتے ہوئے کہا "مگر جم روزانہ آتا ہے اور اب میں مسکین یہ ریستوران کھول کر بیٹھا ہوں اب یہ آئے روز اپنے کسی مہمان کو لے آیا کرے گا اور کہے گا ہم ابراہیم کی طرف سے خاص طور پر انوائیٹڈ ہیں۔" جواب میں سعد قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"کیوں کیا ہوا؟" ابراہیم کو لگا اس نے کوئی انتہائی مضحکہ خیز بات کہہ دی ہو۔

"شکر ہے' تو نے اپنے کسی مہمان کی بات کی ہے' اپنی کسی مہمان نہیں کہا ورنہ ماہ نور سمجھتی' میں گرل فرینڈز بھی تیرے کھاتے سے بھگتاتا ہوں۔"

"خیر' میں اتنا کمینہ بھی نہیں ہوں۔" ابراہیم نے کہا "میں الفاظ کی ہیرا پھیریاں کوئی نہیں کرتا۔ تجھے بھی پتا ہے۔"

"ہاں تو جی۔" پھر ابراہیم ماہ نور کی طرف متوجہ ہوا۔

"وہ جو اس نے مہمان بھگتانے ہیں نا اس ریسٹورنٹ کے سر پر وہ تو بعد کی بات ہے' ہاں آج کی حد تک یہ سچا ہے۔ آج واقعی میں نے ہی آپ دونوں کو انوائیٹ کیا ہے۔"

"اچھا؟" ماہ نور جو ان دونوں کی نوک جھونک کچھ سمجھتے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سن رہی تھی بولی "لیکن وہ کیوں؟"

"دراصل اس کو تمہارے بارے میں بہت تجسس تھا۔" سعد نے کہا۔ "یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ لڑکی کون ہے جس کے ساتھ میں بقول اس کے مری روڈ پر چہل قدمی کر رہا تھا۔"

"مگر ایسا تو کچھ نہیں ہوا تھا۔" ماہ نور نے حیرانی سے کہا۔

"اس کی تشریح بھی یہ ہی کرے گا۔" سعد نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔

"چہل قدمی' مطلب چالیس قدم دور...... مری روڈ اس دن جہاں میں تھا وہاں سے چالیس قدم ہی دور تھی۔" ابراہیم نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"اچھا!" ماہ نور کے پلے اب بھی کچھ نہیں پڑا مگر وہ اخلاقاً" مسکرا دی۔

"اچھا۔۔۔اب" سعد نے میز پر انگلیاں بجاتے ہوئے ابراہیم کی طرف دیکھا "تجھے کوئی کام ہے تو کرلے پھر۔"

"ہاں۔ میں جا ہی رہا ہوں۔" ابراہیم نے غصیلی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں نے آپ کے لیے اسپیشلی کویزین آرڈر کیا ہے۔" پھر وہ فخریہ انداز میں ماہ نور کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "آپ جاتے ہوئے ہماری کمنٹس بک پر اپنے کمنٹس ضرور دیجیے گا پلیز۔"

"بہت شکریہ۔" ماہ نور نے کہا۔ "لیکن آپ جا کہاں رہے ہیں' ہمارے ساتھ کھانا کھائیے نا۔"

"ضرور میں آپ کو جوائن کرتا جی۔" ابراہیم نے کن انکھیوں سے ایک مرتبہ پھر گھورا "لیکن مجھے ایک ضروری کام ہے' ابھی نیا نیا کام شروع کیا ہے نا' سو بکھیڑے ہیں۔" وہ مسکرایا اور خدا حافظ کہتا وہاں سے چلا گیا۔

"مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ تم نے اسے بھگایا ہے۔" ماہ نور نے ابراہیم کے جانے کے بعد سعد سے کہا۔

"وہ پہلوانوں کی اولاد ہے جناب' یونہی بھاگنے والوں میں سے نہیں ہے وہ بھی کسی کے کہنے پر۔" سعد نے اسے تسلی دی۔

"اچھا!" ماہ نور نے یوں کہا جیسے اس سعد کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔

"دراصل تمہارے اس میسج کے بعد کہ تم فرائی ڈے کو واپس جارہی ہو میں چاہ رہا تھا کہ تم سے الوداعی ملاقات کرلی جائے۔ یہ ابراہیم کا ہی آئیڈیا تھا کہ تمہیں اس کا ریسٹورنٹ دکھایا جائے' وہ اس کے بارے میں اوور ایکسائیٹڈ ہے۔" سعد نے ماہ نور کا تامل دیکھ کر وضاحت کی۔

"اور اس کا نام اس نے کس کے مشورے پر انتخاب کیا؟" ماہ نور نے مسکراتے ہوئے کھڑکی کے شیشے سے پار روڈ پر کھڑے رستوران کے ایک بورڈ کو دیکھا جس پر ریستوران کا نام چیٹر باکس لکھا تھا۔

"ہاں۔ یہ میں نے اسے تجویز کیا تھا کیونکہ وہ خود بھی چلتا پھرتا چیٹر باکس ہے۔" سعد نے ہنس کر کہا۔

"ایک بات پوچھوں سعد؟" ماہ نور نے سعد کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ اس روز اس نے بلیک ڈریس پینٹ پر سکائی بلو ڈریس شرٹ پہن رکھی تھی اور اس فارمل لباس میں وہ اپنے عام سے حلیے سے بھی زیادہ جاذب نظر لگ رہا تھا۔

"ضرور پوچھو۔" سعد نے کہا۔

"تمہاری شخصیت پہیلیوں جیسی کیوں ہے؟" ماہ نور نے بالآخر وہ سوال کرہی ڈالا جو اس کے دل میں بار بار اٹھا تھا۔ "اگرچہ تم نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے بارے میں بہت کچھ بتادیا۔ اتنے مختصر سے دنوں میں بندر والے سائیں' کمہار اور فوک سنگر کی وہ گتھیاں جو شاید عرصے تک میرے حواسوں پر چھائی رہتیں' کسی حد تک کھل گئیں' تمہاری ذاتی زندگی کے بارے میں میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی' وہ بھی خاصا جان گئی' پھر بھی۔" ماہ نور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا وہ اپنے مخصوص انداز میں ہونٹوں پر ہاتھ رکھے پورے دھیان سے اس کی بات سن رہا تھا۔

"پھر بھی مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ تمہاری شخصیت پہیلیوں جیسی ہے۔ ایک کے اندر ایک اور پہیلی' اس کے اندر تیسری پہیلی پھر چوتھی۔"

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد ماہ نور لمحہ بھر کے لیے چپ ہوئی پھر سعد کا ردعمل بھانپنے کے لیے اس کی طرف دیکھا۔ سعد کی خاموشی پر اسے لگا جیسے اس کے سوال نے اسے ناراض کردیا تھا۔ لیکن کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ مسکرایا تھا۔

"شاید میں خود کو یا اپنی فیلنگز کو بیان کرنے کا فن نہیں جانتا۔" اس نے کہا "یا یوں سمجھ لو کہ مجھے ابھی تک کوئی دوسرا شخص ایسا ملا ہی نہیں جسے میں تفصیل سے بتاسکوں کہ میں کیا سوچتا' کیا چاہتا ہوں۔ اس لیے میری شخصیت کسی پر کھلتی نہیں۔"

"نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے۔" ماہ نور نے سرہلایا "اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنی تمام عاجزی' انسانی ہمدردی'

ڈاون ٹو ارتھ شخصیت کے ساتھ ساتھ تم میں ایک خاص طرح کا ایٹی ٹیوڈ (رویہ) ہے' تم خود کو ڈیپ ڈاون دوسروں سے بلند سمجھتے ہو' اسی لیے کسی کو اپنے بالکل اصل رنگ کے قریب پھٹکنے کی اجازت نہیں دینا چاہتے' یہ ہی چیز تمہاری شخصیت کو پہیلی بنادیتی ہے۔"

"ہوں۔" سعد کو شاید ماہ نور سے اس قدر بے لاگ تبصرے کی امید نہیں تھی۔

"شاید تمہارا تجزیہ درست ہو' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "شاید ایسا ہی ہو۔" وہ ایک دم الجھا ہوا سا لگنے لگا تھا۔ "لیکن کیونکہ میں اس کی ایک وجہ جانتا ہوں اس لیے تمہارے تجزیے سے اتفاق نہیں کروں گا۔"

"ہاں اس کا تو خیر تمہیں حق ہے۔" ماہ نور نے بے نیازی سے کہا اور گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

"تم نے سارہ کے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے' کیا سارہ ہمیشہ اسی طرح تمہارے بیڈ پر پڑی رہے گی۔" ماہ نور نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"کم از کم اس وقت تک جب تک وہ خود پر یقین کرنا نہ سیکھ لے گی۔" سعد نے مختصر جواب دیا۔

"اور تمہارا کیا خیال ہے' اس میں کتنا وقت لگے گا؟" ماہ نور نے اس کی طرف دیکھا۔

"ایک عمر بھی لگ جائے تو پرواہ نہیں۔" اس نے سوپ میں پسی ہوئی کالی مرچ چھڑکتے ہوئے جواب دیا۔ ماہ نور کو لگا جیسے اس کا دل ایک دھڑکن دھڑکنا بھول گیا ہو۔

"ہوں۔" دوسرے لمحے اس نے خود پر قابو پالیا۔ "وہ خود پر یقین کرنا سیکھ بھی لے تو کیا کبھی دوبارہ سرکس رنگ میں داخل ہوپائے گی؟" ماہ نور کو نجانے کیوں لگا کہ اس کے لہجے میں طنز کی ہلکی سی چبھن تھی۔

"دنیا میں بہت سی ایسی باتیں ممکن ہو جاتی ہیں جن کو اکثر لوگ ناممکنات میں شمار کرکے داخل دفتر کر چکے ہوتے ہیں" سعد نے ماہ نور کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"اور رہی سرکس رنگ کی بات۔۔۔۔ تو ضروری نہیں کہ وہ سرکس رنگ میں دوبارہ داخل ہو' اس کے پاس کرنے کو اور بہت کچھ ہوگا' تم جانتی ہو دنیا کا' زندگی کا کینوس کتنا وسیع ہے اور اس پر استعمال کرنے کے رنگوں کی رینج کتنی زیادہ ہے۔" اس نے کستوری کباب کی پلیٹ ماہ نور کے سامنے رکھی۔

"اسے ٹیسٹ کرو' ابراہیم نے خاص طور سے کہلوایا ہے کہ اسے ضرور چکھا جائے۔"

"اور تمہارا اگلا روپ کیا ہوگا؟" ایک بار پھر ماہ نور کو لگا اس کے لہجے میں تلخی سی گھل گئی تھی۔

"کوئی پتا نہیں۔" اس سوال پر وہ مسکرادیا۔ "من کی موج جدھر کو لے گئی۔"

"من سے یاد آیا۔" ماہ نور نے ڈرنک کا گھونٹ بھرا۔ "اختر کیا کہہ رہا تھا تمہیں یا من پالو یا زن پالو۔" مجھے اس کی صرف یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔"

"اختر کی باتیں اختر ہی سمجھ سکتا ہے' کبھی وہ مولوں اور شہبازوں کے سبق پڑھانے لگتا ہے' کبھی پانی کے اندر سانس لیتی مخلوق کی طرف توجہ دلاتا ہے' کبھی کہتا ہے باؤ صاب فقیری لائن پر لگ جاؤ۔ فقیر بن کے نہیں سوٹ بوٹ پہن کر۔" سعد نے اختر کے لہجے میں کہا۔ "اور کبھی زن اور من کے قصے سنانے لگتا ہے۔"

"پھر تم اس کے پاس کیوں جاتے ہو؟" ماہ نور نے ابرو ذرا سا چڑھا کر سعد کی طرف دیکھا۔ "اگر اس کی باتیں بے تکی اور بے معنی ہوتی ہیں تو۔"

"میں تو بہت سی جگہوں پر بغیر کسی وجہ کے جاتا ہوں۔" سعد نے مبہم سا جواب دیا "ایسی ہی جگہوں میں اختر کا ڈیرا بھی شامل ہے۔"

ماہ نور نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر خاموش ہوگئی۔

"مجھے لگتا ہے' میرے ایک سوال نے آج تمہیں میرے سامنے بھی انٹرووَرٹ ہو جانے پر مجبور کردیا۔ میں

اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔" کھانے کے بعد ریستوراں سے باہر نکلتے ہوئے ماہ نور نے ریستوران کی لابی میں سعد سے دو قدم آگے چلتے ہوئے رک کر سعد کی طرف مڑ کر کہا۔

سعد نے کنسیلڈ لائٹس کی روشنی میں ماہ نور کو دیکھا۔ اس روز وہ شیفون کی سیاہ لمبی قمیص اور سیاہ ڈوپٹے میں ملبوس تھی۔ اپنی عادت سے ہٹ کر اس نے ہلکا میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کاجل لگا تھا اور کانوں میں سیاہ آویزے تھے۔ اس نے پاؤں میں اونچی ہیل کے سینڈلز پہن رکھے تھے۔ اس کے چہرے پر معصومیت تھی اپنے سوال کا جواب پانے کی بے صبری بھی۔ سعد نے اس کے تراشیدہ سلکی بالوں کی چمک کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔

"آئی ایم سوری اگر تمہیں ایسا لگا ہے۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ گلا کھنکھار کر بولا "لیکن میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں آئی' میں نے تم سے کہا تھا کہ اگر میں کسی بات کے بارے میں شیور نہیں ہوتا' میں اس کی طرف جاتا ہی نہیں۔ اگر میں تمہیں ایک اچھی دوست مان لینے کے بارے میں پُریقین نہ ہوتا تو کبھی اپنے پرسنلز تم سے شیئر نہ کرتا۔ ایسے پرسنلز جو تم سے پہلے میں نے کسی سے شیئر نہیں کیے۔ میں نے تمہیں اس روز یہ بات بتائی بھی تھی۔"

"اچھا!" ماہ نور کو لگا وہ قدرے مطمئن ہوئی تھی۔

"ہاں!" سعد نے سرہلایا۔ "اب چلیں۔" اس نے کہا اور ماہ نور مسکرا کر آگے چل دی۔

"ایک بات میں بھی کہوں۔" گاڑی میں بیٹھنے کے بعد سعد نے کہا۔

"ہاں۔" ماہ نور نے اس کی طرف دیکھا۔

"آج تم بہت مختلف لگ رہی ہو۔" وہ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر مسکرایا۔ "جتنی بار تم میں نے تم کو دیکھا ہے ان سے بہت مختلف۔ بہت اچھی' خاصی sane (معقول) لگ رہی ہے آج تو۔"

"مذاق کر رہے ہو۔" ماہ نور جھینپ کر بولی۔

"ہرگز نہیں۔" اس نے سرہلایا۔ "تم واقعی بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

"جھوٹ!" ماہ نور نے بے ساختہ کہا۔

"میرے دل میں جو بات ہوتی ہے میں کہہ دیتا ہوں' میں نے تم سے کہا تھا۔ میری یہ عادت نوٹ کر کے رکھ لو۔" سعد نے اسے یاد دلایا۔

"سلمان ہے نا۔ اس نے مجھے یقین دلا رکھا ہے کہ میں جو مرضی پہن لوں جو مرضی کر لوں' کبھی ایوریج سے زیادہ اچھی نہیں لگ سکتی۔" ماہ نور نے منہ بنا کر کہا۔

"اچھا۔" سعد ہنسا۔ "وہ ایسا کیوں کہتا ہے؟"

"اس لیے کہ میں ہوں ہی ایسی۔" وہ اسی طرح منہ بنا کر بولی "اب تو میں ہر کسی سے یہ ہی سوال کرتی ہوں کہ ایک ایک ٹپ بتاتے جاؤ' میں خود کو کیسے امپروو کروں کہ اچھی لگنے لگ جاؤں۔ میں خود میں کیا تبدیلی لاؤں کہ پیاری لگنے لگ جاؤں۔" سعد نے ماہ نور کے دل کے زخم کرید ڈالے تھے۔ اب وہ بغیر سوچے سمجھے بول رہی تھی۔

سعد اس کی بات پر محظوظ ہوتے ہوئے زیر لب مسکرا رہا تھا۔

کون مان سکتا تھا کہ بچوں کی طرح گلہ کرتی یہ لڑکی کچھ دیر پہلے اس سے اتنے کٹھیلے اور بڑے بڑے سوال کر رہی تھی۔

"تم نے سائیں کی کافی بھی سن لی اور فوک فیسٹول کے سنگر کے گانے بھی' آج میں تمہیں اپنی پسند کا ایک سونگ سنواؤں۔" ماہ نور کے خاموش ہو جانے کے کچھ دیر بعد گاڑی میں سعد کی آواز ابھری۔

"ہوں۔" ماہ نور نے سرہلایا۔

سعد نے گاڑی کا میوزک سسٹم آن کیا اور کچھ سونگز آگے پیچھے کرنے کے بعد ایک جگہ رک گیا۔ گاڑی میں برونو مارس کی آواز گونجنے لگی۔

O'her eyes her eyes
Make the stars look like
they are not shining
her hair her hair
falls perfectly with out
her trying
she is so beautiful
and I tell her everyday

(اس کی آنکھیں ستاروں کی چمک کو ماند کر دیتی ہیں۔
اس کے بال بلا تردد عمدگی سے اس کے شانوں پر بکھرتے ہیں۔
میں اسے ہر روز بتاتا ہوں کہ وہ کتنی خوبصورت ہے۔)

وہ ساکت' خاموش بیٹھی سن رہی تھی۔

yeah I know I know
when I compliment her
she won't believe me
and its so sad to think
she don't see what I see
but every time she asks me
do I look ok
I say when I see your face
there is nothing that I would change
Cause you are amazing
Just the way you are

ہاں میں بخوبی جانتا ہوں
کہ جب میں اس کی تعریف کرتا ہوں
تو اسے یقین نہیں آتا
اور یہ خیال کیسا المناک ہے
کہ وہ خود کو ویسے نہیں دیکھتی جیسے اسے میری نظریں دیکھتی ہیں
لیکن ہر بار جب وہ مجھ سے پوچھتی ہے
کہ کیا میں اچھی لگ رہی ہوں
تو میں اسے بتاتا ہوں کہ جب میں تمہارا چہرہ دیکھتا ہوں تو مجھے کچھ ایسا نظر نہیں آتا جسے تبدیل ہونا چاہیے

کیونکہ جیسی تم ہو وہی حیران کن ہے۔

And when you smile
the whole warld stops
and stares far a while
cause girl you are amazing
just the way you are

اور جب تم مسکراتی ہو۔
تو تمام دنیا رک کر لمحہ بھر کے لیے تمہیں دیکھتی ہے۔ کیونکہ جیسی تم ہو وہ حیران کن ہے۔

ماہ نور دم سادھے گانے کا ایک ایک لفظ سن رہی تھی۔ گانا ختم ہوا اور میوزک سسٹم بند ہو گیا۔ گاڑی میں اتنی خاموشی تھی کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنائی دے سکتی تھی۔ قریب سے گزرتی گاڑیاں' ان کی روشنیاں' جگہ جگہ نصب برقی قمقمے' فٹ پاتھ پر چلتے راہ گیر' ماہ نور کو لگ رہا تھا۔ ہر چیز ساکت تھی اور وہ غیر محسوس طریقے سے آگے' آگے بڑھ رہی تھی۔

پھر گاڑی ہلکے سے دھچکے کے ساتھ رکی۔ "تمہارے ماموں کا گھر آگیا ہے ماہ نور" اس کے کانوں کو محسوس ہوا سعد کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

"مجھ پر اعتبار کرنے' میرے ساتھ باہر جانے' میری سننے اور اپنی کہنے کا بہت شکریہ ماہ نور' تمہارے ساتھ گزرا یہ مختصر وقت' بہت خوب صورت تھا اور یادگار بھی۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"میری وجہ سے جتنا تم الجھن کا شکار رہیں' جتنا بے خود ہوئیں' لوگوں کی نظروں میں آئیں' اس کے لیے ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں۔"

"کیا یہ صرف اتنا اور یہاں تک ہی تھا۔" الفاظ بے اختیار ماہ نور کے منہ سے پھسلے۔

"پتا نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "اتفاقات کے بارے میں پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔"

"میں واپس جا کر بھی تمہارے ساتھ رابطے میں رہ سکتی ہوں کیا۔" ماہ نور نے سوال کیا۔

"میرے لیے یہ اعزاز کی بات ہو گی۔" وہ اپنے مخصوص شوکر انداز میں بولا۔

"اور کیا تم مجھے یہ سونگ گفٹ کر سکتے ہو۔" ماہ نور نے ایک ایسا سوال کیا جو اسے خود بھی احمقانہ لگ رہا تھا۔

جواب میں سعد نے اسے چونک کر دیکھا "یہ سونگ۔" اس نے دہرایا۔ "مگر یہ تو ہر جگہ تمہیں مل سکتا ہے۔" اس نے کہا۔

"ہاں۔" ماہ نور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔ "لیکن کیا تم یہ گانا مجھے گفٹ کر سکتے ہو؟" اس نے وہی احمقانہ سوال دوبارہ دہرایا۔

"اوکے۔" کچھ دیر سوچنے کے بعد سعد نے سر ہلایا "میں اس کا لنک تمہیں بھیج دوں گا' کیا تم اس کو ہی گفٹ سمجھ سکتی ہو؟"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وہ بے اختیار خوش ہو کر بولی اور ہنس دی۔ سعد نے دیکھا' ہنستے ہوئے اس کے کانوں کے سیاہ آویزے ہولے ہولے ہلنے لگے تھے اس کے دانت سفید اور چمک دار تھے۔ وہ اس کی بچوں جیسی فرمائش اور بہلاوے جیسے جواب پر یوں خوش ہونے پر مسکرا دیا۔

"تم جانتی ہو ماہ نور کہ تم کتنی خوش قسمت ہو؟" اس نے کہا۔ "تم اپنی تمام کیفیات کا اظہار بلا جھجک کر سکتی ہو اور کر دیتی ہو۔ میرے نزدیک ایسے لوگ' بہت خوش قسمت ہوتے ہیں۔"

تھینک یو فار دی کمپلیمنٹ۔" وہ سر کو دائیں جانب ذرا سا جھکا کر بولی "اس گانے کے الفاظ بہت خوب صورت ہیں۔"

"ہاں!" سعد نے کہا "ان الفاظ کی خوب صورتی کی وجہ سے ہی یہ مجھے بہت پسند ہے۔ برونو مارس میرے پسندیدہ ترین سنگرز میں سے ایک ہے۔"

"ہوں!" ماہ نور نے کچھ دیر تک اس کی بات پر غور کیا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر اترنے لگی "تم مجھے اس گانے کا لنک ہی گفٹ کرو گے یا الفاظ بھی۔" اترنے سے پہلے مڑ کر اس نے سعد کی طرف دیکھا اور ایک اور احمقانہ سوال اس کے منہ سے نکلا۔

"لنک۔" سعد نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا "اور اس کے الفاظ کے لیے میری پسند مدد گی جو ہم اکثر اچھے دوستوں کے ساتھ شیئر کرتے ہیں۔"

ماہ نور کے لیے اس کا جواب غیر متوقع تھا اسے اندازا نہیں ہوا مگر اسے لگا اس پر سرتاپا خاموشی سی چھا گئی تھی۔ وہ گاڑی کے ڈیش بورڈ پر جلتی بجھتی روشنیوں کو دیکھ رہی تھی۔

"میں تمہیں اس سونگ کا لنک ضرور بھیجوں گا۔" وہ ہولے سے مسکرایا۔ ماہ نور ایک لمحہ کو رکی اور پھر گاڑی سے باہر نکل کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

"گڈ بائے ماہ نور۔" سعد نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کر کے کہا۔

ماہ نور نے ہولے سے سر ہلایا۔ گاڑی کے پہیے گاڑی کے دوبارہ اسٹارٹ ہونے پر ہلکے ہلکے چرچرائے اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔ ماہ نور وہیں کھڑی گاڑی کو اس لین کے آخر تک جاتے دیکھتی رہی یہاں تک کے وہ لین کا موڑ مڑ کر نظروں سے غائب ہو گئی۔

"میں نے تمہیں گڈ بائے نہیں کہا' اس لیے کہ میں تمہیں گڈ بائے کہنا نہیں چاہتی۔"

ماہ نور نے وہیں کھڑے کھڑے سوچا اور پھر مڑ کر گھر کے اندر داخل ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"بیک ٹو ورک۔" وہ سعد کے آفس کے وسط میں پانچ منٹ سے کھڑے اسے فائلز پر سر جھکائے دیکھ رہے تھے۔ اس کا کوٹ اس کی آفس چیئر کی پشت پر رکھا تھا اور شرٹ کے کفس کے بٹن کھلے تھے' ٹائی کی گرہ ڈھیلی ہو چکی تھی۔ یہ صورت حال اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ سعد اپنے کام میں پوری توجہ سے مگن تھا۔

"بیک ٹو ورک" پانچ منٹ بعد انہوں نے اپنی سوچ کو الفاظ دیتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ سعد نے چونک کر سر اٹھایا اور مسکرا دیا۔

"آپ جانتے ہیں میں اپنے الفاظ سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتا۔" اس نے کہا۔

"ہوں۔" انہوں نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

"امید ہے کہ تمہارا وقت اب راضی خوشی پھر سے رواں ہو گیا ہو گا۔" انہوں نے کہا۔

"اچھا خاصا۔" مختصر جواب آیا۔

"ویسے ان وقت صاحب کے موڈ کیسے رہے اس آف میں۔" وہ چند قدم چل کر آگے آئے۔

"خاصے اچھے۔" پہلے مختصر جواب کا ہیر پھیر کیا گیا۔

"کوئی ہلا گلا' کوئی شور شرابا' کوئی کھانا وانا' کوئی پینا پلانا' کوئی گرل فرینڈز' کوئی عاشقی معشوقی' کچھ نئی تازی۔" انہوں نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

سعد نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور ان کے بین السطور مدعا پر غور کیا۔

"تقریباً" سب کچھ ہی ہوا۔" اس نے قلم پر ڈھکن لگاتے ہوئے کہا۔ "ہاں یہ پینے پلانے پر آکر بات رہ گئی۔"

"وہ کیوں بھئی۔ آج کل تو سب وافر میسر ہے' پانی کی طرح بہتی ملتی ہے۔" انہوں نے دانستہ چوٹ کی۔

"آہ!" سعد نے ریوالونگ چیئر کو کمر کے دباؤ سے پیچھے کر کے سر اس کی پشت سے ٹکاتے ہوئے دکھ کا اظہار کیا۔

"یہ تو ہے سب میسر ہے۔" اس نے اسی طرح سر ٹکائے ٹکائے ان کی طرف دیکھا "مگر آپ جانیں' میری میٹرنل جینز کتنی اسٹرونگ ہیں اب ان کا رجحان تو ظاہر ہے ٹھرے اور دیسی طریقے سے کشید کیے گئے محلول کی طرف ہی ہو گا نا اور سین یہ چل رہا ہے کہ یہ دونوں ملاوٹ شدہ ہی دستیاب ہیں اور اکثر تو اموات بھی واقع ہو جاتی ہیں ان کے استعمال سے' لہٰذا محتاط رہنا بہتر سمجھا۔"

"وائز گائے wise guy (عقلمند لڑکا) انہوں نے کہا اور اس کی ٹیبل کے قریب آکر فائلز چیک کرنے لگے۔

"فرینکفرٹ کے بارے میں بتا دیا تمہیں معظم نے؟ فائلز کے صفحے پلٹتے پلٹتے انہوں نے پوچھا۔

"جی ہاں' یہ مژدہ جانفزا صبح آتے ہی گوش گزار ہو چکا ہے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے بال پوائنٹ کا ڈھکن کھولتے اور بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

"زمان نے کچھ بیگز رکھے تھے تمہارے بیڈ روم میں' ملاحظہ کیا؟" انہوں نے اسی طرح جھکے جھکے ایک اور سوال کیا۔

"معذرت خواہ ہوں' نہیں دیکھ سکا۔"

"جینز کا ایک سرا اگر ٹھرے اور رم کی طرف کھینچے تو دوسرے کو اصولاً" ان بیگز کی طرف کھینچنا چاہیے تھا۔" انہیں نجانے کیوں اس کے اس متوقع جواب سے تکلیف سی ہوئی۔

"بدقسمتی سے ایک سرا اتنا اسٹرونگ ہے کہ اس نے ایکویٹر کا سارا بیلنس بیڑا غرق کر رکھا ہے۔ اس کا جھکاؤ مسلسل ایک ہی پول کی طرف ہے' دوسرے کی مقناطیسی کشش میں کہیں کوئی گڑبڑ لگتی ہے۔"

"ہوں۔" انہوں نے ردعمل کے طور پر فائلز کو زور سے بند کیا۔ سعد نے عادتاً" ہونٹ دانتوں تلے دبائے۔

"ویسے آپ لندن تک ہی محدود رہے' گریٹ برٹین کے دوسرے حصوں کا بھی وزٹ کر لیتے تو اچھا رہتا۔" اس نے ایک اور معنی خیزبات کی۔

"مثلاً"۔" انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔

"سمپل..." اس نے دونوں کہنیاں کرسی کے بازو پر رکھ کر ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے شانے اچکائے۔ "صرف انگلینڈ کیوں' اسکاٹ لینڈ' آئرلینڈ اور ایک ذرا فن لینڈ تک بھی ہو آتے۔"

"کوئی خاص وجہ؟" انہوں نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں۔ بس امکان تھا کہ جینز کے کچھ ڈانڈے وہاں کے کسی باشندے سے بھی جا ملتے۔" اس نے کہا۔

"خیر ویسا ہرگز نہیں ہے' جیسا تم سمجھتے ہو یا جیسا اپ ڈیٹ کیے جاتے ہو۔" انہوں نے بدمزہ ہوتے ہوئے کہا۔

"میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی' میں تو صرف سیر سپاٹے کی بات کر رہا ہوں۔"

"وہ ایک بزنس ٹرپ تھا' سیر سپاٹا نہیں۔" انہوں نے خشک لہجے میں کہا۔ "کیونکہ میں اپنے وقت کو یہ اجازت کبھی نہیں دیتا کہ وہ مجھے بلیک میل کرے۔"

"آپ کی عمر تک پہنچ کر میں بھی یہ دعوا کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ کیونکہ وقت نے کسی زمانے میں آپ کو جو جی بھر کر بلیک میل کیا' اس کا ایک ثبوت آپ کے سامنے موجود ہے اور دوسرے کے لیے ہی میں آپ کو بزنس ٹرپ کا دائرہ فن لینڈ تک بڑھانے کا مشورہ دے رہا تھا۔"

"واضح رہے کہ میں نے اولاد پالنے کا فیصلہ بہت پہلے کر لیا تھا' علتیں پالنے کا پلان میرے چارٹر میں کہیں اور کبھی شامل نہیں رہا۔" سعد نے دیکھا' انہیں طیش آنے لگا تھا۔

"بیٹر یو آر۔" اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا "آج آپ نے آخر کار اولاد اور علت کا فرق تو واضح کر دیا بالآخر۔"

"مگر چونکہ تمہارے ہاں بیلنس سارا گڑبڑ ہے لہٰذا امکان غالب ہے کہ تم عمر بھر اولاد کے بجائے علتیں ہی پالتے رہو گے۔" انہوں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مجھے مبارک ہو' آپ کی پیشین گوئی خاص خوش کن ہے۔" سعد نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"خیر فرینکفرٹ کو پلان کر لو۔ زیادہ دن نہیں ہیں درمیان میں۔" وہ واپس بزنس پر آتے ہوئے بولے۔

"شیور!" وہ بھی اپنے ایگزیکٹو روفائل میں واپس آ گیا۔

"ناممکن ہی لگتا ہے کہ اتنے لمبے وقفے کے بعد یہ ملے اور چونچ لڑانے سے باز رہے۔" سعد کے آفس سے باہر نکلنے کے بعد انہوں نے سوچا۔

"چل پھر اے زندگی تیری یہ مرضی ہے تو یونہی سہی۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑے سیل فون پر کوئی نمبر ملاتے ہوئے فیصلہ کیا۔

"ہاں نادر!" اب وہ فون پر کسی سے بات کرتے ہوئے اپنے آفس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ "میں نے نوٹ کیا ہے سعد کی گاڑی کا ماڈل پرانا ہو چکا ہے' مجھے سب میکس کے نئے ماڈلز اور پرائس فارورڈ کرو ذرا جلدی۔"

☼ ☼ ☼

"مجھے سعد سلطان کہتے ہیں۔"

"آئی ایم سوری ماہ نور! میں ذرا لیٹ ہو گیا۔"

"کیا آپ یہ اسکیچ بیچنا چاہیں گی؟"

"میں اس کی منہ مانگی قیمت دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"تم نے چارلس ڈکنز کو پڑھا ہے کبھی؟"

"ایک جگہ میں تمہارے کہنے پر گیا اور مس ہویشم سے مل آیا' کیا ایک جگہ تم میرے کہنے پر چلو گی۔"

"یہ سارہ خان ہے' سارہ ایک ونڈرفل ایکروبیٹ اور ٹیلنٹڈ آرٹسٹ رہ چکی ہے۔"

"میں نے اپنی آنکھوں سے اس کی ہڈیاں ٹوٹتے اور خون بکھرتے دیکھا تھا۔"

"اتنی جلدی نتائج اخذ کرنے سے گریز کیا کرو۔"

"انسان کو اپنی زندگی کے معاملات میں بہت شیور ہونا چاہیے۔"

"کبھی چیزیں اتنی ویلیوایبل ہوتی ہیں کہ آپ ان کی قیمت کا اندازہ ہی نہیں لگا پاتے۔"

"نامور جگہوں اور نامور لوگوں کے بارے میں تو سب ہی جانتے ہوں گے' گمنام جگہوں اور لوگوں کے بارے میں جاننا میرا پسندیدہ مشغلہ ہے۔"

"اختر سے ملنا پسند کرو گی؟"

"میں معذرت خواہ ہوں' میں نے غلط کیا جو تمہیں یہاں لے آیا۔"

"مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش ہے جہاں میرا دل لگ جائے۔"
"ابراہیم میرا بچپن کا دوست ہے' یہ ریسٹورنٹ ابراہیم کا ہے۔"
"شاید میں خود کو یا اپنی فیلنگز کو بیان کرنے کا فن نہیں جانتا۔"
"سارہ کو خود پر یقین کرنے میں ایک عمر بھی لگ جائے تو پرواہ نہیں۔"
"پتا نہیں اتفاقات کے بارے میں پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔"
"تم جانتی ہو ماہ نور! تم کتنی خوش قسمت ہو۔"

Her eyes' her eyes
Make the stars look like
They are not shining

یار ڈاڈھی عشق آتش لائی ہے۔

We found love in a hopeless place

گھوم چرخڑا گھوم تیری کتن والی جیوے

when i see your face
there is nothing I would like to change

اوکھے پینڈے لمیاں نے راہواں عشق دیاں
ککھ نہ چھڈے دیکھ وفاواں عشق دیاں

And when you smile
the whole world stops

"آپ کی آواز میں اتنے سحر کی وجہ۔"
"عشق۔"
آوازوں کا' الفاظ کا' ایک ہجوم تھا جو بازگشت کی صورت ماہ نور کے اردگرد پھیل رہا تھا۔
"آپ کی آواز میں اتنے سحر کی وجہ۔"
"عشق۔"

یہ الفاظ دوبارہ اس کی سماعت سے ٹکرائے اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسلام آباد جانے سے پہلے وہ ایک اسرار کے الجھاؤ میں مبتلا تھی' اسلام آباد سے واپسی پر وہ ایک نئی کیفیت سے دوچار تھی۔ اس کے اردگرد ان مختصر دنوں کی ان گنت یادوں کا ہجوم تھا' الفاظ اور جملوں کا ذخیرہ تھا۔ تعارف اور شناسائی سے لے کر بے تکلفی تک کا مختصر مرحلہ تھا۔ اسلام آباد سے واپسی پر وہ خوش تھی' شانت تھی یا پھر کسی نئی الجھن کا شکار ہو کر ایک نئے مخمصے میں پھنس کر نا خوشی کی کیفیت سے دوچار تھی۔

اس کی خود بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر وہ ان یادوں' ان باتوں اور کیفیتوں سے فرار حاصل کرنے کی خواہش مند بھی ہرگز نہیں تھی۔ اس کے گھر والے' کالج میں اس کی سہیلیاں' اس کے ساتھ پروجیکٹس پر کام کرنے والے اور اس کے ٹیچرز سب ہی ماہ نور کی شخصیت میں واضح تبدیلی محسوس کر رہے تھے۔ مگر شاہ بانو کے سوا کسی نے اسے جتایا نہیں تھا۔ اس کے پاس شاہ بانو کے کسی سوال کا بھی جواب نہیں تھا اور وہ کسی کو جواب دیے بنا بس اس کیفیت میں مگن ہی رہنا جانا چاہتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تم اس بار چودہ دن' سترہ گھنٹے اور پینتالیس منٹ کے بعد ادھر آئے ہو۔" سارہ نے اپنے سامنے بیٹھے سعد سے کہا۔

"سیکنڈز کا شمار کرنا بھول گئیں تم؟" سعد نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔
"ہرگز نہیں۔" سارہ نے سر ہلایا "تیرہ سیکنڈز اوپر ہوئے ہیں۔"
"اچھا!" وہ مسکرایا اور نرمی سے سارہ کی طرف دیکھنے لگا۔ "اور تمہیں پتا ہے کہ ان چودہ دن' سترہ گھنٹے' پینتالیس منٹ اور تیرہ سیکنڈز کے اندر تم میں کیا تبدیلی آئی ہے۔"
"کیا؟" سارہ نے تجسس سے اس کی طرف دیکھا۔
"تم پہلے سے زیادہ بیوٹی فل اور گورجیس ہو گئی ہو۔" اس نے جواب دیا اور اپنے ساتھ لائے پھولوں میں سے پنک ٹیولپ کی ایک لمبی شاخ نکال کر سارہ کی طرف بڑھا دی۔
"تمہاری مسمرائزنگ بیوٹی (مسحور کن خوب صورتی) کے نام۔" اس نے کہا۔
"تم باتیں بنانے کے ماہر ہو۔" سارہ وہ شاخ پکڑتے ہوئے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ پر قابو پانے میں ناکام رہی۔
"اور تمہارے reflexes (اعصاب) پہلے سے زیادہ شارپ اور ایکٹو نظر آ رہے ہیں۔" سعد نے اس کی کہی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔
"وہ کیسے؟" سارہ نے حیرت سے پوچھا۔
"تمہارا بیٹھنے کا انداز' بات کرنے کا طریقہ' ہاتھ بڑھا کر پھول پکڑنے کا عمل سب میری بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔" وہ پر اعتماد لہجے میں بولا۔
"اور اسی خوشی میں سیمی آنٹی کیوں نہ ایک پارٹی تھرو کی جائے' یہ بات اس نے کمرے میں داخل ہوتی سیمی آنٹی کو مخاطب کرتے ہوئے کہی تھی۔
"ہاں۔ میں نے بھی محسوس کیا ہے' اس کے پٹھوں کی جنبش اور ہاتھوں کی گرفت پہلے سے بہتر ہوئی ہے' سیمی آنٹی نے کہا "لیکن یہ بات کہی اس لیے نہیں کہ سارہ کبھی نہیں مانے گی۔"
"رکیں' میں ابھی ایک اچھا سا ڈنر ڈیلیور کرواتا ہوں' آپ کے پاس کینڈلز تو ہوں گی۔" سعد نے سیل فون نکالتے ہوئے سیمی آنٹی سے پوچھا۔
"ہاں ہاں۔ بالکل ہیں۔" سیمی آنٹی لگی بندھی روٹین میں ذرا سی تبدیلی کے تصور ہی سے خوش ہو گئیں۔
"لیکن ایک شرط ہے۔" ڈنر آرڈر کرنے کے بعد وہ ہاتھ بلند کر کے بولا۔
"وہ کیا؟" سارہ اور سیمی آنٹی کے منہ سے بیک وقت نکلا۔
"ڈنر ہم بالکونی میں بیٹھ کر کریں گے' آج موسم بے حد خوشگوار ہے' سیمی آنٹی! چلیں ٹیبل اور چیئرز باہر رکھتے ہیں' لائٹس آف کر کے کینڈلز جلاتے ہیں اور لائٹ سا میوزک بھی ہو گا ساتھ میں۔" اس نے سیکنڈوں میں پروگرام ترتیب دیا۔
"مگر۔" سارہ کا جواب اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ اس نے اسے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا۔
"اگر مگر والی تو کوئی بات ہی نہیں' آج تمہیں اس کمرے سے باہر نکالنے کا افتتاح ہو گا جناب!" وہ سیمی آنٹی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ سارہ کو کمرے سے باہر چیزیں گھسیٹنے' اٹھانے' رکھنے' کھٹر پٹر کی آوازیں آتی سنائی دے رہی تھیں اور وہ اپنی جگہ پر سر جھکائے بیٹھی سوچ رہی تھی کہ یہ صورت حال اس کے لیے کیسی تھی۔ اس نے گود میں رکھی ٹیولپ کی شاخ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ سعد کے لہجے اور آواز میں موجود زندگی اور زندہ دلی کے احساس کو یاد

کیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اگر تھوڑا سا مزید اس پروگرام کی مخالفت کرے گی تو وہ بحث کیے بغیر اسے مسترد بھی کر دے گا‘ مگر وہ پہلا دن تھا جب اس نے سعد کی مان لینے کا سوچ لیا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر گزشتہ کچھ دنوں میں سنی باتوں کا خاصا اثر باقی تھا۔

دھیرے دھیرے رات میں ڈھلتی وہ شام یادگار ترین شاموں میں سے ایک قرار دی جاسکتی تھی۔ چھوٹی سی بالکنی میں بچھی سفید بید کی ہلکی پھلکی کرسیاں اور چھوٹی سی گول اونچی گلاس ٹاپ والی میز پر سلیقے سے سجی نازک سی کراکری‘ چمکتے چمچ‘ کانٹے اور چھریاں‘ لمبی گردنوں والے وائن گلاس اور سفید نیپکنز‘ ٹیبل کے وسط میں رکھا آٹھ موم بتیوں والا شمع دان‘ جس میں سیدھی‘ لمبی آٹھ‘ سفید موم بتیاں جل رہی تھیں۔ کسی فائیو اسٹار ہوٹل سے آیا پرلطف کھانا اور قریبی تپائی پر رکھے لیپ ٹاپ سے اٹھتی نرم موسیقی کی لہریں۔ سعد جب سارہ کو اس کی کرسی سمیت اٹھائے باہر بالکنی میں لایا تو سارہ کو محسوس ہوا جیسے وہ اچانک سے کسی دوسری دنیا میں داخل ہو گئی ہو‘ اس کے سامنے یہ سارا منظر تھا جو اسے پریوں کی دنیا کی کہانیوں کا تصویری خاکہ محسوس ہو رہا تھا۔ سعد نے اسے بید کی کرسی پر بیٹھنے میں مدد دی‘ اس کے سامنے تاحد نظر اونچے پہاڑ اور سربلند چوٹیاں تھیں‘ جن میں بنے چھوٹے چھوٹے رہائشی مکانوں میں برقی قمقمے یوں جگمگاتے تھے جیسے کسی نے تاروں بھری چادر جابجا جھاڑ دی ہو۔ سارہ کے لیے یہ ایک نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ وہ سحرزدہ تھی اور بار بار آنکھیں جھپکا کر اس منظر پر یقین کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”یہ زندگی کا ایک رنگ ہے سارہ خان!“ کھانے کے دوران سعد نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”اور تمہارے چہرے کا جتنا بھی حصہ ان موم کی شمعوں کی روشنی میری نظروں کے سامنے واضح کر رہی ہے‘ اس پر مجھے مسرت اور شوق کا عکس نظر آرہا ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اور سوچ لو کہ زندگی کے ہزاروں رنگوں میں سے ابھی تو یہ صرف ایک ہی رنگ ہے۔“

سارہ نے نظریں اٹھا کر آسمان پر چھائی تاریکی کے نیچے اونچے پہاڑوں پر اُگے چنار کے درختوں کے ہیولے دیکھے اور ہولے سے سرسراتی ہوا کے ساتھ بکھرتے اپنے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑسا۔

”وہ لڑکی اب کہاں ہے؟“ اس نے سعد کی بات کے جواب میں سوال کیا۔

”وہ۔“ اس نے پائن ایپل کا ٹکڑا کانٹے میں پھنساتے ہوئے بے دھیانی سے کہا۔ ”وہ تو شاید واپس چلی گئی اپنے گھر۔“

”شاید۔“ سارہ نے دل میں دہرایا ”یعنی اس کی اہمیت بس اتنی ہی تھی کہ وہ چلی گئی یا نہیں اسے معلوم ہی نہیں۔“ اس نے آنکھیں ایک بار بند کر کے کھولیں‘ پریوں کی کہانیوں کے تصویری خاکوں سا یہ منظر اب پہلے سے بھی زیادہ پیارا لگ رہا تھا۔

چہرہ ہے یا چاندنی رات
زلف گھنیری شام ہے کیا
ساگر جیسی آنکھوں والی
یہ تو بتا تیرا نام ہے کیا

لیپ ٹاپ سے ہوا کی لہروں پر بکھرتی موسیقی کے ساتھ یہ الفاظ بھی فضا میں بکھر رہے تھے۔

”پریا.... پریا رانی‘ سارہ نے سعد کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”کیا تم مجھے اس نام سے مخاطب کرسکتے ہو؟“

جواب میں سعد نے مسکرا کر سرہلایا ”نائس نیم‘ کیوں نہیں۔“

وہ کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

”بڑی مشکل سے بنی ہے یہ پرچی۔ چوہدری صاحب کو بڑے بڑے افسروں کے ترلے کرنے پڑے تب جا کر یہ پرچی ہاتھ آئی ہے۔“ صابرہ نے اپنے سامنے اونچی پیڑھی پر بیٹھی آپا رابعہ سے کہا۔

”کوئی آسان کام تو نہیں ہوتا نا‘ نئے سرے سے ریکارٹ (ریکارڈ) بنوانا‘ علامتیں لکھوانی‘ عارضی اور مستقل پتے بتانے۔“ وہ ان نادیدہ مشکلات کا بیان خود سے ہی کر رہی تھیں جو سعدیہ کے فارم ب بنوانے میں چوہدری صاحب کو پیش آئی تھیں۔

”بڑی مہربانی ہے جی چوہدری صاحب کی۔“ آپا رابعہ نے نظریں نیچے کیے نرمی سے جواب دیا۔

”چوہدری صاحب تو اپنی مہربانیوں میں کمی نہیں کرتے مگر لوگ بڑے بے دیتے (کم ظرف) ہوتے ہیں‘ کئی لوگوں کی تو آکڑ (اکڑ) ہی نہیں ختم ہوتی۔“ صابرہ نے ناک چڑھاتے ہوئے آپا رابعہ کو جتایا۔

”جی!“ بدستور نظریں نیچی رکھتے ہوئے انہوں نے مختصر جواب دیا۔

”سیدھی سی بات ہے نا۔“ اب صابرہ صاف لفظوں میں اپنا مدعا بیان کرنے پر اتریں۔ ”ہم آپ لوگوں کے کام آتے ہیں‘ آپ لوگوں کو چاہیے آپ ہماری بھی سنیں۔“

”جی جی۔ ضرور۔“ آپا رابعہ نے ادب سے کہا۔ ”آپ بتائیں جی!“

”تین باری پیغام بھیجا تھا آپ کو کہ میلاد شریف میں‘ محفل میں‘ ختم قرآن پاک میں ہمارے ساتھ شریک ہوں پر ان چھ سالوں میں آپ نے ایک بار بھی گوارا نہ کیا کہ ہم ماڑے ساڑوں (نیچ) لوگوں کے ساتھ مل بیٹھیں۔“ صابرہ نے کب کا غصہ نکالنے کے لیے اس موقع کو غنیمت جانا تھا۔

”ایسی بات نہیں جی۔“ آپا رابعہ نے نرمی سے کہا۔ ”میں گھر سے باہر کم ہی نکلتی ہوں اور محافل میں بھی شرکت نہیں کرتی۔“

”تو نائیوں کی نوں کے چالیے (چہلم) پر آپ روٹی ورتانے (کھانا بانٹنے) گئی تھیں کیا؟“ صابرہ نے طعنہ دینے کے انداز میں کہا۔ ”وہاں تو سنا ہے‘ آپ نے درس بھی دیا تھا اور دعا بھی کروائی تھی۔“

”جی!“ آپا رابعہ کو دو سال پہلے کا وہ واقعہ یاد آگیا ”ایک تو وہ ہمارے بالکل ساتھ والے گھر میں رہتی تھی‘ ہمسائیگی کا حق تھا‘ دوسرا غریب لوگ ہیں‘ درس سبق پڑھنے والی بی بی کپڑوں کے جوڑے اور ہدیے کے بغیر آنے پر راضی نہیں تھی سو اللہ کے نیک بندوں کی جو چار اچھی باتیں مجھے یاد تھیں۔ میں نے دہرا دیں‘ کوئی خاص نیت
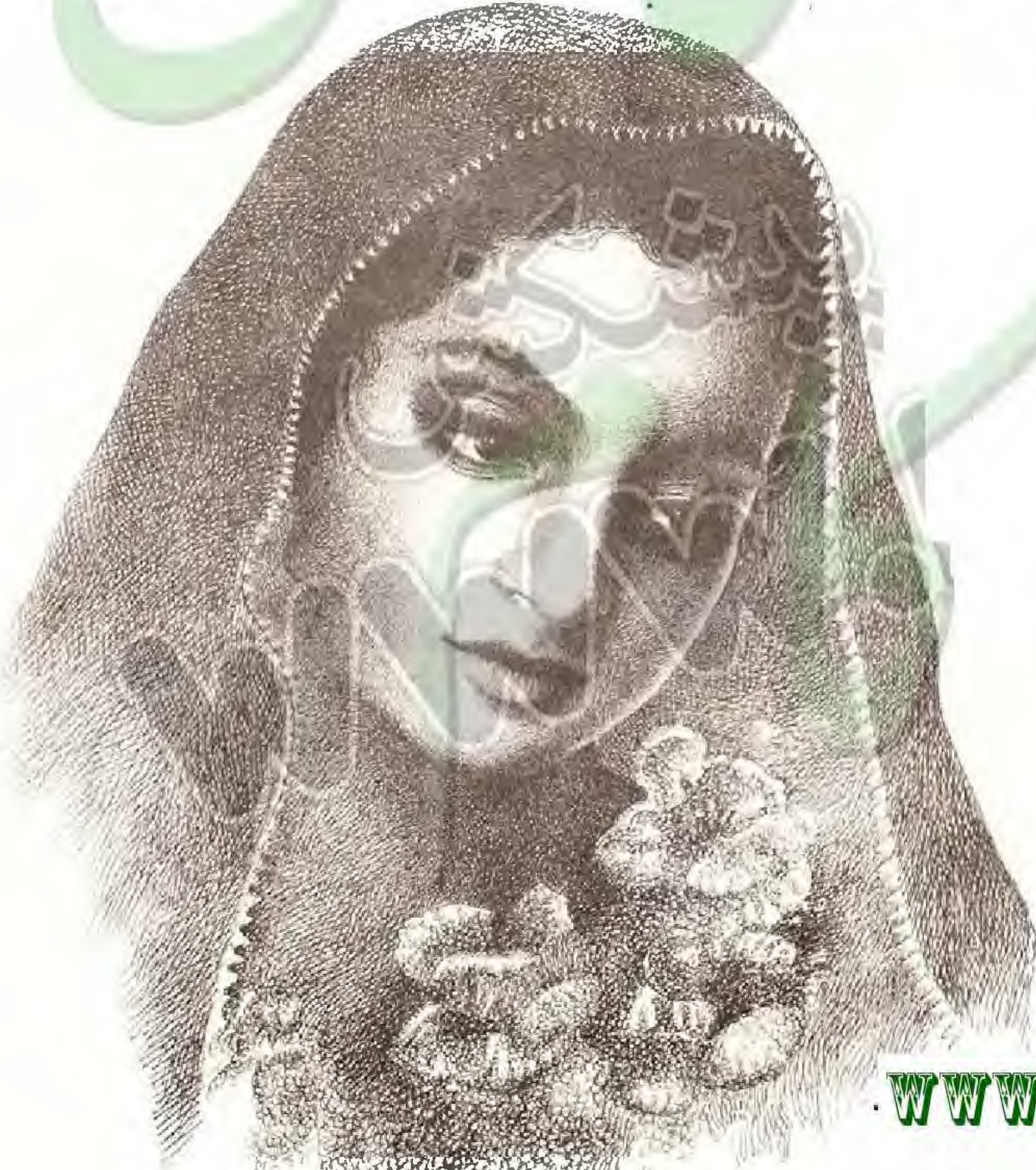
سے میں وہاں نہیں گئی تھی۔" انہوں نے وضاحت کی۔

"پر آپ کے درس سبق کی سارے پنڈ میں دھوم مچی تھی۔" صابرہ نے کلس کر کہا۔ "بس آج مجھ سے وعدہ کر کے یہاں سے اٹھیں کہ آتے درس سبق پر آپ مجھے واری (باری) دیں گی اس بار ضرور۔"

"وہ۔" آپا رابعہ نے کچھ کہنا چاہا' تب ہی میں ان کی نظر ہاتھ میں پکڑے موی کاغذ میں ملفوف فارم پر پڑی۔

"ٹھیک ہے۔ جی ضرور۔" انہوں نے احساس ممنونیت سے بوجھل ہوتے ہوئے لہجے میں کہا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"اب چلتی ہوں۔" انہوں نے اپنے سیدھے ٹوپی برقعے کا نقاب چہرے پر ڈالنے سے پہلے کہا۔ "آپ کا بہت شکریہ۔ چوہدری صاحب سے بھی شکریہ کہہ دیجیے گا۔" چہرہ پر جالی دار نقاب کھینچ کر وہ اپنے ساتھ آئی اپنی ہمسائی سمیت صابرہ کے گھر کا صحن عبور کر گئیں۔

"اب آیا ہے نا اونٹ پہاڑ کے نیچے" ان کے جانے کے بعد صابرہ نے ملازمہ خاص رضیہ سے کہا اور زور سے ہنس دیں۔

☼ ☼ ☼

"او خیر سعدیہ! باؤ آج پھر اکیلی آ رہی ہو واپس۔" کھاری فارم ہاؤس سے باہر نکلا تو سعدیہ کو بڑا سا بستہ اٹھائے اکیلے پگڈنڈیوں پر قدم جما جما کر چلتے آتے دیکھ کر رک گیا۔ طویل راستہ پیدل چل کر یہاں تک آتے وہ پسینے سے شرابور ہو رہی تھی۔

"مس نے سائنس گروپ کی لڑکیوں کو پریکٹیکل کے لیے روکا ہوا تھا۔ آج میں سولنگ پار والے گاؤں کی لڑکیوں کے تانگے پر آئی ہوں' اس نے مجھے پٹے (آغاز) پر ہی تار دیا۔" سعدیہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"ہائے کھاری! بڑی پیاس لگی ہے اور میری ٹانگیں جواب دے گئی ہیں چل چل کے۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"اوئے ہوئے ہوئے۔" کھاری نے سر ہلا کر افسوس کا اظہار کیا اور پھر ادھر ادھر دیکھا۔ "آ تو ساں کو پانی پلاتا ہوں۔" اس نے فارم ہاؤس کا چھوٹا گیٹ کھولا "فارم ہاؤس بھی دیکھ لینا آج اندر سے۔" کھاری نے مسرت بھرے انداز میں کہا۔

"فارم ہاؤس۔" سعدیہ نے حیرت سے پوچھا۔

"آہو فارم ہاؤس۔۔۔ دیکھنا نہیں؟" کھاری نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا "آج بڑا سکون اے چوہدری صاحب شہر گئے ہوئے نیں تے سارے کمی کاری عید کی وجہ سے اپنے اپنے گھر گئے ہوئے ہیں اندر کوئی خاص بندہ نہیں' جو ہیں وہ سوتے پڑے ہیں' آجاؤ آجاؤ۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"ہیں۔" سعدیہ نے بے یقینی سے کھاری کی طرف دیکھا "لیکن اماں انتظار کر رہی ہوں گی' دیر ہو جائے گی۔" دوسرے ہی لمحے اس کی خوشی ہوا ہو گئی۔

"نہیں ہوتی دیر جی۔" کھاری نے سر جھٹکا "اے بس آگے آگے سے دیکھ لو' کوئی بندہ نہیں خاص اندر۔"

سعدیہ نے لمحہ بھر کو سوچنے کی کوشش کی مگر پھر فارم ہاؤس کو اندر سے دیکھنے کا ہمیشہ کا شوق اور تجسس اور اسے پورا کرنے کے اس نادر موقع کا خیال اس کے ناپختہ ذہن پر حاوی ہو گیا۔ اور وہ اپنی تھکی ٹانگوں کو دو قدم مزید گھسیٹتی چھوٹے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

راشدہ رفعت

نانی کی ننھی

"ننھی کی نانی۔" عصمت چغتائی کے قلم کا شاہکار تھی۔ سو تاریخ ادب میں امر ٹھہری' لیکن نانی کی "ننھی" کو تو نہ تاریخ سے واسطہ تھا' نہ ادب سے۔ وہ تو عصمت چغتائی کے نام تک سے ناواقف تھی۔ اس کی دنیا تو اپنی نانی سے شروع ہو کر نانی پر ختم ہو جاتی تھی اور نانی کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھا۔ ان کے

نواسے، نواسیاں بہتیرے، مگر ننھی تو ان کی کل کائنات تھی۔

شمسہ ان کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی تھی جو پہلی زچگی میں ہی کسی پیچیدگی کا شکار ہو کر دنیا سے موڑ گئی۔ ہاں! جاتے جاتے اپنی جیتی جاگتی نشانی ضرور دے گئی۔ نانی جو بیٹی کے ہاں نئے مہمان کی آمد کا استقبال کرنے پہلے سے اس کے سسرال جا پہنچی تھیں۔ جب اسپتال سے بیٹی کی میت گھر پہنچی تو وہ اپنے حواس ہی کھو بیٹھیں، لیکن اس ننھی سی جان کے لیے انہیں مشیت ایزدی کو قبول کرتے ہوئے صبر کا دامن تھامنا پڑا کہ شمسہ کے بھرے پرے سسرال میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ تھا جو بھلے کچھ وقت کو ہی سہی، پر یہ ذمہ داری اٹھانے کی ہامی بھرتا۔

بچی کی دادی تو خیر سے سو بیماریوں کی پوٹلی تھی ہی۔ چاچیاں، تائی، پھوپھی غرض ہر کسی کے پاس بہانہ تیار تھا۔ کسی کے بچے چھوٹے تھے کہ مزید چھوٹا بچہ پالنا ناممکن تو کسی کے اتنے بڑے کہ بچہ سنبھالنا ہی بھول بھال چکی تھیں۔ گھر بھلے سے کسی کا چھوٹا نہ تھا۔ مگر سب کے دل اس ننھی سی جان کے لیے چھوٹے پڑ چکے تھے۔ دس دن تک نانی مرحومہ بیٹی کے سسرال میں رہیں۔ بچی سنبھالنا ان ہی کی ذمہ داری تھی، لیکن آخر انہیں یہاں سے جانا ہی تھا۔

ان بے حس لوگوں کے پاس بچی چھوڑ کر جانے کو دل مانتا تو ساتھ لے جانے کا کوئی سبب نہ بنتا۔ بیٹی مر چکی تھی، مگر داماد زندہ سلامت تھا جو بچی کا باپ تھا۔ اس کا کفیل تھا۔ وہ بھلا اپنی بیٹی سے دستبرداری کیوں اختیار کرتا، مگر یہ بھی نانی کی بھول ہی تھی۔ دس دن بعد شرمندہ شرمندہ سے عقیل نے خود ہی ان سے کہہ دیا۔

"شمسہ چلی گئی اماں! جی تو چاہتا ہے اس کی نشانی سدا نگاہوں کے سامنے رکھوں، مگر مرد ذات کو روزی روٹی کے چکر میں گھر سے باہر نکلنا پڑتا ہے اور گھر میں کوئی اسے سنبھالنے کو تیار نہیں۔ اگر اسے آپ اپنے ساتھ لے جائیں گی تو مجھے اطمینان رہے گا کہ میری بچی کو آپ کی شفقت بھری چھاؤں میسر ہے اور ویسے بھی گھر والے میرے عقد ثانی کے لیے میرے تایا کی بیٹی کا انتخاب کر رہے ہیں۔ میں نسرین کے مزاج کو جانتا ہوں۔ وہ میرے ساتھ تو نباہ کرے گی، لیکن شمسہ کی نشانی ہرگز قبول نہ کرے گی۔"

نانی نے صدمے سے سر اٹھا کر داماد کو دیکھا۔ دس دن، صرف دس دن ہوئے تھے ان کی بیٹی کو اس کی زندگی سے نکلے ہوئے اور وہ کتنی جلدی اس کی جگہ کسی اور عورت کو دینے پر تیار ہو گیا تھا۔ دوسری شادی کرنا بلاشبہ اس کا حق تھا، لیکن ابھی تو محاورتاً" نہیں حقیقتاً" ان کی بیٹی کی قبر کی مٹی بھی نہ سوکھی ہو گی۔ اب ان بے حس لوگوں کے درمیان اپنی شمسہ کی نشانی چھوڑ کر جانے کا وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھیں، سو اپنا اور بچی کا سامان سمیٹا اور اس ننھی سی جان کو سینے سے لگا کر واپس گھر آ گئیں۔ شمسہ کے والد عرصہ ہوا داغ مفارقت دے چکے تھے۔ سو اپنے اس فیصلے کے لیے وہ کسی کے آگے جوابدہ نہ تھیں۔ ان کی اپنی اولادوں میں سے کچھ نے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا تو کچھ نے تحفظات کا اظہار۔

"اماں کا بڑھاپا ہے، اس ننھی سی جان کو کیسے سنبھال پائیں گی۔" منجھلی بہو نے سب سے پہلے دبی زبان میں اعتراض اٹھایا۔

"بہو رانی! اماں اس بڑھاپے میں بھی تم سے زیادہ پھرتی سے گھر کے کام نپٹاتی ہیں۔ اللہ اس بچی کی خاطر مجھے صحت اور مزید تندرستی سے نوازے۔ میں اسے خود پالوں گی۔ کسی کو پریشان ہونے کی قطعاً" ضرورت نہیں۔" انہوں نے اپنی پاٹ دار آواز میں جتایا تھا۔

"میں تو ویسے ہی ایک بات کر رہی تھی۔" منجھلی بہو کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

"اب اس ننھی سی جان کا کوئی نام بھی تو رکھ دیں اماں!" شمسہ سے بڑی عارفہ نے جو بھانجی کو گود میں لٹائے نم آنکھوں سے اس کے نقوش میں مرحومہ بہن کو کھوج رہی تھی۔ اس بات کی طرف ماں کی توجہ

دلوائی۔

"دادی اماں اس کا نام سنو وائٹ رکھ دیں۔ یہ کتنی وائٹ، وائٹ ہے نا۔" نو سالہ ابتہاج نے رائے دی۔ سب مسکرا دیے تھے۔

"یہ اتنی نرم و نازک ہے اس کا نام تو نرمین ہونا چاہیے۔" شمسہ کے تیسرے نمبر والے بھائی نے محبت سے بھانجی کو دیکھتے ہوئے کہا اور سب کو ہی یہ نام بہت پسند آیا۔ سو اس دن سے وہ دنیا والوں کے لیے نرمین کہلائی۔ ہاں! مگر روز اول کی طرح اپنی نانی کے لیے وہ ننھی ہی تھی۔ اس ننھی سی جان کو پال کر انہوں نے دنیا کو حیران کر ڈالا تھا۔ وہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا کام اپنے ہاتھ سے انجام دیتی تھیں۔ مروت اور رواداری میں بہویں ہاتھ بٹانا چاہتیں بھی تو نانی منع کر دیتیں۔ کسی کا احسان لینا ان کی سرشت میں ہی نہ تھا۔ وہ بڑی خوددار خاتون تھیں اور پھر اللہ نے واقعی ان کی دعا بھی سن لی۔ پہلے کے برعکس وہ خود کو زیادہ صحت مند اور چاق و چوبند محسوس کرتی تھیں۔ لیکن ان کی ہزار کوششوں کے باوجود نرمین کی شخصیت ویسے پروان نہ چڑھ رہی تھی، جیسی وہ خواہش مند تھیں۔

☼ ☼ ☼

وقت ایسی برق رفتاری سے گزرا تھا کہ کبھی نانی انگلیوں پر حساب لگانے بیٹھتیں تو حیران رہ جاتیں۔ اس ساون میں انہوں نے ننھی کی بارہویں سالگرہ منائی تھی۔ وہ بالکل ان کی شمسہ کا عکس تھی۔ گلابیاں گھلی ہوئی سفید رنگت، بڑی بڑی آنکھیں، لیکن ان کی شمسہ کی آنکھوں میں تو شوخی اور شرارت رقصاں رہتی تھی۔ ننھی مزاج میں ماں کے برعکس تھی۔ کم گو اور فطرتاً" بہت حساس۔ کسی بی مذاق میں کی گئی بات پر بھی وہ گھنٹوں آنسو بہا سکتی تھی۔ اس کا چڑیا جتنا ننھا دل تھا۔ اور نانی کی نگاہ بے شک بہت کمزور سہی، مگر اپنی ننھی کی آنکھوں کا گیلا فرش انہیں فوراً" نظر آ جاتا تھا۔ پھر پوتے، پوتیوں کی شامت آ جاتی۔

"ننھی کو کس نے چھیڑا؟ کس نے مذاق اڑایا اس کا۔ اسے کس کی بات سے رنج پہنچا؟"

ننھی بے چاری بوکھلا کر، گھبرا کر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے نانی کو روکنا چاہتی، مگر نانی سب کو لائن حاضر کر دیتیں۔ ان کے سب ہی پوتے، پوتیاں بلا کے ہنسوڑ اور خوش مزاج تھے۔ وہ اپنی دادی کی جواب طلبی کا ہرگز برا نہ مناتے۔ ہنسی ٹھٹھول کرتے ہوئے دادی کی خدمت میں پیش ہو جاتے۔ یہ اور بات کہ ان کی ہنسی مذاق کی باتیں نرمین کی آنکھیں نم کرنے کا پھر سے سبب بن جاتیں اور نانی کا پارہ اور اوپر چڑھ جاتا۔ وہ سب کو ہی خوب صلواتیں سناتیں۔ بڑی بہو اور منجھلی بہو اب تنہائی میں مل بیٹھ کر نانی کی اس عادت پر خوب ناک بھوں چڑھاتیں۔

"تیرہویں برس میں قدم رکھ دیا ہے نرمین نے، لیکن اماں نے تو بالکل ہی ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا ہوا ہے۔ اب ایسی بھی کیا نازک مزاجی، ذرا ذرا سی باتوں پر شہزادی صاحبہ کے دل کو ٹھیس پہنچ جاتی ہے۔ جب دیکھو نانی کے سینے میں سر چھپائے آنسو بہانے میں مصروف ہوتی ہے۔"

منجھلی بہو اب اس سے زیادہ ہی خار کھانے لگی تھیں۔ یہ اور بات کہ ننھی کے لیے اپنی ناگواری کا اظہار وہ صرف جٹھانی کے سامنے ہی کر سکتی تھیں۔ شوہر اور شوہر کی ماں کے ڈر سے ننھی کے ساتھ ان کا برتاؤ بہت شفقت آمیز ہوتا تھا اور یہی حال ان کی جیٹھانی کا تھا۔ ایک دوسرے کے سامنے دل کے جتنے مرضی پھپھولے پھوڑ لیں، ننھی کو کوئی تیکھی نگاہوں سے گھورنے تک کی ہمت نہ رہا تھا۔ ماموں بھی مرحومہ بہن کی نشانی سمجھ کر خوب ہی لاڈ اٹھاتے۔ ایسے میں ننھی کی زود رنجی کم از کم نانی کی سمجھ سے باہر تھی۔ کبھی اسکول سے آتی، تو رو رو کر پپوٹے سوجے پڑے ہوتے۔

"بتا تو سہی ننھی! ہوا کیا ہے۔" نانی بے چین ہو کر سوال پر سوال کیے جاتیں اور ننھی پھر سے رونا شروع

کردیتی۔

"اے آبگینے! تو ہی بتادے۔ تیری کلاس اس کے ساتھ والی ہی تو ہے۔ کس نے کیا کہہ دیا میری ننھی کو۔" نانی اپنی پوتی کو آواز دے کر بلاتیں۔

"واوو! ننھی کو کسی نے کچھ نہیں کہا۔ آج ان کی پوری کلاس کا میتھس کا ٹیسٹ خراب ہوا تھا۔ باقی سب کو تو اسٹک لگے تھے۔ مگر ٹیچر نے نرمین کو ڈنڈا تک نہیں مارا' بس سزا کے طور پر دس' پندرہ منٹ کھڑا رکھا تھا۔"

"میں کل اسکول جاؤں گی تیرے ساتھ۔ استانی سے کہوں گی کہ آئندہ میری ننھی کو کوئی سزا نہ دیں۔" نانی' ننھی کو پچکارتیں۔

ننھی روتے روتے پھر عادت کے مطابق نفی میں گردن ہلانا شروع کردیتی۔ نانی کے ساتھ جانے کا مطلب تھا کہ ساری کلاس مل کر اس کا خوب ہی مذاق اڑائے گی۔ آبگینے وغیرہ کی زبانی اسکول میں اس کا نک نیم پہلے ہی مشہور تھا۔ اکثر لڑکیاں اسے "ننھی" کہہ کر چھیڑتی تھیں۔ وہ انہیں کچھ کہہ تو نہ سکتی تھی' ہاں آنسوؤں کے وافر خزانے میں سے آنسو ضرور بہا سکتی تھی' سو بہالیتی' مگر ہر بار نانی کو جانے کیسے خبر ہوجاتی اور ایک دن وہ واقعی اس کے اسکول پہنچ گئیں۔

"بن ماں کی بچی ہے میری ننھی۔ باپ نے کبھی پلٹ کر خبر نہیں لی۔ چڑیا جتنا ننھا دل ہے میری بیٹی کا۔ آپ اسے کچھ کہا نہ کریں۔" نانی نے اس کی کلاس ٹیچر کو لجاجت سے مخاطب کیا تھا۔

"دیکھیے ماں جی! نرمین بہت اچھی بچی ہے۔ پچھلے دو سال سے وہ میری اسٹوڈنٹ ہے۔ ہونہار ہے' قابل ہے' لیکن دوسرے بچوں کی طرح نارمل نہیں ہے۔ اسے اپنے اندر تھوڑی بہت ڈانٹ ڈپٹ سننے کا حوصلہ پیدا کرنا چاہیے۔ میرے دوسرے شاگرد میری معمولی سی ڈانٹ کو خاطر میں ہی نہیں لاتے۔ لیکن نرمین کو تو میں اونچی آواز سے پکاروں۔ بیٹھوں تو اس کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے۔ آپ ٹھنڈے دل سے میری باتوں پر غور کریں کہ کہیں آپ کا بے تحاشا پیار بچی کے اعتماد میں کمی کا سبب تو نہیں بن رہا؟ اسے اس دنیا میں سروائیو کرنا ہے۔ طرح طرح کے لوگوں کو فیس کرنا ہے۔ اس کے سیلف کانفیڈنس کی بحالی کے لیے ضروری ہے کہ وہ آپ پر انحصار کرنا چھوڑ دے۔" ٹیچر سنجیدگی سے نانی سے مخاطب تھی اور بھلے سے اس کے بہت سے لفظ نانی کے پلے نہیں پڑے تھے' مگر گفتگو کا مفہوم ان کی سمجھ میں آگیا تھا۔

چند دن نانی بہت پریشان رہیں' اس نہج پر تو انہوں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ ننھی لڑکی ذات تھی' وہ سدا اسے اپنی نگاہوں کے سامنے دنیا سے بچا چھپا کر تو نہیں رکھ سکتی تھیں۔ کل کلاں کو اسے بیاہنا بھی تھا۔

اس کی استانی صحیح کہتی تھی' ننھی میں دنیا کا سامنا کرنے کی ہمت ہونی چاہیے ...... لیکن وہ مجبور تھیں' کیسے اپنی ننھی کے سینے میں چڑیا جیسے دل کے بجائے مضبوط سا دل رکھ سکتی تھیں۔ وہ تو شاید پیدائشی طور پر ہی بہت حساس بچی تھی۔ ورنہ جتنا لاڈ پیار اسے ننھیال میں ملا' اس کی شخصیت بہت مضبوط اور پراعتماد ہونی چاہیے تھی۔ نانی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیسے اپنی ننھی کی عادت اور مزاج بدلیں۔ یہ ہی پریشانی اپنی بڑی بیٹی سے بیان کی تو اس نے فوراً" ماں کو حوصلہ دیا۔

"آپ کاہے کو فکر کرتی ہیں اماں! ننھی کو کون سا بیاہ کر کہیں اور جانا ہے۔ ابتاج' وہاج' تو چلو اس سے کافی بڑے ہیں' لیکن ولید' صارم' عفان اور نعمان اپنے چاروں پوتوں میں سے جس سے مرضی چاہے ننھی کو بیاہ دیجیے گا۔ خیر سے چاروں بچے ہی قابل ہیں' سلجھے ہوئے اور سمجھ دار۔ نرمین کو بیاہ کر کہیں دور بھیجنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔" شاہدہ کی بات سے ان کی پریشانی دور ہوگئی تھی۔

انہیں اپنے بیٹوں پر پورا بھروسا تھا۔ وہ ماں کے سامنے حرف انکار لبوں پر نہ لاسکتے تھے' لیکن ابھی یہ بات کرنے کا وقت نہ تھا۔ ننھی کے بیاہ میں کافی عرصہ پڑا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ بچوں کے ذہنوں میں قبل از وقت اس قسم کی باتیں ڈالنے سے صحیح نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ سو انہوں نے دل کی بات دل میں ہی رہنے دی۔

☆ ☆ ☆

وقت کا کام گزرنا ہے' سو اپنی رفتار سے گزرتا گیا۔ صحت مند اور چاق و چوبند نانی اب بہت ضعیف اور لاغر لگنے لگی تھیں۔ انہیں محسوس ہورہا تھا کہ جس ننھی جان کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے انہوں نے رب سے مہلت طلب کی تھی۔ وہ مہلت اب ختم ہونے کو ہے۔ ان کی ننھی اب ایک نازک اندام دوشیزہ کا روپ دھار چکی تھی۔ اب نانی جلد از جلد اس کے ہاتھ پیلے کرکے اپنے آخری فرض سے بھی سبکدوش ہونا چاہتی تھیں۔ انہوں نے ایک رات بیٹوں' بہوؤں کو اپنے کمرے میں بلوا کر اپنی خواہش ان کے سامنے رکھی۔

"میں چاہتی ہوں تم میں سے کوئی ننھی کو بیٹی کے ساتھ ساتھ بہو کا درجہ بھی دے دے۔ میری ننھی بہت حساس اور معصوم لڑکی ہے۔ اس چار دیواری کی عادی ہے۔ یہاں اس کی زندگی سہل طریقے سے گزر جائے گی۔ کہیں اور بیاہنے کو میرا جی نہیں مانتا۔ ورنہ تم جانتے ہو کہ اس کے رشتے آنا شروع ہوگئے ہیں۔"

اور اس سے پہلے کہ فرماں بردار بیٹے "آپ کی خوشی ہمارے سر آنکھوں پر اماں!" جیسا کوئی جواب دے پاتے' ان کی بہوؤں نے زبان کھولی۔

"میرے ولید کی خواہش تو آبگینے کے لیے ہے اماں!" بڑی بہو نے دیور کی بیٹی کا نام لیا تھا اور آبگینے بھی نانی کی پوتی ہی تھی' اس بات سے انہیں خوشی ہوئی تھی۔ اب انہوں نے منجھلی بہو کو سوالیہ نگاہوں سے تکا۔ وہ دو عدد بیٹوں کی ماں تھیں۔ دونوں نرمین سے بالترتیب تین اور چار سال بڑے تھے۔ اس کا جوڑ باآسانی کسی سے بھی بن سکتا تھا۔

"عفان تو بڑی آپا کی شازمین کے لیے دلچسپی کا اظہار کرچکا ہے اور نعمان کو آپ جانتی ہیں' اس کی پڑھائی کا سلسلہ دور' دور تک ختم ہونے کا چانس نہیں۔ ماسٹرز کا آخری سال ہے' پھر صاحبزادے کی خواہش ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ہے۔ بلکہ اگر اسکالر شپ مل گیا تو وہ تو باہر جانے کا بھی خواہش مند ہے۔ اگلے پانچ برسوں تک اس کی شادی کا کوئی ارادہ نہیں۔" منجھلی بہو نے بھی ہری جھنڈی دکھادی تھی۔

"اور صارم تو نرمین کو اپنی چھوٹی بہن سمجھتا ہے۔ آپ تو جانتی ہیں ہمیشہ اس نے بڑے بھائیوں کی طرح نرمین کے لاڈ اٹھائے ہیں۔ وہ کہتا ہے' میں تو خواب میں بھی اس قسم کی بات نہیں سوچ سکتا۔" چھوٹی بہو نے بھی ڈرتے جھجکتے کہہ ڈالا۔

یہ نانی کی خوش فہمی بلکہ غلط فہمی تھی کہ بہوئیں ان کی دلی خواہش سے بے خبر ہیں' جبکہ ان کی تینوں بہوئیں ہمیشہ سے جانتی تھیں کہ نواسی کو ہتھیلی کا چھالا بنا کر پالنے والی اماں مستقبل میں بھی ضرور نرمین کو ان کے سر منڈھنے کی کوشش کریں گی' سو تینوں کا ہوم ورک مکمل تھا۔

جیسے ہی نانی نے ان کے سامنے اپنی خواہش بیان کی۔ انہوں نے جھٹ بے عیب بہانے پیش کردیے۔ نانی ٹکر ٹکر ان کی شکل دیکھتی رہیں۔ بیٹوں نے ماں کی دل جوئی کی خاطر کہا کہ وہ اپنے بیٹوں کو سمجھائیں گے' لیکن نانی نے دھیمے سے لہجے میں منع کردیا۔

"بچوں کی جو خواہش ہے' اسے پورا کردو۔ ان کی مائیں ان کے دل کی خوشی بہتر طور پر جانتی ہیں۔ نئی نسل کے بچے ہیں' کسی پر زور زبردستی کی ضرورت نہیں۔"

نانی نے کہہ کر پاندان اپنے آگے کھسکا لیا' یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ محفل برخواست کی جاتی ہے۔ ذرا افسردہ سے بیٹے اور خوشی چھپانے کی کوشش میں ناکام ہوتی بہوئیں کمرے سے باہر نکل گئیں۔ انہیں ہرگز اندازہ نہ تھا کہ یہ مشکل مرحلہ اتنی آسانی سے طے ہوجائے گا۔

"بھابھی! میں آپ کو بتائے دے رہی ہوں کہ بچوں کے کانوں میں یہ بات کبھی نہیں پڑنی چاہیے۔ آپ کا

ولید تو بے شک آبگینے کو پسند کرتا ہے' لیکن میرا عفان دادی کا بہت فرماں بردار ہے۔ اسے پتا چلا کہ دادی کی کیا خواہش ہے تو جھٹ نرمین سے شادی پر راضی ہو جائے گا' جبکہ میں اپنی بڑی آپا سے ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ آپ بھولے سے بھی ولید کے سامنے یہ ذکر مت چھیڑیے گا۔ ولید اور عفان کی کتنی گہری دوستی ہے' وہ فوراً" عفان کو بتا ڈالے گا۔"
منجھلی بہو کے خدشات ابھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئے تھے۔

"نہ بابا! مجھے کسی پاگل کتے نے کاٹا ہے جو میں بچوں کے کانوں سے یہ بات گزاروں گی۔ بس یہ قصہ تو ختم ہی سمجھو۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہمارے خاوندوں نے ماں کو فرماں برداری دکھانے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے تو ابتہاج کے ابو سے صاف کہہ رکھا تھا کہ اماں نے کبھی اس قسم کی خواہش کا اکیلے میں ان کے سامنے اظہار کیا' تب بھی ٹال مٹول سے کام لینا ہے۔ غضب خدا کا جس بچی کے بیس برسوں سے ناز نخرے اٹھاتے آرہے ہیں' اس چھوٹی موئی کو اماں ساری عمر کے لیے ہمارے سر منڈھنا چاہ رہی تھیں۔ اپنی بہوؤں پر تو اماں نے ساری عمر حکومت کی اور اگر ہم نرمین کو بہو بنا لیتے تو اسے سخت بات کہنا تو درکنار' ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ بھی نہ سکتے تھے۔ وہ اماں کی ننھی ہے' ڈھونڈ لیں گی' اس کے لیے کوئی ننھا کاکا۔"

بڑی بہو کا لہجہ آخر میں تمسخرانہ ہو چلا تھا۔ دونوں دیورانیوں نے بھرپور قہقہے کے ساتھ ان کی بات کا لطف لیا تھا اور اپنے کمرے میں نانی مصلیٰ بچھائے رب کی بارگاہ میں مناجات میں مصروف تھیں۔ ویسے تو وہ جب بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی تھیں' پہلی دعا اپنی ننھی کے بارے میں ہی مانگتی تھیں' لیکن اب دعاؤں میں مزید شدت اور عاجزی در آئی تھی۔

اپنی روز بروز بگڑتی طبیعت سے وہ شدید خوف زدہ تھیں۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کے آنکھیں موندتے ہی ننھی کے لیے یہ مانوس چار دیواری بھی اجنبیت کا لبادہ اوڑھ لے گی۔ اسے جلد از جلد اپنے گھر بار کا کرنا اشد ضروری ہو گیا تھا۔

نانی کی صدقِ دل سے مانگی گئی دعائیں بہت جلد قبولیت کا درجہ پا گئیں۔

☼ ☼ ☼

معید اویس' ولید کے بہترین دوستوں میں سے تھا۔ اس کی بہن کی شادی کی تقریب تھی۔ اس نے بصد اصرار کہا کہ ولید اپنی والدہ اور بہنوں کو بھی تقریب میں ضرور لائے۔ ولید کی اپنی دونوں بہنیں تو بال بچوں والی تھیں۔ ماں نے بھی پرائی شادی میں جانے سے انکار کر دیا۔ وہ آبگینے کو ساتھ لے کر جانا چاہتا تھا' لیکن صرف آبگینے کو ساتھ لے جانا اس گھر میں معیوب تصور کیا جاتا' سو آبگینے نے بہت جتن کر کے نرمین کو بھی ساتھ چلنے پر راضی کر لیا۔

شادی کے پنڈال میں آبگینے عادت کے مطابق نرمین کو تنہا چھوڑ کر معید اویس کی کزنز سے دوستی گانٹھ کر گپ شپ میں مشغول ہو گئی۔ اجنبی مجمع میں نرمین اکیلی بیٹھی گھبراہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ معید کا کئی بار کسی کام سے وہاں سے گزر ہوا۔ ہرنی جیسی آنکھوں میں وحشت سموئے وہ لڑکی معید کے دل کے تار چھیڑنے کا سبب بن گئی تھی۔ بہن کی شادی کا ہنگامہ سرد پڑتے ہی اس نے ماں کے سامنے دل کی خواہش بیان کر دی۔

معید تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ خوب صورت' پڑھا لکھا اور برسرِ روزگار' ماں کب سے اس پر شادی کے لیے زور دے رہی تھی' مگر وہ ہر بار ٹال جاتا۔ آخر اس سے دو برس چھوٹی بہن بھی وداع ہو کر پیا دیس سدھار گئی' جب اس نے پہلی بار جھجکتے ہوئے ماں کے سامنے شادی کی خواہش کا اظہار کیا۔ اکلوتے بیٹے کے سر پر سہرا سجانا ماں کے دل میں بھی برسوں کا دبا ارمان تھا' لیکن بہو کے انتخاب کو وہ اپنا اور اپنی بیٹیوں کا حق سمجھتی تھیں۔ بیٹے کے منہ سے یہ ذکر سن کر وہ ششدر رہ گئیں۔

"عافیہ کی شادی پر آپ نے دیکھا ہی ہوگا' ولید کے گھر سے دو لڑکیاں آئی تھیں' ایک ولید کی منگیتر ہے اور دوسری اس کی مرحومہ پھوپھی کی بیٹی' نرمین نام ہے۔ اسی سال بی اے کے پیپرز دیے ہیں۔ سیدھی سادی لڑکی ہے۔ مگر میں نے جیون ساتھی کا جو خاکہ ذہن میں بنا رکھا تھا' اس خاکے پر نرمین ہی پوری اترتی ہے۔ وہ نہیں تو کوئی نہیں۔"

ماں کی گود میں سر رکھے' آنکھیں موند کر نرمین کا سراپا تصور میں لاتے ہوئے وہ ہولے ہولے بول رہا تھا۔ زبیدہ بیگم جہاندیدہ خاتون تھیں۔ سمجھ گئیں صاحبزادے کے سر پر پہلی نظر کا عشق سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ یہ بھی جانتی تھیں کہ بیٹا ہٹ کا پکا ہے۔ جو کام ضد اور طویل بحث مباحثے کے بعد بھی انجام دیتا ہے تو وہ پہلے کیوں نہیں۔ ولید کو وہ جانتی تھیں' اچھے گھر کا لڑکا تھا۔ اگر پہلے علم ہوتا کہ اس کے گھر میں شادی کے قابل لڑکیاں موجود ہیں تو ہو سکتا ہے' زبیدہ خاتون پہلے ہی اس کے گھر کا چکر لگا کر آچکی ہوتیں۔ وہ اور ان کی بیٹیاں معید کی دلہن کی تلاش میں کافی عرصے سے سرگرداں تھیں۔ جہاں بھی کسی مناسب لڑکی کے پائے جانے کا چانس ہوتا' ماں' بیٹیاں دیکھنے پہنچ جاتیں۔

معید کی ٹال مٹول کی وجہ سے کہیں بھی بیل منڈھے نہ چڑھ سکی تھی اور اب جب اس نے خود لڑکی کا نام لیا تو ماں' بہنوں کو دلی قلق ہوا تھا۔ بہرکیف چہرے پر میک اپ اور خوش اخلاقی کی تہیں چڑھائے لڑکی دیکھنے پہنچ گئیں۔ لڑکی بے حد خوب صورت اور شکل سے ہی بہت بھولی بھالی اور معصوم لگ رہی تھی۔

زبیدہ بیگم نے لڑکی کو اوکے کر دیا اور بہت لجاجت سے اس کی نانی سے اس کا رشتہ مانگ لیا۔ ننھی کے دو چار رشتے اور بھی آچکے تھے' لیکن نانی کے من کو کوئی نہ بھایا تھا۔ اب شہزادوں جیسی آن بان والا معید ان کی ننھی کا طلب گار تھا' جس میں کوئی خامی ڈھونڈے سے نہ ملتی تھی۔

انہوں نے بیٹوں سے مشورہ کرنے کا کہہ کر رسمی مہلت مانگی اور چند دنوں میں لڑکے والوں کو ہاں کہلوا دی۔ شادی کی جلدی نانی کو بھی تھی اور لڑکے والوں کی طرف سے بھی جلد شادی پر اصرار تھا۔ یوں ڈیڑھ ماہ بعد کی تاریخ باہمی مشورے سے طے پا گئی۔

نانی کے کمرے میں پڑی شاید ان ہی کے جہیز کی بڑی پیٹی جس پر ہمہ وقت بڑا سا تالا پڑا رہتا تھا' اس کا ڈھکن کھولا گیا اور نرمین کے جہیز کے بہت سے قیمتی آئٹم اس میں سے برآمد ہوئے۔ جانے نانی چپکے چپکے کب سے اپنی ننھی کا جہیز اکٹھا کر رہی تھیں۔ نانی کے جڑاؤ کنگن جو کبھی نانا نے بہت چاؤ اور محبت سے نانی کو بنوا کر دیے تھے۔ مرحوم شوہر کی یہ نشانی انہیں اتنی عزیز تھی کہ کسی بیٹی' بہو کو شادی پر نہ چڑھائے' وہ بھی سنار کو اجلوانے کے لیے بھیج دیے۔ ان کنگنوں کو اب ان کی ننھی کی کلائیوں کی زینت بننا تھا۔ بہوئیں تو بہوئیں' بیٹیاں بھی کچھ حیران اور خفا ہوئیں۔

"میری افشاں کی شادی میں تو اماں! آپ نے دس ہزار نقد دے کر رسم نبھا دی تھی اور نرمین کے لیے۔۔۔"

"ہاں! میرا سب کچھ میری ننھی کا ہی ہے۔ خیر سے افشاں کے ماں' باپ سلامت تھے' ننھی کا میرے سوا کون ہے؟" نانی نے بے لچک انداز میں بیٹی کو ٹوک دیا۔

نانی نے جس دھوم دھام سے نواسی کو بیاہا' دنیا ہکا بکا رہ گئی۔ خود معید کے گھر والے بھی حیران تھے۔ ہر چیز ان کی توقع سے بڑھ کر تھی۔ روتی بلکتی' نانی سے چمٹ چمٹ جاتی' نرمین رخصت ہو کر پیا دیس سدھار گئی۔ نانی بھی مستقل آنسو تو بہائے جا رہی تھیں' لیکن انہیں اپنا آپ بہت ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔ اللہ نے کندھوں پر دھری بھاری ذمہ داری بطریقِ احسن نبھانے کی توفیق دی تھی۔ کل روزِ حشر وہ اپنی لاڈلی شمسہ کے آگے سرخرو رہیں گی۔ نانی کا رواں رواں اپنے رب کا شکر گزار تھا۔

☼ ☼ ☼

ولیمہ کی رسم کے بعد ماموں' بھانجی کو گھر لائے تو

سب ہی نرمین کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ڈیڑھ دن میں ہی کیا روپ چڑھا تھا اس پر۔ ہنسی اس کے لبوں سے جدا ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ نانی اس کی بلائیں لیتی نہ تھک رہی تھیں۔ ایک رات نانی کے ہاں گزار کر صبح وہ معید کے ساتھ واپس سسرال سدھار گئی اور پھر اس کا معمول بن گیا۔ ہفتہ دس دن بعد وہ شوہر کے ساتھ آتی۔ گھنٹہ' دو گھنٹہ نانی کے پاس بیٹھتی اور پھر واپسی کی راہ لیتی۔ ممانیاں روکتی رہ جاتیں۔

"ایک' دو دن تو ٹھہر جاؤ نرمین!"

"اگلی بار آؤں گی تو ضرور رکوں گی ممانی جان!" نرمین مسکرا کر جواب دیتی۔ اس کی شخصیت کا اعتماد ان لوگوں کو حیرت میں مبتلا کر دیتا' جنہوں نے ہمیشہ اسے ڈرا سہما اور روتا بسورتا دیکھا تھا۔

"تمہاری ساس' نندیں تو ٹھیک ہیں تمہارے ساتھ؟" منجھلی مامی کرید تیں۔

"نندیں اپنے گھر بار کی ہیں ممانی! اور اماں الحمدللہ ان کا برتاؤ بہت شفقت آمیز ہوتا ہے۔ بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح پیار کرتی ہیں مجھے۔" نرمین رسانیت سے ان کی تسلی کرواتی۔

"چلو! اچھی بات ہے' ماشاءاللہ۔" ممانی سر ہلا دیتیں۔

"بس نانی کی طرف سے فکر رہتی ہے۔ کتنی کمزور ہو گئی ہیں۔" نرمین پاس لیٹی نانی کے بوڑھے وجود پر نگاہ ڈال کر اداسی سے کہتی۔

"بھلی چنگی ہوں میں۔ تم خوش تو میں بھی خوش۔" نانی اسے جھٹ تسلی دیتیں۔

"میں اگلی بار واقعی آپ کے پاس کافی سارے دنوں کے لیے رہنے آؤں گی۔" وہ نانی کا جھریوں بھرا ہاتھ تھام کر یقین دہانی کرواتی۔

"تیرا شوہر اور ساس اجازت دے تو ٹھیک ہے' ورنہ کوئی ضرورت نہیں ہے آنے کی۔ یہاں بہت لوگ ہیں میرا خیال رکھنے کو۔" نانی سمجھاتیں۔

مگر سچ تو یہ تھا کہ ان کا اپنا جی شدت سے چاہتا کہ کچھ دن کے لیے ان کی ننھی ان کے پاس رہنے کو آجائے۔

زندگی کا اب کوئی بھروسا نہ تھا۔ آتی جاتی سانسوں کی گنتی کسی بھی وقت رک سکتی تھی۔ وہ ہر بار نرمین کے واپس جانے کے بعد پھر سے اس کی راہ تکنے لگتیں۔ اس روز بھی نرمین نے فون کر کے نانی کو اپنی آمد کے متعلق بتایا۔

"میں دوپہر تک پہنچ جاؤں گی نانی! معید سے میں نے پوچھ لیا ہے۔ میں دو' تین دن آپ کے پاس ہی رکوں گی۔"

نانی فون سنتے ہی پرجوش ہو گئیں۔ منجھلی بہو کو بریانی پکانے کا آرڈر دیا تو چھوٹی دلہن سے نرگسی کوفتے پکوائے۔ یہ دونوں چیزیں ان کی ننھی بہت شوق سے کھاتی تھی۔

انتظار کرتے کرتے دوپہر سے شام ہو گئی۔ ابتاج ان کا سب سے بڑا پوتا جو بیوی' بچوں کے ساتھ اسلام آباد رہتا تھا' آج کل چھٹیاں گزارنے آیا ہوا تھا۔ نانی کی بے چینی دیکھی تو جیب سے موبائل نکال کر ننھی کا نمبر ملایا۔

"کہاں ہو بھئی؟ ہم سب تمہارا انتظار کرتے رہ گئے۔"

"سوری ابتاج بھائی! میں فون کر کے بتانا بھول گئی۔ میری ساس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں' اس لیے آنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔" ننھی نے شرمندہ ہو کر وضاحت دی۔ ابتاج نے ننھی کا عذر نانی تک پہنچا دیا۔

"اتنے شوق سے میں نے بریانی اور نرگسی کوفتے بنوائے کہ میری بچی آکر کھالے گی' لیکن چلو خیر!" نانی کو اس کے نہ آنے کا سن کر خاصا قلق ہوا تھا۔

"بتا تو رہا ہے ابتاج کہ اس کی ساس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ جب وہ نرمین کا اتنا خیال رکھتی ہیں تو ان کے دکھ تکلیف میں نرمین کو بھی تو ان کے پاس ہونا چاہیے۔"

منجھلی بہو نے چڑ کر جتایا۔ نانی نے محض ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا۔ ابتاج نے دادی کے چہرے پر پھیلی مایوسی دیکھی تو جھٹ پروگرام ترتیب دے ڈالا۔

"آپ بریانی اور کوفتے ڈونگوں میں ڈلوا دیں' میں اور زارا' نرمین کی طرف ہو آتے ہیں۔ اس کی ساس کی عیادت بھی کرلیں گے اور اگر ان کی طبیعت بہتر محسوس ہوئی تو ان کی اجازت سے نرمین کو اپنے ساتھ ایک' دو دن کے لیے لے آئیں گے۔ پرسوں کی ہماری بھی واپسی ہے۔ اچھا ہے' نرمین ہمارے ساتھ بھی کچھ وقت گزار لے' ورنہ اس کی شادی کے بعد اس سے ڈھنگ سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔"

ابتہاج کے کہنے پر نانی خوش ہو گئیں۔ ان کا یہ پوتا ہمیشہ ان کے دل کی بات پا جاتا ہے۔ اپنی ماں کی تیوریوں پر پڑتے بل نظر انداز کرتے ہوئے اس نے ہمیشہ کی طرح نرمین کا بڑا بھائی ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ نانی اور ماموؤں کے بعد نرمین کو اپنے اس کزن سے بہت محبت' اپنائیت اور بڑے بھائیوں والی شفقت ملی تھی۔ اس کی بیوی زارا بھی اچھی ہنس مکھ لڑکی تھی۔

دونوں میاں' بیوی جھٹ پٹ تیار ہو کر بریانی' کوفتے اور ننھی کی پسند کا چاکلیٹ کیک لے کر اس کے سسرال پہنچ گئے۔

☼ ☼ ☼

نرمین انہیں دیکھ کر بے تحاشا خوش ہوئی۔ اس کی ساس نے البتہ بہت سرد مہری سے ان کے سلام کا جواب دیا تھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے آنٹی آپ کی؟" زارا نے خوش اخلاقی سے دریافت کیا۔

"زندہ سلامت ہوں بی بی!" روکھے سے انداز میں ٹیڑھا جواب آیا۔ زارا چپ ہو گئی۔

"آئیں بھابھی! کمرے میں آجائیں۔" نرمین انہیں اپنے بیڈ روم میں ہی لے آئی۔

"کیا بات ہے' تمہاری ساس کا موڈ کچھ آف لگتا ہے؟" ابتہاج نے دھیمے لہجے میں استفسار کیا۔

"بس بی پی بڑھ رہا ہے' اس لیے مزاج میں کچھ چڑچڑاہٹ آرہی ہے۔" نرمین نے رسانیت سے جواب دیا۔

"آپ لوگ ایزی ہو کر بیٹھیں' میں ٹھنڈا پانی لاتی ہوں۔" وہ پھر کمرے سے چلی گئی۔

"مجھے تو نرمین کی ساس بہت بداخلاق خاتون لگیں۔ اپنے گھر میں تو سب کی زبانی تعریف سنی تھی کہ نرمین کی ساس بہت اچھی ہیں۔ بہت خیال رکھتی ہیں اس کا۔" زارا نے شوہر کے سامنے حیرت کا اظہار کیا۔

"وہاں تو سب انہیں ویسا ہی سمجھتے ہیں' جیسا نرمین نے انہیں پیش کیا ہوگا۔ مجھے نرمین سے اس سمجھ داری کی توقع نہ تھی۔ اپنے گھر میں سب لوگوں کی عادت تمہیں پتا ہی ہے۔ خوامخواہ نرمین پر ترس کھاتے اور اس کا تمسخر اڑاتے۔ اپنے گھر کی باتیں گھر میں رکھنا ہی دانش مندی ہے۔" ابتہاج نے بیوی کو مخاطب کیا۔

"کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں' لیکن ہماری نرمین تو بہت چھوٹے دل کی ہے۔ معمولی معمولی باتوں پر گھنٹوں آنسو بہاتی تھی۔ ساس کی بے رخی کا کتنا اثر لیتی ہوگی۔" زارا کو حقیقتاً" افسوس ہو رہا تھا۔

لیکن ابھی ان کی حیرانی اور افسوس کے لیے بہت کچھ باقی تھا۔ ذرا دیر بعد ہی نرمین کی ساس کی پاٹ دار آواز گھر میں گونج رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں تمہاری نانی کی چالاکیوں کو۔ کھانا بھیجنے کا تو بہانہ تھا۔ پوتے اور پوتے کی دلہن کو خاص مقصد پر بھیجا ہے کہ جاؤ بیٹا! جا کر چھاپہ مارو کہ بچی کس حال میں رہ رہی ہے اور اس کی ساس کی طبیعت دیکھ کر آؤ کہ بڑھیا ڈرامے کر رہی ہے یا واقعی طبیعت خراب ہے۔"

"نہیں امی! ایسی کوئی بات نہیں' دراصل ابتہاج بھائی آج کل اسلام آباد سے چھٹیاں گزارنے گھر آئے ہوئے ہیں۔ نانی نے انہیں۔۔۔"

نرمین جانے کیا وضاحت دے رہی تھی' مگر زبیدہ خاتون نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔

"دیکھو بی بی! میکے جانا چاہو تو چلی جاؤ۔ ہمیں بلاوجہ ظالم مشہور کرنے کی ضرورت نہیں۔ میری طرف سے کوئی پابندی نہیں تم پر۔ کیا' کیا ارمان نہیں تھے بہو سے متعلق۔ اللہ نے ایک ہی بیٹا دیا۔ سوچا تھا' بہو ایسی ڈھونڈوں گی جو خدمت گزار ہوگی۔ ماں سمجھ کر عزت دے گی' لیکن بیٹے نے ماں کو بہو ڈھونڈنے کی زحمت سے ہی بچا لیا اور ایسا گوہر نایاب ڈھونڈا جس کو نہ گھر سے دلچسپی ہے' نہ گھرداری سے۔ ہر وقت نانی کے پاس جانے کی جلدی لگی رہتی ہے۔ پیچھے گھر میں مجھ اکیلی بوڑھی جان پر جو مرضی بیت جائے۔ چکرا کر گر پڑوں تو کوئی اٹھانے والا نہ ہو۔ بیٹا تو صبح کا گیا رات کو گھر لوٹتا ہے۔"

زبیدہ خاتون تیز تیز بول کر ہانپ گئی تھیں۔ باتوں میں نہ ربط تھا' نہ صداقت' لیکن کمرے میں بیٹھے ابتہاج اور زارا ساکت رہ گئے تھے۔ باہر صرف زبیدہ بیگم کی آواز ہی گونج رہی تھی۔ شروع میں منمنا کر ذرا سی وضاحت دینے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد نرمین نے چپ سادھ لی تھی۔ ابتہاج بند دروازے کے پیچھے سے بھی چشم تصور سے نرمین کو دیکھ سکتا تھا۔ چپ چاپ کھڑی' لرزتی' کانپتی اور آنسو بہاتی نرمین' جو کسی بھی وقت کھڑے کھڑے لڑھک کر گر بھی سکتی تھی۔ وہ ایسی ہی کمزور اعصاب اور ننھے سے دل کی مالک تھی۔

"ہمیں آنا مہنگا ہی نہ پڑ جائے ابتہاج!" زارا نے شوہر کے کان میں سرگوشی کی اور ابتہاج کا تو خود پریشانی کے مارے برا حال تھا۔ اگر نرمین کی حالت زیادہ ہی غیر ہو گئی تو وہ کیا کریں گے۔ اسے خراب حالت میں ساس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر جانا ابتہاج کی برادرانہ غیرت کے خلاف تھا تو ناراضی کے اظہار کے طور پر اپنے ساتھ لے جانا زیادہ مشکل کا سبب بن سکتا تھا۔ وہاں نانی کی طبیعت بھی زیادہ ٹھیک نہیں تھی۔ وہ یہ صدمہ سہار پائیں گی بھی یا نہیں اور نرمین کے خاوند اور ساس نے اگر پلٹ کر خبر ہی نہ لی تو پھر اس معصوم لڑکی کا کیا مستقبل ہوگا۔ اس پریشانی کے عالم میں بھی ابتہاج جلدی جلدی صورت حال کا تجزیہ کر کے کسی فیصلے پر پہنچنا چاہ رہا تھا۔

"میں باہر جا کر نرمین کو حوصلہ دوں۔ آپ کو پتا ہے نا' اس کا بی پی کتنی جلدی لو ہو جاتا ہے۔ اسے تو کوئی معمولی ٹوک دے' تب وہ رو' رو کر آنکھیں سجا لیتی ہے۔ پوری زندگی میں کسی نے اسے اتنا نہیں سنایا ہوگا۔ جتنا اس کی ساس اسے سنا رہی ہے۔" زارا کی تشویش بے جا نہیں تھی۔

"ہاں۔۔۔ تم باہر جاؤ۔ نرمین کی خیر خبر لو۔"

نرمین کی مکمل خاموشی سے متوحش ہو کر ابتہاج نے بیوی کو باہر جانے کی اجازت دی اور اس سے پہلے زارا سوچ کو عملی جامہ پہناتی' دروازہ کھول کر نرمین اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں ٹرے تھی۔ جس میں تواضع کا سامان تھا۔ زارا اور ابتہاج کا حیرت کے مارے منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"فریج میں کولڈ ڈرنک بھی تھی ابتہاج بھائی! لیکن میں نے آپ کی پسند کا روح افزا بنایا ہے' لیموں نچوڑ کر۔ بس اسی میں ذرا سی دیر لگی۔"

"تم ٹھیک تو ہو نا نرمین؟" ابتہاج کو اس کا تر و تازہ چہرہ دیکھ کر بھی یقین نہ آیا۔

"آپ امی کی باتوں پر پریشان ہو گئے ابتہاج بھائی!" نرمین ہولے سے ہنسی۔

"کتنی بد دماغ اور بد زبان ہیں تمہاری ساس۔ تم نے کبھی گھر میں اس بارے میں ذکر ہی نہیں کیا۔" زارا نے سرگوشی کے انداز میں اسے مخاطب کیا۔

"نانی کو پریشان کرنے کا کیا فائدہ تھا زارا بھابھی! پھر اللہ کا شکر ہے' میں یہاں بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ معید بہت خیال رکھنے والے اور چاہنے والے شوہر ہیں۔ انہوں نے ہی اپنی ماں کی سائیکی سے مجھے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ تین بہنوں کے اکلوتے بھائی ہیں۔ ان کی ماں ان کے لیے خود دلہن ڈھونڈنا چاہتی تھی' جبکہ معید نے مجھے پسند کر لیا۔ شروع شروع میں تو امی کا رویہ میرے ساتھ بہتر تھا۔ معید کو اندازہ تک نہ ہوا کہ وہ پسند کی شادی کرنے پر ان سے خفا ہیں' لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان کی ناپسندیدگی کھل کر سامنے آ گئی۔ میرے لیے معید کا بڑھتا التفات انہیں مزید عدم تحفظ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ حالانکہ معید ماں کی فرماں برداری میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑتے

مجھے بھی سمجھا رکھا ہے کہ جب امی پر ڈپریشن یا خفگی کا دورہ پڑے تو میں چپ سادھ لوں سو اسی طریقے پر عمل کرتی ہوں۔ تھوڑی دیر میں بول کر خود ہی چپ ہو جائیں گی۔ بس پھر میں جا کر ٹھنڈے پانی کا گلاس پیش کردوں گی۔" زمین نے مسکرا کر وضاحت دی تھی۔

"پلیز! آپ نانی کو جا کر کچھ مت بتایے گا' بلاوجہ پریشان ہوں گی۔"

ابتہاج اور زارا حیرت کے مارے گم صم سے کھڑے زمین کا یہ روپ دیکھ رہے تھے۔ جب اس نے انہیں دوبارہ مخاطب کیا۔ دونوں نے بمشکل گردن ہلائی۔ اس کی شخصیت کی یہ کایا پلٹ دونوں کو ابھی ہضم نہ ہوئی تھی۔ اتنا ٹھہراؤ' سکون اور اعتماد' یہ کسی طور نانی کی ننھی سی زمین نہ لگ رہی تھی۔ اتنے میں بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر دھرا زمین کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے پھرتی سے فون اٹھایا۔

"معید کا فون ہے۔" شرمگیں مسکراہٹ زمین کے لبوں پر پھیل گئی۔ اس نے دھیمے سے لہجے میں معید کو سلام کیا۔ جواب میں وہ جانے کیا بولا تھا کہ اس کے گالوں پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔

"اچھا! اب میری بھی تو سنیں۔" اس نے کچھ لمحوں تک اسے خاموشی سے سنا تھا' پھر بات کاٹتے ہوئے اسے ابتہاج اور زارا کی آمد کے بارے میں بتایا۔

معید نے اسے فون ابتہاج کو دینے کا کہا تھا۔ بہت گرمجوشی سے ابتہاج سے سلام دعا کے بعد اس نے ابتہاج کو رکنے کا کہا تھا۔

"میں بس گھنٹے' سوا گھنٹے تک پہنچ جاؤں گا ابتہاج بھائی! پھر ہم ڈنر اکٹھے کریں گے۔"

"ارے نہیں یار! کھانا پھر کبھی سہی۔ ابھی تو بس میں نکل رہا ہوں۔ زارا کو شاپنگ کروانے لے کر جانا ہے۔" ابتہاج نے بہانہ بنایا۔

"چلیں! ٹھیک ہے' پھر میں اور زمین کل آپ کی طرف آجائیں گے۔ کل میرا آفس کا بھی آف ہے۔ ہم ان شاء اللہ دوپہر کے کھانے سے پہلے پہنچ جائیں گے۔ نانی سے کہیے گا' مزے دار سی بریانی پکوا کر رکھیں۔" اس نے بے تکلفی سے فرمائش کی تھی۔

"یار! تمہاری بریانی کے چکر میں ہی ہمیں یہاں آنا پڑا۔ آج زمین نے گھر آنے کا کہا ہوا تھا۔ دادی جان نے پورا اہتمام کروالیا۔ زمین نہیں آئی تو ہم اس کی بریانی اور نرگسی کوفتے لے کر یہاں آگئے۔" ابتہاج نے ہنستے ہوئے جتایا۔

"سوسوری ابتہاج بھائی! واقعی زمین کا آج آنے کا پروگرام تھا۔ میں نے سوچا تھا' صبح آفس جاتے ہوئے اسے نانی کے پاس چھوڑ آؤں گا۔ ایک' دو دن وہاں رہ لے گی' لیکن امی کی طبیعت کچھ ناساز تھی' اس لیے پروگرام ملتوی کرنا پڑا' لیکن یہ میری سستی ہی غلطی ہے کہ انہوں نے فون کرکے آپ لوگوں کو آگاہ نہیں کیا۔ ناحق آپ لوگوں کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔" معید شرمندہ ہو کر وضاحت دینے لگا۔

"چلو ٹھیک ہے یار! کوئی مسئلہ نہیں۔ بس کل کا پروگرام پکا رکھو۔ ہم انتظار کریں گے' تم دونوں کا۔" ابتہاج نے اسے مزید شرمندہ کرنا مناسب نہ جانا۔

"ضرور ابتہاج بھائی!" معید نے یقین دہانی کروا کر کال منقطع کردی تھی۔

ذرا سی دیر زمین کے پاس بیٹھ کر دونوں میاں' بیوی جانے کے لیے اٹھ گئے۔ دونوں نے شکر کیا کہ واپسی پر زمین کی ساس کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس جھگڑالو خاتون کو الوداع کہنے کو دونوں میں سے کسی کا جی نہ چاہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اپنی زمین کتنی بدل گئی ہے نا زارا۔" واپسی کے سفر میں جب گاڑی مین روڈ پر رواں دواں تھی' ابتہاج نے بیوی کو مخاطب کیا۔ وہ خود اتنی دیر سے یہ ہی سوچے جا رہی تھی۔ میاں کی بات سن کر مسکرادی۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ پرانی والی زمین ہے۔"

"سسرال کیسی عجیب جگہ ہے۔ لڑکیوں کی ساری نازک مزاجی رخصت ہو جاتی ہے۔ عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی زندگی کی کٹھنائیوں سے سمجھوتا کرنے کا سلیقہ آجاتا ہے۔"

ابتہاج کی بات درست تھی۔ وہ خود ماں' باپ کی اکلوتی لاڈلی بیٹی۔ بھلے سے زمین کی طرح کمزور دل کی مالک نہ سہی' پھر بھی نازو نعم میں پرورش پانے والی تنک مزاج سی لڑکی تھی۔ شادی کے بعد جو ڈیڑھ' دو سال جوائنٹ فیملی والے سسرال میں رہنا پڑا تو صبر' تحمل اور برداشت جیسے اوصاف خود بخود پیدا ہوگئے۔ وہ تو ابتہاج کی پوسٹنگ اسلام آباد ہوگئی تب زندگی میں آسانیاں پیدا ہوتی چلی گئیں۔ اب تو چار چھ مہینوں میں آنا ہوتا تو یہاں بھی خوب پروٹوکول ملتا۔ زارا کو اپنی شادی کے بعد کے ابتدائی ایام یاد آنے لگے تھے۔ جبکہ ابتہاج' زمین کے بارے میں ہی بات کیے جا رہا تھا۔

"جب تک زمین کو نانی کا سہارا ملا رہا' اس میں خود اعتمادی پنپ نہ سکی۔ جیسے مرغی اپنے چوزوں کو پروں میں چھپا کر رکھتی ہے۔ دادی جان نے بھی زمین کی پرورش کچھ ایسے ہی کی' لیکن دیکھ لو! اب کیسی بااعتماد ہوگئی ہے۔ ہم اس کے بارے میں غلط اندازے ہی لگاتے رہے کہ ایسی ڈرپوک سی لڑکی کہیں اور جا کر رہ ہی نہ پائے گی۔"

"آپ کی بات جزوی طور پر درست ہے ابتہاج! لیکن حقیقت یہ ہے کہ زمین کو جو اعتماد نصیب ہوا ہے' وہ اس کے شوہر کی محبت نے بخشا ہے۔ اگر اسے معید سے محبت اور اپنائیت نہ ملتی تو وہ آج بھی پرانی والی زمین ہوتی۔ بھلے سے اس کی ساس اچھی ہوتی یا خرانٹ۔ اصل بات جیون ساتھی سے ملا ہوا اعتماد اور محبت ہے۔ آپ نے دیکھا معید کا ذکر کرتے ہوئے زمین کی آنکھیں کیسے جگمگانے لگی تھیں۔" زارا نے کہا۔ ابتہاج ہنس پڑا۔

"اتنی باریک بین تم عورتیں ہی ہوتی ہو۔"

"جی جناب! میں خود ایک عورت ہوں' اسی لیے عورت کی نفسیات بہتر طور پر سمجھ سکتی ہوں۔"

وہ اپنی بات پر مصر تھی۔ ابتہاج محض مسکرا دیا۔

دونوں میاں بیوی کے نقطہ نظر ایک دوسرے سے مختلف سہی' مگر دونوں ایک بات پر ضرور متفق تھے۔ نانی کی ننھی اب ننھی نہیں رہی تھی' وہ بڑی ہوگئی تھی۔ عقل مند اور سمجھ دار۔ ابتہاج اور زارا نے صدق دل سے اس کی ازدواجی زندگی کی خوشیوں کے دیرپا ہونے کی دعا کی تھی۔ رہیں نانی تو ان کی دعاؤں نے تو ان کے بعد بھی ننھی کی زندگی کا احاطہ کیے رکھنا تھا۔

☼

ملیحہ صدیقی

عجیب لوگ

بھابھی عاتکہ صوفے پر دونوں ٹانگیں رکھے آرام سے بیٹھی ٹی وی کی طرف متوجہ تھیں۔

سنبل بھی اپنی دو سال کی سوتی ہوئی پنکی کو گود میں لے کر ان کے برابر آرام سے بیٹھ گئی۔ ان دونوں کا ہی پسندیدہ ڈراما ٹی وی پر آرہا تھا۔ کسی اور معاملے میں بنے نہ بنے ان دونوں نند بھاوج کی اس معاملے میں خوب گاڑھی چھنتی تھی اور جب بھی ملنا ہوتا ڈراموں پر خوب زور و شور سے تبصرے ہوتے۔

انعمتہ صوفے کے برابر ہی کارپٹ پر بیٹھی ہوم ورک کررہی تھی۔ ماں کا شوق اس میں بھی منتقل ہوا تھا سو وہ ہر کام ٹی وی کے آگے بیٹھ کر کرنے کو ہی ترجیح دیتی تھی۔

"مجھے تو لگتا ہے بسمہ گھر چھوڑ دے گی۔" عاتکہ بھابھی پر جوش ہو کر پیشن گوئی کررہی تھیں۔

"ہاں! تو ٹھیک ہے نا۔" سنبل چھالیہ چباتے ہوئے بولی۔ "گھر میں کون اس سے سیدھے منہ بات کرتا ہے۔ بس خدمتیں کرتی رہتی ہے۔ ایسے گھر پر تو لعنت بھیجو۔"

وہ تیزی سے پنکی کو تھپکنے لگی جو کسمسا رہی تھی۔ انعمتہ نے ایک لمحہ سر اٹھا کر انہیں دیکھا' پھر تیزی سے کاپی پر دوبارہ پینسل چلانے لگی۔

"اور شادی دیکھو! کس سے کروا رہے ہیں' وہ عینکو سڑیل سے۔" سنبل نے منہ سکیڑا۔ انعمتہ منہ پر ہاتھ رکھ کے "کھی کھی" کرنے لگی۔

"ہاں! وہ اتنی عمر والا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ کاشان کے ساتھ چلی جائے۔" عاتکہ بھابھی نے زور و شور سے کہا۔

"ہاں تو اور کیا۔ ساری عمر کے رونے سے بہتر ہے بندہ ایک بار ہی ہمت کرلے۔" سنبل نے بھی اسے جانے کی اجازت دے ڈالی۔ دونوں کی پوری پوری ہمدردیاں ہیروئن کے ساتھ تھیں' جو آنسو بہاتے ہوئے ڈرامے کا اختتام کررہی تھی۔ اسی لمحے دروازے سے چاندنی بی کی حاضری ہوئی۔ وہ ہانپتی کانپتی ادھر ہی آرہی تھی۔

انعمتہ تو اسے دیکھتے ہی برا سا منہ بنا کر کمرے میں غائب ہوگئی کیونکہ اس نے آتے ہی جھاڑو ہاتھ میں لے کر "بی بی! ادھر بیٹھ جائیں' بی بی! یہاں سے ہٹ جائیں۔" کی صدائیں لگانی شروع کردینی تھیں۔ مگر آج تو وہ آتے ہی پھسکڑا مار کر قالین پر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں چوکنا ہوگئیں کیونکہ میڈم چاندنی بی یہ انداز تب ہی اپناتی تھیں' جب کوئی محلے کی دھماکے دار خبر ان کے پاس ہوتی۔

وہ بیٹھی کچھ دیر تک سانس درست کرتی رہی تب تک ان کے تجسس کو خاصی ہوا مل چکی تھی۔

"کچھ پتا بھی ہے بی بی جی! آج کیا ہوا۔" وہ مزید تجسس پھیلاتے ہوئے بولی۔

"نہیں پتا تب ہی تو تمہارا منہ دیکھ رہے ہیں' اب بول بھی چکو۔" عاتکہ بھابھی دیر ہونے پر تپ گئیں۔

"یہ کونے والے قمر بھائی ہیں ناں! ان کی منجھلی بیٹی عروج گھر سے بھاگ گئی۔" اس نے دھماکے دار انکشاف کیا۔

"کیا؟" ان دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"کب؟" دونوں ہونق ہو گئی تھیں۔ قمر بھائی کا گھرانہ اچھا خاصا شریف تھا۔

"کل رات ... مت پوچھیں گھر والوں کا کیا حال ہے۔" وہ سینہ پیٹتے ہوئے بولی۔

"اچھا۔" ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

قمر بھائی کی سب سے بڑی بیٹی کی شادی کم عمری میں ہوگئی تھی۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد قمر بھائی پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے تو کچھ ہی عرصے میں عروج نے کمانے کی ذمے داری سنبھال لی۔ عمر کے کئی سنہری برس کمانے اور ذمے داریاں سنبھالنے میں ہاتھ سے پھسل گئے' مگر جب قمر بھائی نے چھوٹے بیٹوں کا ناکارہ پن' آخری بیٹی کو فیشن میں گم اور بوڑھی بیوی کو کھانستے دیکھا تو عروج کی طرف سے نظریں چرالیں اور اس کے لیے آئے رشتوں میں عیب نکالنے لگے۔

"توبہ! کیا زمانہ آگیا ہے۔" سنبل کا ہاتھ ابھی تک منہ پر تھا۔

بھابھی عاتکہ نے بھی اظہار رائے کیا۔ "نہ چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال' نہ بوڑھے ماں باپ کی پروا جو بستر سے لگے پڑے ہیں۔"

"ویسے ہوا کیا تھا چاندنی بی!" سنبل کو کھد بد مچی تھی۔

"ارے! ہونا کیا تھا۔ وہیں اس کا دفتر میں کسی سے چکر تھا۔" چاندنی بی آنکھیں نچاتے ہوئے بولی۔

"اچھا! وہ جس کا پچھلے دنوں رشتہ آیا تھا؟" عاتکہ بھابھی کی یادداشت اس معاملے میں غضب کی تھی۔

"ہاں جی! مگر قمر بھائی نے تو صاف انکار کردیا کہ رنڈوے کو بیٹی نہیں بیاہوں گا۔" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔

"ہاں تو دیکھ بھال کے ہی شادی کی جاتی ہے' مگر آج کل کی لڑکیوں کو تو نہ صبر ہے اور نہ شرم وحیا۔ دیکھو! کیسی کالک ملی ہے۔" سنبل کان پکڑتے ہوئے بولی۔

"اس کی ماں بتا رہی تھی' کل رات خوب لڑی تھی کہہ رہی تھی شادی کے بعد بھی جاب کرتی رہے گی وہ رنڈوا بھی مدد کرے گا۔ مگر کون جانتا ہے' بعد کس نے دیکھی ہے۔ باپ بھی اپنی جگہ ٹھیک تھا۔" چاندنی بی اٹھتے ہوئے بولی۔ اسے جلدی جلدی کام کرکے آگے گھروں میں بھی خبر نشر کرکے چٹخارے لینے تھے۔

"ہاں! تو اور کیا' وہ لوگ بھی ٹھیک ہیں۔ بڑی بیٹی دبئی میں ہے' مگر پیسے دینا تو دور کی بات' وہ تو فون بھی سال کے سال کرتی ہے۔" عاتکہ بھابھی کو بھی قمر بھائی ٹھیک لگے۔

"توبہ! مجھے تو ابھی تک حیرت ہو رہی ہے' کیسے بے شرمی سے گھر والوں کو سسکتا چھوڑ کر بھاگ گئی۔ ائے بھابھی! کیسے ملے گا اسے سکون؟" سنبل پنکی کو زور زور سے تھپکتے ہوئے بولی جو کسمسائے جارہی تھی۔

"بس! کچھ لڑکیاں ایسی ہی بے غیرت ہوتی ہیں۔" عاتکہ بھابھی نے حقارت بھرے انداز میں کہا۔

"اللہ سب کی بیٹیوں کو ایسے داغ سے بچائے۔" چاندنی بی میز کے نیچے سے جھاڑو دیتے ہوئے بولی تو دونوں نے بے ساختہ آمین کہا۔

پنکی اٹھ گئی تھی۔ سنبل اسے لے کر صحن کی طرف چل دی اور عاتکہ بھابھی نے کھانا پکانے کے لیے باورچی خانے کا رخ کیا۔ چاندنی بی اب گنگناتے ہوئے کچرا سمیٹ رہی تھی۔

سمیرا حمید

چلو جانے دو

ناولٹ

بڑے ہال نما لاؤنج میں وہ سات افراد آتش دان کے قریب بیٹھے تھے۔ یہ اس گھر کا سب سے بڑا گرم اور آرائشی حصہ تھا۔ آتش دان کے قریب ہی ایک طرف کھانے کی میز، دوسری طرف کاؤچ اور سامنے ٹی وی اور آتش دان کے عین سامنے کارپٹ پر فلور کشن پر آڑے، ترچھے، لیٹے بیٹھے وہ سب گپیں لگا رہے تھے۔

کچھ ہی دیر پہلے معاذ نے لڑکیوں کے نہ نہ کرنے کے باوجود ٹی وی بند کر دیا تھا اس کا خیال تھا کہ اس ماحول کو سائنسی آلات سے دور ہی رکھنا چاہیے۔ شاید وہ وکٹورین سردیاں انجوائے کرنا چاہتا تھا۔ وہ آتش دان کو تقریباً" دس بار تعریفی کلمات سے نواز چکا تھا۔

"معاذ بھائی! جاتے ہوئے آتش دان اپنے ساتھ لے جائیے گا۔" جرار نے بھرپور سنجیدگی سے کہا۔

"ہوں۔ سوچ رہا ہوں کراچی والے گھر میں بنوا ہی لوں۔" معاذ جرار سے زیادہ سنجیدہ تھا۔

"اسے جلائیں گے کب؟" نمل حیران ہوئی۔

"جب موسم بدلے گا۔"

"موسم کب بدلے گا۔"

"ایک انگلش اخبار کے مطابق دنیا کے موسم خطرناک حد تک تبدیلی کا شکار ہیں اور تیزی سے بدل رہے ہیں۔ اس رپورٹ کو پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ کسی بھی دن موسم تیزی سے بدل سکتا ہے اور کراچی میں برف باری ہو سکتی ہے۔"

"آپ سنجیدہ ہیں؟" حرا حیران ہوئی۔

"بالکل۔" ان کے چہرے کے تاثرات بھی سنجیدہ ہی تھے۔ "چاہو تو وہ اخبار پڑھ لو۔"

"یہ ایک دیوانے کا سا سنجیدہ پن ہے۔ حرا!" شائل گفتگو میں شریک ہوا۔

"شٹ اپ!" معاذ کو نجانے کیوں غصہ آیا۔ "دیکھ لینا ایسا ہی ہوگا۔"

"ہم زندہ ہوں گے نا تب!" شائل نے ہاتھ میں مونگ پھلیوں کو مسل کر معاذ کے منہ کے قریب لا کر پھونک ماری اور جھٹ سے منہ کھول کر ساری منہ میں ڈال لی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک ماہ پہلے معاذ کا دوست یہاں سے ہو کر گیا تھا۔ سبز پہاڑوں کے برف پوش پہاڑوں میں ڈھلنے کے قصے اس نے ایسے اور اتنے مزے لے لے کر سنائے کہ معاذ سے رہا نہ گیا۔ لاہور سے خالہ زاد شائل اور عفان کو ماموں زاد جرار' حرا اور نمل کو اور پنڈی سے مدیحہ کو جو اس کی سب سے چھوٹی خالہ کی پندرہ سالہ بیٹی تھی اپنے ساتھ ملا لیا۔

"سوچو یار! کتنے پاگل نہیں ہم' میں چھبیس سال کا ہونے والا ہوں اور اب یہاں آرہا ہوں۔"

"لیکن میں صرف اٹھارہ سال کا ہوں۔ میں آپ سے کم پاگل ہوں۔" جرار نے دانت نکالے۔ جب سے وہ مری آیا تھا یا اس کے دانت بج رہے تھے یا نکل رہے تھے۔

"تمہیں لایا کون ہے یہاں' تمہارے ابا نے تو پورے دو گھنٹے کا لیکچر دیا تھا کہ جنوری میں مت جاؤ۔"

"ابا لوگوں کا یہی کام ہوتا ہے۔ چھوڑیے انہیں' میرا جائیں۔ کیا میں نے کچھ کہا؟ اف کی؟"

"تم نے کیوں اف کرنا تھا' جیب تو میری خالی ہو رہی ہے۔"

"تو اکیلے آجاتے۔ یہ احسان وحسان مت جتائیں پلیز' اٹھارہ سال کے بچے کی جیب میں کتنے پیسے ہوں گے بھلا؟"

"اٹھارہ سال کے بچے کی جیب میں آئی فون ہو سکتا ہے' خرچ کرنے کے لیے پیسے نہیں۔"

"میں فری میں نہیں آئی' رہائش میری طرف سے ہے۔" مدیحہ نے پستہ نکال کر چھلکا جرار کی طرف پھینکا۔

"واہ مدیحہ! کیا گپ ماری ہے' ماحول کو گرما دیا ہے۔ شائل اور عفان! ذرا کھڑکیاں تو کھول دو۔"

"کیوں۔ کیوں؟" مدیحہ چڑ گئی۔

"پہلے تمہارے پاپا کو لمبی تمہید کے بعد میں نے یہ بات یاد دلائی کہ ان کے بھائی اور تمہارے چچا کا ایک عدد گھر ہے نیو مری میں' جسے تمہارے چچا ریسٹ ہاؤس کہتے پھرتے تھے۔ ایک لمبی "ہوں" کے بعد جس میں ناگواری شامل تھی' تمہارے پاپا کو یہ ریسٹ ہاؤس یاد آیا اور تمہارے چچا جو عشاء کے بعد موبائل آف کر دیتے ہیں' بمشکل تمام ان کے گھر کے چار افراد سے رابطہ کر کے ان کا موبائل آن کروایا۔"

"تو آپ ان چاروں میں سے کسی ایک کو کہتے نا کہ چچا جان سے بات کروا دیں۔" جرار' مدیحہ کے چچا سے متعلق گفتگو ہمیشہ بہت انجوائے کرتا تھا۔

"ان چاروں میں سے کوئی بھی اپنا موبائل اپنے پاپا کو ضرورتاً" بھی دینے کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔" معاذ نے ایک آنکھ دبا کر جرار کو وضاحت دی۔

"مل تو گیا نا فری میں ریسٹ ہاؤس۔" مدیحہ اترا کر بولی۔

"ہاں مل گیا' ایک لمبی ہدایات' ضروریات' احتیاطات' امکانات' تمکنات" جرار نے رک کر سانس لیا۔ "اور فضولیات کی لسٹ سننے کے بعد۔"

مدیحہ کے علاوہ سب دل کھول کر ہنسے۔ جرار بلاوجہ دیر تک ہنستا رہا۔

☆ ☆ ☆

ریسٹ ہاؤس قدرے نشیب میں تھا۔ پہلے ایک ڈھلان پتلی سڑک' پھر چار بڑی اور کھلی سیڑھیاں' پھر کچا پکا راستہ' پھر چھ عدد سیڑھیاں' پھر کچا پکا راستہ اور کنارے پر مزید دس قدم سیڑھیاں اتر کر تین کمروں کا نیلی چھت والا ریسٹ ہاؤس' اوپر سڑک سے تو ریسٹ ہاؤس نظر بھی نہیں آتا تھا۔ گاڑی پارک کر کے اپنا سامان باہر نکال کر سب سے پہلے جرار نے سڑک سے گھر کی طرف جانے والے راستے پر موجود برف پر اپنا پہلا قدم رکھا' جیسے چاند پر نیل نے رکھا ہو گا۔ یہ ان سب کا پہلا مشترکہ ٹور تھا کسی بھی پہاڑی اور برفانی علاقے میں۔

آس پاس بکھری برف کو ان سب نے بے یقینی سے دیکھا۔

"پینڈو۔" نمل زیر لب بڑبڑائی۔ کون سا راستہ اور کیسی سیڑھیاں' ریسٹ ہاؤس تک کا سارا راستہ برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ گرتے پڑتے معاذ اندر سے جبار کو بلا کر لایا جو اپنے ساتھ کدال اور ایک پتلا ڈنڈا لیتا آیا۔ کدال سے اس نے سیڑھیوں کو سیڑھیوں کی شکل دینے کی کوشش کی۔ برف بری طرح جم چکی تھی۔ بمشکل دو قدم کی ایک لمبی لائن وہ سڑک سے گھر تک بنا سکا۔

لڑکے گرتے پڑتے سامان شفٹ کرنے لگے۔ لڑکیاں لانگ شوز اور لانگ کوٹ سنبھالتی جبار کا سہارا لیے باری باری گھر تک جانے لگیں اور جاتے جاتے تین چار بار مزے سے پھسلیں۔

"فلموں میں تو ہیروئن مزے سے ڈانس کرتی رہتی ہے برف پر' ہم کیوں بار بار پھسل رہے ہیں۔" نمل نے گر کے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ پاکستان کی برف ہے شاید اس لیے اور وہ یورپ کی ہوتی ہے۔" حرا نے ہمیشہ کی طرح زیادہ پڑھے لکھے ہونے کا ثبوت دیا۔

"ایک تو ہر اچھی چیز یورپ میں ہی ہے۔" نمل قدم جما جما کر چل رہی تھی۔

ہر بار ان کے پھسل جانے پر جبار مضحکہ خیز انداز سے ہنسنے لگتا۔ وہ گھر کا کل وقتی ملازم تھا۔ رات کو اس کے خراٹے سن کر شائل اور نمل یہ سمجھے کہ شیر باہر کھڑا دھاڑ رہا ہے۔ اس کی ہنسی اور خراٹے ایک جیسا ہی ردھم رکھتے تھے۔ برف پر ایسے چلتا تھا' جیسے بندر کی طرح چھلانگیں لگا رہا ہو۔ معاذ کے نزدیک وہ ایک برفانی بدروح تھی' جو خاص برفانی علاقوں میں ہی پائی جا سکتی ہے۔

"پتا ہی نہیں چلا ایک ہفتہ گزر گیا۔" عفان کم بولتا اور سب سے زیادہ مزے کرتا تھا۔ ہفتہ گزر جانے کا دکھ اسے ہی زیادہ تھا۔ معاذ' جرار اور شائل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ آتش دان میں ہی گھس کے بیٹھ جائیں۔

"کراچی کے رہائشی تو باؤلے ہی ہو جاتے ہیں یہاں آکر۔" مدیحہ نے معاذ سے اپنا بدلہ لیا۔

"پنڈی کے رہائشیوں کو یہ موقع بھی نہیں ملتا۔ پندرہ سال ہو گئے تمہیں پنڈی میں رہتے اور برف کے گولے بنا بنا کر ایسے اچھال رہی تھیں جیسے ہر سیزن یہاں آتی ہو۔" معاذ بھی چپ نہیں رہا۔

"پڑھنے لکھنے والے بچے گھومنے پھرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔" وہ ادا سے بولی۔

"یہاں تم سی ایس ایس کی تیاری کرنے آئی ہو نا اس بار؟"

"واپسی کب ہے؟" حرا کے سوال پر عفان نے اسے کچھ زیادہ ہی غصے سے گھور کر دیکھا۔

"خبردار جو کسی نے واپسی کا نام لیا۔" معاذ نے انگلی اٹھا کر سب کی طرف باقاعدہ لہرا کر کہا تاکہ سب دیکھ لیں اچھی طرح۔

"گھروں سے فون آئے تو کہو آواز نہیں آرہی۔ زیادہ آئے تو فون بند کر دو۔ بند فون بھی بجنے لگے تو فون اٹھا کر باہر پھینک دو۔ یہاں میں تمہیں کھلا رہا ہوں' گھما رہا ہوں' وہ سب خود تو کبھی تمہیں یہاں لائے نہیں۔ اب بچے خود آگئے ہیں تو برداشت نہیں ہو رہا۔"

"پھر بھی کب تک؟" شائل جو کافی دیر سے مونگ پھلی نکال نکال کر جمع کر رہا تھا' ایک ساتھ ہی ساری منہ میں ڈال کر پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

"کسی کو کوئی پرابلم ہے یہاں رہنے میں؟ نہیں نا؟ آرام سے رہو' صبح اٹھو' باہر نکلو' برف پر پھسلو' گولے بناؤ' شیر ہاتھی اونٹ بناؤ' آئس کینڈی کھاؤ' ادھر ادھر گم ہو جاؤ اور رات کو اس پیارے سے آتش دان کے پاس آکر بیٹھ جاؤ اور گپیں لگاؤ بعد میں دیکھیں گے کب جانا ہے واپس۔ میں نے تو موبائل آف کر دیا ہے دو دن سے۔ مجھے نہیں چاہیے سکون میں خلل۔"

"خلل سے آپ کا مطلب گرل فرینڈ تو نہیں؟" جرار نے سنجیدگی سے پوچھا۔ معاذ نے صرف گھورنے پر اکتفا کیا۔

"لگتا ہے کوہ قاف میں آگئے ہیں۔"

"کوہ قاف میں برف ہوتی ہے۔" حرا کا سائنسی

سوال۔

"نہیں۔۔۔ جن اور پریاں ہوتی ہیں۔" شمائل گفتگو میں شریک ہوا۔

"پاپا نے صرف چند دنوں کے لیے اجازت دی تھی۔" حرا پھر سے پریشان ہوگئی۔

"پاپا کا فون آئے تو کہہ دینا۔ برف کا تودہ گرنے کی وجہ سے راستے بند ہیں۔ ہم ریسٹ ہاؤس میں قید ہیں۔ راستے کھلتے ہی آجائیں گے۔" معاذ نے مکمل سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

"میں پاپا سے جھوٹ نہیں بولتی۔"

"جو جو جھوٹ نہیں بولتا' وہ اپنا سامان تیار کرلے۔ صبح گھر والوں سے جاکر سچ بول دینا۔ انتظام کردوں گا تم سب کے جانے کا۔" معاذ نے چڑ کر کہا۔

"یہاں برف کے تودے گرتے ہیں؟" مدیحہ پریشان ہوگئی۔

"برف ہے تو یقیناً" گرتے ہی ہوں گے۔ جبار سے پوچھ لیتے ہیں۔" معاذ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"رہنے دیں پلیز' اس طرح ہنستا ہے جیسے ہمارا مذاق اڑا رہا ہو۔"

"وہ مذاق نہیں اڑاتا نمل! وہ بس ہر بات کو انجوائے کرتا ہے۔" معاذ نے جبار کا دفاع کیا۔

"یہ جو چھت پر اتنی ساری برف گری ہے' اگر چھت گر گئی تو۔۔۔؟ میرا دوست بتا رہا تھا کہ اس کی نانی کے گھر ایبٹ آباد ہر سال کسی نہ کسی کی چھت گرجاتی ہے برف کی وجہ سے۔" جبار نے آنکھیں گھما گھما کر بتایا۔

"اچھا۔۔۔!" معاذ سوچنے لگا۔ "یہ گھر تو دو منزلہ ہے اگر چھت گری تو اوپر والی منزل کی گرے گی۔ معاذ نے سب کو تسلی دی۔ "اور یہ ہر موقع پر تمہارے اور تمہارے دوست کے پاس کوئی نہ کوئی بری کہانی ہی ہوتی ہے سنانے کے لیے؟ اتنے سارے دوست ہیں کہ ہر جگہ کسی نہ کسی کی نانی' دادی موجود ہے کہانیاں سنانے کے لیے۔"

☆ ☆ ☆

رات کا کھانا کھانے سے پہلے وہ سب باہر کا ایک اور چکر لگا آئے تھے۔ نیو مری' کشمیر پوائنٹ' مال روڈ پر وہ ایک بار جاکر بار بار جارہے تھے۔ سب کچھ ان کے لیے نیا تھا اور وہ سب بھرپور انجوائے کررہے تھے۔ وہ ہر بار نئی سے نئی چیز دریافت کرلیتے۔ برف سے ڈھکے چھوٹے بڑے گھر' دھند میں لپٹے پہاڑ اور درختوں اور برف سے ڈھکے رہائشی گھر۔ پتلی گول سڑکیں' کبھی نیچے تو کبھی اوپر' ایکدم سیدھی اور اچانک سے تنگ اور پتلی۔

اس دن وہ سب دریائے نیلم گئے۔ دوپہر کا کھانا وہیں کھایا اور رات کا کھانا کھانے سرشام ہی مین مال پر آگئے۔ جرار اور معاذ کا مشترکہ خیال تھا کہ مال روڈ سے بہتر جگہ تفریح کے لیے کوئی اور نہیں۔

"السلام علیکم لالا جی!" جرار نے دور سے ہی ہاتھ سر تک لے جاکر ہانک لگائی۔

"پورے پاگل لگتے ہو۔" مدیحہ کو اس کی یہ حرکت بری لگتی تھی۔

"سلام کرنا پاگل پن ہے؟" وہ حیران ہوا۔

"مسخرے لگتے ہو پورے دیکھو! وہ خان صاحب بھی ہنس رہے ہیں۔"

"ہاں تو! میں آیا ہی دنیا میں دوسروں کو خوش کرنے کے لیے ہوں۔"

موسم ابر آلود تھا ایسا لگ رہا تھا" ہر چیز دھواں چھوڑ رہی ہے ایک ایک' دو دو کمروں پر مشتمل ہوٹلوں کے باہر کاؤنٹرز پر پکتے کھانوں میں خاص کر تکے' کبابوں اور سجی کی خوشبوئیں بہت دلفریب محسوس ہورہی تھیں۔ ابر آلود گہری شام کی دھندلاتی روشنیاں اور بے فکر لوگوں کی بے فکر چہل قدمی اس شام کا حسن تھی۔

معاذ نے سب کو بڑی بڑی' آئس کینڈی لے کر دی۔

"واہ!" کینڈی کھاتے کھاتے ہر دو منٹ بعد معاذ کے منہ سے نکلتا' مال پر چلتے چلتے لوگوں کا رش انتہا تک بڑھ گیا' ہوٹلوں کے ایجنٹ ہر نئے آنے والے کے پیچھے بھاگتے ہاتھ پکڑ کر اس طرف گھسیٹتے بھی۔۔۔

...رہے تھے اس موسم میں پاگل ہی نکلتے ہیں۔" معاذ نے حرا اور مدیحہ کو مخاطب کیا۔ "یہ ہزاروں پاگل ہیں کیا؟"

"یہ ہزاروں لوگ نہیں' ان کے ابا۔" شمائل نے اپنا فرض سمجھا اس بات کا جواب دینا۔

"شٹ اپ!" مدیحہ سے پہلے حرا چلائی۔

زیادہ تر لڑکے لڑکیوں کے گروپس تھے۔ اس موسم میں بوڑھے تو خیر کیا نکلتے۔ کپلز کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ زیادہ تر کا تعلق مری' پنڈی' اسلام آباد' اور قریب کے ہی دوسرے علاقوں سے تھا۔ ایلیٹ کلاس زیادہ نظر آرہی تھی۔ لڑکوں کا ایک گروپ ان ٹرالیوں کو' جو وہاں آنے والوں کو سامان' بچوں یا ضعیف افراد کو کرائے پر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں' غلط استعمال کررہے تھے۔ ایک بیٹھتا ایک گھسیٹتا' پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ مال پر یہی تماشا کررہے تھے۔ ساتھ بے ہودہ "ہو ہو ہاہا" الگ سے' چلنے پھرنے والے بری طرح بے زار تھے ان کے اس بے ڈھنگے شوق سے۔۔۔

مال سے زیر زمین مارکیٹ کی ایک دکان سے چپلی کباب اور دوسری دکان سے کڑاہی کھا کر وہ شاپنگ کے ارادے سے ادھر ادھر دکانوں کا جائزہ لینے لگے۔

معاذ پہلے ہی کہہ چکا تھا' جو فارغ ہوتا جائے گاڑی کے پاس آتا جائے۔ گاڑی وہاں سے کافی دور پارک تھی۔ معاذ جہاں تک سہولت سے ڈرائیونگ کرسکتا تھا' وہ وہاں تک کرکے گاڑی پارک کردیتا تھا۔ ان گول گول بل کھاتی سڑکوں پر وہ گاڑی نہیں چلا سکتا تھا۔

حرا ایک دکان میں کافی دیر سے کرتے دیکھ رہی تھی۔ وہ فیصلہ نہیں کرپارہی تھی کہ کرتا لے یا جیولری۔ وہ چاہتی تھی اپنی دوست کے لیے ایک جیسی ہی چیزیں لے لے۔ باہر برف باری شروع ہوچکی تھی۔ شام کا اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ مال پر افراتفری سی شروع ہوگئی تھی۔ حرا نے سر باہر نکال کر دیکھا۔ پہلی برف باری انہوں نے ریسٹ ہاؤس میں دیکھی تھی اور دل کھول کر مزا کیا تھا' اس نے جلدی سے اپنا بیگ چیک کیا' اس کے پاس پیسے کم تھے۔ کچھ دیر پہلے نمل اس کے ساتھ ہی اس دکان پر مختلف چیزیں چیک کررہی تھی۔ اب وہ غائب تھی۔ باہر نکل کر اس نے ایک دو دکانوں میں جھانک کر مدیحہ کو دیکھا مگر نہ وہاں مدیحہ تھی نہ ہی کوئی اور۔ گروپ کی صورت تو انہوں نے پہلے بھی کبھی شاپنگ نہیں کی تھی۔ کوئی کہیں ہوتا' کوئی کہیں۔

"بیٹا! آپ مال کے ہی کسی ہوٹل میں رہائش پذیر ہو؟" وہ کرتوں والی دکان پر واپس آئی کہ ایک دو ہی خرید لے' جب کام کرتے بزرگوار نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔" اس نے سر نفی میں ہلایا۔ سال پر برف باری کا ہلا گلا انتہا کو پہنچ چکا تھا۔

"اسلام آباد سے آئی ہو تو جلدی نکل جاؤ۔ برف باری میں سڑک پر پھسلن کی وجہ سے روڈ بند ہوجاتے ہیں اور۔۔۔"

اسلام آباد کے لیے نفی میں سر ہلاتی اگلی بات سنتے ہی وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکی۔ باہر بھی افراتفری کا ہی عالم تھا۔ اس کا فون بھی بج رہا تھا لیکن تیزی سے قدم جما جما کر چلتے ہوئے وہ بیگ میں سے فون نہیں نکال سکتی تھی۔ مال پر گاڑیوں کی لمبی لائن اسے نظر آگئی۔ گاڑیوں کے ہارن' لوگوں کا شور' اچانک ہی منظر کچھ کا کچھ ہوگیا۔ گاڑیوں کے درمیان سے وہ بمشکل آگے بڑھنے لگی۔

"کہاں ہو۔ جلدی آؤ۔" مسلسل بجتے فون کو اس نے ایک جگہ رک کر سنا۔

"آرہی ہوں۔" کہہ کر وہ تیزی سے چلنے کی کوشش کرنے لگی۔

مال کی مین سڑک اس نے عبور کرلی تھی۔ اب بل کھاتی گول نیو مری کی طرف جانے والی سڑک جس کے ایک طرف پہاڑ تھا' درمیان میں چھوٹی سی سڑک اور دوسری طرف کھائیاں اور سڑک کے انتہائی کنارے پر برف تھی' وہ چلتی کہاں برف کے اوپر۔۔۔ جیسے تیسے کرکے وہ کنارے کنارے چلنے لگی۔ گاڑیوں میں بیٹھے لوگ اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے' چلنے

والوں میں سے وہ اکیلی ہی لڑکی تھی جو جلدی میں بھی تھی بوکھلائی ہوئی بھی اور پریشان بھی۔

"جلدی آؤ حرا!" معاذ کی چوتھی بار کال آئی۔ "سب آچکے ہیں۔ ایک تم ہی نہیں آئیں۔ کہاں ہو تم؟ فوجی ہمیں یہاں سے جلدی نکلنے کے لیے کہہ رہے ہیں وہ راستہ کلیئر کروا رہے ہیں۔ میں گاڑی آگے لے کر جا رہا ہوں۔ تم ذرا تیز تیز چلو۔"

وہ تیز کہاں سے چلتی، دوبار پھسل چکی تھی۔ گاڑیاں آگے پیچھے پھنسی کھڑی تھیں۔ لگتا تھا اب ہر شخص کو جانے کی جلدی ہے۔ ہلکی ہلکی برف باری جاری تھی۔ رکی ہوئی ٹریفک میں کبھی کبھی برائے نام حرکت پیدا ہو جاتی۔ شاید راستہ آگے سے جام تھا، پھر ان میں تھوڑی سی زیادہ حرکت نظر آنے لگی اور گاڑیاں آگے پیچھے تیزی سے حرکت کرنے لگیں۔ اب تو وہ سڑک پر پاؤں بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔ ناچار وہ برف کے ڈھیر پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اور وہ پھر تھوڑا بہت جتنا راستہ مل رہا تھا چلنے لگی۔ عجیب مشکل تھی۔ بیگ میں رکھا فون بار بار بج رہا تھا۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ ضرور الجھ کر پیچھے جا گرے گی۔ گو وہ ایسی خطرناک کھائیاں نہیں تھیں، پھر بھی گرنے کا خوف الگ تھا۔

اچانک ایک زوردار دھماکا سا ہوا اور وہ خوف سے بری طرح گر پڑی۔ برف کے ڈھیر میں شاید کوئی ٹھوس چیز دبی ہوئی تھی، جو اس کی کمر پر بری طرح لگی۔ اٹھ کر سنبھلنے پر درد کی ایک تیز لہر اس کی کمر میں اٹھی۔ دھماکے کی آواز سے اوسان الگ خطا تھے۔ گاڑیوں میں سے لوگ نکل نکل کر سامنے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"حرا! تم ٹھیک ہو؟" معاذ کی گھبرائی ہوئی آواز اسے فون پر سنائی دی۔ وہ رونے لگی اور وہ گھبرا گیا۔ "دو گاڑیاں الٹ گئی ہیں۔"

"کیا؟" وہ درد بھول کر چلائی۔

"ہاں... تم تو حادثے والی جگہ کے پاس نہیں ہو نا، کہاں ہو تم۔"

"مجھے نہیں معلوم، میں برف پر بیٹھی ہوں۔ میں گر بھی گئی۔ کمر میں درد ہے بہت۔ آگے جانے کا راستہ نہیں ہے۔ آپ کہاں ہیں؟"

"لگتا ہے تم اس جگہ سے کافی دور ہو۔ جہاں گاڑیاں الٹی ہیں۔ تم وہیں بیٹھی رہو۔ میں کچھ کرتا ہوں، میں نے باقی سب کو ریسٹ ہاؤس بھیج دیا ہے۔ میں اکیلا یہاں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

وہیں بیٹھے بیٹھے اسے کافی دیر ہو گئی۔ افراتفری میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ریسکیو ٹیم آچکی تھی۔ وہ لوگ مستعدی سے ادھر ادھر مصروف ہو گئے۔ وہ لوگوں کو گاڑیوں میں پرسکون بیٹھنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ پیدل اور گاڑیوں دونوں کے لیے آگے جانا ناممکن تھا۔

"میڈم! آپ ٹھیک ہیں؟" ایک فوجی اس کے پاس آیا۔

"نہیں۔" اس نے رونی صورت لیے کہا۔ "میں گر گئی ہوں اور مجھے وہاں جانا ہے۔" اس نے ہاتھ سے بلاک سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ "میری فیملی وہاں ہے اور میں یہاں اکیلی ہوں۔"

فوجی نے اس کے ہاتھ کے اشارے کی طرف دیکھا۔ "وہاں دو گاڑیاں الٹ چکی ہیں۔ جب تک کرین نہیں آتی، سڑک کلیئر نہیں ہو گی۔"

"کب آئے گی کرین؟" اسے لگا یہی کوئی پندرہ بیس منٹ تک آجائے گی۔

"کل تک شاید ہی یہ سڑک کلیئر ہو۔"

"کل تک..." وہ چلائی۔ جلدی سے معاذ کو فون کیا ساری صورتحال بتائی۔ معاذ الٹا خود پریشان ہو گیا۔

فوجی لوگوں کو گاڑیوں میں سے نکلنے کا کہہ رہے تھے۔ لوگ گاڑیوں میں ہیٹر آن کیے بیٹھے تھے۔ پیٹرول ختم ہوتے ہی ہیٹر بند ہو جاتے اور ان کی گاڑیاں بنا پیٹرول کے وہیں بند کھڑی رہتیں۔ وہ بار بار انہیں یہی سمجھا رہے تھے، گاڑیوں میں لاک رہنے سے ان پر غنودگی طاری ہونے کا خطرہ تھا۔ ہیٹر بند ہوتے ہی نیند میں ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ خاص کر چھوٹے

بچوں کے ساتھ۔ لوگ گاڑیاں لاک کر کے مال روڈ کے ہوٹلز کی طرف بھاگے۔ حسب معمول مال کے ہوٹلز ایسے ہی کسی واقعے کے انتظار میں تھے۔ انہوں نے موقع دیکھتے ہی کرائے پانچ چھ گنا بڑھا دیے۔ وہ ٹوٹے پھوٹے کمرے جن کے کرائے سردیوں میں چار پانچ سو سے زیادہ نہیں ہوتے تھے اب سات، آٹھ ہزار ہو گئے تھے۔ لوکل ویگنوں اور ٹیکسیوں میں بیٹھے لوگ زیادہ پریشان تھے۔

"بیٹا! آپ ٹھیک ہیں؟" وہ سردی سے کانپ رہی تھی اور کمر کا درد الگ۔

"نہیں..." اس نے صاف کہا۔ اس کے ہونٹ نیلے ہو گئے تھے اور رونے سے آنکھیں سرخ۔

"ادھر آئیں میرے ساتھ۔" وہ ان کے پیچھے پیچھے چلتی ایک فوجی جیپ تک آئی۔

"یہاں بیٹھیے..." وہاں تین چار خواتین پہلے سے ہی موجود تھیں اور گرم دودھ پی رہی تھیں۔ ایک کپ حرا کو بھی دیا۔

"آپ کا نام کیا ہے بیٹا؟"

"حرا!" اس کی آواز بری طرح کانپ رہی تھی۔

"حرا بیٹا! پریشان مت ہوں۔ میں ڈاکٹر خاور ہوں۔"

"میری کمر میں درد ہے میں گر گئی تھی۔"

"اوہ... ٹھنڈ کی وجہ سے زیادہ درد محسوس ہو رہا ہو گا۔ میں آپ کو پین کلر نہیں دے سکتا، جب تک اچھی طرح سے چیک اپ نہ ہو جائے۔ آپ کی فیملی..."

اس نے سر سے بلاک سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ "میں یہاں اکیلی ہوں... اس طرف... ہیں وہ لوگ..."

وہ سمجھ گئے۔ "پریشان مت ہو بیٹا! ایک تو بچے آپ لوگ کسی کی بات نہیں سنتے۔ کب سے الرٹ دے رہے تھے کہ اس موسم میں گھروں میں رہیں۔"

"میں لاہور سے آئی ہوں۔"

"بیٹا! رات تک تو یہ راستہ کلیئر نہیں ہو گا۔ آپ اکیلی ہو۔ ہوٹل بھی نہیں جا سکتیں۔ میرا گھر یہاں سے کچھ دور ہے۔ یہ پانچ لوگ میرے ساتھ جا رہے ہیں۔ آپ بھی چلیں۔ یہاں مجھے سب جانتے ہیں۔ قریب ہی میرا اسپتال ہے۔ آپ اپنی فیملی سے پوچھ لیں۔"

اس کا تو تھوڑا بہت چلتا دماغ بھی ماؤف ہو چکا تھا اگر معاذ وغیرہ کچھ نہ کر سکے تو وہ کیا کرے گی۔ اس نے معاذ کو فون کیا۔ ساری صورت حال بتائی، پھر معاذ کی ڈاکٹر خاور سے بات کروائی۔

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ ان کے ساتھ۔" معاذ نے پانچ منٹ اسے ہولڈ کروانے کے بعد کہا۔ "میں نے یہاں کھڑے فوجیوں سے ان کے بارے میں پوچھا ہے۔ سب جانتے ہیں انہیں، وہ قابل اطمینان ہیں۔ تم جاؤ ان کے ساتھ، میرا تمہارے پاس آنا ناممکن ہے۔"

"میں انہیں ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔" ڈاکٹر خاور نے ان پانچ افراد کی طرف اشارہ کر کے ایک فوجی افسر کو بتایا۔

کافی دیر چلتے رہنے کے بعد ڈاکٹر خاور کے گھر پہنچے۔ کھانا کھلا کر ان کی ملازمہ جنت، حرا اور ایک دوسری عورت کو ایک کمرے میں لے آئی۔ باقی لوگ ہال میں لگے بستر پر پہلے ہی ڈھیر ہو چکے تھے۔ بیڈ پر گرتے ہی وہ سو گئی۔ اس کی کمر بہت دکھ رہی تھی۔ گرمائش ملتے ہی درد کم ہونے لگا۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اٹھ کر واش روم تک ہی چلی جاتی۔

☼ ☼ ☼

وہ اتنی گہری نیند سوئی جیسے اپنے بیڈ روم میں ہو۔ اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ فریش ہونے کے بعد وہ کمرے سے باہر آئی۔ گھر میں بہت سے افراد کی موجودگی کے آثار نظر آ رہے تھے وہ کچن میں آگئی۔

گھر بہت بڑا کھلا اور کشادہ تھا، آتش دان، بہت بڑا اور قدیم طرز کا تھا۔ لاؤنج کے ایک طرف کچن اور دوسری طرف ہال نما کشادہ کمرا تھا۔ ہال کے ساتھ ہی آگے پیچھے دو کمرے بنے تھے جن میں سے ایک میں وہ سوئی

تھی۔

"یہ لیں آپ ناشتا کریں۔" اس کے کچن میں آتے ہی جنت نے ٹرے ٹیبل پر رکھی۔ سنکے ہوئے توس، آملیٹ اور جام تھا۔

"چائے پیو گی یا کافی؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ سارا کچن الٹا پلٹا تھا۔ استعمال شدہ برتنوں کا ایک ڈھیر جمع تھا۔ جنت تیزی سے کام سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جنت کی شکل سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ بہت تھک چکی ہے۔

"میں ناشتا کر کے مدد کرواتی ہوں۔" اس نے پیشکش کی۔

"شکریہ بی بی!" وہ ساتھ والی ایک کرسی پر ڈھے گئی۔ "پچیس لوگوں کو ناشتا کروایا ہے۔"

"اور لوگ آئے تھے رات؟" وہ حیران ہوئی۔

"لڑکے تھے کافی سارے۔ ناشتا کر کے چلے گئے۔ لاؤنج میں سوئے تھے رات کو۔"

"راستہ کھل گیا؟" حرا خوش ہوئی۔

"نہیں ابھی نہیں، باہر نکل کر تو دیکھیں! کتنی برف باری ہوئی ہے۔"

"اچھا...!"

مقامی لوگ جتنا کر سکتے ہیں کرتے ہیں۔ سڑک کے اوپر پہاڑی پر میری بہن کا گھر ہے۔ کچھ لوگ وہاں اس کے گھر میں بھی ہیں۔ پچھلی بار ایک نومولود ٹھنڈ سے مر گیا تھا۔ ہمیں بہت دکھ ہوا۔"

"اوہ!" حرا کو دکھ ہوا۔

جنت سانس لینے کے بعد پھر سے کچن سمیٹنے لگی۔ حرا نے بھی اٹھ کر اس کی مدد کروائی۔ اپنے گھر میں اس نے کبھی بیڈ کور تک ٹھیک نہیں کیا تھا لیکن جنت کو دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ دوسروں کے لیے بے لوث خدمت کرنا کتنا اہم ہے۔ حرا اس سے متاثر ہوئی تھی۔ جنت کے ساتھ ہی مل کر اس نے سارا گھر صاف کیا۔ رات کو اس کے ساتھ آنے والی عورتیں ہال میں موجود تھیں ہال باقی گھر کی نسبت زیادہ گرم تھا۔

دوپہر کا کھانا حرا نے جنت کے ساتھ مل کر بنوایا بھی اور سب کو کھلایا بھی۔

"بی بی! میں سونے لگی ہوں، بہت تھک گئی ہوں۔ آپ بھی سو جائیں۔"

"میں بی بی نہیں ہوں۔ میرا نام حرا ہے۔" حرا نے نرمی سے کہا۔

"اچھا حرا بی بی! چاہے تو ہال میں آجائیں یا اسی کمرے میں چلی جائیں۔"

وہ اس کے یوں حرا بی بی کہنے پر مسکرانے لگی۔

نمل، معاذ وغیرہ سے تفصیلی بات کرنے کے بعد وہ فریش ہو گئی۔ کمر کا درد بھی ٹھیک تھا۔ کمرے کا بیرونی دروازہ کھول کر وہ گھر کے پچھلی طرف آگئی۔ بہار میں یقیناً یہ گھر کے لان کا خوبصورت منظر پیش کرتا ہو گا۔ برف سے ڈھکا لان بہت بڑا تھا۔

باہر کا منظر دیکھ کر حرا نے ایک لمبی سانس لی۔ برف پر قدم جما جما کر چلنے کے باوجود وہ دو بار پھسل چکی تھی۔ جتنے دنوں سے وہ یہاں تھے۔ وہ سب سے زیادہ پھسلی تھی۔ پہلے تو سب اسے اٹھا بھی لیتے تھے، پھر اس کے گرنے پر ہنستے ہوئے آگے بڑھ جاتے تھے۔

تیسری بار وہ پھسلی تو دس فٹ تک پھسلتی ہی چلی گئی۔ وہ اوپر سے نیچے کی طرف جا رہی تھی۔ خود کو پھسلنے سے روکنے کے لیے اس نے برف کو گرفت میں لینے کی کوشش کی مگر ناکام رہی اور دھڑام سے ایک گڑھے میں جا گری۔ اتنے تکلیف دہ انداز میں گرنے پر اس کی اچھی خاصی چیخ نکل گئی۔ اس کا سانس بری طرح سے اکھڑا ہوا تھا۔ گر کر سنبھلتے ہی اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ برف سے بھرنے کے بعد گڑھا آٹھ فٹ گہرا تھا۔ اچھل کر اس نے گڑھے سے باہر دیکھنا چاہا مگر ناکام، کنارے کو پکڑ کر اوپر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی وہ بھی ناکام۔ اس کی گرفت کناروں پر موجود برف پر جم ہی نہیں رہی تھی۔

ایک بار وہ گڑھے سے تقریباً آدھی اوپر آچکی تھی کہ پھر نیچے...

اسی لمحے اس نے کچھ فاصلے پر کسی کو دیکھا... شاید نظر کا دھوکا تھا، پوری طرح دیکھنے سے پہلے ہی وہ دھڑام سے نیچے شاید دھند میں لپٹی کوئی چیز تھی۔ وہ دعا مانگنے لگی کہ وہ جنت ہی ہو۔

"جنت... جنت...!"

لیکن جنت نہیں آئی۔ پانچویں کوشش میں وہ پھر آدھی باہر نکل آئی۔ اس بار دو عدد پاؤں اس کے باہر نکلتے ہاتھوں سے ٹھیک تین فٹ کے فاصلے پر کھڑے نظر آئے۔ اس کے آدھا باہر نکلتے ہی وہ دو فٹ اور دور ہو گئے کہ مبادا وہ انہیں ہی نہ پکڑ لے۔ جب وہ دوبارہ واپس گری تو اسے شدید غصہ آیا... اس پر جو باہر تھا لیکن اس کی مدد نہیں کر رہا تھا۔

"کوئی ہے...؟" وہ چلائی "کون ہے باہر... ہیلپ... ہیلپ۔"

وہ ایک ایک لفظ کو کھینچ کھینچ کر چلانے لگی۔ اس بار اس نے اوپر چڑھنے کی کوشش بھی ترک کر دی کیونکہ اس کا اس طرح باہر نکلنا ناممکن تھا۔

"آخر تمہیں کتنی اور ہیلپ چاہیے؟"

گڑھے کے کنارے ایک دم وہ لمبا تڑنگا شخص بھاپ اڑاتا مگ تھامے نمودار ہوا۔ اس کے انداز میں تمسخر تھا اور اس سے پہلے شاید وہ ہنستا بھی رہا تھا۔

حرا کی نظریں اس پر ٹک گئیں۔

"بتاؤ اور کتنی مدد چاہیے؟" وہ کنارے پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا جیسے سیف الملوک میں مچھلی تلاش کر رہا ہو۔ اس نے مگ سے گھونٹ بھرا۔

"تم شہری لوگ خود کو سمجھتے کیا ہو؟ نام کروز یا جیٹ لی؟ بہت پسند کرتے ہو ایڈونچر؟"

حرا کو شہری لوگ پر حیرت ہوئی "تو کیا مری گاؤں ہے۔"

"چلو پھر نکلو یہاں سے۔ ٹام کروز بن کر لگاؤ چھلانگ اور ثابت کر دو خود کو۔ پچیسویں کوشش میں بھی تم یہاں سے نکل آئیں تو میں چائے پینا چھوڑ دوں گا... چلو شاباش کرو کوشش۔" وہ اسے پچکارنے لگا اور ساتھ ہی اٹھ کر دو قدم پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"شٹ اپ!" حرا اتنا ہی برداشت کر سکتی تھی بس۔

"شٹ اپ؟" اس نے حیرانی لیے اس کے ہی انداز میں اس کے الفاظ دہرائے اور ایسے ہی کنارے پر آکر بیٹھ گیا جیسے اپنی ہنسی اور حیرت دبا رہا ہو۔

"میں نے تمہیں گرایا ہے؟ میں نے کہا تھا گھر سے اس خراب موسم میں نکلو اور یہاں گھومنے چلی آؤ۔ نیوز چینل الرٹ دے دے کر تھک چکے ہیں لیکن شاید تمہیں اس برفانی موسم میں برفانی ریچھ کی طرح گشت کرنے کا جنون ہے یا شو... شو... کرتے قلابازیاں لگاتے پہاڑوں پر چھلانگیں لگانے کا شوق پورا کرنے آئی ہو۔ وہاں سے نکال کر پایا تمہیں یہاں لائے مگر وہی تمہاری جیٹ لی ٹائپ کی روح تمہیں پھر گھر سے باہر لے آئی اور تم اس گڑھے میں آگریں۔ دو بار پھسل کر سنبھلیں مگر پھر بھی واک کرنے سے باز نہیں آئیں۔ جب برف پر چل نہیں سکتیں تو چلتی کیوں ہو۔ اگر میں تمہیں کھڑکی سے نہ دیکھ رہا ہوتا تو تم یہیں پڑے پڑے ٹھنڈ سے اکڑ جاتیں اور تمہاری اکڑی ہوئی لاش ـــ ہی تمہارے گھر جاتی اور تمہاری وہ جنت... ہیلپ... ہیلپ کی آوازیں یہاں سے پندرہ فٹ سے آگے سنائی نہیں دے رہیں اور گھر چالیس فٹ کے فاصلے پر ہے اور جنت اس سے بھی بہت زیادہ فاصلے پر... تم شہری لوگ... کبھی برف نہیں دیکھی...؟ برف دیکھتے ہی ایسے پاگل ہو جاتے ہو جیسے انگلش موویز میں بھیڑیے چاند کے نکلتے ہی ہو جاتے ہیں۔"

حرا اسے ہی دیکھ رہی تھی اور اسے دیکھ ہی سکتی تھی۔

"نکلو اب..." وہ بد تمیز اب بھی چپ نہیں ہوا تھا۔ ساتھ ساتھ چائے کے گھونٹ بھی لے رہا تھا۔

"اچھا... اگر میرے سامنے نہیں نکل سکتیں تو میں چلا جاتا ہوں۔" اور وہ کہتے ہی چلا بھی گیا۔ ایک بار پھر حرا نے بمشکل سر نکال کر باہر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا وہ واقعی میں جا چکا تھا۔

"بد تمیز!" حرا ایسی سے کھڑی کچھ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

"یہ لو چارلیز انجلز..." اس نے لکڑی کے ایک

جوڑے تختے کو گڑھے میں نیچے سے اوپر کی طرف آڑھا رکھا۔ ”اس پر سے چل کر اوپر آجاؤ۔“

وہ اس کے جانے کا انتظار کرنے لگی کہ وہ جائے تو وہ اوپر آئے۔ اس کے سامنے وہ باہر نہیں آنا چاہتی تھی مگر وہ مزے سے وہیں کھڑا رہا ناچار ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے بلی کی طرح چلتی وہ باہر آگئی۔

”یہ تختہ میں یہیں رہنے دیتا ہوں۔ ہو سکتا ہے تمہارا دوبارہ اس طرف آنے کا ارادہ ہو۔“

وہ اس کے آگے آگے چلتا ہوا مسلسل بول رہا تھا۔ حرا کا دل چاہ رہا تھا اسے اس گڑھے میں دھکا دے دے۔۔۔ وہ اس کے پیچھے چل رہی تھی اور چلتے چلتے وہ دوبارہ گری۔۔۔

اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔ ”بہت خوب۔۔۔ کمال کا کرتی ہو۔ پھر گر کر دکھاؤ۔۔۔“ ہاتھ سینے پر باندھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

وہ ہاتھ جھاڑتی اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اس کی شکل بتا رہی تھی کہ وہ بمشکل ضبط کر رہی ہے اور سامنے والے کی شکل بتا رہی تھی کہ وہ اس کے ضبط سے خوب محظوظ ہو رہا ہے۔

”بہت ذہین ہو۔“ وہ اسے سر سے لے کر نیچے تک دیکھ کر بولا۔

”بہت اچھی میچنگ کی ہے شوز کی ڈریس کے ساتھ لیکن شاید تمہیں کسی نے یہ نہیں بتایا کہ برف پر چلنے کے لیے شوز کو اوپر سے نہیں' نیچے سے دیکھا جاتا ہے۔ تمہارے شوز پھسلنے کے لیے بیسٹ ہیں۔ ان فیکٹ ان سے بہتر شوز دنیا میں اور ہو ہی نہیں سکتے۔ سو کیپ سلپنگ۔“

کہہ کر وہ آگے چلنے لگا۔

اس بار وہ زیادہ احتیاط سے قدم جما کر چلنے لگی۔ اس وقت وہ اپنے سب سے بہترین سوٹ میں ملبوس تھی۔ سیاہ ڈبل ہائی نیک گھیرے نیلے' ٹاپ نمائی شرٹ اور ہم رنگ گھٹنوں تک لانگ کوٹ' سیاہ اسکارف گرہ کی صورت گردن کے گرد لپٹا ہوا تھا اور جن لانگ شوز پر اس نے اتنی تنقید کی تھی۔ وہ لانگ شوز ایمرجنسی میں رات ایک بڑے اسٹور سے لائی تھی۔ برفانی علاقے وزٹ کرنے کے لیے یہ اس کی من پسند ڈریسنگ تھی۔

اس کی قسمت خراب کہ چلتے چلتے وہ ایک بار پھر پھسل گئی۔

اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستا رہا جیسے سالوں بعد موقع ملا ہو۔

”بہت خوب۔۔۔ بہت خوب۔۔۔!“

غصے اور خفت سے وہ وہیں بیٹھی رہی۔ اس نے اس کے سامنے اٹھ کر چلنے کی کوشش ہی ترک کر دی اور اس کے وہاں سے چلے جانے کا انتظار کرنے لگی۔

”کیا انداز ہے شہری لوگوں کا۔۔۔“ بلند بانگ خود کلامی کرتے وہ واقعی چلا ہی گیا۔

ایک بار مزید گرنے کے بعد وہ بھی اندر آ ہی گئی۔ کچن میں سے اس کے اور جنت کے ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ خفت اور شرمندگی سے اس کا برا حال تھا۔ اتنے لمبے تڑنگے انسان کے سامنے اس کی اتنی بے عزتی ہو گئی تھی۔

کچھ ہی دیر میں جنت اس کے لیے چائے سے بھرا مگ اور دو ابلے انڈے لے آئی۔ جنت کی آنکھیں ابھی بھی مسکرا رہی تھیں۔

”حرا بی بی! اپنا موڈ خراب مت کیجیے۔ مہران بھائی ایسے ہی ہیں۔ میں بھی گر جاتی تو ایسے ہی کرتے۔ رات بھر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کام بھی کرواتے رہے ہیں اور باتیں بھی سناتے رہے ہیں سب کو۔ لڑکوں کا جو گروپ رات یہاں رہا' ان کے ساتھ تو انہوں نے حد ہی کر دی۔ کہہ رہے تھے کہ اس خراب موسم میں اگر وہ گھر سے نہ نکلتے تو اتنے شاندار حادثے کا شکار کیسے ہوتے۔“

جنت کافی دیر تک بولتی رہی لیکن اس نے نہیں سنا۔ اسے شدید غصہ تھا۔

”بدتمیز۔۔۔ جاہل!“ حرا غصے سے بڑبڑائی۔ جب وہ جنت کے ساتھ مل کر گھر صاف کر رہی تھی تب تک کوئی گھر میں موجود نہیں تھا۔ شاید یہ مہران نامی بلا کچھ دیر پہلے ہی گھر آئی تھی۔

[illegible] میں اپنے ہاتھوں پر لگاؤں۔“ حرا نے دونوں ہاتھ جنت کے سامنے کر کے کہا۔

”اوہ!“ وہ ہاتھوں کو دیکھ کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ جنت کے ساتھ کمرے میں بیٹھی باتیں کرتی رہی پھر جنت کچن میں چلی گئی۔ نمل سے فون پر بات کرنے کے بعد وہ بھی کچن میں آگئی۔ اسے دھڑکا ہی لگا ہوا تھا کہ وہ پھر نہ آجائے۔ اس شخص کے سامنے اس کی عجیب و غریب درگت بنی تھی۔

جتنا ہو سکا وہ جنت کے ساتھ کام کرواتی رہی۔ رات جو خواتین آئی تھیں۔ انہیں جنت کھانا اور دوا دے چکی تھی۔ ان میں سے ایک کو نمونیا ہو چکا تھا۔ ایک ویسے ہی بہت بیمار ہو گئی تھی۔ بار بار قے کر رہی تھی۔

بمشکل سات بجے تھے۔ کام کروا کر وہ واپس کمرے میں آگئی۔ ایک دو میگزین رکھے تھے' اٹھا کر پڑھنے لگی' پڑھنا کیا تھا عجیب سے میگزین تھے نہ فیشن سے متعلق نہ شوبز سے۔ بیڈ کی سائیڈ پر پین رکھا تھا' اٹھا کر وہ اپنا پسندیدہ کام کرنے لگی۔ وہ اپنے ہاتھ لگنے والے ہر اخبار' میگزین' تصویر' کتاب پر ناک' کان' مونچھیں' داڑھی' ٹوپی' گول گول دائروں والی بڑی عینک بنا دیا کرتی تھی۔ میگزین میں موجود ماڈلز کو چارلی کی طرح لمبا ٹیل والا کوٹ اور لڑکوں کو سینڈریلا فراک پہنا دیا کرتی تھی۔ بنائے گئے کرداروں کے نام اور ان سے متعلق جملے بھی لکھا کرتی تھی۔ کافی دیر تک وہ میگزین کے ساتھ مصروف رہی۔

”ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں کہ آپ کو برا نہ لگے تو کھانا ان کے ساتھ کھالیں۔“

”میں آرہی ہوں۔“

☼ ☼ ☼

سلام کر کے وہ ڈائننگ ٹیبل پر ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ باہر برف باری ہو رہی تھی آتش دان روشن تھا۔ مٹر پلاؤ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ گرم اور روشن ماحول بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”فیملی کیسی ہے حرا آپ کی؟“ چاولوں کی ٹرے اس کے سامنے کر کے وہ پوچھنے لگے۔

”وہ سب ٹھیک ہیں۔“ حرا ان کے بارے میں بتانے لگی۔

”حادثے والی جگہ تو کلیئر ہو چکی ہے لیکن برف باری کی وجہ سے اس طرف سفر خطرناک ہو سکتا ہے خاص کر نتھو مری کی طرف۔ صبح تک کوشش کر کے میں آپ کو بھجوا دوں گا مگر آپ یہاں اطمینان سے رہیں۔ میری وائف سردیاں شروع ہوتے ہی اسلام آباد بیٹی کی طرف چلی جاتی ہے۔ وہ زیادہ ٹھنڈ پسند نہیں کرتی۔ ہم چار لوگ ہی یہاں ہوتے ہیں اس موسم میں۔ آپ کو یہاں کوئی مسئلہ تو نہیں۔“

”نہیں۔۔۔“ اس نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔ ”میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں۔ جو کچھ آپ نے میرے لیے کیا۔“

شکر گزار ہونے کی ضرورت نہیں بیٹا! یہ میرا فرض تھا۔ جنت نے مجھے بتایا تو مجھے اچھا نہیں لگا۔ مہران بس ایسا ہی ہے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ ہماری مہمان ہو۔“

”اٹس او کے۔“ ڈاکٹر صاحب شرمندہ شرمندہ سے اسے اچھے نہیں لگے۔

”مذاق کرتا ہے بس وہ۔۔۔ سنجیدہ نہیں ہوتا۔“ وہ اس کا دفاع کر رہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی کہ صبح تو اس نے یہاں سے چلے ہی جانا ہے پھر کیوں نہ وہ مسٹر مہران صاحب کا حساب برابر کرتی جائے۔

”آپ اتنے شفیق ہیں اور ان کا رویہ۔۔۔ برتاؤ۔۔۔“ وہ جان بوجھ کر خاموش ہو گئی۔ ادھوری بات زیادہ پر اثر ہوتی ہے۔

کھانا کھاتے یکدم ان کے ہاتھ رک گئے۔

”اتنی بدتمیزی سے وہ میرا مذاق اڑاتے رہے۔ بلند بانگ قہقہے لگاتے رہے۔ گھر آئے بے بس مہمان کے ساتھ کوئی ایسا کرتا ہے۔“ وہ بھول گئی تھی کہ وہ گھر آیا مہمان نہیں۔ گھر لائی گئی پناہ گزین ہے۔

"ٹھیک کہا حرا! یہی بات میں اسے سمجھا تا ہوں۔"

"اس گڑھے سے اوپر آنے کے لیے مجھے دستانے اتارنے پڑے اور ٹھنڈی برف نے میرے ہاتھ سن کر دیے اور خون رسنے لگا۔"

"اوہ!" ڈاکٹر صاحب نے کھانا چھوڑ کر اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ "مجھے دکھاؤ۔"

اس نے ہاتھ سامنے کیے۔ "جنت سے دوا لے کر میں نے لگائی تھی مگر درد۔۔۔" پھر بات ادھوری۔

باقی الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے جہاں وہ بیٹھی تھی وہاں سے دائیں طرف سیدھی روش میں کچن تھا اور کچن ٹیبل پر کھانا سامنے رکھے وہ اسے نظر آگیا۔ وہ یکسوئی سے حرا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

حرا گھبرا گئی۔ "میں شرمندہ ہوں بیٹا!"

"نہیں۔۔۔" نہیں، میں تو بس ایسے ہی۔۔۔ اٹس اوکے۔"

جلدی جلدی پلیٹ صاف کر کے وہ کمرے میں آگئی۔ کھانا ابھی اس نے اور کھانا تھا لیکن۔۔۔

"کیا ضرورت تھی ان سے یہ سب کہنے کی، ان کے بیٹے کی شکایت۔"

کچھ ہی دیر بعد جنت ٹرے لیے آگئی۔ "حرا بی بی! کھانا کھالیں آپ نے ٹھیک طرح سے نہیں کھایا کھانا۔"

"نہیں! میں کھا چکی ہوں۔" اس نے مروتاً کہا ورنہ مٹر پلاؤ تو اس نے ابھی شروع ہی کیا تھا۔

"میں رکھ جاتی ہوں جب دل چاہے کھا لیجیے گا۔" وہ رکی۔ "مہران بھائی کہہ رہے تھے بھوکے پیٹ سونے سے رات کو برے برے خواب آتے ہیں۔"

حرا بری طرح چونکی۔ کھانا مہران نے بھجوایا تھا۔ غصہ ایک طرف۔ کھانا اس نے پیٹ بھر کر کھایا، معاذ کو فون کیا باری باری سب سے بات کی۔

"حرا۔۔۔!" معاذ بھائی کی الجھن بھری آواز سنائی دی۔ "تمہیں یاد ہے مدیحہ کے چچا نے جو ایک گھنٹے کا لیکچر دیا تھا اس ریسٹ ہاؤس کے بارے میں۔"

"نہیں۔۔۔ مجھے نہیں یاد۔۔۔ اور کیوں یاد رکھتی۔"

"ہم سب نے بھی یہی کہا کیوں یاد رکھتے۔۔۔ وہ سب ناممکنات، ہدایات، ضروریات، امکانات، احتیاطات، ممکنات اور فضولیات بھول گئے۔ کل رات جبار اپنے گھر جانے کا کہہ کر گیا اور ابھی تک نہیں آیا۔ ہم سب گھر کے اندر دبکے پڑے رہے، برف ہٹانے کے لیے ہمیں تو پورے گھر میں کوئی چیز نہیں ملی۔ معلوم نہیں جبار کب آئے گا۔"

"تو۔۔۔" حرا گھبرا گئی۔

"ہم تو خود یہاں قید ہیں۔"

"اوہ۔۔۔ برف باری تو ابھی بھی ہو رہی ہے وقفے وقفے سے۔ رات تک تو مزید ڈھیر بن جائے گا۔ آپ نے جانے ہی کیوں دیا جبار کو۔۔۔"

"کہہ رہا تھا گیا اور آیا۔۔۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ گیا اور آیا کے درمیان وہ اتنا لمبا وقفہ دے گا۔ اس کے آتے ہی میں کچھ بھی کر کے تمہیں لینے آجاؤں گا۔ تم ڈاکٹر صاحب سے میری بات کرواؤ۔"

"وہ تو شاید جا چکے ہیں اسپتال واپس، میں صبح ان سے بات کروا دوں گی۔ اچھا تو نہیں لگتا نا اس طرح کسی کے گھر رہنا۔"

"اچھا تو نہیں لگتا لیکن۔۔۔" وہ چپ ہو گیا۔ "یقین کرو اس سب میں میرا ذاتی کوئی قصور نہیں پھر سوچو جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہی ہوتا ہے۔"

حرا کو ہنسی آگئی۔ اس نے مہران سے متعلق کوئی بات نہیں بتائی۔

ٹرے کچن میں لا کر وہ برتن دھونے لگی۔ جنت سو چکی تھی۔ گھر میں سناٹا تھا جیسے یہاں کوئی نہیں رہتا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ برف باری میں باہر نکلے اور کسی خان کے ہوٹل سے قہوہ پیے۔ معاذ کے ساتھ وہ نکل بھی جاتی مگر یہاں سے کیسے جاتی، لاؤنج میں بنی قد آدم کھڑکیوں سے وہ باہر دیر تک دیکھتی رہی۔ گھر کے اندر اور باہر دونوں طرف کا منظر انتہائی دلفریب تھا۔

وہ کچن کی طرف آنے کے لیے کمرے سے باہر نکلی، کمرے سے آگے راہداری کی طرف وہ جیسے ہی مڑی چھناکے سے فرش پر کچھ گرا۔ یہ وہی مگ تھا جو آج دن میں مہران کے ہاتھ میں تھا فرش پر چائے ٹوٹے مگ سمیت پھیل گئی۔

"یہ کیا کیا تم نے؟" وہ غصے سے چلایا۔

حرا مگ کے گرنے اور اس کے چلانے پر سہم گئی۔

"سوری" ۔وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکی جبکہ اس سب میں اس کی قطعاً کوئی غلطی نہیں تھی۔

"سوری"۔۔۔ اس نے اس کے لفظ جیسے چبائے۔ جینز جیکٹ اور گردن کے گرد مفلر لپیٹے، سر پر پٹھانوں والی مخصوص ٹوپی لیے وہ اسے اور ٹوٹے مگ کو دیکھ رہا تھا۔

"میں ابھی بنا دیتی ہوں، میں شرمندہ ہوں، انجانے میں۔۔۔"

"کیسے بناؤ گی؟"۔۔۔ وہی چبانے والا انداز۔

"میں بنا لیتی ہوں چائے" وہ سمجھی شاید وہ سمجھتا ہے کہ اسے چائے بنانی نہیں آتی "مجھے آتی ہے چائے بنانی۔"

"بناؤ گی کس سے"۔۔۔ وہی انداز۔

"پانی۔۔۔ دودھ۔۔۔ اور"

"دودھ نہیں ہے۔۔۔ اب۔۔۔؟"

وہ پریشان ہو گئی۔

"اتنی ٹھنڈ میں، میں گھر سے اتنی دور گیا، ہوٹل والے کے پاس سارا دودھ ختم ہو چکا تھا۔ صرف یہ آدھا مگ دودھ ہی مجھے مل سکا۔ میرے سر میں درد ہو رہا تھا۔ ان فیکٹ درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ رات کے اس پہر میں اٹھا اور سوچا چائے ہی پی لوں شاید فرق پڑ جائے درد میں۔" وہ باقاعدہ اداکاری کر رہا تھا۔ "لیکن میں ایسا کیسے کر سکتا تھا۔۔۔ میں نے ایسا سوچا بھی کیسے۔۔۔ جبکہ تم یہاں موجود ہو۔۔۔"

عام حالات ہوتے تو حرا تالیاں بجاتی اور کہتی "بہت اچھا ہوا" مگر اب

"ایم سوری۔۔۔"

"مجھے سوری نہیں، چائے چاہیے؟"

"آپ کافی پی لیں۔۔۔"

"میں کافی نہیں پیتا۔۔۔"

"خشک دودھ ہے تو میں اس کی۔۔۔"

"ڈرائے ملک، بیک ملک، فریش ملک، سب ملک ختم ہو گئے ہیں آج۔"

وہ اسی پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا۔

وہ اس کی طرف بے بسی سے دیکھنے لگی۔ اس کی قسمت خراب جو وہ اس وقت کمرے سے باہر آئی۔

"تمہیں اپنے کمرے میں چین نہیں تھا؟"

"وہ حرا سے ایسے مخاطب ہوتا تھا جیسے دونوں کی بچپن سے خونی دشمنی چلی آرہی ہو۔

وہ حرا سے پانچ چھ سال بڑا ہو گا، معاذ جیسا لمبا اور ورزشی جسم۔۔۔ چند دنوں کی بڑھی ہوئی داڑھی اور نکھری ہوئی سانولی رنگت وہ خوبصورت نہیں بے حد پرکشش، سوبر اور ڈیسنٹ لگتا تھا وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کی بارعب شخصیت کی وجہ سے ان کے سامنے بولا ہی نہیں جاتا۔۔۔

"میں نے سوری کیا تو ہے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز رندھ گئی۔

"کیا کروں میں اس سوری کا۔"

"اپنے سر پر ماریں۔۔۔" اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔ برداشت کی حد تک ختم ہو گئی، اخلاق ایک طرف۔۔۔ ضبط دوسری طرف اور "انہوں نے میری مدد کی ہے" تیسری طرف رکھ کر وہ بولی۔

"اپنی خوشی سے یہاں نہیں آئی، بدقسمتی سے آئی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم اس علاقے اور یہاں کے رہنے والوں کے بارے میں، مجھے یہ بھی معلوم نہیں کیسے شوز پہن کر برف پر چلا جاتا ہے۔ اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہاں میں آپ کی چائے سے ٹکرا جاؤں گی، سارا دودھ بھی ختم ہو جائے گا۔ معلوم ہوتا تو چائے سے ٹکرانے کے بجائے میں اس گڑھے میں گرنا پسند کرتی اور اپنی اکڑی ہوئی لاش کی صورت گھر جانا پسند کرتی۔"

وہ سانس لینے کے لیے رکی۔

وہ زمین سے مگ کے ٹکڑے اٹھا کر سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"جاہل... گنوار... پاگل..." زیر لب دو تین گالیاں دے کر وہ کمرے میں آگئی۔

☼ ☼ ☼

صبح ناشتے کی ٹیبل پر اسے ڈاکٹر صاحب مل گئے۔ اس بار اس نے ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کی غلطی نہیں کی۔ معاذ نے ان سے بات کی۔ ڈاکٹر صاحب ہنسنے لگے۔

"بیٹا! آپ پریشان نہ ہو"۔ وہ حرا سے مخاطب تھے۔ "آپ اطمینان سے رہو۔ راستہ کلیئر ہو تب جانا۔ ہم پر آپ کی مہمان نوازی بار نہیں..."

جنت کے ساتھ مل کر پھر حرا نے جتنا ہو سکتا تھا کام کروایا۔ ایک بار باہر جانے کے بعد وہ دوبارہ باہر نہیں گئی...

"حرا بی بی سبزیاں کاٹ دیں گی آپ؟"

"ہاں کیوں نہیں۔" حرا آلو چھیلنے لگی۔

"ڈاکٹر صاحب نے چھ لوگوں کا کھانا منگوایا ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں اکبر آجائے گا کھانا لینے۔ روٹی کے لیے آٹا کم ہے۔ سوچا، جتنی دیر میں، میں آٹا لاؤں گی آپ سبزیاں بنا کر پکا دیں گی لیکن میری واپسی تک تو آپ آدھی سبزی بھی نہیں بنا سکیں گی، آپ بازار تک جا سکتی ہیں؟"

"ہاں! کیوں نہیں... کہاں ہے بازار...؟"

"سیدھے ہاتھ والی سڑک سیدھی جاتی ہے کچھ دور ہی دکانیں ہیں وہاں سے مل جائے گا۔"

جنت جلدی جلدی اسے باقی ضروری چیزیں بھی بتانے لگی۔

"اپنے شوز دے دو مجھے۔" حرا نے جنت کے شوز پہن لیے۔ سڑک پر بہت پھسلن تھی لیکن وہ آرام سے چل رہی تھی۔ جوتوں کا فرق اسے معلوم ہو گیا تھا۔ تیزی سے چلنے کے بعد اسے آدھے گھنٹے بعد دکانیں نظر آئیں۔

"یہ کچھ دور ہے؟" اس نے جنت سے تصور میں کہا۔

اس نے سارا سامان لیا، واپس جاتے ہوئے اس کے لیے چلنا مشکل ہو گیا۔ آتے ہوئے ڈھلان تھی اب چڑھائی تھی۔ وہ بھی سامان کے ساتھ، تین عدد وزنی شاپرز اٹھانا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا... کچھ دور چلنے کے بعد سامان سڑک پر ہی چھوڑ کر وہ واپس دکان کی طرف گئی۔

"ٹرالی ہے؟" اس سوال پر دکان دار اس کی شکل دیکھنے لگا۔ ناچار وہ پھر واپس گئی اور شاپرز اٹھائے "آخر جنت بھی تو سودا لے کر جاتی ہی نا تو پھر میں کیوں نہیں۔ اس نے ہمت سے کام لیا۔

وہ دس منٹ چلتی، شاپرز نیچے رکھتی، سانس لیتی اور پھر اٹھا کر چلنے لگی۔

"ہم شہری لوگ..." خود ہی کہہ کر وہ ہنسنے لگی... کیا سوچتی ہو گی جنت مجھے کچھ آتا ہی نہیں ہے۔

پھولے ہوئے سانس کے ساتھ وہ ساتھ ساتھ بولتی بھی جا رہی تھی، ایک کار تیزی سے اس کے قریب سے گزر کر رکی، اس کا خیال تھا ڈاکٹر صاحب یا جنت کا شوہر ہو گا لیکن وہاں مہران صاحب تھے، اس نے بیٹھے بیٹھے ہی پیچھے کا دروازہ کھولا، حرا نے جلدی جلدی سامان اندر رکھا اور دروازہ بند کر دیا اور اپنا اسکارف ٹھیک کرتی آگے بڑھ گئی، وہ بھی زن سے کار آگے بڑھا لے گیا۔

"بدتمیز! ایک بار بھی نہیں کہا کہ بیٹھ جاؤ۔"

غصہ ترک کر کے اس نے آس پاس غور کیا، بہت دلکش سڑک تھی۔ دور دور سے چھوٹے چھوٹے گھر نظر آ رہے تھے۔ وہ فرصت سے آرام آرام سے چلنے لگی۔ کبھی کسی درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو جاتی۔ دن روشن نہیں تھا۔ دھند میں لپٹا ہوا تھا، برف کے ایک ڈھیر کے پاس رک کر وہ برفانی ریچھ بنانے کی کوشش کرنے لگی، کافی دیر تک بناتے رہنے کے بعد بھی جب برف نے ریچھ کی شکل اختیار نہیں کی تو وہ اسے ویسا ہی چھوڑ کر گھر کی طرف آگئی۔

کچن پر نظر پڑتے ہی وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ جنت جلدی جلدی روٹیاں بنا رہی تھی اور مہران انہیں

سینک رہا تھا۔ اسے بے انتہا شرمندگی ہوئی۔ اسے جلدی آنا چاہیے تھا تاکہ وہ جنت کے ساتھ کام کروا سکے، شرمندہ شرمندہ سی وہ کمرے میں آگئی۔

کچھ ہی دیر بعد جنت آگئی۔

"حرا بی بی آجائیں۔ میں نے ہال میں دستر خوان لگا دیا ہے"۔

شرمندہ سی وہ آ کر ان سب کے ساتھ کھانا کھانے لگی اگر جنت بغیر کسی غرض کے سب کی اتنی خدمت کر سکتی ہے تو وہ کیوں نہیں۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ جنت کے مقابلے میں کس قدر چھوٹی ہے۔

جنت کے "نہ نہ" کرنے کے باوجود اس نے سب کچھ سمیٹا، برتن دھوئے اور کچن صاف کیا...

شام ہونے سے پہلے ہی تینوں عورتیں اور مرد چلے گئے۔ شام کو وہ ڈرتے ڈرتے باہر گئی لیکن پھر کمرے میں واپس آ کر ایف ایم سننے لگی۔ جنت کمرے میں آئی اور کمرے میں رکھے میگزین اٹھا کر لے گئی۔ دس منٹ بعد ہی وہ انہیں لیے واپس آئی۔

"حرا بی بی! یہ سب آپ نے کیا ہے؟" جنت نے دو تین صفحے اس کے سامنے الٹ پلٹ کر پوچھا... وہ جواب کیا دیتی۔ اس کی شکل پر چھائی شرمندگی بتا رہی تھی کہ یہ سب اس نے ہی کیا ہے۔ جنت میگزین واپس لے گئی۔ پانچ منٹ بعد دروازے پر دستک دے کر مہران آ کھڑا ہوا۔ غصے سے اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔

"یہ آرٹ کے نمونے آپ نے بنائے ہیں؟"

حرا نے سوچا ہی نہیں تھا کہ یہ گھر اس کا نہیں اور نہ ہی وہ میگزین اس کے تھے نہ ہی یہاں کمل تھی جو برداشت کر لیتی۔

وہ شرمندہ سی اسے دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے سوال پر سوری کہے یا "ہاں"

"اس میگزین کو غور سے دیکھیے! کبھی ایسا میگزین دیکھا ہے... یہ کوئی فلمی یا فیشن میگزین نہیں ہے۔ اس میگزین کو میرا ادارہ محدود تعداد میں شائع کرتا ہے ان لوگوں کے لیے، جن کا اس شعبے سے تعلق ہے یعنی میرا... اور ان کو پڑھنے والے کسی نادر چیز کی طرح انہیں سنبھال کر رکھتے ہیں۔ انہیں آپ سنبھال کر رکھیے۔ آپ کی آرٹ کی نمائش کے لیے کام آئیں گے..."

اس نے میگزین بیڈ پر پھینکے اور چلا گیا۔

شرمندگی سی شرمندگی تھی جو وہ محسوس کر رہی تھی۔

اب اسے احساس ہو رہا تھا یہ اس گھر میں کی جانے والی اس کی باقاعدہ غلطی تھی۔ وہ حقیقتاً "اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ڈرتے ڈرتے وہ کمرے سے باہر نکلی۔

"میں بہت شرمندہ ہوں جنت! میری غلطی ہے۔"

مہران کے سامنے تو وہ ایک لفظ نہیں کہہ سکی۔

"جو ہونا تھا ہو گیا، حرا بی بی! اب آپ پریشان نہ ہوں۔"

"میں واقعی میں بہت شرمندہ ہوں تم میری طرف سے ان سے معذرت کر لو۔"

"میں کہہ دوں گی..." جنت مسکرائی۔

سارا وقت وہ کمرے میں رہ رہ کر اپنی حرکت پر کڑھتی رہی۔

رات گئے ہمت کر کے کمرے سے باہر آئی تاکہ جنت کے ساتھ جا کر خود سے مہران سے سوری کہہ آئے۔ لاؤنج میں روشن دان کے پاس ہی وہ کتاب لیے بیٹھا تھا، قریب ہی لیپ ٹاپ پر انگلش میوزک بج رہا تھا۔

اس نے اسے دیکھ نہ لیا ہوتا تو وہ واپس چلی جاتی بھاڑ میں جائے سوری، کل تو اس نے واپس چلے ہی جانا تھا... پھر بھی وہ اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں میگزین کے لیے آپ کو سوری کہنے آئی ہوں۔"

"اب کیا ہو سکتا ہے گیواٹ۔" اس نے کوئی تاثر دیے بغیر کہا، یعنی غصہ ابھی بھی تھا۔

"میں جانتی ہوں، میری غلطی ہے۔" اس نے اتنا ہی کہا۔

"آپ ہماری مہمان ہیں، اب آپ کو کچھ کہہ تو نہیں سکتے۔ اس لیے اٹس اوکے۔" وہ پھر بنا تاثر کے

بولا۔

اس کا پارہ یکدم ہائی ہو گیا۔ معذرت تو بندہ طریقے سے قبول کرلے۔

"میں آپ کی نہیں ڈاکٹر صاحب کی مہمان ہوں۔ انہوں نے ہی مجھے پناہ دی، میری مدد کی، میرا خیال رکھا۔ آپ تو جب ملے، خونخوار، منہ پھاڑ ہی ملے ہیں، نہ لڑکی ہونے کا احساس ہوا نہ ہی اکیلے اور مہمان ہونے کا خیال۔"

"ہوں ۔۔۔" اس نے ایک لمبی ہوں کی ۔۔۔ جیسے مزے لے کر اپنا پسندیدہ کھانا کھایا جاتا ہے۔ "خونخوار ۔۔۔ منہ پھاڑ ۔۔۔ بہت اچھی باتیں کرلیتی ہیں آپ ۔۔۔ بہت متاثر کیا اس بار بھی آپ نے ۔۔۔"

"آپ کی بدتمیزی نے بھی بہت متاثر کیا مجھے۔" وہ بدو بولی۔

"اس بدتمیز شخص نے ہی اس رات آپ کو اکیلا دیکھ کر اپنے بابا کو آپ کے پاس بھیجا تھا۔ اس گڑھے میں آپ خود گریں، لیکن نکالا میں نے۔ چائے میری آپ نے گرادی، مگ میرا توڑ دیا جو میری بہن خاص میرے لیے ملائیشیا سے لائی تھی۔ میگزین میرے آپ نے آرٹ کے نمونے بنا دیے اور بدتمیز بھی میں ہوں ۔۔۔ آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"اگر میں آپ کے گھر میں نہ ہوتی تو میں آپ کو بتاتی کہ آپ کیا ہیں۔ اور میں کیا ہوں ۔۔۔" وہ غصے سے بھڑک اٹھی تھی۔

"آپ میرے گھر میں ہیں اس بات کو بھول جائیں۔ آپ بتائیے مجھے۔"

"میں آپ سے سوری کر رہی ہوں اور آپ باتیں سنا رہے ہیں مجھے۔"

"مجھے نہیں چاہیے آپ کا سوری ۔۔۔ پھر ۔۔۔"

"پھر یہ کہ آپ بھاڑ میں جائیں۔"

"جہاں آپ گری تھیں وہاں؟" وہ تمسخر سے بولا۔

حرا نے اس کے چہرے پر آئی مسکراہٹ کو دیکھا۔ وہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی، کچھ کہے بنا وہ کمرے میں واپس آگئی۔

"آپ وہیں جارہی ہیں؟" اسے اپنے پیچھے آواز سنائی دی۔

"جنگلی ۔۔۔ سنکی ۔۔۔ گنوار ۔۔۔" وہ دیر تک بڑبڑاتی رہی۔

☼ ☼ ☼

صبح ہوتے ہی معاذ کا فون آگیا وہ اسے لینے آرہا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟" اس نے ناشتا کر کے جنت سے پوچھا۔

"وہ تو رات آئے ہی نہیں۔"

اس کے بیگ میں مال سے خریدی ہوئی کچھ جیولری تھی۔ اس نے بے حد شکریہ کے ساتھ وہ جنت کو دی، جو بصد اصرار بھی وہ نہیں لے رہی تھی۔ اس کے شوہر اکبر کے ساتھ اسے مال تک جانا تھا وہیں سے معاذ نے اسے لینا تھا۔

جنت سے اچھی طرح مل کر وہ اکبر کے ساتھ آگئی، رستے میں آنے والے ڈاکٹر خاور کے چھوٹے سے ہسپتال میں ان سے مل کر اور ان کا شکریہ ادا کر کے وہ مال سے معاذ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر ریسٹ ہاؤس آگئی۔

وہ سب لوگ تیاری کر کے بیٹھے تھے۔ اس کے آتے ہی فوراً واپسی کے لیے نکل پڑے۔ اس کی کہانی سننے کے بعد جس میں مہران کا کہیں ذکر نہیں تھا، وہ سب اپنی اپنی خوش گپیوں میں مگن ہو گئے۔ سب معاذ کو دھمکی دے رہے تھے کہ وہ سب جاکر حرا کے بچھڑ جانے والی کہانی سب کو سنائیں گے۔

"میرے بابا کی توبہ جو اتنے بڑے گینگ کے ساتھ اس طرف آیا۔"

"مسئلہ گینگ نہیں تھا، مسئلہ موسم تھا، ہم نے غلط وقت کا انتخاب کیا۔" شائل نے گینگ کا دفاع کیا۔

"یار! برف ہی نہیں دیکھ پاتے تو کیا فائدہ یہاں آنے کا۔"

"آپ شہری لوگ برف دیکھنے کے لیے تو پاگل ہو جاتے ہیں۔" کافی دیر سے خاموش حرا ایکدم بولی۔

"ہم شہری لوگ مطلب ۔۔۔؟" شائل حیرت سے بولا۔

"ہاں! ہو جاتے ہیں پاگل۔ جو نہیں دیکھا اسی کے لیے ہوتے ہیں نا، سارا سال ہوا اور دھوپ پر ہی گزارا کرتے ہیں۔ تھک جاتے ہیں ہم شہری لوگ ۔۔۔"

معاذ کو بات بات پر بلاوجہ غصہ آرہا تھا، شاید وہ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔

"آپ یہاں شفٹ ہو جائیں معاذ بھائی!" مدیحہ بولی۔

"سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں ۔۔۔"

حرا سب سے زیادہ خاموش تھی۔ آتے ہوئے جو جوش ان سب میں تھا جاتے ہوئے وہ اداسی میں بدل گیا تھا اور یہ اداسی سب سے زیادہ حرا محسوس کر رہی تھی۔ وہ ہر گزرتی سڑک، درخت، پہاڑ ۔۔۔ گھر کو اداسی سے دیکھ رہی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ واپسی پر وہ اتنی اداس ہو جائے گی ۔۔۔ لیکن وہ اداس اور خاموش ہوتی ہی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

نمل نے کالج میں سب کو مزے لے لے کر اپنے ٹور کے بارے میں بتایا، حرا کسی کو کچھ نہیں سنا سکی۔

وہ تین بہن بھائی تھے۔ بڑی نمل، حرا اور پھر جرار ۔۔۔

ان کے بابا اتنے سخت تھے کہ ان کی پڑھائی کی وجہ سے گرمیوں کی چھٹیوں میں بھی انہیں کہیں جانے نہیں دیتے تھے۔ معاذ کراچی سے آیا تو وہ اسے انکار نہیں کر سکے۔ ویسے بھی معاذ ان کے کزن کا بیٹا تھا۔ وہ اسے پسند بھی کرتے تھے اور اعتبار بھی۔ معاذ کا پروگرام سن کر جرار نے اتنا شور ڈالا کہ انہیں تینوں کو اجازت دینا ہی پڑی۔

نمل انجینئرنگ تھرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی اور حرا بی کام کی۔ سردیاں گزریں ۔۔۔ گرمیاں آگئیں ۔۔۔ اور پھر گرمیاں بھی گزر گئیں۔ حرا کی اداسی بڑھتے بڑھتے مسلسل خاموشی کی صورت اختیار کر گئی۔ شروع میں سب نے نوٹ کیا پھر وہ اس کی خاموشی کے عادی ہو گئے۔ میوزک کو سنتے سنتے اس نے گانوں کے بولوں پر توجہ دینی شروع کر دی اور وہ انہیں دہراتی رہتی ۔۔۔ حیرت انگیز طور پر اس نے ایک بار عابدہ پروین کو سنا اور وہ سنتی ہی چلی گئی۔

"معاذ سے شادی کرو گی؟" نمل نے اچانک دھماکا کیا تھا۔

حرا کو جیسے کرنٹ لگا۔ "تم نے کیوں پوچھا؟"

"بابا اور ماما کی خواہش ہے کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کا معاذ کے ساتھ رشتہ پکا ہو جائے ۔۔۔ سوچا تم سے تمہاری مرضی پوچھ لوں۔"

"ناں ۔۔۔" اس نے فوراً کہا۔ "اور تم؟"

"ظاہر ہے، ہاں ۔۔۔" نمل دل کھول کر ہنسی۔ "معاذ کی بھی یہی مرضی ہے۔ تمہیں تو میں ویسے ہی تنگ کر رہی تھی۔ ویسے تم نے معاذ کے لیے "نہ" کیوں کہا۔ کوئی خرابی ہے اس میں؟"

"نہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ ایسے خاموش ہو گئی جیسے پھر نہیں بولے گی۔ اس کی نظریں چھوٹے سے سفید بیر پر ٹکی تھی۔ جب وہ اکبر کے ساتھ ڈاکٹر خاور کے گھر سے واپس آرہی تھی تو واپسی پر اس کی نظر سڑک کے کنارے اس برفانی ریچھ پر پڑی تھی جو وہ بنانے کی کوشش کرتی رہی تھی، لیکن بنا نہیں سکی تھی، وہ برف کا ریچھ خوبصورتی سے تیار کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں برف ہی سے بنا سفید مگ تھا جو وہ منہ کے قریب لے کر جارہا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ کس نے بنایا ہو گا۔ اس وقت اس نے اسے غصے سے دیکھا تھا لیکن اب وہ اسے بری طرح یاد آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

بہار کا موسم تھا اور وہ سرخ سیبوں کا تازہ جوس نکال رہا تھا۔

"کالی مرچ دو جنت!" اس نے قریب ہی کام کرتی جنت سے کہا۔

"اوہ۔۔۔ وہ تو کل ہی ختم ہو گئی تھی' یاد ہی نہیں رہا منگوانا۔"

"تم کسی کام کی نہیں ہو جنت!" مہران پچھلے ڈیڑھ سال سے اسے وقفے وقفے سے یہ ضرور کہہ دیتا تھا۔ قریب ہی کچن ٹیبل پر آیان بیٹھا تھا۔ وہ کچھ دن پہلے ہی آسٹریلیا سے اپنے سمسٹرز سے فارغ ہو کر آیا تھا۔

وہ مہران سے چھوٹا تھا۔ سب سے بڑی سارہ تھی۔ آیان اکاؤنٹس کا اسٹوڈنٹ تھا' مہران ڈاکو منٹریز بناتا تھا۔ تین سال پہلے وہ بھی آسٹریلیا میں ہی تھا۔

"حیرت ہے! جنت اب تمہارے کسی کام کی نہیں رہی۔" آیان نے مزا لیا۔

دو گلاس اپنے لیے بھر کر اور ایک جنت کے لیے وہیں چھوڑ کر وہ کچن کے دروازے سے پیچھے لان میں آ گیا۔

"تو وہ محترمہ یہاں گری تھیں۔" آیان نے گڑھے کی طرف اشارہ کیا۔

مہران نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرانے لگا۔ "اکبر نے پانی کے پائپ کے لئے کھدائی کی تھی۔ موسم بدلا تو اس نے کام درمیان میں ہی روک دیا' پانی کا مسئلہ حل ہو گیا تو یہ گڑھا ایسے ہی رہ گیا۔"

"اگر اکبر کام مکمل کر لیتا تو وہ یہاں نہ گرتی۔"

"اگر یہ نہ ہوتا تو بھی وہ کہیں نہ کہیں جگہ تلاش کر کے گر ہی جاتی۔"

"ہاہا۔۔۔ اتنا شوق تھا گرنے کا' "ٹوکے ٹو" لے جاتے۔ ایک ہی بار شوق پورا کر دیتے۔" آیان کہہ کر "کھی کھی" کرنے لگا۔

"مت پوچھو کیسے گرتی تھی۔ یو نو! جو بلیک لانگ شوز اس نے پہن رکھے تھے۔ وہی شوز جو ماڈلز ریمپ پر پہن کر واک کرتی ہیں اور ٹک ٹک کرتی مزے سے چلتی جاتی ہیں۔ بس اسے یہ غلط فہمی تھی کہ وہ بھی انہیں پہن کر برف پر ویسے ہی چل سکتی ہے۔"

آیان کے لیے ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔

"جب میں یہاں اسے اپنی کھڑکی سے دیکھ رہا تھا تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنی بری طرح گرے گی مگر جب وہ گری تو ہنس ہنس کر میرا برا حال ہو گیا۔ جب میں اس کے سر پر جا کر کھڑا ہوا تو اس کی شکل دیکھنے والی تھی۔"

"بہت خوب صورت تھی وہ۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ خوب صورت تو نہیں۔۔۔ مگر کیوٹ بہت تھی۔۔۔ غصہ کرتی تو چھوٹی سی مانو بلی لگتی تھی۔"

"اس مانو بلی سے تھوڑی سی دوستی ہی کر لیتے۔"

"کیسے کر لیتا' ایک کے بعد ایک واقعہ ہوتا چلا گیا پھر وہ چلی گئی۔ میں کام سے صبح اسلام آباد چلا گیا تھا واپس آیا تو وہ جا چکی تھی۔ ویسے جنت بازار میں ملنے والوں سے بھی اچھی دعا سلام رکھتی ہے۔ شہر اور گھر کا اتا پتا رکھتی ہے ایک فون نمبر نہیں لے سکی اس سے۔"

"افسوس جنت کی کارکردگی پر۔۔۔" آیان مزے لے رہا تھا۔

"کہہ رہی تھی اتنا کام تھا ان دنوں کہ ہوش ہی نہیں رہا بس اتنا معلوم ہے کہ وہ لاہور سے آئی تھی۔"

"اسے معلوم ہے نا کہ تم یہاں رہتے ہو۔"

"ہاں۔۔۔ ڈیڑھ سال ہو گیا۔ اسے تو معلوم ہے ہمارے گھر کا۔" مہران نے آہ بھری "پھر بھی۔۔۔"

"پھر بھی یہ کہ وہ تم جیسے بدتمیز سے ملنے کیوں آئے۔۔۔ ویسے مہران اسے پسند کرتے ہو یا محبت؟"

"محبت کا تو نہیں معلوم۔۔۔ لیکن جس دن سے وہ گئی ہے اسی دن سے وہ مجھے یاد آنے لگی ہے۔ کوئی وجہ بھی نہیں اور پھر بھی۔۔۔ فیس بک پر ڈھونڈا۔۔۔ حرا خان' حرا احمد' حرا سلطان' حرا زمان اور نہ جانے کتنی حرا کو میسج کر چکا ہوں' مگر وہ حرا نہیں ملی۔"

"وہ تمہیں ناپسند کرتی ہو گی بہت' ہو سکتا ہے وہ دوبارہ آئی ہو یہاں گھومنے مگر یہاں نہ آئی ہو۔ ظاہر ہے اگر وہ یہاں نہیں آئی تو اس کا مطلب بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ وہ انگیجڈ ہو سکتی ہے' ہو سکتا ہے اس کی شادی ہو چکی ہو یا وہ کسی کو پسند کرتی ہو اور یہ بھی کہ اسے یاد بھی نہ ہو کہ وہ کبھی یہاں آئی بھی تھی اور یہ کہ "تم ہو کون" تم نے ان امکانات پر غور کیا؟"

"نہیں۔۔۔" مہران نے جل کر کہا۔ "میں نے

صرف ایک امکان پر غور کیا ہے کہ وہ یہاں آئی ہے اور کہتی ہے۔ میں تو ڈاکٹر صاحب سے ملنے آئی ہوں۔"

"فرض کرو ایسے ہو جاتا ہے تو۔"

"تو بس آگے اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔"

"چلو اب یہ فرض کرو کہ ایسا کچھ نہیں ہوتا تو۔؟"

مہران نے اس بار صرف اسے گھور کر ہی دیکھا۔

"وہ تمہیں پسند نہیں کرتی۔"

"تم اس سے پوچھ کر آئے ہو؟"

"واقعات اور تاریخ گواہ ہے لڑکیاں ان لڑکوں کو پسند کرتی ہیں جو ان سے تمیز سے بات کریں۔ انہیں نہیں جو انہیں کھری کھری سنائے' ویسے انکل شیراز کی بیٹی کا کیا کرنا ہے۔ بہت خوب صورت ہے صوفیہ۔"

"یار! سارہ' ماما' پاپا سب نے تنگ کر رکھا ہے' چاہتے ہیں راتوں رات دولہا بن کر اس کے گھر پہنچ جاؤں۔"

"میری مانو تو صوفیہ کے لیے ہاں کہہ دو۔ حرا نہیں آئے گی۔ ڈیڑھ سال کم نہیں ہوتا۔"

"کہہ تو ٹھیک رہے ہو لیکن۔ اداسی ختم ہی نہیں ہوتی یہ سوچ کر کہ وہ چلی گئی اور اب آ نہیں رہی۔"

"چلتے ہیں پھر آج ہی انکل شیراز کے گھر۔" آیان نے اسے بہلایا۔ "کچھ دن لگیں گے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ویسے وہ میگزنز مجھے بھی دکھائیں۔ کہاں ہیں۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی مہران مسکرانے لگا۔

"ویسے اچھا ہوتا کہ تم لاہور جا کر گلی گلی اسے تلاش کرتے۔"

"لاہور بہت بڑا ہے۔" مہران نے کہا۔ "وہاں گلیاں بھی بہت ہوں گی۔"

"ہو سکتا ہے وہ کسی اور شہر شفٹ ہو چکی ہو۔"

"تم کتنی بکواس کرتے ہو۔"

"ہو سکتا ہے وہ ملک سے ہی باہر چلی گئی ہو۔" آیان خاموش نہیں ہو رہا تھا۔

"ہو سکتا ہے' وہ یہاں آنے کی تیاری کر رہی ہو۔" مہران نے منہ لٹکا کر کہا۔

"یہ آخر والا 'ہو سکتا' ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ امید چھوڑ دو مہران اب۔ بس۔"

☼ ☼ ☼

نمل اور معاذ کی بات پکی کر دی گئی تھی۔ حرا نے فون کر کے کئی بار معاذ کو مری چلنے کے لیے کہا مگر وہ مان ہی نہیں رہا تھا۔ وہ ڈر گیا تھا' خاص کر کسی لڑکی کو وہ ساتھ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس بار وہ لاہور آیا تو وہ پھر اس کے سر ہو گئی۔ صرف معاذ ہی تھا جو اسے لے کر جا سکتا تھا۔ پاپا تو خیر کبھی نہ جاتے اور نہ ہی جرار کے ساتھ جانے دیتے اور نہ کوئی سمجھتا تھا کہ اس کی کوئی خاص ضرورت ہے۔

"نہ اب نہیں کبھی حرا! میں بہت ڈر گیا ہوں۔"

"آپ کو تو بہت پسند ہے وہ علاقہ۔" وہ کب سے اسے منا رہی تھی۔

"بے حد پسند ہے لیکن کسی لڑکی کو لے کر میں نہیں جاؤں گا۔"

"نمل کے ساتھ بھی نہیں؟"

"نہیں۔ میں بہت محتاط ہو گیا ہوں۔"

"حادثات تو ہوتے ہی ہیں۔ ہم سب ٹھیک ٹھاک واپس تو آ گئے نا۔"

"ایک بار ٹھیک ٹھاک واپس آ گئے۔ نہ جانے اگلی بار کیا ہو۔"

"آپ اتنا ڈر گئے ہیں' اب سردیاں بھی نہیں ہیں۔ سب جاتے ہیں وہاں۔" وہ رو دینے کو تھی۔ "میں نے اتنے سارے پیسے جمع کر لیے ہیں۔ آپ کے پیسے خرچ نہیں ہوں گے۔"

"مسئلہ پیسے نہیں ہیں۔"

"پلیز میرے لیے۔ خدا کے لیے کوئی تو چلے وہاں میرے ساتھ۔" وہ سچ مچ رونے لگی۔ معاذ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا ہوا حرا؟" وہ بے حد پریشان ہو گیا۔

"میں بھول آئی ہوں کچھ وہاں۔ مجھے جا کر لا نے دیں۔"

"کیا بھول آئی ہو؟" وہ کیسے سمجھتا۔ حرا نے صرف گیلی آنکھوں سے معاذ کو دیکھا۔

"میں نے اتنا انتظار کیا کہ کوئی تو مجھے وہاں لے جائے مگر۔"

معاذ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"ڈاکٹر خاور کے گھر جانا ہے؟"

حرا نے صرف سر ہلایا۔ اندر لاکھ وسوسے تھے مگر کسی کو تو بتانا ہی تھا۔

"ہم ان کے گھر جا کر کہیں گے کیا حرا!" وہ پریشان ہو گیا۔ "بہت عجیب سا لگے گا۔"

"ہم کہیں گے ہم ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں۔" حرا نے جوش سے کہا۔ "ان سے ملنے آئے ہیں' باقی وقت بتا دے گا کہ ہمارا جانا ٹھیک تھا یا نہیں۔"

ناچار معاذ نے پھر سے وہی گینگ اکٹھا کیا۔ کسی کو بھی خبر دیے بغیر۔

ان سب کو ہوٹل میں چھوڑ کر حرا کو لیے وہ چل پڑا۔ گاڑی میں بیٹھی حرا وسوسوں کا شکار تھی۔

☼ ☼ ☼

صرف آیان تھا جو یکسوئی سے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ ماما نے اسلام آباد سے سارہ کو بلوا لیا تھا۔ پاپا' ماما اور سارہ کافی دیر سے اس کی اور صوفیہ کی متوقع منگنی کو ڈسکس کر رہے تھے۔

مہران لیپ ٹاپ کھولے بے مقصد فضول سے آن لائن گیمز کھیل رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر صوفیہ پر غصہ آ رہا تھا۔ کیا ضرورت تھی انکل شیراز کی کنواری بیٹی ہونے کی۔ نہ وہ ہوتی' نہ اس پر اتنا دباؤ ڈالا جاتا اس سے شادی پر۔ وہ آرام سے انتظار کرتا رہتا' وہ برے برے منہ بنا رہا تھا۔

"پاپا! آپ انکل سے کہہ دیں ہم کل آئیں گے ان کے گھر۔" سارہ نے شاید سب معاملات نبٹا لیے تھے۔

آیان نے اسے آنکھ ماری۔

"ٹھیک ہے۔" پاپا نے فون ہاتھ میں پکڑا۔

"بیٹا! فرقان کا انتظار کر لیتے ہیں۔" ماما نے سارہ کے شوہر کا نام لیا۔

"ماما! وہ ایک ہفتے تک نہیں آ سکتے۔ کیا ضرورت ہے ان کا انتظار کرنے کی۔"

"میرا خیال ہے اس کا انتظار کر لینا چاہیے۔" مہران نے زور دے کر کہا۔

ڈاکٹر خاور فون ہاتھ میں لیے باری باری دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ "بتاؤ بیٹا سارہ! میں کیا کروں۔"

"پاپا! آپ کر دیں انہیں فون۔"

ڈور بیل کی آواز صرف آیان نے ہی سنی۔ ناچار اسے ہی اٹھنا پڑا لیکن جنت پہلے ہی دروازہ کھول چکی تھی۔

"ہمیں ڈاکٹر خاور سے ملنا ہے۔ انہوں نے ہماری بہت مدد کی تھی میری بہن کو اپنے گھر میں رکھا تھا جب۔"

لاؤنج میں بیٹھے مہران نے لیپ ٹاپ ایک طرف پھینکا اور لپک کر دروازے تک آیا۔

آیان انہیں اندر لا رہا تھا۔ مہران وہیں کھڑا ہو گیا اور معاذ کے پیچھے چھپنے کی ناکام کوشش کرتی حرا۔

سفید کرتا اور چوڑی دار پاجامے۔ میں وہ پہلے سے زیادہ کیوٹ لگ رہی تھی۔ لاؤنج میں بیٹھے سب ان کی طرف دیکھنے لگے۔ ڈاکٹر خاور حرا کو پہچان کر فوراً" اٹھے۔ فون ابھی ان کے ہاتھ میں ہی تھا۔

جب وہ باری باری سب کو سلام کر رہی تھی تو اس تک آ کر رک گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا۔ پہلی بار!!!

وہ دونوں جان گئے تھے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے کیا بن چکے ہیں۔!

عُظمیٰ افتخار

صراطِ مستقیم

میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا' بس یہی سنتا آرہا تھا کہ ہمارا گھرانہ صراطِ مستقیمی ہے۔

میں یعنی عمر حسن جو میاں محمد طفیل حسن کا اکلوتا بیٹا اور چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میں کافی عرصے تک اس لفظ کے معنی اور گہرائی سے نابلد رہا۔

ابا میاں صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ شرعی لباس پہنتے تھے۔ ہر بات میں قرآن و حدیث کا حوالہ دیتے تھے۔ انہوں نے اپنے سارے بچوں کے اسلامی نام رکھے تھے۔ بڑی آپا کا نام عائشہ' منجھلی آپا کا نام فاطمہ' چھوٹی آپا کا نام زینب اور اپیا کا نام مریم تھا اور ان چاروں کے بعد میرا نمبر تھا یعنی عمر حسن کا۔

ابا میاں صبح تڑکے فجر کے ساتھ اٹھ جاتے اور پھر اماں کے ساتھ باقی سب کو بھی جگا دیتے۔ نماز کے بعد تلاوت قرآن' تسبیحات' پنج سورہ' اذکار' یہ سب چلتا رہتا۔ تاوقتیکہ سب بہنیں اور میں کالج و اسکول اور ابا میاں اپنے جنرل اسٹور پر نہ چلے جاتے۔

اشراق' چاشت' اوابین اور دوسری نفلی عبادتوں کا بھی اہتمام ہوتا۔ اماں جان کو اس بات پر فخر تھا کہ محلے میں واحد ان کا گھر تھا' جہاں سورج نکلنے سے پہلے ہی روشنی ہو جاتی ہے اور خدا کا ذکر بلند ہوتا تھا۔

میں سات سال کا کیا ہوا' مجھے لگا گویا کہ میرا بچپن ہی رخصت ہو گیا ہو۔ ادھر مولوی صاحب نے مجھے قرآن ختم کروایا۔ ادھر بڑی آپا نے ابا میاں اور اماں کے ساتھ مل کر مجھے بھی صراط مستقیمی بنانے کی ٹھان لی۔ وضو کے فرائض' غسل کے احکام' نماز جمعہ کی فضلیت' نماز' روزے کا اہتمام' صبح سے لے کر رات گئے تک' کھانے' پینے' سونے' اٹھنے' کپڑے بدلنے' گھر سے نکلنے اور داخل ہونے کی۔ غرض جتنی مسنون دعائیں تھیں' سب انہوں نے مجھے رٹوا دی تھیں۔

بڑی آپا میں اور مجھ میں گیارہ سال کا فرق تھا۔ بڑی آپا کے پانچ سال بعد منجھلی آپا ہوئی تھیں۔ ان سے دو سال چھوٹی زینب آپا تھیں اور زینب آپا کے تین سال بعد مریم اپیا ہوئی تھیں اور ان کے ایک سال بعد ہی میں دنیا میں وارد ہو گیا تھا۔ یوں بڑی آپا کی اس گھر میں اہمیت مسلم تھی۔ وہ ابا کی صحیح معنوں میں جانشین تھیں اور میں جو اکلوتا تھا اور جس کے اس گھر میں ناز اٹھنے چاہیے تھے' اس کے ساتھ سب کا برتاؤ کچھ اس محاورے کے مصداق تھا کہ "کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ سے۔" گویا سب کو یہی لگتا تھا کہ میرا اکلوتا پن مجھے بگاڑ نہ دے۔

یہ اور بات ہے کہ میرے اندر ایسی باغی روح تھی کہ بظاہر میں ابا میاں' اماں جی اور سب بہنوں کی ہر بات پر کان دھرتا۔ مگر ان کا ہم خیال نہ ہو پاتا۔ بقول غالب۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اپنے گھر سے زیادہ میرا دل مدحت پھپھو کے گھر لگتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ ارکان اسلام سے نابلد تھے' یا ان کی زندگی میں اصول و ضوابط نہ تھے۔ بس یہ تھا کہ وہاں بات بات پر مذہب کا پرچار نہیں کیا جاتا تھا اور سب

سے بڑھ کر جو بات وہاں میرے دل لگنے کا سبب بنتی تھی، وہ حسن آرا کی ذات تھی۔ مدحت پھپھو کی اکلوتی بیٹی۔ وہ مجیب بھائی سے سال بھر ہی چھوٹی تھیں۔ میں جب بھی پھپھو کے گھر جاتا، مجیب بھائی سے زیادہ حسن آرا کے گلے کا ہار بنا رہتا۔

حسن آرا صورت و سیرت دونوں میں یکتا تھیں۔ دودھ جیسی رنگت تھی ان کی، صراحی دار گردن کی باریک جلد کے پار سے رگوں کا جال جھلک دکھلاتا تھا۔ پانی پیتیں تو گلے سے گھونٹ گھونٹ اترتا دکھائی دیتا تھا۔ کمر تک آتے گھنے سیاہ بال، متناسب قد و قامت ... غرض جس تقریب میں حسن آرا ہوتیں وہاں ساری لڑکیوں کا حسن ماند پڑ جاتا تھا۔ خوش الحان اتنی تھیں کہ قرأت اور نعت خوانی گویا ان پر ختم تھی۔

ان کو دیکھ کر میرا باغی دل کرتا کہ میں انہیں کبھی حسن آرا آپا نہ کہوں، مگر وہ چونکہ منجھلی آپا فاطمہ کی ہم عمر تھیں۔ یعنی مجھ سے پورے چھ سال بڑی تو آپا کہنا مجھ پر فرض تھا۔ ان کے کبوتر کے پروں کی طرح سفید اور ملائم ہاتھوں کو اکثر میں اپنے ہاتھ میں لے کر کہتا تھا۔

"آپ اتنی اچھی ہیں کہ میرا دل کرتا ہے، میں بڑا ہو کر صرف آپ سے ہی شادی کروں۔" جواباً وہ زور سے ہنس پڑتی تھیں۔

"منے میاں... تمہیں میرے ہاتھ میں یہ انگوٹھی نظر نہیں آتی؟" وہ اپنا بایاں ہاتھ میری نظروں کے سامنے کرتیں۔ جس کی درمیانی انگلی میں پرانی وضع کی سونے کی انگوٹھی تھی۔

"ویسے بھی جب تک تم شادی کے قابل ہو گے۔ میں فرہاد کے ساتھ رخصت ہو جاؤں گی۔"

فرہاد کے نام پر ان کی آنکھوں میں روشنی سی اتر آتی تھی۔ جیسے کسی نے ستارے کوٹ کر بھر دیے ہوں۔ فرہاد، مقصود پھوپھا کے دوست عبدالقادر کا بیٹا تھا۔ حسن آرا کو عبدالقادر انکل نے اپنے بیٹے کے لیے بہت چھوٹی عمر میں ہی پسند کر لیا تھا۔ پھر وہ پڑھائی کی غرض سے پردیس سدھار گیا۔ پھوپھی اماں اور پھوپھا کو اس بات پر بڑا ناز تھا کہ ان کا ہونے والا داماد ولایت سے پڑھ کر آئے گا۔ اور یہ ناز بجا بھی تھا کہ پورے خاندان میں نہ تو کوئی اتنا عالم فاضل تھا اور نہ ہی مال دار کہ باہر سے تعلیم حاصل کر کے آتا مگر حسن آرا کی طبیعت میں بلا کی سادگی تھی۔

انہوں نے کبھی رشتہ کی بہنوں، بھاوجوں یا سہیلیوں کے سامنے اس بات پر غرور کا اظہار نہ کیا تھا۔ بلکہ وہ ہر ایک کے کام آتیں۔ خاندان بھر میں شادی بیاہ کا معاملہ ہو یا کوئی اور مسئلہ، پھوپھی اماں اور حسن آرا کا حسن اخلاق اور ہر فن مولا ہونا، سب کے لیے تقویت کا باعث بنتا۔ یوں حسن آرا کی خوبیوں کی چھاپ مجھ پر گہری ہوتی چلی گئی۔

جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا۔ حسن آرا آپا دل ہی دل میں میرے لیے فقط حسن آرا بنتی گئیں۔ میری بہنیں ایک ایک کر کے رخصت ہو گئیں۔ میں نے گریجویشن کر کے گاڑیوں کے اسپیئر پارٹس کا کام پہلے ایک دوست کی شراکت میں شروع کیا اور پھر اپنا علیحدہ کاروبار شروع کر لیا مگر حسن آرا بیاہ کر فرہاد کے سنگ نہ گئیں۔ دیار غیر کی چکاچوند نے فرہاد کو واپسی کا راستہ ہی نہ دکھایا۔ وہ وہیں اپنے ساتھ پڑھنے والی کسی ملائیشین لڑکی کی زلف کا اسیر ہو گیا۔ فرہاد کے بعد حسن آرا نے کسی سے شادی نہ کی۔ البتہ یہ ضرور سنا تھا کہ دو، ایک جگہ ۔ ان کے رشتے کی بات چلی مگر جب لڑکے والوں کو بچپن کی منگنی ختم ہونے کا پتا چلا تو دوبارہ پلٹ کر نہ آئے۔ مجیب بھائی کی شادی بھی غیروں میں ہوئی۔ نگہت بھابھی کچھ عرصہ ساتھ رہیں، پھر جب مجیب بھائی کو ان کے سسر نے اپنے ساتھ کاروبار میں لگا لیا تو وہ بھی سسرال کو پیارے ہو گئے اور نگہت بھابھی نے صد شکر ادا کیا۔ وہ حسن آرا کے حسن سے خائف تھیں، جس پر ان کا بھائی بری طرح فریفتہ ہو گیا تھا۔

مقصود پھوپھا کو پہلے ہی بیٹی کی منگنی ٹوٹنے کا غم تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے خود کو مجرم گردانتے تھے۔ مجیب بھائی کے گھر سے چلے جانے نے گویا سونے پہ سہاگہ کیا۔ ایک رات وہ ایسا سوئے کہ پھر آنکھ نہ کھولی۔ پھر حسن آرا

نے ماں کو سنبھالنے اور زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھانے کے لیے کمر کس لی اور درس و تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اسکول سے آنے کے بعد وہ گھر میں بھی محلے کے بچے بچیوں کو قرآن کی تعلیم دیا کرتیں اور ٹیوشن پڑھاتی تھیں۔

حسن آرا اب بھی خاندان بھر میں مقبول تھیں۔ سب کے کام آتی تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ پہلے کچھ لوگ ان کے حسن سے خائف رہتے تھے اور کچھ مرعوب۔ اب وہی سب انہیں دیکھ کر دبے دبے لفظوں میں جملے کستے تھے اور آہیں بھرتے تھے۔

"اچھی صورت کا بھی کیا فائدہ، اصل میں تو جسے پیا چاہے، وہی سہاگن۔"

☆ ☆ ☆

"عمر! میں نے تمہیں رانیہ کی تصویر بھیجی تھی رافع کے ہاتھ۔ دیکھی تم نے، کیسی لگی تمہیں؟"

بڑی آپا نے مجھ سے سوال کیا۔ ہم دونوں اس وقت اماں جان کے کمرے میں موجود تھے۔

"نہیں آپا! رافع نے تو مجھے کوئی تصویر نہیں دی۔" میں یکسر لاعلم تھا۔

"میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ یاد سے تمہیں دے دے۔ حد ہے اس کے لاابالی پن کی بھی۔ میں خود ہی دیکھتی ہوں جا کر۔ کہیں تمہاری الماری کی دراز میں نہ رکھ دی ہو اس نے۔ اس لڑکے کا تو سارا دماغ بس کمپیوٹر میں لگا رہتا ہے۔"

آپا اپنے بیٹے رافع کی شان میں بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں تو میں اماں جان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ آج تھکن سے برا حال تھا۔ اماں جی ہولے ہولے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

ہر بار جب بھی تمام بہنیں میکے میں جمع ہوتیں۔ ذکر گھر کی ذمہ داریوں، سسرال والوں کی ناز برداریوں سے نکل کر مہمان داری پر آ جاتا۔ اور وہ چاروں اس بات پر متفق ہو جاتیں کہ اب تو ایک عدد بھابھی آ ہی جانی چاہیے۔ عید بقرعید اور مختلف تہواروں پر بیٹیاں میکے آتی ہیں تو اپنے ناز اٹھواتی ہیں مگر ادھر تو معاملہ ہی الٹا ہے۔ سسرال میں بھی کولہو کا بیل بنے رہو اور میکے آ کر بھی اپنے لیے خود ہی اہتمام کرو۔

یوں ہر بار میری شادی کا ارمان میکے جا کر جاگ اٹھتا تھا۔ جب تک اماں باوا کے گھر رہتیں، حتی الامکان اس مہم کا آغاز کیے رہتیں مگر جیسے ہی سسرال روانہ ہوتیں، شوہر، بچوں اور گھرداری میں پڑ کر سب بھول بھال جاتیں۔ اسی کشمکش میں، میں اپنی زندگی کی تیس بہاریں دیکھ چکا تھا، یہ سال جاتا کہ میں اکتیس کے سرے پر آ کھڑا ہوتا۔

مگر اس بار بڑی آپا واقعی اس معاملے میں سنجیدہ تھیں۔ وہ اپنی نند کی بیٹی رانیہ کی تصویر لے کر آئی تھیں۔

"یہ لو عمیر! رافع نے تمہاری الماری کی دراز میں ہی رکھ دی تھی۔" انہوں نے ایک لفافہ جس میں رانیہ کی تصویر تھی، میری سمت بڑھایا۔ میں نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھول کر لفافے کی سمت دیکھا، پھر ہاتھ میں پکڑ کر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

"اماں! بڑی ہی پیاری بچی ہے۔ فقط اکیس سال کی ہے، خوب صورت من موہنی سی، عمر کے ساتھ خوب ہی جچے گی۔ اور ہمارا عمر تو ہے ہی لاکھوں میں ایک۔ نیک، باحیا، صوم و صلوٰۃ کا پابند، مجھے یقین ہے میری نند ہمارے صراط مستقیمی گھرانے میں رشتہ جوڑ کر ہمیشہ فخر محسوس کریں گی۔"

آپا، رانیہ اور میری تعریفوں میں رطب اللسان تھیں اور ہمیشہ کی طرح تان لفظ "صراط مستقیمی گھرانے" پر ہی ٹوٹی تھی۔ گویا یہ جملہ کہنا بذات خود ایک سند کی حیثیت رکھتا ہو اور ہمیشہ ہی کی طرح اماں جان بڑی آپا سے سو فیصد متفق تھیں۔

"ارے عائشہ! کل تم فون پر اپنی پھپھو کے متعلق کچھ کہہ رہی تھیں۔ مگر رابطہ ہی ٹوٹ گیا تھا، کیا بات تھی؟" اماں کو کل کی بھولی بسری بات یاد آئی تھی۔

"ارے اماں! کیا بتاؤں۔ نیکی کا زمانہ ہی نہیں۔ میں

پھپھو کے گھر حسن آرا کے لیے اپنے دیور کا رشتہ لے کر گئی تھی مگر پھپھو نے صاف جواب دے دیا۔"

میں جواب تک آنکھیں موندے مزے سے لیٹا تھا۔ چونک کر سیدھا ہو گیا۔

"کیوں بھئی۔ مدحت کی کیا مت ماری گئی ہے۔ لڑکی کو کیا ساری عمر بٹھائے رکھنے کا ارادہ ہے۔" اماں سخت حیران تھیں۔

"میرا خیال ہے حسن آرا نے ہی انکار کیا ہو گا۔ لگتا ہے اب بھی اسے اپنے حسن پر ناز ہے۔ بے شک میرا دیور رنڈوا ہے۔ دو بچوں کا باپ ہے۔ مگر دل کا تو اچھا ہے نا۔ پہلی بیوی کو بھی اس نے خوش رکھا تھا۔ اب اگر ہماری دیورانی عمر ہی تھوڑی لکھوا کر آئی تھی تو یہ خدا کی مرضی ہے۔ مگر حسن آرا بھی کوئی ننھی بچی تو نہیں ہے۔ خیر سے فاطمہ کی ہم عمر ہے اور ہماری فاطمہ اب چار بچوں کو سنبھالے بیٹھی ہے۔ میرے سسرال کا معاملہ تھا۔ میں تو سب کے سامنے نکو بن کر رہ گئی۔"

بڑی آپا سخت کبیدہ خاطر تھیں۔

"تم فکر نہ کرو عائشہ! میں تمہارے ابا میاں سے بات کروں گی کہ وہ مدحت سے اس سلسلے میں بات کریں۔"

اماں، بڑی آپا کو تسلی دے رہی تھیں۔ میں بے چین سا ہو کر ان کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا۔

بھلا کہاں حسن آرا جیسی سلجھی ہوئی اور نازک اندام لڑکی اور کہاں بڑی آپا کا گیم شحیم دیور، جو ایک عدد بیوی بھگتا چکا تھا۔

اماں جان کے کمرے سے نکل کر میں اپنے کمرے میں آیا اور لفافے میں سے تصویر نکال کر دیکھنے لگا۔ وہ واقعی اکیس سال کی خوب صورت سی لڑکی تھی جو اسٹائل سے ایک طرف دوپٹا ڈالے، خوب صورت سے انداز میں میری نگاہوں کے سامنے تھی۔

"حیرت ہے! ساری زندگی آپا مجھے صراط مستقیم کا سبق پڑھاتی رہیں اور میرے لیے لڑکی دیکھتے وقت صرف ظاہری خوبیوں پر نگاہ کی۔"

تصویر اچھی تھی مگر میرے دل کو نہ چھو پائی۔۔۔ میں نے بے دلی سے دراز میں ڈال دی۔

اور وہ تصویر میرے دل کو کیوں نہ چھو پائی تھی۔ یہ راز مجھ پر اگلے دن کھلا، جب میں پھپھو کے گھر پہنچا۔

☼ ☼ ☼

"باجی! انسان کو سیدھا راستہ کیسے ملتا ہے۔ کیا نماز پڑھنے سے ایسا ممکن ہے؟"

کوئی بچی دینیات کی کتاب کھولے حسن آرا سے مخاطب تھی۔ میں پھپھو کے کمرے سے نکلتے ہوئے دروازے میں ہی رک گیا۔ مجھے حسن آرا کا جواب سننا تھا۔

"بیٹا! اللہ سے توفیق مانگنے سے، بار بار عاجزی و انکساری سے اس کے دربار میں خود کو کھوٹا سکہ سمجھ کر خالص سونا بنا دینے کی عرضی پیش کرنے سے صراط مستقیم کا پتا ملتا ہے۔ بنا توفیق کے کوئی راہ نہیں نکلتی۔ چاہے کوئی ساری زندگی زمین پر ماتھا ٹیکتا رہے اور جب توفیق ملتی ہے تو قدم صرف ایک ہی محترم و مبارک ہستی کے نقش قدم پر اٹھتے ہیں، جو اخلاق کے کامل درجے پر فائز ہیں اور جنہیں رحمتہ اللعالمین کہا جاتا ہے۔

ہم جو بھی عمل کریں، صرف دو باتیں دھیان میں رکھ کر کریں۔۔۔ ایک یہ کہ ہم اپنے ہر عمل کے لیے، چاہے وہ رائی کے دانے کے برابر کیوں نہ ہو، خدا کے آگے جواب دہ ہیں اور دوسرا یہ کہ ہمارا عمل سیرت طیبہ سے ہم آہنگ ہے یا نہیں۔ کلمہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج یہ ارکان اسلام ہیں۔ ان پر ایمان رکھنا اور عمل پیرا ہونا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ مگر اصل مومن وہ ہوتا ہے جس کا اخلاق سب سے بہترین ہوتا ہے۔ جس کے معاملات لوگوں سے سلجھے رہتے ہیں اور ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ۔۔۔

"مومن وہ ہے جس سے لوگوں کو اپنی جان و مال کا کوئی خطرہ نہ ہو۔۔۔ مومن کبھی طعنے دینے والا، لعنت کرنے والا، بدگو اور زبان دراز نہیں ہوتا۔" اس لیے

میرے پیارے بچو! جو مومن بنے رہنے کی ہردم سعی کرتا ہے' وہ صراط مستقیم پر ہمیشہ گامزن رہتا ہے۔"

حسن آرا نرمی اور محبت کے ساتھ بچے' بچیوں سے مخاطب تھیں اور ان کا کہا ایک ایک لفظ میری سماعتوں میں جذب ہوا جا رہا تھا۔

بھلا میں اس راستے کا مسافر کیوں کر ہو سکتا تھا۔ میں نے تو کبھی توفیق چاہی نہ تھی اور اس پر ہمارا یہ حال تھا کہ ہم خود پر نازاں تھے۔ میرے دل میں حسن آرا کا جو مقام تھا' وہ آج اور اونچا ہو گیا تھا۔ بس وہی ایک لمحہ تھا۔ جب میرے دل نے حسن آرا سے شادی کا قصد کیا۔

☼ ☼ ☼

جس نے سنا دانتوں میں انگلی داب لی کہ میں یعنی عمر حسن حسن آرا سے شادی کا خواہش مند تھا۔ گویا یہ خبر نہ تھی ایک دھماکا تھا جس نے سب کے اعصاب جھنجھلا کر رکھ دیے تھے' بڑے ہال نما کمرے میں ہونے والی سرگوشیاں اب اونچی آوازوں میں بدل چکی تھیں۔

"شرم تو نہ آئی بالشت بھر کے لڑکے کو اپنے جال میں پھنساتے ہوئے۔ توبہ توبہ!" اماں نے باقاعدہ اپنے گال پیٹے۔

"ارے! اگر بتول کی بیٹیوں کا نام بھی لیا ہوتا تو سمجھ میں آتی بھی کہ ہم عمر ہیں' چلو ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے دل کو بھا گئی ہوں گی مگر حسن آرا... ہائے عمر! یہ کیا کہا تو نے..." صدمے سے ان کے اوسان خطا تھے۔

"آئے ہائے آپا! میری بیٹیوں کا کیا ذکر..." بتول خالہ جو پاس ہی بیٹھی تھیں' تڑپ اٹھیں۔

"میری بیٹیوں کو ایسے عشوے نخرے دکھلانے نہیں آتے' آئی سمجھ... یہ حسن کے تیر تو تمہاری نند کی بیٹی حسن آرا ہی چلا سکتی تھی۔"

وہ برقعہ سنبھال کر باہر کو لپکیں۔ بتول خالہ کا تڑپنا بنتا بھی تھا۔ کب سے ان کی نظریں مجھ پر لگی تھیں۔ بانکا سجیلا بھانجا تھا۔ مرکزی مارکیٹ میں گاڑیوں کے اسپیئر پارٹس کی بڑی سی دکان تھی اور پھر اکلوتا... فائزہ' ربیعہ یا بانو جس بیٹی کا بھی مجھ سے نصیب جڑتا گویا راج کرتی...

اماں ارے ارے کرتی ہی رہ گئیں مگر بتول خالہ نہ رکیں۔ میرے اس اعلان نے ان کے سارے خواب چکنا چور کر دیے تھے۔

"اماں پلیز! آپ حسن آرا کو الزام نہ دیں۔ وہ ایسی نہیں ہیں۔ وہ تو اس بات سے یکسر لاعلم ہیں۔" میں اپنی جگہ منمنایا۔

"واہ عمر واہ! ابھی اس گھر میں وہ بی بی قدم رنجہ نہ فرمائیں اور تم اس کی حمایت کر رہے ہو۔ اور آپ جناب کا تخاطب تو دیکھو... یعنی تمہیں بھی یہ احساس ہے کہ وہ چھ سال بڑی ہے تم سے۔" اماں کی کھولن کم نہ ہو رہی تھی۔

"آئے دن پھپھو کے گھر کے چکر یونہی تو نہ لگتے تھے۔ یہاں تو سال گزر جاتا اور تم ہمارے گھر نہ جھانکتے تھے۔"

منجھلی آپا فاطمہ کو بھی شاک لگا تھا۔ حسن آرا اور وہ ہم عمر تھیں۔ ساتھ ساتھ بڑی ہوئی تھیں۔ مگر فاطمہ آج بھی حسن آرا کے حسن سے خائف تھی اور ان کے لیے دل میں آج بھی رقابت اور حسد محسوس کرتی تھیں۔

"اماں! آخر برائی کیا ہے حسن آرا میں' خوب صورت' سلیقہ شعار' اور مہذب ہیں۔ جب بھی آتی ہیں' آپ کے لیے اور ابا کے لیے نت نئے کھانے بنا جاتی ہیں۔ گرمی' سردی کے سارے کپڑے آپ ہمیشہ ان سے سلواتی ہیں کہ حسن آرا کے ہاتھ کی صفائی ٹیلر ماسٹر کو بھی مات دیتی ہے۔ چھوٹی آپا اور مریم آپا کی شادی کی ساری تیاری آپ نے ان کے ساتھ مل کر کی تھی کہ بڑی آپا ان دنوں عمرے پر گئی ہوئی تھیں اور منجھلی آپا کی ساس بیمار تھیں۔ اور تو اور مریم آپا کے ہاں جب غفران ہوا تو میوے سوجی کی پنجیری بھی وہی بنا کر لائی تھیں..."

حسن آرا کی خدمات ان گنت تھیں مگر میں صرف چیدہ چیدہ ہی گنوا رہا تھا۔ میری بات سن کر ہر کوئی چراغ پا ہو گیا۔

"دیکھ رہی ہیں اماں! آپ اسے۔ محترم کیا تعریفوں میں رطب اللسان ہیں۔ ارے ہمارے صراط مستقیمی ابا نے اولاد کو سیدھی راہ پر رکھنے کے لیے کیا کچھ نہ کیا۔ اور یہ ہیں کہ ایک نامحرم لڑکی کی شان میں قصیدے پڑھ رہے ہیں۔" چھوٹی آپا تڑپ کر بولی تھیں۔

"صراط مستقیمی اور ہم... ہا۔" میں نے تلخی سے جملہ ادھورا چھوڑا اور جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اماں... میں حسن آرا سے محبت کرتا ہوں اور ان ہی سے شادی کروں گا۔ آپ سب لوگ یہ بات کان کھول کر سن لیں۔" میں پلنگ کے پائے کو ٹھوکر مارتا باہر نکل آیا تھا۔ مگر بڑی آپا کی بات نے میرے بڑھتے قدم روک دیے۔ وہ پوری گفتگو کے دوران اب تک نہ بولی تھیں۔ گویا صدمے میں تھیں۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی اماں! حسن آرا ایسا اوچھا وار کرے گی۔ پھپھو کے انکار کہلا بھیجنے کے بعد بھی یہ بات میرے لیے معما تھی کہ آخر حسن آرا کس برتے پر میرے دیور کا رشتہ ٹھکرا رہی ہے۔ چھتیس سال کی ہونے والی ہے۔ باپ کو مرے عرصہ گزرا اور بھائی کی موجودگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ سمجھ میں تو اب آیا ہے۔ اس نے ہمارے کاٹھ کے الو جیسے بھائی کو جو اپنے بس میں کیا ہوا تھا مگر بے فکر رہیں اماں... میں دوسری بار حسن آرا سے ہار نہیں مانوں گی۔ یہ میری ناک کا معاملہ ہے' سسرال میں میری ساکھ کی بات ہے یہ... مجھے جو کرنا پڑا میں کروں گی مگر حسن آرا کی شادی عمر سے نہ ہونے دوں گی۔ عمر کو شادی تو رانیہ سے ہی کرنا پڑے گی۔"

آپا کا لہجہ ٹھوس تھا... مگر میں پر یقین تھا کہ جب یہ بات ابا میاں کی عدالت میں جائے گی تو فیصلہ میرے حق میں ہی ہو گا۔ آخر حسن آرا ان کی سگی بھتیجی تھیں اور سب سے بڑھ کر وہ ہر بات میں قرآن و حدیث کا حوالہ دیتے تھے۔ یقیناً" وہ میرے فیصلے سے خوش ہوتے کہ میں ایک احسن قدم اٹھانے جا رہا ہوں۔

☼ ☼ ☼

ابا میاں نے مجھے اپنے کمرے میں طلب کیا تھا۔ یقیناً" میری صبح کی کہی گئی ساری گفتگو من و عن ان تک پہنچ چکی تھی۔ میں قدرے جھجکتا ہوا ان کے کمرے میں حاضر ہوا۔ صد شکر تھا کہ کمرے میں صرف ابا میاں اور اماں بی تھیں۔ بہنوں میں سے کوئی نہ تھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ میں نے اپنے حق کے لیے سب کے سامنے اونچی آواز میں بات کی تھی۔ ورنہ آج سے پہلے میں گھر کا سب سے چھوٹا بچہ ہونے کی حیثیت سے سب کے فیصلے مانتا اور ان پر عمل کرتا آیا تھا۔

"آؤ برخوردار! ہم نے سنا ہے کہ تم نے رانیہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔" ابا جان اپنی آگے پیچھے جھولتی ہوئی کرسی پر براجمان تھے۔

"جی..." میں نے مختصراً" کہا۔

"کیوں' کیا کمی ہے اس بچی میں؟"

"جی کمی تو کوئی نہیں ہے۔ اصل میں' میں رانیہ کے بجائے حسن آرا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے آہستگی سے کھل کر کہہ ہی دیا تھا۔

"ہوش میں تو ہو عمر! حسن آرا تم سے عمر میں چھ سال بڑی ہے۔ بھلا میری تربیت میں کہاں کمی رہ گئی تھی کہ تمہاری نگاہ چوک گئی اور حسن آرا آپا تمہارے لیے فقط حسن آرا بن کے رہ گئی۔"

ابا میاں کی آواز میں گونج تھی۔ انہوں نے مجھے نفسیاتی طریقے سے گھیرا تھا۔

"ابا میاں! بے شک میں انہیں احترام میں حسن آرا آپا کہتا تھا مگر ہیں تو وہ میری پھپھو زاد نا... اور شریعت کی رو سے ان سے میری شادی جائز ہے۔ رہی بات عمر میں چھ سال بڑی ہونے کی تو میرے لیے عمروں کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا۔ آخر ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ و سلم نے بھی تو اپنے سے پندرہ سال بڑی خاتون سے شادی کی تھی۔" میں آگے بھی کچھ کہتا کہ ابا میاں نے گرج کر میری بات کاٹ دی۔

"واہ میاں واہ... تم جو جمعہ کے لیے بھی مارے

باندھے جامع مسجد جاتے ہو۔ روزے کے لیے سحری میں اٹھنا بھی تمہیں دشوار لگتا ہے۔ آج شادی کی بات آئی تو شریعت کو درمیان میں لے آئے اور مثال بھی نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی دیتے ہو۔ ارے۔ ان کے تو ہر فعل میں حکمت ہوتی تھی۔"

ابا میاں نے زور سے ڈانٹ پلائی تھی اور میں جو اس فعل کے پیچھے چھپی حکمت کی وضاحت کرنا چاہتا تھا' خاموش ہی کھڑا رہ گیا۔ ورنہ یہ ضرور واضح کرتا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فعل کیا ہی اس لیے تھا کہ امت کو بتایا جاسکے کہ شادی کا معیار سیرت و کردار کی خوبی ہونا ہوتا ہے نا کہ عمروں کا فرق اور ظاہری خوب صورتی۔

"پتا نہیں اس چڑیل نے کیا جادو کردیا ہے کہ صبح سے اسی کے نام کی مالا جپ رہا ہے۔ ماں باپ کا بہنوں کا کسی کا کوئی لحاظ ہی نہیں رہا ہے۔ بھلا بتاؤ! لوگ کیا کہیں گے کہ اکلوتے بیٹے کے لیے وہی لڑکی رہ گئی تھی جو چھ سال تک کسی اور کے نام پر منگنی کی انگوٹھی پہنے رہی۔

اور پھر میری عائشہ۔۔۔ اس کی کیا عزت رہ جائے گی سسرال میں۔ دیور کا رشتہ لے کر گئی تو مدحت نے انکار کردیا۔ رانیہ کی بات یہاں چلانا چاہی تو یہ موصوف راضی نہیں۔ میاں صاحب! سمجھائیں اسے کہ ہمارے خاندان میں محبت جیسی خرافات کی کوئی گنجائش نہیں۔" اماں جان جواب تک خاموش بیٹھی تھیں' چیخ پڑیں۔

"کیا تم واقعی اس معاملے میں سنجیدہ ہو۔" ابا میاں نے اماں جی کی پوری بات سنی' پھر میری طرف دیکھا۔ میں نے گردن جھکادی۔

"ٹھیک ہے میں مدحت اور حسن آرا سے بات کروں گا مگر یاد رکھنا! اگر وہاں سے انکار ہوا تو تمہاری شادی وہیں ہوگی' جہاں ہم سب چاہتے ہیں۔ اب تم جاؤ۔"

ابا میاں نے فیصلہ سنادیا تھا۔

"میاں صاحب! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ بھلا مدحت اور حسن آرا کیوں انکار کریں گی۔ بھلا گھر آئی لکشمی کون ٹھکراتا ہے۔ لڑکے کو اپنے قابو میں کیا ہی اسی لیے ہے کہ وہ ان کی ہی زبان بولے۔"

اماں سخت کبیدہ خاطر تھیں اور میں اور میرا باغی دل مسرت سے سرشار تھا۔

☆ ☆ ☆

آج میرا ولیمہ تھا۔ شادی ہال بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ ہفتہ بھر سے گھر میں رونق لگی تھی۔ میں یعنی عمر حسن جو اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا اور چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ اس کی شادی کا سب کو بے حد ارمان تھا۔ اس لیے مایوں' مہندی سے لے کر بارات تک ہر ضروری اور غیر ضروری رسم ادا کی گئی اور ایسے میں کسی کو یہ بات یاد نہ آئی کہ یہ رسمیں نہ مذہب کا حصہ ہیں اور نہ شریعت کا۔

اماں جان ہر ایک سے مبارک بادیں وصول کررہی تھیں۔ ابا میاں فخر سے سینہ تانے سب مہمانوں سے مل رہے تھے۔ ہر کوئی ان کے فیصلے کو سراہ رہا تھا کہ بیٹے کی خوشی کے ساتھ ساتھ انہوں نے بیوہ بہن کی بیٹی کا بھی خیال رکھا اور بڑی آپا عائشہ۔۔۔ وہ اپنی سسرال میں مزید معتبر ہوگئی تھیں۔ میرا پہلو بھی آباد ہوچکا تھا مگر میرا دل ہنوز خالی تھا اور شاید عمر بھر اب اسے یونہی خالی رہنا تھا کہ باغی ہونے کی کچھ تو سزا اس کا نصیب بنتی۔

ہال میں دو اسٹیج بنے ہوئے تھے۔ ایک پر میں اور رانیہ ولیمہ کے دولہا دلہن کی حیثیت سے بیٹھے تھے اور قدرے فاصلے پر بنے دوسرے اسٹیج پر بڑی آپا کے دیور کے پہلو میں کچھ دیر قبل نکاح کے بعد حسن آرا کو لاکر بٹھایا گیا تھا۔

ابا میاں کے کمرے میں اس رات جو مسرت و شادمانی کا لمحہ میری زندگی میں آیا تھا۔ وہ بہت مختصر ثابت ہوا تھا۔ جب مجھے پتا چلا کہ پھپھو نے میرے لیے انکار کہلا بھیجا ہے اور حسن آرا کی جنید سے شادی کے لیے راضی ہیں تو میں سرتاپا جھلس گیا تھا۔

بے شک وہ میری محبت سے آگاہ نہ تھیں۔۔۔ مگر کہاں جنید اور کہاں میں۔ حسن آرا کے لیے میں اپنے گھر والوں کے سامنے ڈٹ گیا تھا اور وہ مجھے ٹھکرا گئی تھیں۔

شدید تکلیف کے احساس نے مجھے دکان سے سیدھا گھر جانے کے بجائے ان کے دروازے پر لا کھڑا کیا تھا۔ دروازہ کتنی ہی دیر دستک دینے کے بعد کھلا تھا۔ سامنے وہی دشمن جاں تھی۔ الجھی الجھی سی' اجڑی اجڑی سی۔ وہ ایک طرف ہوگئیں میں اندر آگیا۔

"پھپھو کہاں ہیں۔" میں پوچھنا چاہتا ہوں ان سے کہ انہوں نے میرا رشتہ کیوں رد کیا۔۔۔" نہ سلام نہ دعا۔ میں نے براہ راست بات کی۔

"انہیں بہت تیز بخار ہے۔ وہ سو رہی ہیں۔ اور رشتہ امی نے نہیں میں نے رد کیا ہے۔" وہ آہستگی سے بولیں۔

"مگر کیوں حسن آرا! جب فیصلے کا اختیار آپ کے ہاتھ میں تھا تو آپ نے ایسے شخص کو کیوں چنا جو آپ کے قابل نہیں ہے۔ اور میں۔۔۔ مجھ میں کیا کمی ہے؟؟"

"فیصلے کا اختیار میرے ہاتھ میں کب تھا۔ ماموں میاں بے شک آئے تھے۔ مگر ایسے نہیں جیسے بیٹی کا باپ' اپنی بیٹی کی رضامندی جاننے کے لیے آتا ہے۔ انہوں نے تو یہاں عدالت لگا کر مجھے کٹہرے میں کھڑا کردیا تھا۔ تمہارے سب گھر والے تھے۔ بہت دھول اڑی ہے یہاں پر۔۔۔ میرا کردار' میری ماں کی تربیت' ان کی عزت' سب اس دھول میں اٹ گئے۔" حسن آرا کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

"اور تم بتاؤ منے میاں۔۔۔! میں نے تمہیں محبت و التفات کا ایسا کون سا سرا تھمایا تھا کہ تم یہ سمجھے میں تم سے شادی کروں گی؟" بہت عرصے بعد انہوں نے مجھے بچپن کے تخاطب سے پکارا تھا۔

"تم نے شاید مجھے کبھی غور سے دیکھا ہی نہیں۔ ورنہ یہ ضرور جان جاتے کہ میری آنکھوں میں آج بھی فرہاد کا عکس ہے۔

لڑکیاں تو کوری مٹی کے پیالوں کی طرح ہوتی ہیں۔ سنبھال سنبھال کے آپ برسوں ان میں پانی پی سکتے ہیں مگر ذرا سی چوک ہوئی۔۔۔ اور پیالا ٹوٹ گیا۔ پھر وہ کسی کی پیاس بجھانے کے کام نہیں آتا۔ فرہاد کیا گیا' میرے اندر بھی دراڑیں ڈال گیا۔ مگر پرسوں رات میں پوری طرح ٹوٹ گئی۔ جب میری روتی سسکتی ماں نے ہاتھ جوڑ کر مجھے جنید سے شادی کرنے کا کہا۔۔۔ اور اب میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑ رہی ہوں۔ میرے راستے میں پھر کبھی نہ آنا۔"

حسن آرا نے اپنے دونوں ہاتھ میرے سامنے جوڑ دیے۔ میں تڑپ اٹھا۔ آنسو موتیوں کی طرح ان کی آنکھوں سے گر رہے تھے اور خود میری آنکھوں کے آگے بھی آنسوؤں کی چادر سی تن گئی تھی۔

زندگی میں آخری بار میں نے بے اختیار ان کے کبوتر کے پروں کی طرح سفید اور ملائم ہاتھ کچھ ساعتوں کے لیے چھوئے اور اپنی سسکیوں کو دباتا ان کے گھر کی چوکھٹ ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا۔

کاش! میں نے اپنے باغی دل کو سمجھالیا ہوتا تو آج حسن آرا پر یوں تہمت نہ لگتی اور وہ اپنے فرہاد کی یادوں کے ساتھ ساری زندگی جیتی رہتیں۔

اماں نے میرا شانہ ہلایا تو میں ماضی سے حال میں لوٹ آیا۔ حسن آرا کی رخصتی کی جارہی تھی۔ وہ ہمیشہ کے لیے جنید کے ساتھ ملتان جارہی تھیں۔ میرے سارے گھر والے قرآن کے سائے میں انہیں رخصت کرنے کے لیے ان کے گرد جمع تھے۔ میں اپنے لیے سجائے گئے اسٹیج پر یکہ و تنہا کھڑا تھا اور دوسرے اسٹیج پر کھڑے ہجوم کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ جانے اصل صراط مستقیم کون تھا۔ حسن آرا یا میرے گھر والے؟

☆☆

عفت سحر طاہر

میرے ہمدم میرے دوست

"آخر تم بولتی کیوں نہیں اپنے باپ سے کہ تمہیں اس شادی پہ اعتراض ہے؟"
ماما بھی اسی پہ چڑھ دوڑی تھیں اور وہ بلک کے رو دی۔ باپ کی لاڈلی تھی پر منہ پھٹ نہیں تھی اور نہ ہی اتنی بے دید و بدلحاظ کہ ان کے سامنے جا کھڑی ہوتی۔ البتہ ماما سے کہہ دیا کہ اس کا اعتراض پاپا تک پہنچا دیں۔ اور اسی رات پاپا کے حضور جواب طلبی بھی ہو گئی۔

مکمل ناول

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ بہت اعتماد کے ساتھ ان کے کمرے میں گئی۔ ماما ایک طرف منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔ یقیناً" وہ پاپا کے ساتھ لاحاصل بحث کر کے منہ کی کھا چکی تھیں۔ ہانیہ کا دل ڈوب سا گیا۔

پاپا نے اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے اپنے سامنے بیڈ پر بیٹھنے کا کہا تو وہ ایک نظر ماما کے خفگی سے پر چہرے کو دیکھنے کے بعد پاپا کے سامنے بیٹھ گئی۔

"اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں تمہاری؟" یہ تمہید تھی۔ ہانیہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"ٹھیک پاپا۔۔۔"

"اور۔۔۔ آگے کا کیا سوچا ہے تم نے۔ آئی مین ماسٹرز کے بعد؟" انہوں نے بات جاری رکھی۔ ہانیہ نے محتاط لفظوں کا سہارا لیا۔

"میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں پاپا!" اس نے امید بھری نظروں سے انہیں دیکھا' پھر ایک نظر ماما پر ڈالی تو انہوں نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلا کر گویا اسی لائن کو آگے بڑھانے کا اشارہ دیا۔

"اور پاپا! آپ نے میری ہر بات مانی ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی خواہش بھی نہیں ٹالی۔ میری ہی نہیں' زونیہ اور سعدیہ آپی کی بھی۔ آئی ہوپ! آپ مجھے میرے فیوچر کا فیصلہ کرنے کا حق بھی دیں گے۔" اس نے ذومعنی بات کی۔ نہ کہتے ہوئے بھی سب کہہ گئی۔

پاپا خاموش ہو گئے۔ ہانیہ کا دل کانوں میں دھڑکنے لگا۔ اس نے دزدیدہ نظروں سے پاپا کو دیکھا۔ وہ جیسے کسی سوچ میں گم تھے' پھر گہری سانس بھر کے مسکرائے۔

"اوکے۔۔۔ تم جتنا جی چاہے پڑھو۔ چاہے تو جاب بھی کر لینا۔ میں تمہیں کبھی نہیں روکوں گا مگر اس کے بدلے آج پہلی بار تم سے میں ایک فرمائش کرنا چاہتا ہوں تو کیا میری بیٹی میری وہ فرمائش پوری کرے گی؟"

"اگر میرے بس میں ہوا تو ضرور پاپا۔۔۔" وہ برافروختہ سی ہونے لگی۔ پاپا نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ ملائمت سے اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھاما اور ہونٹوں سے چھو لیا۔ ہانیہ کا دل موم ہونے لگا۔

"میری عزت' میرا وقار' میری زبان سب تم ہی سے ہے ہانی!" پاپا نے بات کیا شروع کی' اپنی عزت کا سارا بار ہی اس کے سر پہ رکھ دیا۔

"اسے ایموشنلی بلیک میل مت کرو وقار۔" ماما نے تیز لہجے میں کہا۔

"تم چپ رہو ثمینہ! جیسے میں سعدیہ اور زونیہ کی مرتبہ چپ رہا تھا۔" پاپا نے سرد انداز میں انہیں خاموش کروا دیا اور ہانیہ کو لگ رہا تھا کہ وہ کسی شکنجے میں پھنسنے والی ہے اور اس سوچ کے ساتھ ہی اس کی سانس رکنے لگی۔

"میں چاہتا ہوں کہ تمہاری میرڈ لائف بہت اچھی اور کامیاب ہو ہانی! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ سعدیہ اور زونیہ کے رشتوں پر میں دل سے راضی نہیں تھا۔ مگر تمہاری ماں اور بہنوں کی بے جا ضد کے آگے میں ہار مان گیا۔"

"تو کیا غلط ضد کی تھی ہم نے؟ عیش کر رہی ہے سعدیہ اور زونیہ کے سسرال والوں کا بھی شہر میں اونچا نام ہے۔" ماما پھر سے ضبط کھو بیٹھیں۔

"اگر تم خاموش نہیں رہ سکتیں تو دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔ میں ہانیہ سے ضروری بات کر رہا ہوں۔"

پاپا کا انداز ماما کے لیے کافی عرصے سے سرد ہی تھا۔ جب سے سعدیہ آپی کی شادی ہوئی تھی یا پھر بعد میں جب زونیہ نے ضد کی کہ وہ علی ہی سے شادی کرے گی اور ماما نے بیٹیوں کا پورا پورا ساتھ دیا۔ پہلے سعدیہ آپی نے سلیپنگ پلز تک کھالیں معیز بھائی کے پیچھے اور زونیہ نے محض دھمکی ہی دی تھی کہ پاپا مان گئے مگر اس دن کے بعد سے پاپا اور ماما کے مابین محسوس کن سرد مہری آگئی تھی۔

ماما منہ دوسری طرف کر کے بیٹھ گئیں۔ ہانیہ کی رنگت زرد تھی۔ اس کی دنیا میں روشنیوں سے پہلے ہی اندھیرا ہونے والا تھا' یہ وہ اچھی طرح جان چکی تھی۔ وہ کبھی بھی اپنے پیارے پاپا کو نیند کی گولیاں کھا لینے اور ایزد کے بغیر مر جانے کی دھمکی نہیں دے سکتی تھی۔ وہ سب سے چھوٹی تھی۔ پاپا کی لاڈلی' پاپا کے

رنگ میں رنگی۔

"میں نرگس کی طرف جاتا ہوں' بلکہ پچھلے دو سالوں سے جا رہا ہوں' تمہیں پتا ہے نا؟" پاپا نے اپنی اکلوتی بہن کا ذکر کرتے ہوئے ہانیہ کو متوجہ کیا تو اس نے مرے مرے انداز میں سر ہلایا۔

"بہت اچھا ماحول ہے ان کا۔ سادگی اور اپنائیت سے بھرا۔" پاپا بہت جذب سے بول رہے تھے۔ خوشی ان کے چہرے پر چمک رہی تھی اور ہانیہ کا دل ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا۔

وہ اس سے کیا مانگنے والے تھے' وہ جانتی تھی۔

"کہنے کو تو گاؤں ہے' مگر اب تو وہاں ہر کوئی پڑھ رہا ہے۔ اعلا تعلیم کے لیے شہر آ رہا ہے۔ نرگس کے سارے بچے بھی بڑے اچھے اسکولز اور کالج میں پڑھے ہیں۔ میں تو حیران رہ گیا تھا دیکھ کر۔"

"خدا کے لیے وقار! بند کرو یہ نرگس نامہ۔ یہ اس آزمائش کے قابل نہیں ہے۔ میں نے اپنی بیٹیوں کی ایسی تربیت نہیں کی کہ وہ لاہور جیسے شہر سے اٹھ کے کسی چک میں بیاہ کے چلی جائیں۔" ماما تنفر سے بولیں۔ اب کی بار پاپا نے انہیں نظر انداز کرتے ہوئے سیدھے سبھاؤ ہانیہ سے پوچھا۔

"میری خواہش تھی اللہ مجھے ایک بیٹا دیتا ہانیہ! سعدیہ اور زونیہ کی مرتبہ بھی یہ خواہش تھی مگر تمہاری دفعہ تو میں نے خدا سے بہت گڑگڑا کے دعائیں مانگیں۔ تب تم پیدا ہوئیں تو میں نے تم سے نفرت نہیں کی بلکہ یہ سوچ کر کہ اللہ نے یقیناً" میرے حق میں بہترین فیصلہ کیا ہے' میں نے سب سے زیادہ محبت تمہیں دی۔ تم سعدیہ اور زونیہ سے بہت الگ ہو اور میں جانتا ہوں کہ تم ان کی دنیا میں خوش رہ بھی نہیں سکتیں۔ اسی لیے میں نے نرگس سے خود بات کی ہے تمہارے اور عباد کے رشتے کی۔ اب تم بتاؤ کیا میرا تم پر اتنا بھی حق نہیں تھا؟"

ہانیہ سمجھ گئی۔ پاپا اس کے ہاتھ سے ایزد لے کر عباد تھمانا چاہ رہے تھے۔ تھے تو دونوں کھلونے۔ پر ایک ہانیہ کی مرضی کا تھا اور دوسرا پاپا کی مرضی کا۔۔۔ تو اسے کیا کرنا چاہیے؟ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔

"پاپا۔۔۔ میں کیسے اجنبی لوگوں میں۔۔۔ آئی مین! ایک گاؤں میں کیسے رہ سکتی ہوں میں؟" اس کی پلکیں بھیگنے لگیں۔

"وہ تمہاری پھپھو کا گھر ہے بیٹا! وہاں کوئی بھی تمہارے لیے اجنبی نہیں ہے۔ عباد ہے' اس سے چھوٹی کرن اور پھر سعد' سب دوستوں کی طرح ہیں۔ بلکہ جتنی محبت اور اپنائیت میں نے اس گھر میں دیکھی ہے' ویسی ان شہروں میں کہیں نہیں دیکھی۔" وہ اس کے ہر اعتراض کا منہ بند کر رہے تھے۔

"اور رہنا گاؤں یا شہر میں نہیں ہوتا ہانیہ! بلکہ لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ شہر کے لوگ بدترین ہوں تو ان کے ساتھ رہا جا سکتا ہے کیا؟ ساری بات انسانیت کی ہے۔ وہ چاہے شہروں میں ہو یا دیہاتوں میں۔" وہ نرمی سے بول رہے تھے۔ ہانیہ کا دل پگھل کر آنکھوں کے رستے بہنے لگا۔

"پاپا۔۔۔ میں نے کبھی اپنے فیوچر کے متعلق اس طرح نہیں سوچا۔"

"تو اب سوچ لو ہانی۔۔۔ ٹیک یور ٹائم بیٹا! کوئی زبردستی نہیں تم پر۔ صرف میری خوشی اور مان ہے۔" پاپا کو شاید اس کے بہتے آنسو نظر ہی نہیں آ رہے تھے۔ یا شاید وہ ماما کے مقابلے میں اس بار اپنی ضد منوانے کی خاطر اتنے سخت دل ہو گئے تھے۔

انکار کے تند و تیز الفاظ ہانیہ کے ہونٹوں تک آ کر لوٹ رہے تھے۔

"جلدی بالکل بھی نہیں ہے۔ تم اچھی طرح سے سوچ لو۔ میں تمہیں نرگس کے گھر لے کے جاؤں گا۔ تم خود عباد سے ملنا۔ وہ بالکل میری طرح ہے۔" پاپا کے انداز میں محبت بول رہی تھی۔

ہانیہ چپ چاپ اٹھ کے آ گئی۔ پاپا کے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے پاپا کا تیز لہجہ اور پھر ماما کے چیخنے چلانے کی آوازیں اپنے کمرے تک آتے

ہوئے سنیں مگر وہ جیسے ایک عالم دکھ میں تھی۔ یا شاید عالم بے خودی میں۔ اس کا دوپٹا زمین پہ رلتا ہوا آرہا تھا۔

لاؤنج میں ٹی وی دیکھتی زونیہ نے ٹی وی کی آواز کم کرتے ہوئے اس سے کچھ پوچھا مگر ہانیہ کو کچھ سنائی ہی نہیں دیا۔ پاپا کی باتیں اس کی سماعتوں کو پر کر چکی تھیں۔ ان کی عزت اور مان کا بوجھ ہانیہ کی گردن جھکائے ہوئے تھا۔ اتنا کہ وہ زونیہ کو دیکھ نہیں پائی تھی۔ یوں ہی پاؤں گھسیٹتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

رات وہ بہت روئی۔ دل و دماغ نے ایک ہی فیصلہ کیا کہ وہ ایزد کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ فقط پاپا کی خوشی کی خاطر وہ اپنی ساری زندگی کی خوشیاں داؤ پر نہیں لگا سکتی۔

اس نے سوچ لیا کہ وہ بس ایک بار پاپا کی نافرمانی کرے گی اور اس کے بعد ساری عمر ان کی فرماں بردار بن کے رہے گی مگر بس یہ ایک فیصلہ وہ اپنی مرضی سے کرنا چاہتی تھی۔

"صبح میں پاپا کو صاف انکار کر دوں گی۔ مجھے عباد سے شادی نہیں کرنی۔" اس نے قطعی فیصلہ کرتے ہوئے منہ پہ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور تولیے سے منہ پونچھتی بیڈ پہ آبیٹھی۔

"میں پاپا کو منا لوں گی۔" اس نے ذہن کو مطمئن کیا۔ اب وہ قدرے بہتر محسوس کر رہی تھی۔

"پاپا نے کہا ہے مجھ پر کوئی زبردستی نہیں۔ میں جو چاہے فیصلہ کر سکتی ہوں۔"

وہ بیڈ پہ لیٹتے ہوئے ان کی بات دہرا کر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ بھی آف کر دیا۔ اس نے اپنی زندگی کی اچھی طرح پلاننگ کر لی تھی۔

مگر ہوتا تو وہی ہے جو خدائے بزرگ و برتر کی پلاننگ ہے۔

☆ ☆ ☆

آدھی رات کو زونیہ نے آکر اسے جھنجوڑا اور بتایا کہ پاپا کو ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔ وہ بے اختیار رونے لگی۔ نیند سے یوں ایک دم اٹھائے جانے اور اتنی بری خبر نے اس کے اعصاب پر شدید اثر کیا تھا۔ زونیہ نے اسے سختی سے ہلایا۔

"جلدی کرو' ماما کے ساتھ جانا ہے۔ ڈرائیور اور چوکیدار۔۔۔ کو بلوایا ہے ماما نے پاپا کو اسپتال لے جانے کے لیے۔" زونیہ اس سے زیادہ مضبوط اعصاب کی مالک تھی یا شاید ماما کی طرح قدرے بے حس۔

اور وہ اعصابی مریضہ کی طرح لرزتی کانپتی زونیہ اور ماما کے ساتھ پاپا کو لیے شہر کے بہترین اسپتال چلی آئی۔

پاپا آئی سی یو میں تھے۔ اس نے پاپا کے لیے ڈھیروں دعائیں کر ڈالیں اور اس دوران اس نے ماما کے چہرے پر سختی ہی دیکھی۔

چٹانوں کی سی سختی۔

ہانیہ کا رونے سے برا حال تھا اور زونیہ موبائل سے نمبرز ملاتی جانے کس کس کو اطلاع کرتی رہی۔ اگر وہ پریشان بھی تھی تو کم از کم ہانیہ کی طرح کھلی کتاب بن کے نہیں پھر رہی تھی۔

"سعدیہ آپی تو فیملی کے ساتھ بھوربن گئی ہوئی ہیں۔" زونیہ نے اطلاع دی۔

"اٹس او کے۔" ماما کے انداز میں لاتعلقی سی تھی۔ پھر انہوں نے بدحال سی ہانیہ کو تیز نظروں سے دیکھا۔

"تم اپنی حالت درست کرو۔ اب ٹھیک ہے وہ۔ ابھی آدھے گھنٹے تک روم میں شفٹ کر دیں گے اسے۔" ہانیہ نے شاکی نظروں سے ماں کو دیکھا۔

"میرے باپ ہیں وہ۔ فطری پریشانی ہے میری۔" اس کے آنسو پھر سے ابل آئے۔ زونیہ کو کوفت نے گھیرا۔

"تو رونے سے کیا مصیبت ٹل جاتی ہے۔"

"رات تو بالکل ٹھیک تھے پاپا۔ اتنی باتیں کیں مجھ سے۔۔۔ پھر اچانک۔۔۔" ہانیہ کو ماں سے پوچھتے پوچھتے اچانک ان کے کمرے سے اٹھنے والا شور شرابا یاد آنے

لگا تو وہ ان کا منہ دیکھنے لگی۔

"تو کون سا پہلا ہارٹ اٹیک ہے تمہارے باپ کا اور ویسے بھی انسان کسی بات پر اتنا ہی زور اور ضد لگائے جتنا کہ وہ برداشت کر سکتا ہو۔" ماما بہت سفاک تھیں۔ یہ ہانیہ کو اس لمحے ہسپتال کے اس کوریڈور میں علم ہوا۔

"اور تم۔۔۔" دفعتاً انہوں نے دانت پیسے۔

"خبردار! جو تم اس کی بلیک میلنگ کا شکار ہوئیں۔ بے وقوفوں کی طرح ہر فیصلے پر سر جھکا دینا محبت کی نہیں جہالت اور بے وقوفی کی نشانی ہے۔ سعدیہ اور زونیہ کو دیکھو۔ ہاتھ بڑھا کے ستارے توڑ لیے ہیں انہوں نے۔ تم کیوں باپ کی فرمائش پہ اپنے ہاتھ باندھ رہی ہو؟ یہ ایک فیصلہ ہے جس پر تمہاری اگلی ساری زندگی ڈیپینڈ کرتی ہے ہانیہ! اس کا اختیار اپنے ہی ہاتھ میں رکھو۔"

"مگر پاپا۔۔۔" ہانیہ کی آنکھوں سے گرم پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا۔

"شٹ اپ ہانی!" وہ سختی۔۔۔ بلکہ سخت دلی سے بولیں۔

"زندگی اور موت کے دن مقرر ہیں۔ کسی کی باتوں سے انسان کی زندگی بڑھتی یا کم نہیں ہوتی۔ تمہارے انکار سے اس کی زندگی کم نہیں ہو جائے گی اور نہ ہی اقرار سے سو سال بڑھ جائے گی۔ وہی فیصلہ کرو جو تمہاری مرضی ہے۔ ہاتھ بڑھاؤ اور ایک ستارہ تم بھی توڑ لو۔"

ہانیہ کو ان کی بہت سی باتوں پر اعتراض تھا مگر ان سب سے ایک طرف ماما کی اس قدر سخت دلی پر۔

ڈاکٹرز نے پاپا کو کمرے میں شفٹ کر دیا۔ ابھی وہ دواؤں کے زیر اثر سو رہے تھے۔

"میں پاپا کے پاس رکتی ہوں۔ اب تو صبح ہو ہی چکی۔ آپ تھوڑے ریسٹ کے بعد آجائیے گا۔" ہانیہ نے ماما اور زونیہ سے کہا تو وہ مان گئیں۔

"ویسے تو ڈرائیور موجود ہے یہاں۔ تم بھی چلی چلو۔ ابھی کون سا وقار کو ہوش آیا ہے۔" ماما نے کہا۔ تو

ہانیہ کا دل برا ہونے لگا۔ وہ ان سنی کرتے ہوئے پاپا کے کمرے میں چلی آئی۔

"ڈرائیور کے ہاتھ ناشتا اور تمہارا بیگ بھجوا دوں گی میں۔" زونیہ نے کمرے میں جھانک کر اسے تسلی دی تو وہ سر ہلاتی پاپا کے بستر کے پاس رکھی کرسی پر ٹک گئی۔

ماما اور زونیہ چلی گئیں۔ ہانیہ نے خود کو تھوڑا آرام دہ محسوس کیا۔

پاپا کے چہرے پر نظر کی تو اسے رونا آنے لگا۔ کل رات یہ چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ اس نے ان کے چہرے پہ چھائی زردی دیکھ کر دل میں سخت تکلیف محسوس کی اور ان بند لبوں نے رات میرا ہاتھ کتنی محبت سے چوما تھا۔ کیا دنیا میں اور کوئی شخص مجھ سے اتنی محبت کر سکتا ہے؟

"کبھی نہیں۔" اس کے ذہن و دل کی رائے متفق تھی۔

"میں پاپا سے ایزد کا ساتھ مانگتی رہوں۔ ضد کروں۔ لیکن اس کے بجائے وہ مجھے عباد کا ہاتھ تھما دیں تو کیا میں پاپا سے اتنا ہی پیار کر پاؤں گی جتنا ابھی کرتی ہوں۔۔۔؟ یا میں عباد سے کبھی محبت کر پاؤں گی۔۔۔؟"

"بالکل نہیں۔"

اور پاپا۔۔۔ پاپا جیسا ظرف کہاں سے لاؤں۔ بیٹا مانگتے ہوئے جنہیں بیٹی ملی تو بہتر کے بدلے بہترین کا سوچ کر مجھ سے بیٹے سے بڑھ کے محبت کی۔

پاپا کا سرد ہاتھ تھامے اس کے آنسو بہے چلے جا رہے تھے۔ یونہی الٹی سیدھی سوچیں اور عجیب سے وسوسے۔

ماما نے ڈرائیور کے ہاتھ اس کا ناشتا بھجوا دیا تھا۔ دل نہ چاہنے کے باوجود اس نے چائے کے ایک کپ کے ساتھ دو تین بسکٹ کھا لیے۔

ماما اور زونیہ دوپہر کو آئیں تو ان کے ساتھ سعدیہ آپی اور معیز بھائی بھی تھے۔

اس وقت پاپا ہوش میں تھے اور ہانیہ ان سے چھوٹی

چھوٹی باتیں کر رہی تھی۔ اور وہ اب قدرے بہتر محسوس کر رہے تھے۔

"زونی نے تو ڈرا کے رکھ دیا ہمیں۔ سارا پروگرام چھوڑ کے آنا پڑا۔"

"کیسے ہیں آپ پاپا۔" سعدیہ آپی بولتے ہوئے سوچنے کی زحمت کم ہی کیا کرتی تھیں۔

ہانیہ نے بے اختیار پاپا کو دیکھا۔ وہ ہلکے سے مسکرائے اور سعدیہ آپی کے قریب آنے پر ان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"ٹھیک ہوں میں۔"

معیز بھائی بھی "کیسی طبیعت ہے اب انکل؟" کہہ کر ماما سے گفتگو میں مصروف تھے۔ ان کے اور پاپا کے سفارتی تعلقات بھی سرد مہری کا شکار تھے۔ جانے کیوں پاپا کو وہ داماد کے روپ میں قبول نہ تھے دوسری طرف معیز بھائی بھی پاپا سے لیے دیے ہی رہتے تھے۔

سعدیہ آپی جتنی دیر وہاں رہیں انہیں اپنا پروگرام ملتوی کر کے بھوربن کی تفریح چھوڑ کے آنے کا غم ستاتا رہا۔ پاپا تو اچھے بھلے ہوش و حواس میں تھے۔ ان کی باتیں سن سن کر ہانیہ خوامخواہ پاپا کے سامنے چور سی بن رہی تھی۔ حالانکہ پاپا تو یوں ظاہر کر رہے تھے جیسے انہوں نے سعدیہ آپی کی کوئی بھی بات سنی ہی نہ ہو۔

سعدیہ آپی اور معیز بھائی تھوڑی دیر ہی ٹھہرے۔ پاپا ابھی دو دن تک اسپتال ہی میں تھے۔ ہانیہ نے خود فیصلہ کر لیا کہ اسے پاپا کے پاس ہی ٹھہرنا ہے۔ ماما کو شوہر کے بغیر تو نیند آجاتی مگر اپنے بستر اور اپنے تکیے کے بغیر سونا محال تھا تو زونیہ کو اسپتال کی فضا اور دوائیوں کی بو سے نفرت تھی۔ سو شام کے بعد وہ دونوں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"ہانی بیٹا! آپ بھی جاؤ۔ ریسٹ کرو جا کر۔" پاپا نے پیار سے کہا۔

"کم آن پاپا! اتنا اچھا موقع ملا ہے باتیں کرنے کا اور آپ ایسے مشورے دے رہے ہیں۔ اور ریسٹ تو اس بیڈ پر بھی ہو جائے گا۔" ہانیہ نے مصنوعی خفگی سے کہا اور کمرے میں موجود دوسرے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

"میں نے تو کہا ہے اسے کہاں عادت ہے رات بھر جاگ کے خدمتیں کرنے کی۔ اور پھر یہاں نرسز ہیں ڈاکٹرز ہیں۔ کوئی مسئلہ ہی نہیں پیشنٹ کو اکیلے رہنے میں۔"

ماما کی لاتعلقی کبھی کبھار سنگ دلی کی حد تک پہنچتی محسوس ہوتی تھی۔

"اوکے ماما! آپ دونوں جائیں۔ میں پاپا کے پاس ہی رہوں گی اور پاپا کو لے کر ہی گھر آؤں گی۔" ہانیہ جلدی سے آگے بڑھ کے ماں کو پیار کرتے ہوئے بات بدل گئی۔ پھر زونیہ سے کہا۔

"اور زونی! تم جاتے ہوئے ڈاکٹر سے پاپا کے کھانے کے متعلق پوچھ لینا۔ اور پھر گھر سے بھجوا دینا۔"

"اوکے۔" وہ دونوں بائے کہہ کے چلتی بنیں۔

ہانیہ کو جانے کیا ہوا یکدم رونا سا آیا۔

"کیا ہوا؟" پاپا اسے آنکھیں مسلتے دیکھ کر حیران ہوئے۔

"پاپا! پتا نہیں کبھی کبھار ماما مجھے آپ کی سوتیلی بیوی لگتی ہیں۔" اور پاپا کو اس کی بات پر زور سے ہنسی آئی۔

"سوتیلی بیوی۔ یہ صحیح کہا تم نے۔"

"آئی مین۔ ایک عمر ساتھ گزارنے کے بعد بھی وہ پل کے اس پار ہیں اور آپ اس پار۔" ہانیہ کو ماما کا انداز اور باتیں تکلیف دے رہی تھیں۔

"جس کے ساتھ قلبی و روحانی تعلق ہو پاپا! اس کے تو اندر تک اتر جانا چاہیے۔ بن کہے اس کی خوشی اس کے غم کو محسوس کرنا چاہیے۔ میاں بیوی کے رشتے سے زیادہ قریب کوئی رشتہ بنایا ہی نہیں گیا اس دنیا میں۔ اور اسی میں اتنی دوری۔ ساری عمر اک عذاب میں کاٹنے کے مترادف ہے۔" ہانیہ نے جھرجھری سی لی تو وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دیے۔

"اب تو عمر گزر گئی بیٹا جان! اور پھر اولاد ماں باپ کی بہت سی کمیوں پر پردے ڈال دیتی ہے۔ بیلنس ہو ہی جاتا ہے کچھ نہ کچھ۔"

ہانیہ کو سعدیہ آپی اور زونیہ کے لاتعلق سے انداز

یاد آئے۔ پیار تو وہ بھی پاپا سے کرتی ہی ہوں گی مگر انہیں دنیاداری بھی بہت عزیز تھی۔

مگر ہانیہ کو تو دنیا بھر سے زیادہ اپنے پاپا عزیز تھے۔

"موبائل ہے تمہارے پاس؟"

"جی پاپا! زونیہ میرا کچھ سامان لائی تو ہے۔ اسی میں ہو گا۔" وہ دوسرے بیڈ پہ پڑا بیگ چیک کرنے لگی تو پاکٹ میں سے اپنا سیل فون بھی مل گیا۔

"ذرا اپنی پھپھو کو فون کر دو بیٹا!" پاپا نے کہا۔

"وہ۔ میرے پاس تو نمبر نہیں ہے ان کا۔" ہانیہ ہڑبڑا گئی۔ جو کچھ وہ صبح سے بھولی ہوئی تھی وہ یاد آنے لگا۔

ان چاہا رشتہ ان چاہا بندھن۔

پاپا نے اسے نمبر بتایا۔

"یہ عباد کا نمبر ہے۔ اسے میری بیماری کا بتا دو اور اسپتال کا نام اور روم نمبر بھی۔" پاپا نے بستر پہ دراز ہوتے ہوئے کمزور لہجے میں کہا تو وہ ہچکچا سی گئی۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس نے کال ملا ہی لی۔ چند لمحوں کے بعد شاید عباد لائن پر تھا۔

"ہیلو۔" اجنبی نمبر کی وجہ سے اس کی ہیلو سوالیہ تھی۔ ہانیہ نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

"میں ہانیہ بات کر رہی ہوں۔"

"جی! کس سے بات کرنی ہے آپ نے؟" وہی لاتعلق سا انداز۔

"عباد صاحب سے بات کرنی ہے۔" وہ قدرے چڑ کر بولی۔

"جی۔ میں عباد صاحب ہی بول رہا ہوں آپ کون ہیں؟" وہ حیران سا پوچھ رہا تھا۔ ہانیہ سلگ کر رہ گئی۔

"پاپا سے بات کر لیں آپ۔" اس نے فون پاپا کی طرف بڑھا دیا۔

"شاید آپ کو پہچان لیں۔ میں ذرا ڈاکٹر کے پاس ہو کے آتی ہوں۔" وہ کہہ کر کمرے سے نکل آئی۔

اسے درحقیقت سخت غصہ آرہا تھا۔ یہ وہ شخص تھا، جس سے پاپا اپنے تئیں اس کا رشتہ طے کیے بیٹھے تھے اور وہ اس کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔

"میں پاپا کو صاف لفظوں میں انکار کر دوں گی۔ مجھے پاپا اور ماما جیسی لائف نہیں گزارنی۔"

وہ جب تک ڈاکٹر سے پاپا کی صحت یابی کے بارے میں گفتگو کر کے آئی پاپا نیم غنودہ کیفیت میں تھے۔ نرس ان کے پاس ہی تھی۔

"میڈیسن لے لی ہے انہوں نے۔ اب انہیں ریسٹ کرنے دیں۔ فی الحال زیادہ باتیں نہ کرنے دیں۔" نرس نے مسکراتے ہوئے پاپا کے پاس پڑے موبائل کی طرف اشارہ کیا تو اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ہانیہ نے اپنا موبائل اٹھا لیا۔

نرس کے جانے کے بعد وہ تھوڑی دیر تک کرسی قریب کیے پاپا کا ہاتھ تھامے سہلاتی رہی۔ وہ سو رہے تھے۔

ہانیہ نے ان کا زرد پڑتا ہاتھ چوم لیا۔ ہانیہ کو یقین تھا پاپا بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔

اس نے موبائل پہ ٹائم دیکھا۔ آٹھ بجنے والے تھے۔ ابھی نیند کا نام و نشان بھی نہ تھا، سو وہ اسپتال کا ایک چکر لگانے نکل پڑی۔

پرائیویٹ کمروں میں بے پناہ خاموشی تھی البتہ وارڈ میں مریضوں اور ان کے اہل و عیال کی چہل پہل نرسز کی آمد و رفت جاری تھی۔ یا پھر کاؤنٹر پہ کھڑی گہری لپ اسٹک لگائے گپیں لگاتی نرسیں۔

وہ کاریڈور کا دروازہ دھکیل کر باہر لان میں نکلی۔ وہاں بھی کافی ملاقاتی ادھر ادھر بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اپنے دھیان میں برآمدے کی سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ ناکافی روشنی میں پاؤں ٹھیک سے نہیں پڑا اور وہ دوسری سیڑھی سے نیچے آرہی۔ وہ اتنی اچانک گری کہ سامنے سے آنے والا بھی اسے بچا نہیں پایا۔ ہانیہ کا پاؤں بری طرح مڑا تھا۔ تکلیف کی شدت سے اس کے منہ سے کراہ نکل گئی تو اس شخص نے بیٹھتے ہوئے ہانیہ کا پاؤں جلدی سے سیدھا کر کے تیزی سے مساج کیا۔

"فوراً" یہ مساج نہیں کریں گی تو تکلیف بڑھ جائے گی۔"

گرنے کی شرمندگی اور پاؤں کی تکلیف دونوں ہی زیادہ تھیں ہانیہ کو رونا آنے لگا۔

"اٹھنے کی کوشش کریں تاکہ اندازہ ہو چل سکتی ہیں آپ یا نہیں۔" وہ مشورہ دے رہا تھا۔

"آپ دومنٹ خاموش نہیں رہ سکتے۔" وہ چڑ کر بولی تو مقابل نے تحیّر سے اسے دیکھا۔

"سبحان اللہ۔ محترمہ کیا یہاں استراحت فرما کر غور و فکر کرنا چاہ رہی ہیں؟" اس کے انداز میں طنز تھا۔

"آپ کو کیا۔۔۔ آپ جہاں جا رہے ہیں' وہاں جائیں۔" ہانیہ نے ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں رگڑیں۔

"یہ شاید۔۔۔ بلکہ یقیناً" آپ ہی کا ہے۔" اس نے پاس پڑا موبائل فون اٹھا کر ہانیہ کی طرف بڑھایا۔

ایک اور احسان۔

ہانیہ نے دیکھا۔ اتنی زور سے گرنے کے بعد بھی وہ ٹھیک حالت میں تھا۔

"اگر آپ نے اندر جانا ہے تو میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ہانیہ جواب دیے بغیر اٹھی مگر دو قدم چلنے پر ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ پاؤں پر زیادہ بوجھ نہیں ڈال سکتی۔

"میں بھی اندر ہی جا رہا ہوں اور بھروسا رکھیے 'شریف آدمی ہوں۔ چاہے تو نرسوں سے مار پڑوا لیجیے گا اگر کچھ شک ہوا تو۔" وہ دوستانہ انداز میں ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا تو ہانیہ کو مجبوراً" اس کا بازو تھامنا پڑا۔ ہاتھ نہیں تھاما کہ کچھ عجیب سا لگا تھا۔

بمشکل سیڑھیاں چڑھ کے وہ اس کے ساتھ ہسپتال کی عمارت میں داخل ہوئی۔ اس شخص نے کاؤنٹر پہ موجود نرس کو ہانیہ کی کنڈیشن بتا کر ٹیبلٹ لے کر دی اور ساتھ میں مساج کے لیے کریم۔

"تھینکس۔۔۔" ہانیہ اس کی مشکور ہوئی۔ کھلتے نقوش والا اونچا لمبا سادہ شخص ہانیہ کو اچھا لگا۔

"تھینکس ٹو یو۔ مجھ پر اعتبار کرنے کے لیے۔" اس کی مسکراہٹ بہت دلکش تھی۔ دوستانہ سی۔ نہ کوئی نظربازوں والا انداز اور نہ خوامخواہ کی بے تکلفی۔

وہ اپنے موبائل پہ کوئی نمبر ملا رہا تھا۔ نرس ہانیہ کے پاؤں پر کریم سے مساج کر رہی تھی۔ ہانیہ کے ہاتھ میں دبا موبائل بول اٹھا۔ اسکرین پہ آنے والا نمبر عباد رضا کا تھا۔

ہانیہ کی تیوری پر بل پڑے۔ نرس کو روک کر اس نے پاؤں جوتے میں ڈالا۔ اس نے چند گز کے فاصلے پر موجود اجنبی کو دیکھا' جو اس کی طرف پشت کیے شاید فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔

ہانیہ اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتی۔۔۔ وہاں سے پرائیویٹ رومز کی طرف چل پڑی۔ اس کا اس اجنبی سے مزید گفتگو کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں دبا فون اب خاموش ہو چکا تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو پاپا سو رہے تھے۔ وہ بھی آکر اپنے کاؤچ نما بستر پر بیٹھ گئی۔ پیروں کو جوتوں کی گرفت سے آزاد کر کے بستر پر رکھا اور مضروب پاؤں کا ہلکے ہاتھ سے مساج کرنے لگی۔ اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

ہانیہ چونکی ڈاکٹر یا نرس دستک دے کر نہیں آتے تھے۔

"یس۔۔۔" الجھ کر اس نے قدرے اونچی آواز میں کہا تو دروازہ آہستہ سے کھلا۔ سامنے موجود شخص کو دیکھ کر وہ حیران ہوئی۔ ادھر بھی یہی صورت حال تھی۔

"ارے آپ۔۔۔ آپ تو وہاں سے ایسے بھاگیں کہ میں۔۔۔" وہ خوش گوار سی حیرت کے ساتھ بولتا ہوا اندر داخل ہوا' پھر بستر پر سوئے وقار صاحب کو دیکھ کر نا صرف اس کے الفاظ گم ہوئے بلکہ چہرے کے تاثرات میں بھی سنجیدگی اتر آئی۔ وہ جا کر وقار صاحب کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"یہ میرے پاپا ہیں۔" ہانیہ نے جلدی سے تعارف کرایا۔

"اور میرے ماموں جان۔۔۔" قدرے توقف کے بعد صاف آواز میں کہتے ہوئے اس نے جھک کر وقار

صاحب کے پیر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

ہانیہ حیران رہ گئی۔

"عباد رضا۔۔۔؟"

وہ چند لمحوں کے بعد اس کی طرف پلٹا' جو صاف سلیٹ ذہن لے کر منہ اٹھائے اسی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے ان کی؟" وہ بڑی اجنبیت سے پوچھ رہا تھا۔ ہانیہ گڑبڑا کر حواس میں لوٹی۔

"ہاں۔۔۔ اب تو بہت بہتر ہیں۔"

"آپ میرے خیال میں اب گھر چلی جائیں۔ میں ان کے پاس ہی رکوں گا۔" وہ اتنے تحکمانہ انداز میں بولا کہ ہانیہ کو غصہ آنے لگا۔

"جی نہیں! میں پاپا کے پاس ہی رہوں گی۔"

"ڈرائیور ہے تو اسے فون کر لیں۔ صبح آسکتی ہیں آپ۔" وہ جیسے اس کی بات سن ہی نہ رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے لان میں جو نرمی اور دوستانہ پن اس کے لہجے سے جھلک رہا تھا' اب ناپید تھا۔

"یہ "میرے" پاپا ہیں۔" ہانیہ نے احتجاج کیا۔

"تو میں کون سا اپنے نام لکھوانے لگا ہوں؟" وہ بھی قدرے جھنجلا سا گیا۔ پھر مصالحانہ انداز میں بولا۔

"اور میں خود نہیں آیا یہاں پر۔ ماموں جان نے بلایا تھا مجھے۔ اب یہاں ایک وقت میں ایک ہی اٹینڈنٹ رہ سکتا ہے۔"

ہانیہ کو ناگوار تو لگا مگر فی الحال کہنے کو کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ اگر وہ رات اسی کمرے میں رہنے والا تھا تو واقعی ہانیہ کا یہاں رہنا مشکل تھا۔ وہ غصہ ضبط کرتی ماما کو فون کرنے لگی۔

ڈرائیور کو بھیجنے کا سن کر وہ چونکیں۔

"خیریت ہی ہے۔ بس پاپا کے کچھ خاص تیمار دار آگئے ہیں۔ اس لیے میں گھر آنا چاہ رہی ہوں۔"

"تمہاری پھپھو۔۔۔؟" ماما فوراً" نتیجے کے قریب ترین پہنچیں۔

"ان کے صاحب زادے۔" ہانیہ نے بھرپور طنز کیا۔ وقار صاحب کے نزدیک کرسی پر بیٹھا عباد یقیناً" اس کی بصیرت افروز گفتگو سے اچھی طرح بہرہ ور ہو رہا تھا۔

"اسے دفع کرو وہاں سے۔ تم کیوں بھاگ رہی ہو۔" ماما کو غصہ آیا۔

"شوق سے نہیں بھاگ رہی۔ اب اس کی موجودگی میں تو رات رہ نہیں سکتی یہاں۔" ہانیہ کو تو پہلے ہی غصہ آ رہا تھا۔ وہ مزید چڑ گئی۔

"بھیجتی ہوں میں ڈرائیور کو۔ اور اس لونڈے سے تو میں آکے نمٹوں گی صبح۔" غصے میں ان کا لہجہ یوں ہی پٹڑی سے اتر جایا کرتا تھا۔ فون بند کر کے وہ عباد رضا کی پشت کو گھورنے لگی۔ ابھی پاپا جاگ رہے ہوتے تو وہ اس شخص کو وہاں سے نکلوا کر ہی دم لیتی۔

اور ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اس نے ایک دم عباد رضا کو اٹھ کر پاپا پر جھکتے دیکھا۔

ہانیہ کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ وہ اپنے پاؤں کی تکلیف بھول کر تیزی سے بستر سے اتر کر پاپا کی طرف بڑھی۔

"کیسے ہیں ماموں جان۔۔۔؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ پاپا جاگ چکے تھے۔

ہانیہ کے حلق سے بے اختیار گہری سانس خارج ہوئی۔ پاپا نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

"اکیلے آئے ہو؟"

"میں لاہور ہی آیا ہوا تھا۔ چاولوں کی سپلائی کے سلسلے میں۔ امی کو تو میں نے بتایا ہی نہیں۔ صبح انفارم کروں گا۔" وہ ہلکے سے مسکرا کر بولا۔

"اچھا کیا۔" پاپا نے کہا پھر ہانیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

"عباد سے ملیں تم۔؟" ہانیہ خاموش کھڑی رہی تو وہ عباد سے کہنے لگے۔

"یہ ہانیہ ہے۔ ہانیہ وقار۔" پاپا کے لب و لہجے میں موجود پیار نے ہانیہ کو ساری تلخی بھلا دی۔ اس کی طرح عباد بھی خاموش رہا۔

"ڈرائیور کو فون کر کے بلوا لو ہانی! اب عباد ہے میرے پاس۔ فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ویسے

بھی کل شام تک شاید میں ڈسچارج ہو جاؤں۔" پاپا نے بھی اسے رخصت کرنا چاہا تو خفگی سے بولی۔

"میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی پاپا! مگر اب آپ نے کہا ہے تو رکوں گی بھی نہیں۔"

وہ حد درجہ بے زار تھی۔ عباد نے اس پر سرسری نگاہ ڈال کر ہٹالی۔

ڈرائیور کا انتظار کرنے تک وہ پاپا سے بھی ناراض ہو چکی تھی، جو عباد سے باتوں میں مگن ہو کر اسے بھی بھلائے ہوئے تھے۔ جیسے وہی ان کا سگا اور اکلوتا بیٹا ہو۔

☆ ☆ ☆

ماما تو گھر میں بھوکی شیرنی کی مانند پھر رہی تھیں۔

"مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس شخص کو عقل کس عمر میں آئے گی۔ نہ دوست کی پہچان اور نہ دشمن کی۔" ہانیہ کو دیکھتے ہی وہ پھٹ پڑی تھیں۔

پاپا کے متعلق ان کے الفاظ ہانیہ کو اچھے تو نہیں لگے مگر اس وقت ماما کے سامنے اعتراض کرنا اپنی شامت بلوانے کے مترادف تھا۔ سو وہ تھکے انداز میں زونیہ کے ساتھ ہی صوفے میں دھنس گئی۔

وہ دونوں دس بجے تک ہانیہ ہی کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔

"شرم نہیں آئی اسے ہسپتال میں بیٹی کا پرد کھوا کرتے ہوئے۔" وہ ان کے الفاظ پر سید ھی ہو بیٹھی۔

"ماما پلیز! وہ پاپا کی عیادت کے لیے آیا ہے، مجھے دیکھنے نہیں۔" اس نے برا مانتے ہوئے کہا تو انہوں نے جاہل عورتوں کی طرح ہاتھ جھٹکا۔

"ارے چھوڑو۔ میں کیا جانتی نہیں ہوں وقار احمد کو۔ اپنی ضد پوری کرنے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جاسکتا ہے۔" وہ شدید غصے میں تھیں۔

"غضب خدا کا۔ بیٹی سے منہ دیکھے کی محبت جتارہا ہے۔ سگی بہن بھی ہوتی تب بھی کوئی بات تھی۔ سوتیلی بہن اور وہ بھی سالوں بعد کا ملاپ۔ ایسے فدا ہوئے یہ تو بہن اور بھانجوں پر کہ حد نہیں۔"

"تم نے پاپا سے بات نہیں کی؟" زونیہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"کل انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ ابھی وہ اسپتال کے بیڈ پہ ہیں اور میں ان سے ایسی فضول باتیں کرنا شروع کر دیتی۔" ہانیہ نے تاسف سے جواب دیا۔

"تم اپنی زندگی برباد کرلو گی باپ کا سوچ سوچ کر۔" ماما نے غصے سے کہا۔

"ارے! میں تو کل رات کسی ٹھکانے لگا ہی دیتی بات کو۔ اگر اس کی طبیعت نہ بگڑ جاتی تو..." وہ غصے کے عالم میں اپنا ہی پول کھول گئیں۔ ہانیہ نے دکھ اور بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

"اختلاف کرنے کا بھی کوئی طریقہ ہوتا ہے ماما! یہ کیا کہ ایک بندے کو موت کے منہ تک پہنچا دیا جائے۔"

"تو اگلا بندہ بھی اتنی ہی ضد لگائے جتنی کہ برداشت کر سکتا ہو۔ اینی وے۔ بات یہیں ختم ہوئی ہے کہ اقرار یا انکار کا حق تمہارے پاس ہے۔" وہ سرد مہری سے بتا رہی تھیں۔

"اور میں انکار ہی کروں گی۔" ہانیہ نے بے اختیار کہا تو اس کا لہجہ کمزور نہ تھا۔ ماما کو کچھ اطمینان ہوا۔

"سعدیہ تو ضد لگا کے بیٹھی ہے کہ تمہاری شادی ایزد ہی سے ہو۔ بہن ہے تمہاری بہترین ہی سوچے گی تمہارے لیے۔" اب کی بار ماما نے نرمی سے کہا تو وہ ہلکا سا مسکرا دی۔

"ویسے وہ عباد ہے کیسا؟ تم تو ملی ہو اس سے۔" زونیہ نے تجسس سے پوچھا تو ہانیہ نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"دیکھنے میں تو بہت اچھا ہے۔"

"علی سے بھی؟" زونیہ کو علی کی وجاہت کا بہت زعم تھا۔

"آئی ایم سوری! بٹ یس۔" ہانیہ شانے اچکا کے کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا یہ صاف گویانہ انداز زونیہ سے ہضم نہیں ہوا تو چیخ کر بولی۔

"تو پھر کیوں انکار کر رہی ہو۔ علی سے اچھا ہے تو پھر ایزد سے بھی اچھا ہی ہوگا۔"

"زونی! بی ہیو یور سیلف۔" ماما نے اسے جھڑکا، پھر ہانیہ سے بولیں۔

"تم جاؤ۔ فریش ہو جاؤ۔ میں ہاجرہ سے کہہ کے چائے بنواتی ہوں۔"

ہانیہ فوراً" اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ واقعی بے حد تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی۔ وہ تھکاوٹ دور کرنے کے لیے شاور لینے گھس گئی۔ باہر نکلی تو اس کا موبائل بج رہا تھا۔

ایزد کا نام اسکرین پہ جگمگاتے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر دلفریب سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ اس نے جلدی سے موبائل آن کر کے کان سے لگایا۔

"کہاں تھیں یار! اتنی دیر سے کال کر رہا ہوں۔ گھر آگئی ہو؟" وہ جھنجلایا ہوا تھا۔ ہانیہ آہستہ سے ہنس دی۔

"فون پر بڑی بے قراری دکھا رہے ہیں۔ ہسپتال میں آنا تو دور کی بات ایک فون کال تک نہیں کی۔"

"میں بزی تھا یار!" وہ لاپروائی سے بولا۔

"پاپا خوش ہو جاتے ایزد!" ہانیہ نے آہستہ سے اسے احساس دلایا۔

"اب تمہارے پاپا کو خوش کرنے کے لیے پچیس لاکھ کا نقصان کر لیتا۔ ملائیشیا سے ایک ڈیلی گیشن آیا ہوا تھا۔ امپورٹنٹ ڈیلنگ تھی ان کے ساتھ۔" وہ الٹا اس پر خفا ہونے لگا تو ہانیہ کی جان پہ بن آئی۔

"اوکے... اوکے مان لیا جناب!" وہ تو مان گئی مگر ایزد ابھی بھی وہیں اٹکا ہوا تھا۔

"اور تمہارے پاپا تو سنا ہے ویسے ہی میرے کافی خلاف ہو رہے ہیں۔"

"ایکچوئلی میری پھپھو نے اپنے بیٹے کا پرپوزل دیا ہے میرے لیے۔ اس لیے پاپا ذرا جذباتی ہو رہے ہیں۔ ورنہ تو وہ بہت سوفٹ نیچر کے انسان ہیں۔" وہ پاپا کی صفائی پیش کرنے لگی۔

"خیر! دفع کرو۔ تم یہ بتاؤ کل فارغ ہو۔ ایک پارٹی ہے بہت زبردست سی فرینڈز کی طرف سے۔" وہ فوراً" بات بدلتے ہوئے لہجہ بھی بدل گیا۔ وہ جو اسے دفع کرو' کہنے پر ٹوکنے والی تھی۔ فوراً" انکار کر گئی۔

"کل تو نہیں ایزد! پاپا ہسپتال میں ہیں۔ کل شام تک شاید گھر آجائیں۔"

"پارٹی تو رات کو ہے یار! تم نے کون سا پاپا کے گھٹنے سے لگ کے بیٹھے رہنا ہے۔" ایزد خفا ہونے لگا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں ایزد! ہی از مائی فادر۔ ابھی ہارٹ اٹیک سے گزرے ہیں اور میں پارٹیز اٹینڈ کرتی پھروں۔ واٹ اے جوک؟" ہانیہ نے اسے احساس دلایا۔

"اوکے! ایک تو تم لڑکیاں فوراً" جذباتی ڈراموں پہ اتر آتی ہو۔ دنیا کے کام رک تو نہیں سکتے ناں۔ بیماری ہو یا موت۔" وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں کہتا ہانیہ کا دل دہلا گیا۔

"کیا آپ نے یہی فضول باتیں کرنے کے لیے فون کیا تھا؟"

"جس بات کے لیے کیا تھا' اس سے تو تم انکار کر چکیں۔"

"تو کون سا آپ کے فرینڈ کی لاسٹ پارٹی تھی یہ۔" ہانیہ نے اس کا موڈ ٹھیک کرنا چاہا۔

"تمہارے ساتھ تو پہلی ہوتی۔ سب اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ آئیں گے۔" وہ بد مزا تھا۔

"میں آپ کی گرل فرینڈ نہیں ہوں۔" ہانیہ کو یہ لفظ کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ ابھی بھی بے اختیار ہی اسے ٹوک گئی تو اس نے گہری سانس بھری۔

"میں نے اپنی نہیں دوستوں کی گرل فرینڈ کہا ہے۔"

"اوکے!"

"اوکے۔ پھر بات کریں گے۔ بلکہ اب جب ملیں گے تو بات کریں گے۔"

ایزد نے فوراً" ہی بات سمیٹتے ہوئے فون بند کر دیا تو

ہانیہ نے بددل ہو کر موبائل بستر پہ ڈالا اور سر پہ لپٹا تولیہ کھول کر بال خشک کرنے لگی۔
کبھی کبھار ایزد کا رویہ بہت بے اعتنا سا ہو جاتا تھا۔ جیسے فقط خود کو اہمیت دینے والا یا صرف ہانیہ کو۔ اس سے منسلک رشتوں کو شاید وہ کچھ سمجھتا ہی نہ تھا۔
"خدا کرے یہ میرا وہم ہی ہو۔" ہانیہ نے دعا کی تھی۔

٭ ٭ ٭

اگلے روز ماما اور زونیہ اسپتال گئیں۔ ہانیہ نے بہت زور لگایا مگر ماما اسے لے جانے کو راضی نہ تھیں۔
"اب تک وقار نے اپنی بہن کی پوری فیملی بلوالی ہو گی گاؤں سے۔ تمہارا نہ جانا ہی بہتر ہے۔ ویسے بھی آج ڈسچارج ہو کر تمہارے پاپا آ ہی جائیں شاید۔"
وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ دل ہی دل میں اپنی سوتیلی پھپھو کو بھی کوسا۔ جن کی محبت پاپا کے دل میں اچانک ہی امڈ آئی تھی۔
پھر اسے عباد یاد آیا۔
اگر ایزد والا معاملہ نہ ہوتا تو یقیناً" وہ عباد کو اس لحاظ سے بہت پسند کرتی مگر اب تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔
دوپہر کو ماما اور زونیہ واپس آگئیں۔
"پاپا کی طبیعت کیسی ہے؟" اس نے ان کے اندر آتے ہی پوچھا۔
"ٹھیک کیوں نہ ہو گی۔ وہاں اسپتال میں مجمع لگائے بیٹھے ہیں اپنے سوتیلوں کا۔" ماما جلی بھنی آئی تھیں۔ لوگوں سے سگی نندیں برداشت نہیں ہوتیں یہ تو پھر سوتیلی نند تھیں۔
"اور آپ انہیں ان کے ساتھ اکیلا چھوڑ کے آگئیں؟" وہ پریشان ہوئی۔
"تو اور کیا' وہاں بیٹھ کے ان پینڈوؤں کے افکار سنتی رہتی۔ میرے تو سر میں درد ہو گیا۔ باتیں' باتیں باتیں۔ تمہارا باپ تو کہیں سے دل کا مریض لگ ہی نہیں رہا تھا۔" ماما میں سفاکی انتہا درجہ کی تھی۔ خاص طور پر تب جب ان کی انا اور عزت نفس پر بات آن پڑتی۔
"خیر! بات چیت اور انداز سے تو کوئی بھی پینڈو نہیں لگ رہا تھا۔ سوائے پاپا کی بہن محترمہ کے۔" زونیہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔
"پاپا بتا رہے تھے بچے سب ہی اچھے اسکولز' کالجز میں پڑھے ہیں۔" ہانیہ نے جتایا۔
"دفع۔ ہمیں کیا کرنے ہیں اتنے مطلبی رشتہ دار۔ شوہر تو کب کا مر گیا نرگس کا۔ پتا نہیں کیسے خیرات زکوٰۃ سے بچے پڑھا لکھا لیے اور اب تمہارے باپ کے کاروبار پہ نظر جما کے بیٹھ گئی ہے۔ تب ہی تو بنا دیکھے تمہارا رشتہ قبول کر رہی ہے۔"
ماما کے دل میں ان سب کے لیے ڈھیروں نفرت تھی۔ حالانکہ پاپا اور نرگس پھپھو کی شادی ایک ہی تاریخ کو ہوئی تھی مگر ماما اپنے شوہر کو لے کر ایسی الگ بسیں کہ پھر پاپا کی نرگس پھپھو سے ماں باپ کی فوتگیوں پر ہی ملاقات ہو سکی۔ اس کے بعد کس کے کیا حالات رہے' کوئی نہیں جانتا۔ اور ماما تو ویسے بھی پھپھو سے دو چار بار ہی ملی ہوں گی اور وہ بھی مختصر دورانیے کے لیے۔
وہ تو سالوں بعد جانے کیسے پاپا کی پھپھو اور عباد سے ملاقات ہو گئی تو پاپا سوتیلی ہی سہی مگر بہن کو سامنے پا کر پگھل گئے۔ ماما کی اکھڑ اور تسلط پسند طبیعت پاپا کو بے زار کر چکی تھی' سو وہ بہت شرمسار اور کھلے دل سے اپنے پرانے رشتوں میں لوٹے اور ان کا بھی کھلی بانہوں سے استقبال کیا گیا۔ اور نتیجہ اب عباد رضا کے پرپوزل کی صورت سامنے تھا۔
"واقعی! مجھ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے انہیں۔ نہ دیکھا نہ بھالا۔" ہانیہ کو بھی ماما کی دولت ہڑپنے والی بات میں دم نظر آیا۔
شام کو پاپا ڈسچارج ہو کر آئے تو پھپھو کی پوری فیملی ان کے ساتھ تھی۔ معہ عباد رضا۔ ہانیہ کو خفقان ہونے لگا۔
"دیکھ لیا در کرنے کا نتیجہ۔ پہلی بار میں ہی صاف لفظوں میں انکار کر دیتیں تو یہ سب نہ ہوتا۔" بظاہر ماما سب سے بہت محبت سے مل رہی تھیں۔
نرگس پھپھو ہانیہ اور زونیہ سے بڑے تپاک سے ملیں مگر ہانیہ کو بطور خاص پیشانی چوم کر دعا بھی دی۔
کرن اس کی ہم عمر تھی۔ سادہ دل اور بات بات پہ ہنسنے والی اور اس سے ڈیڑھ سال ہی چھوٹا سعد تھا۔ باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑنے والا۔
ذرا سی دیر میں چائے کی میز پر بڑا اچھا سا ماحول بن گیا تھا۔
"اچھا ہے۔ میں خود نرگس کو انکار کر دوں گی۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔" ماما نے پکا ارادہ کر لیا تھا۔
نرگس پھپھو کم گو اور سنجیدہ سی خاتون تھیں۔ کھانے کے بعد ماما اور نرگس پھپھو کے ساتھ صرف عباد ہی پاپا کے کمرے میں تھا۔ تب ہی نرگس پھپھو نے باضابطہ طور پر عباد اور ہانیہ کے رشتے کی بات کی۔ اب تفصیل تو کسی کو پتا نہ تھی کہ آگے کیا ہوا مگر ماما اس کمرے سے روتی ہوئی نکلی تھیں۔
"ماما! کیا ہوا؟"
ہانیہ اور زونیہ' کرن اور سعد کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی تھیں' ماما کو دیکھ کے افتاں و خیزاں پیچھے لپکیں۔
"جا کے اپنے باپ سے پوچھو۔ بستر پہ پڑ کے بھی جسے چین نہیں اور نہ ہی وہ مجھے چین سے رہنے دینا چاہتا ہے۔" اچھی خاصی پڑھی لکھی ماما اس وقت جاہل لگ رہی تھیں۔ ہانیہ کو کوفت نے گھیرا۔ ان کی آواز ٹی وی لاؤنج تک آسانی سے جا رہی تھی۔
"ہوا کیا ہے ماما! کم از کم پاپا کے متعلق بات کرتے ہوئے تو دھیان رکھا کریں۔" ہانیہ نے دبے لفظوں میں انہیں احساس دلایا تو وہ اسی پر چڑھ دوڑیں۔
"تم ہی کو سولی پہ چڑھا رہا ہے وہ شخص۔ ایک لفظ جو میرے اعتراض کا سنا ہو۔ ایسا عشق چڑھا ہے اس کے سر پر بہن اور بھانجے کا۔ میں صاف کہہ رہی ہوں ہانی! تم نے اگر اپنے باپ کے سامنے اس رشتے سے انکار نہیں کیا تو کل کو رونے کے لیے میرا کندھا مت ڈھونڈنا۔"
ماما سخت بدلحاظ ہو رہی تھیں مگر وہ تو اس اطلاع پر ہی برافروختہ ہو گئی۔ ماما کا لب و لہجہ کہاں یاد رہتا۔
فوراً" پاپا کے حضور اس کی پیشی ہو گئی۔
وہ کمرے میں داخل ہوئی تو پاپا کے بستر پر پیروں کی طرف نرگس پھپھو بیٹھی تھیں۔ جبکہ عباد پاپا کے بستر پر ان کی بائیں طرف بیٹھا تھا۔ پاپا کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔
ہانیہ کو وہ دونوں ماں بیٹا بہت برے لگے۔ جنہوں نے پاپا کے ذہن کو اپنی ہی لائن پہ لگا دیا تھا۔ اسے دیکھ کر پاپا نرمی سے مسکرا دیے۔
ہانیہ کی آنکھوں میں نمی سی دوڑ گئی۔ وہ اپنے پاپا کو کبھی دکھی نہیں کر سکتی۔ کبھی رلا نہیں سکتی۔ یہ اس پل پاپا کی وہ نرم و شفیق سی مسکراہٹ دیکھ کے اسے شدت سے احساس ہوا تھا۔
پاپا نے اسے اپنے پاس پڑی کرسی پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔
"تمہاری ماما نے تم سے کچھ بات کی؟" پاپا بہت پرسکون تھے۔ جیسے کہ وہ جانتے ہوں ہانیہ وقار انہیں مایوس نہیں کرے گی۔
ہانیہ کا دل تھم سا گیا۔
"جی پاپا۔" مدھم لہجے میں کہہ کر سر جھکائے وہ اپنی ہمت مجتمع کرنے لگی۔ ایزد سکندر کا خیال اسے توانائی بخشنے لگا۔
"نرگس! یہ میری بہت پیاری اور سب سے اچھی بیٹی ہے۔ میرے دل کے سب سے زیادہ قریب۔" وہ پھپھو کو بتا رہے تھے۔ ہانیہ کا دل پاپا کی محبت سے لبریز ہو گیا۔ وہ اکثر اس کا ایسے ہی تعارف کراتے تھے جس پر زونیہ خاص طور پر ناک بھوں چڑھاتی۔
"تم بتاؤ ہانی! میری خواہش ہے کہ تم اپنی زندگی کا باقی ماندہ سفر عباد کے ساتھ طے کرو۔ تم کیا کہتی ہو؟" پاپا

کہہ رہے تھے۔ ہانیہ کی سانس تھمنے لگی۔

کیا وہ انکار کرپائے گی؟

"جب سے میں نے تمہارے متعلق یہ فیصلہ کیا ہے' میں خود کو بہت خوش اور مطمئن محسوس کررہا ہوں ہانی!" پاپا کے لب و لہجے سے ہی ان کی خوشی چھلک رہی تھی اور وہ ان سے یہ خوشی نہیں چھین سکتی تھی۔

"میں جانتا ہوں تم سعدیہ اور زونیہ سے بالکل ڈفرنٹ ہو۔ تم نے ہمیشہ میرا سر بلند کیا ہے۔" وہ فخر سے کہہ رہے تھے۔

جھکے سر کے ساتھ ہانیہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ ان کا سر کبھی نیچا نہیں کرسکتی تھی۔

"عباد کہہ رہا تھا کہ ایک بار تم سے تمہاری رائے لے لی جائے' اس کے بعد ہی یہ رشتہ طے ہوگا۔"

ہوا کا ایک تازہ جھونکا ہانیہ کے چہرے سے ٹکرایا۔ آزادی کا ایک روزن کھلا تھا شاید۔

"میں تمہارا جواب اچھی طرح جانتا ہوں مگر عباد کی تسلی کے لیے میں چاہتا ہوں کہ اگر تمہیں کوئی اعتراض ہے تو کہہ دو۔"

کھٹ کھٹ کھٹ.... تمام روزن بند ہوچکے تھے۔

پاپا تمام بار اس کے نازک شانوں پہ ڈال کر اب منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ہانیہ نے اپنی ہمت اکٹھی کرنا چاہی۔

ایک نام ہی تو ہے۔ دو لفظی ایزد سکندر۔

ایک بار منہ سے نکالنے کی دیر ہے۔ کیا عباد پھر ساری عمر اس کا نام بھی سننا پسند کرے گا؟

"بولو ہانی! کیا تمہیں میرا فیصلہ غلط لگتا ہے۔ اپنی ماما کی طرح؟" پاپا بڑی آس لیے اس سے پوچھ رہے تھے۔

مگر نہیں۔

ہانیہ کو شدت سے احساس ہوا۔

یہ آس نہیں۔ وہ مان تھا جو ہمیشہ سے پاپا کو ہانیہ پر رہا تھا۔ اس کے لب کسی انجانی بات کے بوجھ سے کئی بار لرزے مگر وہ ایک بار بھی پاپا کا مان توڑنے کی ہمت نہیں کرپائی۔

اسے پاپا کے بائیں طرف بیٹھے شخص سے نفرت محسوس ہوئی' جس نے جان بوجھ کر اسے اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا' جو شاید اس کے کندھوں پہ رکھ کے بندوق چلانا چاہتا تھا۔

"جی پاپا! جیسے آپ کی خوشی۔" وہ رو رہی تھی۔ اپنی بزدلی پر۔ اپنی کم ہمتی پر۔ وہ زندگی سے اپنا حق' اپنی خوشی چھین نہ پائی تھی۔

پاپا نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر اس کے بالوں کو چوم لیا تو وہ بے اختیار روئے چلی گئی۔ پاپا خوش تھے۔ بے حد و بے حساب۔

✲ ✲ ✲

ماما سے جتنا ہوسکا' انہوں نے ہانیہ کو برا بھلا کہہ دیا۔ اس پر چیخ چلا لیا۔ صرف گالیاں دینے کی کسر بچی تو وہ انہوں نے عباد اور اس کے گھر والوں کو دے کر پوری کرلی۔

"بس کردیں ماما! جاہل گنوار لگ رہی ہیں ایسے۔" زونیہ اکتا گئی تھی اس جذباتی ڈرامے سے۔

"بکواس بند کرو تم۔" ماما اس پر الٹیں۔

"جو ہونا تھا' وہ تو ہوچکا۔ آپ کیوں اپنا بی پی بڑھا رہی ہیں۔ آگے جس کی زندگی برباد ہورہی ہے' وہ جانے اور اس کا کام۔"

"ارے ٹٹ پونجیوں میں کھپا دیا میری بیٹی کو۔ جو خود دانے دانے کو ترسے ہوئے ہیں' وہ میری آسائشوں میں پلی بیٹی کو کیا کھلائیں گے' کیا پہنائیں گے۔" ماما نے ہاتھ ملے۔

ہانیہ دم سادھے رہی۔ ماما کا صدمہ حد سے زیادہ تھا۔ انہوں نے یہ سب کرتے قطعاً" خیال نہ کیا تھا کہ عباد اور اس کی فیملی اندر پاپا کے کمرے میں موجود تھی اور وہ کمرا ساؤنڈ پروف تو کبھی بھی نہ رہا تھا۔

"پتا نہیں کس لالچ میں چلے آئے یہاں۔ ارے! سوتیلوں کا بھلا کیا حق بنتا ہے زمین و جائیداد پر۔"

زونیہ بور ہوکر وہاں سے اٹھ گئی اور اپنے کمرے میں چلی گئی مگر ہانیہ کو ابھی ماما کی مزید لعن طعن سننے کے لیے یہیں بیٹھنا تھا۔ حالانکہ اس کا شدت سے جی چاہ رہا تھا کہ اپنے بیڈ روم میں بند ہوکے خوب روئے چیخے چلائے۔ ایزد سکندر کی یاد کا ماتم کرے کہ آئندہ اس کی اجازت نہیں ملنے والی تھی۔

✲ ✲ ✲

ہانیہ اور زونیہ کی شادی ایک ہی روز طے ہوئی تھی۔

سعدیہ آپی کو پتا چلا تو انہوں نے بھی کم و بیش' ماما ہی جیسا ہنگامہ کیا۔ ہانیہ کے تو انہوں نے ماما اور زونیہ کے سامنے ہی وہ لتے لیے کہ وہ گنگ سی بس سنتی رہ گئی۔

"کیا جواب دوں گی میں ایزد کو.... اور معیز کیا کچھ نہیں سنائے گا مجھے۔ اتنی ہمت نہیں تھی تو یاری لگانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ بیچ راہ میں لا کے ایسے پلٹی ہو کہ اس کا احساس بھی نہیں۔ کہ میں کیا منہ دکھاؤں گی اسے۔ معیز تو میری جان کو آجائے گا۔" سعدیہ آپی! جانے کیوں رونے والی ہورہی تھیں۔

"ہم نے تو پکا ارادہ کرلیا تھا ہانیہ اور ایزد کی شادی کا۔ ایزد بھی کتنا پسند کرتا ہے اسے.... معیز کا بزنس ماما...." ہانیہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس کس بات کو رو رہی ہیں۔ مگر ماما خود ان تین چار روز میں اس معاملے پر اتنا ماتم کرچکی تھیں کہ اب بور سی ہوگئی تھیں۔ بے زاری سے بولیں۔

"اب کیا ہوسکتا ہے۔ زبردستی تو ایزد سے نکاح پڑھوانے سے رہے۔ جیسا چل رہا ہے چلنے دو۔ یہ جانے اور اس کا باپ۔"

مگر سعدیہ آپی تو ہانیہ سے تمام رشتے ختم کرنے آئی تھیں۔ ہانیہ ضبط کرتی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

"اب بس کرو۔ جسے خود اپنی بربادی کا احساس نہ ہو' اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔ یہ ہانیہ کا اپنا فیصلہ ہے۔" ماما سعدیہ آپی سے کہہ رہی تھیں۔

اور وہ بند کمرے میں ایزد سکندر کی یادوں کا سوگ منا رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

زونیہ اور علی نے اپنی شادی کی تمام شاپنگ اکٹھے کی۔ شاپنگ سے آکر زونیہ نے بطور خاص تمام چیزیں ماما کو دکھائیں۔ در پردہ وہاں بیٹھی ہانیہ کو۔

"ہر چیز میں نے علی کی پسند سے لی ہے۔ بھئی! جس کے لیے پہننا ہے' ہر شے اسی کی پسند سے ہونی چاہیے۔" وہ اترا اترا کر کہہ رہی تھی۔ ہانیہ بے تاثر بیٹھی سنتی رہی۔

"تمہاری سسرال سے کوئی فون نہیں آیا۔ دن ہی کتنے باقی ہیں شادی میں۔ ایک چھلے تک کی توفیق نہیں ہوئی ان لوگوں کو۔" زونیہ سے اس کی خاموشی برداشت نہ ہوپائی تھی۔ طنز سے کہا۔ ہانیہ گویا وہاں موجود ہی نہ تھی' نظر گھما کے ٹی وی دیکھنے لگی۔

"آیا تھا اس کی سو کالڈ نند کا فون۔ اس کی پسند کے کلرز پوچھ لیے اور بس۔ فارمیلٹی پوری ہوگئی۔" ماما نے حقارت سے جواب دیا۔

"ہونہہ! پینڈو لوگ ہیں ماما! دیکھنا بری لے کے آئیں گے اور ان کی رنگ برنگی عورتیں میرج ہال میں اسٹیج پہ چڑھ کے کپڑے جوتے دکھائیں گی۔" زونیہ بھی ماما ہی کا دوسرا روپ تھی۔

"حق ہا۔ اپنی مرضی سے کنویں میں گری ہے یہ۔ کوئی ایک بھی ہاتھ تھام لیتی تو ہم بچا لیتے اسے۔ مگر اسے تو کنویں کی تہہ میں باپ کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ ہر طرف سے آنکھیں بند کرکے چھلانگ لگائی ہے۔"

ماما کے پچھتاوے ختم ہونے میں ہی نہیں آرہے تھے مگر ہانیہ کی برداشت شاید آج جواب دے گئی۔

"اپنی مرضی سے کنواں چنا ہے میں نے تو مرا ہوا سمجھ کر اب بخش دیں مجھے۔ مت دہرائیں بار بار میرے زخموں کو کریدنے کا عمل۔" وہ پھٹ پڑی۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ زونیہ نے بڑبڑاتے ہوئے

اپنے شاپنگ بیگز اٹھانے شروع کردیے۔

"خدا خیر ہی کرے۔ ہر وقت کا رونا اور نحوست۔ مجھے اپنی شادی کی تاریخ آگے پیچھے کروالینی چاہیے تھی۔" وہ سارا سامان اپنے کمرے میں اٹھالے گئی۔

"یوں روتے روتے مرجاؤگی تم۔ ابھی بھی وقت ہے کون سا نکاح پڑھوالیا ہے تم نے۔ باپ کو صاف انکار کردو۔ ایزد منتیں کررہا ہے سعدیہ کی۔ ہر حال میں تمہیں اپنانے کو تیار ہے۔ سعدیہ اور معیز تمہارا پورا ساتھ دیں گے۔ معیز تو کہہ رہا تھا کورٹ میں جاکر تم دونوں کی شادی کروادے گا۔"

شیطان کا کوئی ایک روپ نہیں ہوتا۔ وہ یونہی رنگ بدل بدل کے سامنے آتا اور بہکاتا ہے۔ ماما کی زبانی یہ سب سن کر ہانیہ کو منزل بالکل سامنے اور بہت آسان دکھائی دینے لگی۔

کیسا خوش رنگ خواب تھا۔ ہانیہ وقار اور ایزد سکندر۔ زندگی کی شاہراہ پہ ہم قدم تو راستے پھول اور خوشیاں تتلیاں۔

اسی وقت پاپا کے کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے ہانیہ کے نام کی اونچی پکار سنائی دی تو وہ ہڑبڑا کر کسی خواب سے جاگی اور جوتوں میں پاؤں پھنساتی تیزی سے ان کے کمرے کی طرف بھاگی۔

"یا اللہ! یہ شخص لے ڈوبے گا اسے۔" وہ اپنا مینازم بیکار جاتا دیکھ کر غصے سے بولیں۔

☼ ☼ ☼

یہ بھی صد شکر کہ ایزد نے اس سے کوئی رابطہ نہ کیا تھا۔ ورنہ وہ خود کو سنبھال نہ سکتی اور شاید اس کے لیے اپنے فیصلے پر قائم رہنا بھی دشوار ہوجاتا۔ ہاں مگر سعدیہ آپی نے اس سے تمام تر ناراضی کے باوجود اس تک پیغام ضرور پہنچایا تھا۔

"ایزد تمہارا انتظار کررہا ہے۔ تمہارا اٹھایا ہمت کا ایک قدم تمہیں ایزد کی طرف لے آئے گا ہانیہ! ایزد کو کھو کر تم سوچ نہیں سکتیں کیا کچھ کھو رہی ہو۔ بربادی چن لی ہے تم نے۔" وہ خاموشی سے سنتی رہی اور دل خون کے آنسو بہاتا رہا۔

"میری ہمت نہیں پڑتی آپی! میری انگلی تھام کر جس شخص نے مجھے قدم اٹھانا سکھایا' آج اس کی مخالفت میں غلط قدم اٹھالوں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔" بہت کچھ سننے کے بعد بالآخر اس نے یہ کہا تو سعدیہ آپی نے غصے سے فون بند کردیا۔

ایزد سکندر کو خود سے دور جاتا پاکر ہانیہ نے اپنے دل میں عباد کے لیے سخت نفرت محسوس کی تھی۔

☼ ☼ ☼

پاپا اس سے بے حد خوش تھے۔ اس کی شادی تک وہ یوں بھلے چنگے ہوگئے جیسے کبھی بیمار ہوئے ہی نہ تھے۔

"ڈراما تھا سب۔ تمہیں بلیک میل کرنے کے لیے۔" ماما تنفر سے کہتیں۔

"ماما! فار گاڈ سیک۔ کچھ تو آسان کریں اس قیامت کو میرے لیے۔ بار بار ان چاہی زندگی گزارنے کے طعنے مت دیں۔ آپ تو میرے لیے یونہی خوش ہوں جیسے زونیہ کے لیے خوش ہورہی ہیں۔" ماما تاسف سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

"اس شخص کو اپنے قریب بھی مت آنے دینا ہانی! اس کے کندھے پہ رکھ کے بندوق چلاؤ۔ دیکھنا! دنوں میں تم سے متنفر ہوجائے گا۔ جب فیصلہ اس کی طرف سے ہوگا تو پاپا کی نظروں میں تم مجرم نہیں بنوگی۔ تھوڑی سی ہمت کرنا ہانی! ایزد تمہارا انتظار کرے گا۔"

سعدیہ آپی نے برائیڈل روم میں آکر ایک نئی شیطانی سوچ اسے تھمائی تھی۔ جس پر عمل کرنا ہانیہ کو بہت آسان لگا۔

واقعی۔ پاپا کا حق تو اس نے ادا کردیا۔ اس شخص کا بھلا اس پر کیا احسان تھا کہ جاکر اس کی زندگی کو سکون اور خوشی سے بھردیتی۔ وہ اسی لائن پہ سوچنے لگی۔

☼ ☼ ☼

دونوں باراتیں اپنے مقررہ وقت پر آئیں۔ علی کی بارات تو ظاہر ہے اس جیسے الٹرا ماڈرن جچ کھاتے ہوئے اور قیمتی لباسوں والے لوگوں پر مشتمل تھی۔ خود علی کی ماما شیفون کی خوبصورت قیمتی ساڑھی پہنے ہوئے تھیں۔ مختصر سے بلاؤز کی آستینیں غائب تھیں۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ہانیہ کی بارات بھی آگئی۔

سعدیہ آپی بطور خاص برائیڈل روم میں ہانیہ اور زونیہ کے پاس آئیں۔ زونیہ کے سسرال والوں کی تعریفوں کے پل باندھے۔

"ہانی کے سسرال والے بھی تو آگئے ہیں۔" زونیہ نے ایک ترچھی نگاہ ساکت مجسمے کی مانند بیٹھی ہانیہ پر ڈالی جو اس روپ میں خوبصورت مورت لگ رہی تھی۔

"ہاں! آگئے ہیں۔ ایک سے بڑھ کے ایک پینڈو اٹھا کے لائے ہیں۔ ہمارے مردوں نے گھر میں کبھی شلوار قمیص نہیں پہنی اور وہ لوگ بارات کے ساتھ یہ ڈریس پہن کے آئے ہیں۔" سعدیہ آپی نے حقارت سے کہا۔ اوپر سے زونیہ کی مذاق اڑاتی ہنسی۔ ہانیہ کا دل متلانے لگا۔

نکاح کے وقت قاضی صاحب اور گواہان کے ساتھ پاپا اندر آئے تھے۔ زونیہ کا نکاح پہلے پڑھایا گیا تو حق مہر سوا لاکھ روپے لکھا گیا۔ ہانیہ کے نکاح کی سنت ادا کی گئی تو حق مہر بیس ہزار سکہ رائج الوقت تھا' جو موقع پر ہی ہانیہ کو ادا کردیا گیا۔ ہانیہ کے دل نے ہمک ہمک کر زونیہ کی خوش قسمتی پر رشک کیا مگر سب کے باہر جاتے ہی پاپا نے پہلے زونیہ کو پیار کیا اور اس کے بعد ہانیہ کی پیشانی چوم کر سینے سے لگایا تو اس کی منجمد حسیات پگھلنے لگیں۔

"آئم پراؤڈ آف یو ہانی! تم میری بہترین بیٹی ہو۔" پاپا بہت خوش مگر کمزور اور تھکے ہوئے سے لگے۔ ہانیہ کا دل ٹھہر سا گیا۔

اس کی یہ قربانی اس کے کسی بہت پیارے کے لیے خوشی اور سکون کا باعث تھی۔ یہ اطمینان اسے بھلا گیا۔

دونوں بہنوں کی رخصتی اکٹھی ہوئی تو دونوں کی سجی ہوئی گاڑیاں مخالف سمتوں کی طرف رواں دواں ہوگئیں۔

نرگس پھپھو اور کرن کے درمیان وہ خود کو پھنسا ہوا محسوس کررہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر سعد اور فرنٹ سیٹ پر عباد تھا۔ کرن سارے راستے مسلسل دونوں بھائیوں سے ہنسی مذاق کرتی رہی۔ سعد اس کی باتوں کے جواب ایسی پھلجھڑیوں کی صورت دیتا کہ کوئی اور موقع ہوتا تو ہانیہ کی ہنسی نہ رکتی مگر اس وقت تو یہ ساری صورت حال اسے اپنا مذاق اڑاتی محسوس ہورہی تھی۔

اس کا سر دکھنے کو آگیا۔ اسے لگا جیسے وہ لوگ اپنی کامیابی پر نازاں و مسرور ہوں کہ اس کے قابل نہ ہوتے ہوئے بھی اسے بیاہ لے جارہے تھے۔

ان کی ہنسی مذاق کے درمیان عباد محض ایک آدھ فقرہ ہی بول رہا تھا۔ وہ اور نرگس پھپھو چپ ہی رہے مگر سعد اور کرن کو جانے کون سی ایسی خوشی مل گئی تھی کہ چپ ہی نہیں ہورہے تھے۔ قریب تھا کہ وہ غصے کے مارے چیخ اٹھتی۔ اسی وقت مختلف موڑ مڑتی' دھچکے کھاتی گاڑی آہستہ ہوتے ہوئے رک ہی گئی۔

اس نے سنا تھا گاؤں کی زندگی شہر سے مختلف ہوتی ہے۔

"چہ چہ۔ نو بجے سونے والے لوگ۔" سعدیہ آپی کل تک اس کا تمسخر اڑا رہی تھیں۔

اور یہاں ساڑھے گیارہ بجے رخصتی ہوئی تھی اور ڈیڑھ گھنٹے میں وہ لوگ گھر پہنچے تھے۔

اور یہاں ایک رونق میلے کا سماں تھا۔

گاڑی رکتے ہی بھانت بھانت کی آوازیں اور بولیاں۔

"آپ کی دلہن دیکھے بنا بھلا کسی کو نیند آنی تھی۔" کھنکھناتے لہجے میں کرن نے یقیناً "عباد سے کہا تھا' پھر دروازہ کھول کر گاڑی سے اتری اور جھک کر ہانیہ کا بازو تھاما۔

"آجائیں بھابھی! گھر آگیا ہے۔"

وہ بے جان ہوتے وجود اور تمام تر غیر رضامندی کے ساتھ گاڑی سے نیچے اتری۔ مووی لائٹس آن تھیں۔

ایک تو شور ہنگامہ اور عورتوں کا رش۔ اوپر سے

مووی لائٹس کی گرمی۔ ہانیہ جیسی نرم و نازک لڑکی کا حلق خشک ہو گیا۔ غم کے مارے کھانا تو پہلے ہی نہ کھایا تھا۔ اب پیاس کے مارے دم نکلنے لگا۔ مگر وہ کس کو آواز دے۔

زونی' ماما... پاپا... اس کے حلق میں کانٹے اگ آئے۔ آنکھیں بھر بھر آئیں۔ کیسے انمول رشتے چھوڑ آئی تھی پیچھے۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔

بمشکل گھر میں داخل ہوئے تو اسے لگا اس کی ٹانگیں بے جان ہو رہی ہوں۔ پہلے اس کی پنسل ہیل کی ہیل رپٹی' پھر اس کے گھٹنے بے جان سے ہو کر مڑے تو آنکھیں موندتی وہ ڈھے گئی۔ پتا نہیں کون کون سی فضول رسموں میں الجھے لوگوں کو تب پتا چلا' جب انہوں نے دلہن کو گٹھڑی کی مانند زمین پر پڑے دیکھا۔ ایک ہلچل سی مچ گئی۔

عباد نے فی الفور مووی کیمرا آف کروایا۔

کرن اور نرگس پھپھو خواتین کو اندر کمرے میں لے گئیں تو عباد پھرتی سے ہانیہ کو اٹھا کر اپنے کمرے تک لایا اور بستر پر لٹاتے ہوئے پیچھے آتی کرن سے کہا۔

"اس کا دوپٹا وغیرہ کھول دو۔ گرمی کی وجہ سے ایسی حالت ہوئی ہوگی۔"

کرن نے تیزی سے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ہانیہ کے دوپٹے کی پنیں اتارنا شروع کیں۔ عباد اے سی آن کر کے پلٹا تو ہانیہ کی پلکوں میں خفیف سی لرزش ہوئی۔ کرن نے اس کا گال تھپتھپایا۔

"پپ... پانی..." اس کی مدھم سی آواز۔

کرن تیزی سے لپکی اور لمحہ بھر میں ٹھنڈے پانی کی بوتل اور گلاس لے آئی اور گلاس میں پانی ڈال کر ہانیہ کا سر اونچا کرتے ہوئے اس کی ہونٹوں سے لگایا۔

عباد سینے پہ بازو لپیٹے کھڑا تھا۔ ہانیہ کو پانی پیتے اور مندی آنکھیں کھولتے دیکھ کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔

"بڑی نازک دوہٹی لے کے آیا اس عباد!" باہر عورتیں اسے چھیڑ رہی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے سعد کی طرف بڑھا۔

"مووی میکرز کو فارغ کر دو اب۔"

"بھابھی کیسی ہیں اب؟" سعد بھی متفکر تھا۔

"ٹھیک ہے۔ گرمی کی وجہ سے بے ہوش ہوئی تھی۔" عباد نے سنجیدگی سے کہا تو وہ مطمئن سا پلٹ کر مووی میکرز کی طرف چلا گیا۔

پانی پی کر اس کے اعصاب کو تقویت ملی تو وہیں اے سی کی کولنگ نے طبیعت کی گرانی اور کسلمندی دور کر دی۔

"آپ کا دوپٹا سیٹ کر دوں؟" وہ تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی' جب کرن نے پوچھا۔ وہ اس کے سوال کا ماخذ جان کر قدرے سختی سے بولی۔

"نہیں! بلکہ میں یہ جیولری بھی اتارنا چاہ رہی ہوں۔"

"ابھی تو بھائی آنے والے ہیں۔" کرن نے بے اختیار کہا تو ہانیہ نے سکون سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تو...؟" وہ جھینپی۔

"ان سے کچھ تعریف تو کروالیں پہلے' پھر چینج کر لینا۔"

ہانیہ سر جھٹک کر مزید کچھ کہے بغیر جیولری اتارنے لگی تو کرن خاموش سی ہو گئی' پھر اسی خاموشی سے اس نے سائیڈ ٹیبل کی دراز میں سے ایک مخمل کا بنا پاؤچ نکال کے دیا۔ ہانیہ نے ساری جیولری اس میں ڈال دی اور وہ پاؤچ لاپروائی سے سائیڈ ٹیبل پر ہی رکھ دیا۔

"واش روم کہاں ہے...؟" اس کے پوچھنے پر کرن نے کمرے میں موجود دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ الجھلباتھ تھا۔

"میرا سوٹ کیس؟ اس میں میرے کپڑے تھے۔" ہانیہ کو دھیان آیا۔

"آپ کا نائٹ سوٹ لٹکا دیا ہے۔" کرن نے بتایا۔

وہ لہنگا سمیٹتی بیڈ سے اتری۔ کرن نے مستعدی سے خوبصورت سی نازک چپل اس کے سامنے کی۔ وہ خاموشی سے چپل پہن کر واش روم میں آ گئی۔

جدید طرز کا بنا واش روم ہر قسم کی سہولت سے آراستہ۔ مہکتا ہوا سا تھا۔ چمکدار ٹائلز۔ خوبصورت سی لائٹنگ اور نہانے کے لیے ایک طرف باکس بنا ہوا تھا۔

ایک گاؤں میں اس طرح کے واش روم کا تصور کرنا بھی محال تھا۔

وہ سر جھٹکتی اپنا نائٹ ڈریس دیکھنے لگی۔ ہلکی سی کڑھائی سے سجا گلابی اور فیروزی رنگ کا خوب صورت سا ٹراؤزر اور شرٹ اسے اچھا لگا۔ اس نے فوراً" اسے بیشتر بھاری بھر کم لہنگے سے چھٹکارا حاصل کرتے ہوئے وہ کپڑے پہن لیے۔ آئینے میں جھانکا تو چہرہ اجنبی سا لگا۔ صابن لگا کر ٹھنڈے پانی سے منہ دھویا تو اپنا آپ بے حد ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا۔

وہ تر و تازہ سی ہو کر واش روم سے نکلی تھی۔ تولیے کے بجائے یونہی ہاتھوں ہی سے پانی کے قطرے چہرے سے جھٹکتی باہر آئی تو عباد کو سامنے کاؤچ پر نیم دراز کیفیت میں لیٹا پا کر ٹھٹک سی گئی۔

پھر اگلے ہی پل خود کو سنبھالتے ہوئے آگے بڑھی۔ اپنے پرس میں سے ٹشو پیپر نکالا اور اس سے تھپتھپا کر چہرہ خشک کرنے لگی۔ عباد سیدھا ہو کر بیٹھا۔

"کیسی طبیعت ہے تمہاری...؟"

ہانیہ کا جی نہ چاہا کہ اس کی بات کا جواب دے۔

"اب ٹھیک ہے۔" مگر وہ مختصراً" کہہ کر یونہی خوامخواہ اپنا پرس کھول کے اس میں جھانکنے لگی۔

عباد نے چند لمحے اسے دیکھ کر جانے کیا اندازہ لگایا تھا' پھر اٹھ کر واش روم میں چلا گیا۔ ہانیہ نے گہری سانس بھرتے ہوئے پرس بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر پھینکا۔

"واٹ نان سینس! میں ایسے بزدلوں کی طرح کیوں جان بچا رہی ہوں۔ مجھے اس پر پہلی ہی رات میں اس رشتے سے ناپسندیدگی واضح کر دینی چاہیے تاکہ وہ اپنی حد ہی میں رہے۔" اس نے خود کو ڈانٹتے ہوئے وہ لائحہ عمل یاد کیا جو وہ میکے سے طے کر کے آئی تھی۔

عباد کے باہر آنے تک وہ بیڈ کے ایک کنارے پہ لیٹی آنکھوں پہ بازو رکھے خود کو سویا ہوا ظاہر کر رہی تھی مگر آنکھوں کی جھریوں سے درحقیقت وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

واش روم سے وہ نہا کے چینج کر کے نکلا تھا۔ تولیے سے رگڑ کے بال خشک کرتا وہ ہانیہ ہی کو دیکھ رہا تھا۔ ہانیہ کا دل بے ترتیب سا ہوا۔

وہ کیا سوچ رہا ہے؟

پھر تولیہ کاؤچ کی پشت پر پھیلا کر وہ ڈریسنگ کی طرف آیا اور برش اٹھا کر بال سنوارنے لگا۔ ہانیہ کو اپنا دل ہاتھ پیروں میں دھڑکتا محسوس ہونے لگا۔

برش رکھ کے وہ لائٹ بند کرتا بیڈ کی طرف آیا تو ہانیہ کی سانسیں رک سی گئیں مگر وہ تکیے سے بستر جھاڑ کر اپنی جگہ پر یوں لیٹا' جیسے اس بستر پر وہ بالکل اکیلا ہو۔

اطمینان کے ساتھ ساتھ ہانیہ کو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ وہ تو گھر سے ہی یہ سب سوچ کے چلی تھی مگر عباد کیا گیم کھیل رہا تھا؟ نکاح میں آئی لڑکی' جس پہ وہ شرعی حق رکھتا تھا۔ اسے پہلی رات ہی یوں نظرانداز کرنا...؟

تسلی تو کیا خاک ہوتی۔ اس کا ذہن الجھنے لگا۔ اسے ماما اور زونیہ کی باتیں یاد آئیں۔

"تو کیا واقعی عباد نے جائیداد کی خاطر..." اس کا دل پریشان ہوا۔

☆ ☆ ☆

صبح اس کی آنکھ کھلی تو چند لمحے اسے ماحول سے مانوس ہونے میں لگے۔ یونہی لیٹے لیٹے اس نے چہرہ گھما کے جائزہ لیا۔ عباد کمرے میں موجود نہیں تھا۔ واش روم کا دروازہ بھی ادھ کھلا تھا۔

بیڈ کے داہنی طرف دیوار میں شیشے کی بڑی سی کھڑکی جس کے پردے سائیڈ پہ کر دیے گئے تھے۔ یہ کمرا یقیناً" پچھلی سائیڈ پر بنا تھا اسی لیے دھوپ کے بجائے کمرے میں صرف صبح کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

وہ کھلے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹتی اٹھ بیٹھی۔ ایک نظر کمرے پر دوڑائی۔

نفیس سا فرنیچر' خوبصورت پردے' وارڈ روب۔

تمام اشیا کی ترتیب میں بہت نفاست کی جھلک تھی۔

ہانیہ گاؤں میں ایسے طرزِ زندگی پر غور کرتی بستر سے اترنے لگی۔ اسی وقت دروازہ کھٹکھٹایا گیا تو بے اختیار ہی اس کے منہ سے یس نکل گیا۔ اپنے حلیے کا دھیان اسے تب آیا جب کرن کے ساتھ ایک پیاری سی لڑکی کو اندر آتے دیکھا۔ کرن خجل سی ہوئی۔

"بھائی کہہ رہے تھے آپ جاگ رہی ہوں گی۔ میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا؟" کرن کا انداز معذرت خواہانہ تھا۔ ہانیہ مروتاً "شاید" کچھ کہتی مگر اس سے پہلے ہی کرن کے ساتھ آنے والی لڑکی بول اٹھی۔

"یہ شہر والوں کا بے باک انداز ہے کرن! دیکھا نہیں تم نے۔ بارہ بجے تو ان کی صبح ہو رہی ہے اور چینج ابھی تک نہیں کیا۔" شکل کی پیاری لڑکی کا لہجہ اتنا ہی تیکھا اور طنز سے بھرپور تھا۔ اس کا حملہ اتنا اچانک تھا کہ کرن بے چاری گھبرا سی گئی مگر ہانیہ کا تو دماغ ہی گھوم گیا۔

"ان کی تعریف۔۔۔؟" ہانیہ نے سرد مہری سے دریافت کیا۔

"یہ زینی ہے۔ زینب۔ میری پھپھو کی بیٹی ہے۔" کرن جانے کیوں ہکلا سی گئی۔ جبکہ زینی عین ہانیہ کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ جیسے اس سے اپنا تقابل کر رہی ہو۔ ہانیہ کو وہ لڑکی خطرناک لگی۔

"کرن سے کہاں میرا تعارف کرایا جائے گا۔ اس کے لیے مجھے ہی زحمت کرنا پڑے گی۔" لب و لہجے سے وہ پڑھی لکھی لگ رہی تھی مگر انداز ازحد طنزیہ اور کٹیلا تھا۔ ہانیہ کی برداشت جواب دے گئی۔

"اچھا جی۔ آپ کیا بہادر شاہ ظفر کی پوتی ہیں۔" اپنی طرف سے ہانیہ نے بھرپور طنز کیا۔ مگر جواباً" بے حد اطمینان سے جو زینی نے کہا' اس نے صحیح معنوں میں ہانیہ کو بھک سے اڑا دیا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولی تو لہجے میں کھلا چیلنج تھا۔

"جی نہیں۔ میں آپ کے شوہر نامدار کی قائم مقام منگیتر ہوں۔"

ہانیہ کو لگنے والا جھٹکا شدید تھا۔

لیکن اس جھٹکے میں دکھ نہیں بلکہ حیرت و بے یقینی کا عنصر تھا۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ شادی کے اگلے ہی روز اس کے شوہر کی قائم مقام منگیتر یوں سامنے آکھڑی ہوگی۔ کرن کی رنگت اڑ سی گئی۔

وہ بے چاری تو زینی کو بھابھی دکھانے لائی تھی۔ معلوم نہ تھا کہ زینی یوں اپنا آپ عیاں کردے گی۔

"آپ بھی آئیں نا نیچے۔ سب آپ کا ویٹ کر رہے ہیں ناشتے کے لیے۔"

کرن نے یوں ظاہر کیا جیسے زینی نے کوئی بات کی ہی نہ ہو۔ زینی بھی نخوت سے سر جھٹک کر کمرے سے نکل گئی۔ کرن بھی پلٹی۔

"ٹھہرو کرن۔۔۔!" ہانیہ کے انداز میں محسوس کن سختی تھی۔ کرن بے چارگی سے پلٹی۔

"ابھی جو کچھ تمہاری کزن نے کہا' وہ سچ ہے؟"

"آپ فریش ہو جائیں۔ صبح صبح اپنا موڈ خراب مت کریں اور ناشتے کے لیے آجائیں۔" وہ کہہ کر باہر چلی گئی۔ ہانیہ کا سر چکرا گیا۔

منگیتر کے ہوتے ہوئے جس شخص نے ہانیہ سے بیاہ رچالیا تھا اسے ماسوائے روپے پیسے کے اور کس شے کا لالچ ہو سکتا ہے۔ وہ ماما کی نہج پہ ہی سوچ رہی تھی۔ فریش ہو کر وہ باہر نکلی تو اس کا سوٹ کیس کمرے میں موجود تھا۔

اپنی مرضی کا لباس نکال کے سادہ سی ڈریسنگ کے ساتھ وہ گیلے بال شانوں پہ بکھیرے کمرے سے نکل آئی۔ رات بھی کچھ نہیں کھایا تھا' سو اب بھوک چمک اٹھی تھی۔ ٹی وی لاؤنج کے ساتھ ہی ڈائننگ روم تھا۔ باتوں کی آوازوں کے تعاقب میں وہ وہیں جا نکلی۔ دس کرسیوں والی ڈائننگ ٹیبل اس وقت بھانت بھانت کے لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔

اسے دیکھ کے ایک دم سے خاموشی چھا گئی تو ہانیہ نروس سی ہو گئی۔ کرن اس کی کیفیت کا اندازہ کرکے فی الفور اٹھی اور آگے بڑھ کے اس کا حنائی ہاتھ تھام کر اپنی خالی کی ہوئی کرسی پر لا بٹھایا۔ جہاں ایک طرف نرگس پھپھو بیٹھی تھیں اور دوسری طرف تیکھے نقوش والی خاتون براجمان تھیں۔

"نہ سلام' نہ دعا۔ دلہن تو لگتا ہے سدا سے یہیں رہتی ہے۔" یہ طنز ان ہی خاتون کی طرف سے آیا تھا۔ بظاہر لہجہ خوش گوار۔ ہانیہ شرمندگی کا شکار ہوئی۔ واقعی اتنے سارے لوگوں کو ایک ساتھ دیکھ کر وہ جھجک کا شکار ہو کر سلام بھی نہیں کرپائی تھی۔

نرگس پھپھو خاموش رہیں۔ خدا جانے ان کے پاس کوئی جواب تھا نہیں یا وہ اس کی حمایت میں بولنا نہیں چاہتی تھیں۔ ہانیہ اس اجنبی ماحول سے وحشت زدہ سی ہونے لگی۔ دس لوگوں کی بیس آنکھیں اسی پہ لگی تھیں۔

"امی! آپ کی شہری بہو تو ناشتے کی آس میں آئی ہے۔ ادھر ہم دوپہر کے کھانے کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔" ہانیہ کو اپنا تمام تر اعتماد ہوا ہوتا محسوس ہوا۔ اتنے سارے لوگوں میں وہ کوئی بدزبانی نہیں کرسکتی تھی اور نہ کوئی بدلحاظی دکھا سکتی تھی۔

"السلام علیکم۔۔۔ بھئی ناشتا تو ابھی میں نے بھی کرنا ہے اور کون رہ گیا ہے ناشتا کرنے والا؟" یہ عباد کی آواز تھی۔

ہانیہ نے بے اختیار چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ ٹیبل پر بیٹھے لڑکوں سے ہاتھ ملاتا لڑکیوں سے ہائے ہیلو کر رہا تھا۔

"ہانیہ! مختصر سا تعارف ان سب کا یہ ہے کہ یہ سب لڑکے تمہارے دیور ہیں۔ اور یہ سب لڑکیاں تمہاری نندیں۔"

عباد اس کی کرسی کی پشت تھامے اس طرف قدرے جھک کر بیٹا رہا تھا۔ اس کی یہ بے تکلفی ہانیہ کی سمجھ سے بالاتر تھی مگر فی الحال ہانیہ کی توجہ سامنے رو میں بیٹھی زینی کے سرخ پڑتے چہرے کی طرف تھی۔ وہ ایک دم کرسی گھسیٹ کر اٹھی۔

"مجھے چھوڑ کر۔۔۔ انڈر اسٹینڈ!" تلخی سے کہتی وہ پاؤں پٹختی وہاں سے چلی گئی۔

"زینی۔۔۔ ادھر آؤ۔" ساتھ بیٹھی خاتون نے زینی کو آواز دی اور ساتھ ہی عباد کو بھی سرزنش کی۔

"تمہیں پتا تو ہے اس کا۔ پھر کیوں تنگ کرتے ہو اسے۔ وہ تو پہلے ہی بہت دکھی ہے۔"

"پھپھو! اس نے میری پوری بات سنی ہی کہاں ہے۔ میں بھی اسے چھوڑ کے باقی سب نندیں ہیں' کہنے والا تھا۔" عباد نے اطمینان سے کہا۔

"اوہ۔۔۔" ہانیہ پر کھل گیا کہ یہ خاتون عباد کی پھپھو یعنی زینب عرف زینی کی والدہ محترمہ تھیں۔

"تم بتاؤ ہانیہ! ڈائریکٹ لنچ ہی کرو گی یا ناشتا کرنے کا موڈ ہے؟" عباد اس سے پوچھ رہا تھا۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" وہ بے ساختہ سچ بول گئی۔

"اب کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ کھانا ہی کھالو۔ اس وقت تو حلوہ پوری اچھی بھی نہیں لگے گی۔" نرگس پھپھو نے سنجیدگی سے مشورہ دیا تو ہانیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

لڑکے سعد کے ساتھ اٹھ گئے اور لڑکیاں کرن کے ساتھ یقیناً" کچن کی طرف گئی تھیں۔ اب نرگس پھپھو اور عباد کی پھپھو کے نرغے میں ہانیہ بیٹھی رہ گئی تھی یا ہانیہ کی پشت پہ کھڑا عباد۔

"بھئی! ایسی منہ دھوئی دلہن تو پہلی بار دیکھی ہے میں نے۔ ہمارے زمانے میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔" عباد کی پھپھو نے اسٹارٹ لیا تو نشانہ ہانیہ کی سادگی تھی۔

"کیوں پھپھو! آپ کے زمانے میں دلہنیں منہ نہیں دھوتی تھیں؟" عباد نے تحیر سے پوچھ کر سوال کی سنگینی کو یوں زائل کیا کہ نرگس پھپھو کے ساتھ ہانیہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے عباد کو گھورا۔

"فضول باتیں مت کرو۔ ہم تو ہمیشہ سج بن کے رہے۔ ان کے ابا تو خوب راضی ہوتے تھے اس ادا سے۔"

"میں ایسے ہی اس سے راضی ہوں پھپھو! مجھے پیسٹری بن کے بیٹھے رہنے والی لڑکیاں بہت بری لگتی

ہیں۔" عباد کا اطمینان کمال کا تھا۔

ہانیہ کو یوں کمرے سے نکل آنے کا افسوس ستانے لگا۔ اچھا تھا وہیں ناشتے کا انتظار کرتی رہتی۔ یہ سارا ڈراما تو دیکھنے کو نہ ملتا۔

ذرا دیر کے بعد کھانے کی ٹیبل طرح طرح کی ڈشنز سے سج گئی۔ عباد نے نرگس پھپھو کے اٹھتے ہی ہانیہ کے ساتھ والی نشست سنبھال لی۔ لڑکوں نے کھانے کی ٹیبل کو بوفے بنالیا اور اپنی پسند کی اشیا پلیٹوں میں سجا کے ٹی وی لاؤنج میں چلے گئے۔ اب ڈائننگ ٹیبل پر رش کم تھا۔

زینب نے آکر بڑے اعتماد سے ان کے مقابل کرسی سنبھال لی اور مختلف ڈشز اٹھا کے عباد کی طرف بڑھانا شروع کیں۔ زینی کے ہاتھوں سے چاولوں کی ڈش تھام کر وہ اپنی پلیٹ کے بجائے ہانیہ کی پلیٹ میں ڈالنے لگا۔ زینی کی پیشانی پر پڑنے والے بل بہت نمایاں تھے۔

اب وہ سالن کا ڈونگا اٹھا کر اسے پیش کر رہا تھا۔ ہانیہ نے اسے روک دیا۔ اس نے چاولوں پر کباب کے ساتھ محض رائتہ اور سلاد لیا۔

اپنا مختصر سا کھانا ختم کر کے سب سے پہلے معذرت کرتی ہانیہ وہاں سے اٹھی اور اپنے کمرے میں آکر دم لیا۔

باہر کی محفل اب زوروں پر تھی۔ سوچوں میں گم وہ چونکی۔ اس کا موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ اس نے جلدی سے موبائل اٹھایا۔ پاپا کی کال تھی۔

"السلام علیکم۔۔۔ کیسی ہے میری شہزادی بیٹی؟" پاپا کی آواز سے زندگی جھلک رہی تھی۔ ہانیہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"ٹھیک ہوں پاپا! آپ کی طبیعت کیسی ہے اب؟"

"میں تو ایک دم فٹ فاٹ ہوں۔ بھئی ایک دم سے اتنے بڑے بیٹے کا باپ جو بن گیا ہوں۔" وہ بہت خوشی سے عباد کا ذکر کر رہے تھے۔

ہانیہ کے دل کو تکلیف ہوئی۔ پاپا بے چارے نہیں جانتے تھے کہ ان کا یہ پلا پلایا بیٹا ان کے ساتھ کیا گیم کھیل رہا ہے۔

"عباد کہاں ہے؟"

"جی وہ۔۔۔ باہر ہیں۔" وہ مدھم پڑی۔

"ہانی۔۔۔ وہ بہت اچھا انسان ہے۔ اس کی قدر کرنا۔" پاپا نے بہت سی باتوں کے درمیان اسے نصیحت کی جو کم از کم ہانیہ کو تو قطعاً پسند نہیں آئی۔ عباد نے موجودہ حیثیت میں اسے ذرا بھی متاثر نہیں کیا تھا۔

موبائل آف کرتے ہوئے اسے خیال آیا۔ عباد اور اس کی پہلی ملاقات اسپتال میں ہوئی تھی۔ تب وہ اسے برا نہیں لگا تھا۔ اس نے بے زاری سے سر جھٹکا۔ تب ہی دروازہ کھلا تو ہانیہ چہرہ موڑ کے دیکھنے لگی۔ عباد اندر آیا تھا۔

ہانیہ نے اپنے اندر کوئی بھی تاثر ابھرتا محسوس نہیں کیا۔ اپنا موبائل فون اٹھا کر یوں ہی نمبروں سے کھیلنے لگی۔ عباد آکر بیڈ پر بیٹھا اور جوتے اتار کر بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔

"زینی کیا لگتی ہے تمہاری؟" ہانیہ کی توجہ موبائل پر مگر لہجہ طنز سے بھرپور تھا۔ نیند سے بوجھل ہوتی عباد کی آنکھیں پٹ سے کھلیں۔

"مطلب۔۔۔؟" وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ ہانیہ کا ارادہ اس کی ٹھیک ٹھاک کلاس لینے کا تھا۔

"مطلب یہ کہ۔۔۔ زینی سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟" اب وہ بڑے اعتماد سے عباد کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے عباد کے تاثرات میں ناگواری دیکھی۔

"تمہارا مطلب جو بھی ہو۔۔۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تم یوں مجھے تو تڑاخ کر کے مخاطب کیا کرو گی؟" اس نے بالکل ہی غیر متعلق بات کی۔ لمحہ بھر کو ہانیہ اگلی بات بھول گئی۔

"کافی بڑا ہوں میں تم سے اور پھر جو رشتہ ہے تمہارا مجھ سے وہ احترام کا متقاضی ہے۔"

ہانیہ نے گہری سانس بھرتے ہوئے جیسے خود کو کمپوز کیا اور پھر رسان سے بولی۔

"زینی سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟"

"کزن ہے میری۔ تمہارے ساتھ ہی اس کی امی بیٹھی تھیں۔ میری پھپھو کی بیٹی ہے۔" اس نے بڑی تفصیل سے اپنا اور زینی کا رشتہ واضح کیا یا شاید لفظوں کے پردے میں چھپایا تھا۔ کم از کم ہانیہ کو ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔

"اس کے علاوہ۔۔۔؟"

عباد نے چونک کے اسے دیکھا۔ "کیا جاننا چاہتی ہو تم؟"

"میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں مسٹر عباد! کہ ایک عدد منگیتر رکھتے ہوئے بھی آپ کو اس ایمرجنسی میں شادی کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی اور یہ کہ میرے پاپا کو کس لیے دھوکا دیا ہے آپ نے۔ کس لالچ میں؟" وہ چیخ بولی۔

چند لمحوں تک عباد اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ جیسے اسے اندر تک پڑھ لینا چاہتا ہو۔ پھر بڑے اطمینان سے پوچھنے لگا۔

"تمہارا کیا خیال ہے مجھے کیا لالچ ہو سکتا ہے؟"

"میرے پاپا کا بزنس، گھر اور کیا۔" ہانیہ کو اس کی اداکاری پر جی بھر کے غصہ آرہا تھا۔ وہ تنفر سے بولی۔

"نکاح میں اپنے ساتھ بداعتمادی لائی ہو ہانیہ وقار۔"

"اور تم۔۔۔ جس نے نکاح کے نام پہ دھوکے کا کھیل کھیلا ہمارے ساتھ، اس کا کیا؟" ہانیہ کی نرم مزاجی کہیں دور جا سوئی۔

"میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں یہاں ریسٹ کرنے آیا ہوں۔" وہ بولا اور پھر آرام سے لیٹ گیا اور دوسرا تکیہ اٹھا کر چہرے پر رکھ لیا۔ ہانیہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔

اس کی قربانی یوں رائیگاں جائے گی، اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

"ایکسکیوزمی مسٹر عباد! مجھے بھی کوئی شوق نہیں تھا اس شادی کا۔ مجھے مجبور کیا تو صرف میرے باپ کی خواہش نے مگر میں تمہارا یہ چہرہ ضرور انہیں دکھانا چاہتی ہوں۔" ہانیہ سلگی۔ اس کے الفاظ نے جادو کا اثر کیا۔ عباد فی الفور تکیہ پرے کرتا اٹھ بیٹھا۔

"شٹ اپ۔۔۔ اب اس سے زیادہ ایک لفظ بھی نہیں۔۔۔ اگر تم نے ماموں جان سے ایک بھی فضول لفظ کہا تو۔۔۔" وہ دانتوں پر دانت جما کر رہ گیا۔

اس کے انداز و الفاظ میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ ہانیہ اپنی جگہ دبک کر رہ گئی۔

عباد نے گہری سانس بھر کے جیسے خود کو معتدل کیا اور پھر اسے سمجھانے والے انداز میں بولا۔

"تم نے جن حالات میں اس شادی کے لیے ہامی بھری ہے، وہ تم اچھی طرح جانتی ہو اور میرا نہیں خیال کہ تم اب کوئی بے وقوفی کر کے اپنے پاپا کی زندگی سے کھیلنے کی کوشش کرو گی۔"

ہانیہ سن رہ گئی۔

وہ کیا کہہ رہا تھا اور اسے کیا سمجھانا چاہ رہا تھا۔ وہ سمجھ میں آتے ہی اس کی زبان بند ہو گئی۔ وہ کروٹ لے کر لیٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

اس کا ولیمہ بڑے اچھے میرج ہال میں شان دار طریقے سے ہوا تھا۔ زونیہ کا ولیمہ ایک روز بعد تھا۔ آج وہ علی کے ساتھ ہانیہ کے ولیمہ میں آئی تو ان دونوں کی شان ہی نرالی تھی۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے وہ دونوں صحیح معنوں میں لوبرڈ لگ رہے تھے۔

پاپا ان کے پاس آئے تو عباد اور ہانیہ دونوں سے بہت محبت سے ملے۔ ماما نے عباد سے فارملیٹی نبھائی مگر ہانیہ سے کٹی کٹی سی رہی تھیں۔ ان کی سرد مہری ہانیہ سے چھپی ہوئی نہ تھی۔

سعدیہ آپی کا رویہ بھی ماما سے الگ نہیں تھا۔ ہانیہ خود ترسی کا شکار ہونے لگی۔ اپنوں کی بے رخی دل کو اندر تک کاٹ رہی تھی۔ اتنی بڑی قربانی دینے اپنے جذبات و احساسات کا خون کرنے کے بعد بھی اسے جنت نہ ملی تھی۔ ہال کی ارینجمنٹ سے لے کر کھانے تک ہر انتظام بہترین تھا۔

"میں تو زونی کی سسرال کو انوائٹ کرنے کے حق

میں ہی نہیں تھی۔ ان جاہل گنوار لوگوں میں آ کے تو وہ سو باتیں کرتے۔" ماما نے نخوت سے کہا تو وہ دل مسوس کے رہ گئی۔

"چلیں نا آپ لوگ ہمارے ساتھ۔ ہانیہ کا گھر نہیں دیکھیں گے۔" تقریب کے اختتام پر جب سب واپسی کے لیے ہانیہ سے ملنے لگے تو عباد نے مسکراتے ہوئے شائستگی سے سب کو دعوت دی۔ جو کسی کو بھی قبول نہ تھی۔

"مجھے تو ڈسٹ الرجی ہے اور گاؤں کے راستے تو..." ماما نے اپنی بے زاری کو کسی پردے میں نہ چھپایا تھا۔

زونیہ اور سعدیہ آپی نے مروتاً بھی کوئی اخلاق نہ نبھایا تھا۔ چلتے ہوئے ماما نے سب کو زونیہ اور علی کے ولیمہ میں آنے کی دعوت بھی پتا نہیں کس رو میں دے دی یا شاید بابا کے خیال سے۔ ورنہ وہ تو ان گنوار لوگوں سے ملنا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔

گھر آ کے سب اسے گھیر کے بیٹھ گئے۔ جبکہ ہانیہ کا دل چاہ رہا تھا تنہائی پا کر خوب روئے۔ بلکہ چیخے چلائے۔ تاکہ اندر کا غبار نکل سکے۔

مگر ادھر فطری تقاضے تھے دنیاداری کے۔ وہ گاجری کلر کے حسین لہنگے میں یوں ساکت بیٹھی مومی مجسمہ لگ رہی تھی۔ ہنسی، مزاح، قہقہے۔ کوئی بھی شے اس کے سکتے کو توڑ نہیں پا رہی تھی۔

دھم سے اس کے پاس کوئی صوفے میں دھنسا تو اس نے خشمگیں انداز میں چہرہ گھمایا۔

"کسی کی یاد آ رہی ہے؟" بے حد ہمدردی بھرا انداز۔ پچکارتا ہوا لہجہ۔

"عالی کو تو کسی شے کا لالچ ہو سکتا ہے مگر تمہیں کس لالچ نے اس شادی پر مجبور کیا تھا؟" لبوں پہ مسکراہٹ دھیما مگر زہریلا لہجہ، یہ زینی تھی۔

ہانیہ کا دماغ گھومنے لگا۔ اسی وقت عباد صوفے کے پیچھے سے ان پر جھکا۔

"کیا پٹیاں پڑھا رہی ہو میری بیوی کو..." اس کا لہجہ خوش گوار تھا۔

"ہونہہ... پڑھے ہوئے کو کیا پڑھانا۔ میں تو صرف یہ پوچھ رہی تھی کہ کس کی یاد میں گم بیٹھی ہے، یوں افسردہ سی۔"

وہ زینی تھی۔ جسے کسی کا خوف نہ تھا۔ اونچی آواز میں بولی تو کسی کو معاملے کا پتا نہ ہونے کے باوجود اس کے انداز و الفاظ نے ٹی وی لاؤنج میں خاموشی پھیلا دی۔

"چلو بھئی! اب بس کرو۔ نیند آ رہی ہے، چل کے سوؤ سب۔" نرگس پھپھو نے کھنکھارتے ہوئے محفل برخاست کی تو سب خاموشی سے اٹھنے لگے۔ کسی نے بھی زینی کے مقابل آنے کی جرات نہ کی تھی۔

✡ ✡ ✡

وہ لباس تبدیل کر کے نکلی تو عباد تکیے سے بستر جھاڑ تا لیٹنے کی تیاری میں تھا۔ تولیہ سے چہرہ خشک کرتی وہ اس کی طرف آئی۔

"تم اپنی منگیتر کو سمجھاؤ گے یا یہ کام مجھے کرنا پڑے گا؟" اس کا جملہ اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھا کہ وہ تکیہ ہاتھوں میں تھامے پورا کا پورا اس کی طرف گھوم گیا۔ چہرے پہ ناگواری اور غصہ لیے وہ اسی سے مخاطب تھی۔

"پہلے تو تمہیں سمجھانے کی ضرورت ہے مسز! اپنے انداز و الفاظ پہ غور کرو ذرا۔ شوہر سے بات کرنے کا طریقہ سیکھو۔"

عباد کے انداز میں سنجیدگی تھی۔ وہ پلٹ کے تکیہ اپنی جگہ پہ سیٹ کرنے لگا۔ "تم مجھ پر پابندی نہیں لگا سکتے۔ میں جیسے جی چاہے گا بات کروں گی۔" وہ تلملائی۔

"تم بیوی ہو کر میری پابندی میں نہیں ہو تو اس پر کس حق سے پابندی لگاؤں میں؟"

عباد کا لہجہ بھی پر سکون تھا۔ وہ چیخی۔

"منگیتر تو ہے نا۔ اسی بات کا رعب دکھا کر تو وہ مجھے سناتی ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"جو بات ختم ہو چکی' اسے بار بار مت دہراؤ ہانیہ! وہ اب میری منگیتر نہیں ہے۔ شی از جسٹ اے کزن۔ (وہ محض کزن ہے)"

"تو یہ بات تم اسے سمجھاؤ۔ میں بھاگ کے تمہارے ساتھ نہیں آئی کہ یہاں سب کی باتیں سنتی رہوں۔"

وہ خود اذیتی کے عالم میں تھی۔ ورنہ ایسی بدتمیزی اس کی سرشت میں نہ تھی۔ عباد نے بے اختیار آگے بڑھ کے اسے بازو سے تھاما اور تادیبی انداز میں بولا۔

"میرے لیے مزید مشکلات پیدا مت کرو ہانیہ! اس گھر میں کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو تمہارے یہاں آنے اور میرے اس شادی کے فیصلے سے خوش نہیں ہیں۔ تمہارا رویہ حالات خراب کردے گا۔" وہ جو اس کی باتیں سن کے ساکت سی تھی۔ اس کے خاموش ہوتے ہی بھڑک اٹھی۔

"بہت خوب۔ یوں کہو کہ میرا رویہ تمہارا پلان خراب کردے گا۔ اگر ایسی ہی ناراضی تھی سب کی تو کس لالچ میں تم نے مجھ سے شادی کی ہے' بولو۔"

"فضول باتیں مت کرو ہانیہ! میں ماموں جان کا بہت احترام کرتا ہوں۔" وہ نہ جانے اتنی ہی قوت برداشت کا مالک تھا یا محض ہانیہ کو برداشت کررہا تھا۔

"ماموں جان کا یا ان کی جائیداد کا....." وہ چیخی۔

اس کے الفاظ سن کر چند لمحوں تک وہ اسے دیکھے گیا۔ ہانیہ نے بھی نگاہ نہیں چرائی۔ پھر وہ گہری سانس بھرتا اس کے بازوؤں پر سے ہاتھوں کی گرفت ہٹاتا بستر کی طرف پلٹ گیا۔

"تم اپنی ذہنیت کے مطابق جو چاہے سمجھ سکتی ہو۔"

"میں بے وقوف نہیں ہوں۔"

"وہ تو میں دو دنوں میں ہی جان گیا ہوں۔" وہ اپنی جگہ پر لیٹتے ہوئے اطمینان سے کہتا اسے سیار رہا تھا۔

"میں پاپا کو سب کچھ بتادوں گی۔ تم انہیں چیٹ کررہے ہو۔ میں نے خوامخواہ جذباتیت میں آکر اپنی زندگی داؤ پہ لگادی۔" اسے رونا آنے لگا۔

"اب تو لگادی نا۔ صبح اٹھ کے پچھتا لینا۔ نیند آرہی ہے لائٹ آف کردو۔"

وہ آنکھیں موندے کہتا اسے زہر سے بھی بری چیز لگا مگر اس سے زیادہ شور' ہنگامہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ سو خود کو سنبھالتی لائٹ آف کرکے اپنی جگہ پر آلیٹی۔ اب اسے اس ان چاہی زندگی سے نکلنے کا کوئی لائحہ عمل طے کرنا تھا۔ جو پاپا کے لیے بھی قابل قبول ہوتا۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز زونی کا ولیمہ تھا۔

ہانیہ سارا دن کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ کرن اس کا ناشتا کمرے میں ہی لے آئی۔ سو نخروں سے اس نے ناشتا کیا۔ کرن سے بھی سیدھے منہ بات نہیں کی۔ حالانکہ وہ بہت خوش مزاج اور مخلص سی لڑکی تھی مگر چونکہ وہ عباد کی بہن تھی۔ اس لیے ہانیہ نے اس کا بھی بائیکاٹ کردیا۔ وہ بے چاری ناشتے کے برتن سمیٹ کر کمرے سے نکل گئی۔

"بس..... یہی طریقہ ٹھیک ہے۔ تم لوگوں کو تمہاری اوقات یاد نہ دلادی تو کہنا۔ ہانیہ وقار کیا چیز ہے۔ ابھی پتا نہیں تم سب کو۔" ہانیہ نے اپنے طریقہ کار پر خود کو شاباشی دی تھی۔

دوپہر کے کھانے پر نرگس پھپھو خود اس کے کمرے میں آئیں۔ وہ لیٹی ہوئی تھی۔ صبح سے کروٹیں بدل بدل کے اور ٹہل ٹہل کے تھک گئی تھی۔ مگر کمرے سے باہر جانا اسے منظور نہ تھا۔ پھپھو کو دیکھ کر وہ مارے مروت کے اٹھ بیٹھی۔

"کیا بات ہے ہانیہ..... طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" انہوں نے پیار سے پوچھا۔

"جی....." دوپٹا ٹھیک کرتی وہ یہی کہہ سکی۔ خفگی اس کے چہرے ہی سے ٹپک رہی تھی۔

"تو پھر آؤ نا۔ باہر آکے سب میں بیٹھو۔"

"نہیں۔ میں ان سب میں جاکے نہیں بیٹھ سکتی۔" نرگس پھپھو کی بات کے جواب میں وہ جس صفاچٹ انداز میں بولی اس نے کمرے میں داخل ہوتے عباد کو نہ صرف ٹھٹکایا بلکہ تیوری پر بل بھی ڈال دیے۔

"کیوں ہانیہ.....؟" نرگس پھپھو نے عباد کو آتے نہیں دیکھا تھا۔ بے حد حیرت سے پوچھنے لگیں۔

"ابھی آتی ہے امی جان! آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں۔ اکیلی جانے سے گھبرا رہی ہے' میرے ساتھ جائے گی۔"

ہانیہ کے کسی اور منہ توڑ جواب سے پہلے ہی عباد نے اپنے لہجے میں مقدور بھر بشاشت بھرتے ہوئے جواب دیا۔

نرگس پھپھو پریشانی سے عباد کو دیکھنے لگیں۔ اس نے ماں کو شانوں سے تھام کر کہا۔

"ڈونٹ وری۔ میں فریش ہوجاؤں۔ دس منٹ میں آرہے ہیں ہم دونوں۔ آپ کھانا لگوائیں۔"

نرگس پھپھو الجھی ہوئی سی کمرے سے نکل گئیں۔ بچی تو نہ تھیں کہ ہانیہ کا بے اعتنا انداز نہ پہچانتیں۔

ہانیہ ویسے ہی مغرورانہ انداز میں گردن اکڑائے بیڈ پہ ٹانگیں لٹکائے بیٹھی رہی۔ عباد اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟"

"میں تمہیں ہر بات بتانے کی پابند نہیں ہوں۔" ہانیہ نے اس کی عزت نفس کے پرخچے اڑائے تھے۔ یوں جیسے کسی ملازم سے بات کررہی ہو۔

مگر اگلا لمحہ ہانیہ کے لیے تضحیک بھرا تھا۔ جھک کر اسے بازو سے تھام کر ایک جھٹکے میں اپنے سامنے کھڑا کرتے ہوئے وہ غرایا۔

"مائنڈ یو ہانیہ وقار! نہ تو میں تمہیں بھگا کے لایا ہوں اور نہ ہی اٹھا کے۔ تم اپنی مرضی سے نکاح نامے پہ سائن کرکے میرے گھر آئی ہو۔ پھر یہ نخرے کس بات کے دکھا رہی ہو؟" دھیمی آواز میں شعلوں کی سی لپک تھی۔ ہانیہ کو لگا بھوری آنکھوں سے نکلتے شعلے پل بھر میں اسے جلا کر راکھ کردیں گے۔

"ڈونٹ ٹچ می....." اسے فی الوقت یہی احتجاج سوجھا۔

"میں عباد رضا ہوں ہانیہ بی بی! کوئی نفس کا مارا شخص نہیں' جو اچھی شکل سامنے پاکر چھونے کی حسرت پالوں۔ میرے دل میں اترنے کے لیے تمہیں ابھی بہت سے لوازمات کی ضرورت ہے۔" عباد کے انداز میں تمسخر تھا' تلخی تھی۔

وہ جی بھر کے جھلسی۔ "بازو چھوڑو میرا۔"

"آئندہ تم امی سے اس لب و لہجے میں بات نہیں کروگی۔" وہ متنبہ کررہا تھا۔

"میں نے ان سے بدتمیزی نہیں کی۔ میں باہر نہیں جانا چاہتی۔" ہانیہ کا بازو اس کی سخت گرفت میں دکھنے لگا تھا۔ اوپر سے ذلت کا احساس۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

"تمہیں جانا ہوگا۔" وہ اپنی بات پہ زور دیتے ہوئے بولا اور اس کے بازو کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔

"تم مجھے تکلیف پہنچا رہے ہو۔"

"تمہیں ایسا کوئی بھی کام نہیں کرنا جس سے میری ماں کی انسلٹ ہو۔ ہانیہ..... یاد رکھو کہ اس گھر میں تم ان ہی کی خواہش پر آئی ہو۔"

اس نے جیسے ہانیہ کی بات سنی ہی نہ تھی۔ بڑی سختی سے کہتے ہوئے اپنی بات اس کے کانوں تک پہنچائی اور اس کا بازو چھوڑ کر پلٹ گیا۔ وہ بے اختیار دوسرے ہاتھ سے اپنا بازو مسلنے لگی۔ اتنی بے دردی سے پکڑا تھا کہ بازو میں خون جما محسوس ہورہا تھا۔

"تو کیا ضرورت تھی دوسروں کی خواہش پر اس دلدل میں اترنے کی۔" وہ چیخی۔ شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے وہ ٹھٹکا۔ اس نے محض چہرہ موڑ کے ہانیہ کو دیکھا۔

"یہ سوال میں تم سے کروں تو شاید تمہارے پاس بھی کوئی جواب نہ ہو۔" اور واقعی ہانیہ لاجواب ہوگئی۔

"میرے باہر نکلنے تک جو تیاری کرنی ہے کرلو۔ ورنہ ایسے ہی اٹھا کے لیے جاؤں گا۔"

وہ کہتا ہوا واش روم میں گھس گیا۔ ہانیہ نے کتنی ہی

گالیوں کو حلق سے واپس لوٹایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

یہ کیا غلطی کر ڈالی میں نے۔ زندگی بھر کے لیے طوق گلے میں ڈال لیا۔ اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

کاہی اور عنابی رنگ کی لمبی فراک اور چوڑی دار پاجامے میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔

"ماشاء اللہ۔۔۔ میں سمجھی تھی کہ دلہن بن کے ہی روپ آیا ہے۔ تم تو ہر روپ میں چاند ہو۔"

نرگس پھپھو نے اس کی پیشانی چومی اور اس پر سے لال نوٹ وار کے کام والی کو تھمایا۔ ہانیہ سب کے بیچ نروس سی ہونے لگی۔ فراک کے گلے پر ہوئے نفیس سے کام اور دو رنگے نگوں کا عکس اس کے رخساروں پر پڑ رہا تھا۔

"جدید ڈیزائن کے کپڑے پہن کے اور پارلر سے تیار ہو کے سب ہی چاند لگتے ہیں مامی!" زینی نے تنک کر کہا۔ اس سے نرگس پھپھو کا توصیفی انداز اور ہانیہ کو یوں بے اختیار سراہنا برداشت نہیں ہوا تھا۔

"تو تم بھی پارلر کا ایک چکر لگا لیتیں۔" عباد ٹائی کی ناٹ باندھتا ادھر آیا تھا۔ سادگی سے بولا تو سب دبی آواز میں ہنسے۔ زینی کی رنگت سرخ پڑ گئی۔

"تم تو مجھ سے بات نہ ہی کرو۔"

عباد، ہانیہ کے ساتھ آ کھڑا ہوا تھا۔ ہانیہ کی نگاہ بے اختیار سامنے دیوار پہ لگے قد آدم آئینے کی طرف اٹھی۔ جس میں ان دونوں کی اکٹھی شبیہہ تھی۔

اس قدر مکمل اور خوب صورت جوڑی۔۔۔ ہانیہ کو لمحہ بھر کو خود رشک آیا۔ مگر جوں ہی اسی آئینے میں عباد سے نگاہ ملی تو اس نے اپنی توجہ ہٹالی اور اپنے ہاتھ میں پکڑا پاؤچ چیک کرنے لگی۔ اس کا دل جانے کیوں اس پل بڑی بے ترتیبی سے دھڑکا تھا۔ زونیہ اور علی کی جوڑی بھی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

مگر جو بات ہانیہ اور عباد کے لیے دیدے سے انداز میں سب کو دکھائی دے رہی تھی وہ زونیہ اور علی کے اونچے قہقہوں اور ہاتھ پہ ہاتھ مارنے میں مفقود تھی۔

فراک کی ہم رنگ پنسل ہیل پر اسی دو رنگ کے خوب صورت سے نگینے جڑے ہوئے تھے مگر اسی نازک اور ہانیہ کی پسندیدہ سینڈل کے اسٹریپس نے اس کے نازک پیروں کا حشر کر دیا تھا۔

اسٹیج پر چڑھنے تک عباد اس کی حالت بھانپ چکا تھا۔ ماما نے دنیاداری کو ہی سہی مگر زونیہ کے ولیمہ میں بہرحال ہانیہ اور عباد کو صحیح معنوں میں پروٹوکول دیا تھا۔ ابھی بھی ان دونوں کو دولہا، دلہن کے ساتھ فوٹو سیشن کے لیے اوپر بلایا۔

عباد دو سیڑھیاں طے کر چکا تھا۔ ہانیہ کی ہچکچاہٹ محسوس کر کے واپس پلٹا اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"میری سینڈلز تنگ کر رہی ہیں۔" توجیہی انداز میں کہتے ہوئے لاپروائی کا سا تاثر دیتے ہوئے ہانیہ نے اس کا ہاتھ تھام کر سیڑھیاں طے کیں۔

"او ہو۔۔۔ سالی صاحبہ۔۔۔" علی ہانیہ کو دیکھ کے چہکا۔

عباد نے ایک گہری نگاہ علی کے بے تکلف انداز پر ڈالی۔ سعدیہ آپی اور معیز بھائی، عباد، ہانیہ، زونیہ اور علی کے جوڑے اسٹیج پر موجود تھے۔ فوٹو سیشن ہو رہا تھا۔

"ہنی مون کا تو سوچ لیا ہو گا تم نے زونی۔۔۔ کیوں علی! یورپ کا چکر تو لازمی لگے گا تمہارا۔" سعدیہ آپی کی یوں ہی نہیں سوجھی تھی۔ یقیناً" ہانیہ اور عباد کو احساس کمتری دلانا مقصود تھا۔

"ہاں سوچا تو ہے مگر پہلے ہانی بتائے گی۔ یہ کہاں جا رہی ہے؟" زونیہ نے اترا کر کہا۔

"تم بتا دو، میں نے ابھی ان خرافات کا نہیں سوچا۔" ہانیہ اپنی دلکش سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"بھئی۔ میں نے تو سوچ لیا ہے کہ یورپ ہی جانا ہے مگر اب سالی صاحبہ کو دیکھ کر جی چاہ رہا ہے کہ ان ہی کے ساتھ نکل جاؤں۔" اپنی طرف سے علی نے بڑی شرارت سے کہا تھا مگر۔۔۔

زونیہ کا رنگ میک اپ کے باوجود اڑتا محسوس ہوا

تھا اور عباد جس طرح جھٹکے سے کھڑا ہوا، ہانیہ کو لگا کہ وہ علی کو مارنا ہی نہ شروع کر دے۔ گھبرا کے وہ خود بھی اٹھ گئی۔

"علی کا مطلب وہ نہیں تھا عباد!" ماما کو علی کے اس گھٹیا مذاق پر صفائی دینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

"جی۔۔۔ میں سمجھ رہا ہوں۔ اٹس انف ہانیہ! اٹھو کافی فوٹو سیشن ہو گیا۔"

"جی۔۔۔" خود ہانیہ کو بھی علی کا بے ہودہ جملہ پسند نہیں آیا تھا۔

"آئم سوری۔۔۔ اٹس جسٹ اے جوک۔" علی نے ڈھٹائی سے اپنی بے ہودگی کو مذاق کے کھاتے میں ڈالا۔

"آدمی کی زبان سے نکلا ہر جملہ اس کی ذہنی استعداد کا پتا دیتا ہے مسٹر علی! آج آپ کی ذہنیت کا پتا چل گیا۔" وہ سرد مہری سے کہتا ہانیہ کے ساتھ اسٹیج سے نیچے اتر آیا۔

وہ دونوں اپنی ٹیبل پر آئے تو ہانیہ خاموشی سے نرگس پھپھو کے پاس بیٹھ گئی۔ کرن اور سعد بے چارے اپنی طبع کے برخلاف خاموشی سے ایک کونے میں ماں کے ساتھ بندھے بیٹھے تھے۔ یقیناً" ماما نے انہیں کوئی لفٹ نہیں کرائی تھی۔ وہ لوگ حالیہ واقعہ سے لاعلم بیٹھے تھے۔

"آپ لوگ مزید بیٹھیں گے ابھی؟" اس کے تیور اور کسی کو تو نہیں ہانیہ کو ضرور سمجھ میں آ رہے تھے۔ وہ خفیف سی یوں ہی چہرہ گھما کر اسٹیج کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔ ہاتھ لگانے تھوڑی آئے تھے ہم۔" نرگس پھپھو نے ناراضی سے کہا۔

"یہاں منہ لگانے کے قابل بھی کوئی نہیں ہے۔" بے اختیار ہی وہ تلخی سے کہتا نرگس پھپھو کا رنگ فق کر گیا۔

ہانیہ کو اس کے الفاظ اچھے تو نہیں لگے مگر فی الحال علی کے بے ہودہ فقرے کے زیر اثر وہ یہ سب سننے پر مجبور تھی۔ وہ یہیں علی کا کہا جملہ اگل دیتا تو۔۔۔؟

"عابی۔۔۔ دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟" پھپھو بمشکل کہہ پائیں۔

تب تک وہ چھوٹے بھائی، بہن کے خیال سے خود کو سنبھال چکا تھا۔

"بہت تھک گیا ہوں میں امی! اتنے دنوں سے بھاگ دوڑ میں لگا ہوا ہوں۔"

وہ فوراً" ہی ماں کے شانوں کو دباتا نارمل ہو گیا مگر پھپھو کو بہو کے سامنے اس کے بولے ہوئے الفاظ سخت معیوب لگے تھے۔ سو وہ فوراً" ماننے کے حق میں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔

کھانے کے دوران ماما ان کی طرف آئیں۔ "ٹھیک طرح سے کھائیں آپ لوگ۔"

انہوں نے شاید بیٹی کا تھوڑا سا خیال کر ہی لیا تھا۔ ہانیہ نے ہلکا سا سکون محسوس کیا۔ ورنہ ماما تو سب پہ یوں ہی ظاہر کر رہی تھیں جیسے فقط سعدیہ آپی اور زونیہ ہی ان کی اولادیں ہیں۔

"ویسے بھابھی۔۔۔ آپ کی فیملی میں لوگ بولتے بہت کم ہیں۔ میں تو جب سے آیا ہوں، کسی سے بات کرنے کو ترس گیا ہوں۔" سعد نے کھانے کے درمیان اسے شرمندہ کر دیا۔ اوپر سے عباد کی طنزیہ نگاہیں۔

"تمہیں جو عادت ہے ہر وقت بولنے کی۔ تمہاری تو زبان اکڑ گئی ہو گی۔" کرن نے اس کی بات کو ہوا میں اڑایا۔

"ہانی۔۔۔ بیٹا! ٹھیک طرح سے کھاؤ نا۔" نرگس پھپھو اسے بے دلی سے بریانی میں چمچہ گھماتے دیکھ کر نرمی سے بولیں۔

"جی۔۔۔"

عباد نے ان کے کہنے کے باوجود ایک لقمہ بھی نہیں چکھا تھا۔ مکس گیدرنگ تھی۔ یقیناً" مرد و زن کی تخصیص نہ ہونے کے باعث ہی عباد نے قدرے کونے میں نشست چنی تھی۔

"بڑی جلدی فارغ ہو گئے تم۔" پاپا نے بالآخر عباد کو آلیا تھا۔ ان کے کوئی دیرینہ دوست بڑے سالوں کے بعد ملے تھے، ابھی انہوں نے چھوڑا تھا۔

"جی... اور آپ نے کھانا کھالیا ہے۔" وہ ادب سے کھڑا ہوا تو ہانیہ کو بہت اچھا لگا۔ اس نے ابھی تک معیز بھائی اور علی کو پاپا کا اتنا ادب و احترام کرتے نہیں دیکھا تھا۔

"ارے یار... ہم کہاں کھاسکتے ہیں یہ مرغن لوازمات۔ ہمارا تو پرہیزی کھانا ہوگا۔" پاپا مسکرائے تو وہ بے چین ہونے لگی۔ پیچھے روک کے انہیں دیکھا۔

"پاپا... آپ نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کھایا؟"

"ارے... یہ تو بوائی بھی ہیں۔" سعد نے کرن کی طرف جھک کر حیرت سے سرگوشی کی تو اس نے گھورا۔

"بس... ابھی گھر چل کے لے لوں گا کچھ۔"

"گھر میں کسی نے کیا بنا کے رکھا ہوگا پاپا! اور اتنے دنوں سے تو فنکشنز چل رہے ہیں تو... آپ نے؟" وہ بے چین ہو اٹھی۔ ماما نے اتنی زحمت کہاں کی ہوگی کہ شوہر کے لیے الگ سے پرہیزی کھانا بنالیتیں۔

"اب اتنا بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں مائی ڈول! زرینہ سے اپنی پسند کے پرہیزی کھانے بنوا کے کھا رہا ہوں میں۔" انہوں نے کل وقتی ملازمہ کا حوالہ دیا تو وہ کچھ مطمئن ہوئی۔

"ہم ابھی نکل رہے ہیں ماموں جان! آپ چلیں نا ہمارے ساتھ۔ میں نے بھی کچھ ٹھیک سے نہیں کھایا۔ گھر جا کے ذرا انجوائے کرتے ہیں۔" عباد نے بڑی خوش اخلاقی سے کہا۔

"ارے بھئی۔ تمہارے لیے تو دعوت عام ہے۔ جو جی چاہے کھاؤ۔" پاپا ٹھٹکے۔

"اتنے دنوں سے یہی ہیوی کھانا کھا رہا ہوں۔ طبیعت بوجھل ہو رہی ہے۔ کچھ لائٹ سا کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔

"اور وہ ہانیہ کے ہاتھ کا پکا کھانا ہی ہو سکتا ہے۔ کیوں ہانی!" پاپا کا ہاتھ شفقت سے اس کے سر پہ آٹھرا تو اس کی آنکھوں میں نمی سی اتر آئی۔

"جی پاپا! کیوں نہیں۔" پاپا اور نرگس پھپھو وابسی پر سب سے اسٹیج پر مل کے آگئے باقی کوئی نہیں گیا۔ ماما اور سعدیہ آپی! تصویریں اتروانے میں مصروف تھیں انہیں ہانیہ سے ملنے کا ذرا خیال نہ آیا۔

ہانیہ کو اپنی شادی کے لمحات یاد آئے۔ ماں بہنوں کو اس طرح اس نے کسی بھی وقت اپنے آس پاس محسوس نہیں کیا تھا۔

"اب چلیں بھی پرنسا! گاڑی یہیں لے آؤں؟" عباد کی آواز پردہ گوش پر اکر ہوا میں اڑی۔ پاپا اور پھپھو شاید نکل چکے تھے۔

ہانیہ نے ایک نظر اس کے سنجیدہ چہرے پہ ڈالی۔ پاپا کے سامنے وہ اور بھی عباد ہوا کرتا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی۔

کتنا جی چاہ رہا تھا کہ ماما اسے گلے لگا کے رخصت کرتیں۔ زونی مزید ٹھہرنے کا اصرار کرتی...

اس کی سیاہ آنکھوں کی سطح پر نمی سی پھیلنے لگی۔ منظر کچھ دھندلا سے گئے۔ پاؤں کسی چیز سے رپٹا تو وہ سیڑھیوں سے گرنے کو ہوئی مگر کسی مہربان ہاتھ کی گرفت نے اس کے بازو کو اپنی گرفت میں لے کر سنبھال لیا۔

پارکنگ تک وہ کسی ننھی بچی کی مانند اس کے ساتھ یوں ہی چلتی ہوئی آئی۔ پھپھو کرن اور سعد گاڑی میں بیٹھے تھے۔ جبکہ پاپا پاس کھڑے پھپھو سے باتوں میں مصروف تھے۔

وہ بے اختیار اپنا بازو چھڑاتی پاپا کی طرف بڑھی۔

"گاڑی میں بیٹھیں نا پاپا!" پاپا نے ہنستے ہوئے اس کا سر سینے سے لگا کر چوم لیا۔

"وہ تو مذاق تھا بیٹا! ابھی میں گھر جا کر کھانا کھاؤں گا اور پھر ریسٹ کروں گا۔"

"پاپا پلیز... سب تو ابھی یہیں ہیں۔ آپ اکیلے گھر میں۔" وہ بے چین سی ہونے لگی۔

"کم آن ہانی! جہاں اتنی عمر تنہا گزاری ہے وہاں تھوڑی اور سہی۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولے تو اسے رونا آنے لگا۔

"چلیں نا ماموں جان! کچھ دن وہاں چل کے رہیں۔" عباد نے بھی اصرار کیا۔

"سفر کافی لمبا ہے یار! ابھی طبیعت اجازت نہیں دے رہی۔" انہوں نے عباد کا شانہ تھپتھپایا اور پھر اسے گلے سے لگالیا۔

"ہانی کا خیال رکھنا۔ یہ میری سب سے پیاری بیٹی ہے۔ بہت دھیمی طبیعت کی اور فرماں بردار۔"

ہانیہ کا دل بھرانے لگا۔

پاپا کو واقعی اس سے بہت محبت تھی۔ وگرنہ کیا انہوں نے یہ الفاظ علی سے زونیہ کے متعلق کہے ہوں گے؟ وہ جانتے تھے کہ زونیہ کو اپنا خیال کروانا خوب آتا ہے۔

اور ماما...

انہوں نے ایک دفعہ بھی ہانیہ سے گھر چلنے کو نہیں کہا تھا' حالانکہ مکلاوے کی رسم باقی تھی۔ رسم نہ سہی دنیاداری ہی سہی مگر وہ تو ایسی مصروف تھیں کہ ایک ہی بیٹی انہیں یاد تھی اور اس کی ماڈرن سسرال۔

ہانیہ بہت بڑے دل کے ساتھ واپس آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اگلا روز قدرے پرسکون تھا۔ شادی کا ہنگامہ تھما تو مہمان اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ ماما کا فون آیا۔

"تم آج آجاتیں عباد کے ساتھ۔ زونی تو کل ہمارے ساتھ ہی آگئی تھی۔" ہانیہ کو رونا آنے لگا تو وہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"بہت جلدی یاد آگیا آپ کو۔"

"تم خود ہی اپنے شوہر کا دم چھلا بنی ہوئی تھیں۔ ہمارے ساتھ بیٹھ کر ہنستی بولتیں تو ہمیں پتا بھی چلتا کہ ہماری بیٹی آئی ہے۔" ماما ادھار تو رکھتی ہی نہیں تھیں۔

"وہاں ہنسنے بولنے کو تھا ہی کیا... بولنے تک کی تو تمیز نہیں تھی علی کو۔"

ہانیہ کڑھی مگر ماما شاید کل والے معمولی اثر سے نکل چکی تھیں۔

"اب بس کرو ہانی! بہنوئی تو سالیوں سے پتا نہیں کیسے کیسے مذاق کرلیتے ہیں۔ علی نے ایک ذرا سا جملہ کیا کہہ دیا تمہارے گنوار شوہر نے قیامت ہی اٹھا دی۔ علی بھی بعد میں باتیں بنا رہا تھا۔"

"تو اسے ضرورت ہی کیا تھی اتنا فضول بولنے کی۔" ہانیہ اس بحث سے اکتا سی گئی۔

"ہاں بھئی۔ اب تم تو انہی دقیانوسی لوگوں کی زبان بولوگی۔ دو دن ہوئے نہیں کہ سب بھول گئیں۔"

ماما کے طنز نے اسے کیا کچھ یاد نہیں دلایا تھا۔ اس کا دل یک لخت ہر بات سے اچاٹ ہوگیا۔

"میں پھر کسی دن آؤں گی ماما! ابھی میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔"

"کیا ہوا طبیعت کو؟" ماما کی بات درمیان میں ہی تھی کہ فون سعدیہ آپی نے جھپٹ لیا۔

"ابھی دو روز ہی ہوئے ہیں شادی کو اور تمہاری طبیعت بھی خراب ہوگئی؟"

سعدیہ آپی بے تکا بولی تھیں۔ ہانیہ کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔

"تم نے پاس بھی کیوں آنے دیا اس اجڈ گنوار کو۔ ذرا سی شکل ہی تو اچھی ہے بس۔ مینرز کی تو اسپیلنگ بھی نہیں آتی ہوں گی اسے۔ ایزد کو بھول گئیں ہانی! کیسے دم بھرتا تھا تمہارا۔" ہانیہ گنگ سی ہو گئی۔

"جلدی سے اس جھنجھٹ کو ختم کرو ہانی! تمہاری من پسند زندگی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ ہم سب ہیں نا تمہارا ساتھ دینے کو۔ پاپا کی فکر مت کرنا۔ ایزد تمہارے انتظار میں ہے۔ دیکھنا ہاتھ کا چھالا بنا کے رکھے گا تمہیں۔"

اس کی کیفیت عجیب سی ہونے لگی۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز نرگس پھپھو کے جانے پر وہ لاہور جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی' جب وہ تپا تپا سا کمرے میں آیا۔

وہ بالوں کو ڈرائیر سے خشک کر رہی تھی۔ اسے آئینے میں دیکھ کر بھی انجان سی بنی رہی۔ مگر وہ شاید اسی سے دو' دو ہاتھ کرنے آیا تھا۔

"بیاہ کے اب یہاں آگئی ہو تو یہ روز' روز جانے کی کیا تک بنتی ہے؟"

"روز' روز؟" ہانیہ کو برا لگا۔ آئینے میں اسے گھور کے دیکھا۔

"میرے خیال میں شادی کے بعد آج میں پہلی دفعہ جا رہی ہوں۔"

"تک تو کوئی نہیں بنتی نا۔ جہاں چاہتیں نہ ہوں' وہاں خود سے نہیں جایا کرتے ہانیہ وقار۔"

وہ جتانے والے انداز میں بولا۔ تو ہانیہ یوں تڑپ کے اٹھی۔

"پھر تو مجھے یہاں بھی نہیں آنا چاہیے تھا۔" لمحہ بھر اسے دیکھنے کے بعد وہ آرام سے بولا۔

"یہ تو تم پہلے سوچتیں۔ اب تو آچکیں۔"

"غلطی ہو گئی۔ میری زندگی کی سب سے بڑی سوچی سمجھی غلطی۔" اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

"اگر ایزد سکندر کا ساتھ ہوتا تو زندگی کا یہ رنگ ہوتا؟" وہ سوچ کر رہ گئی۔

"تم جب چاہو اپنی غلطی سدھار سکتی ہو۔" طنزو تلخی سے بھرپور جواب نے ہانیہ کو سلگا دیا۔ پر کاٹ کر پنجرہ کھولنے اور رہائی کا اذن دینے والا صیاد۔

"وہ تو میں ضرور ہی سدھاروں گی عباد رضا!" اس کی طرف پلٹتے ہوئے ہانیہ کا لہجہ بھی تلخ تھا۔

"ضرور۔۔۔" عباد نے فی الفور کہا۔ "مگر ابھی جو میکے سدھار رہی ہو تو امی سے کہو تم میرے' بجائے سعد کے ساتھ جانا پسند کرو گی۔ میں وہاں جانا نہیں چاہتا۔" اس نے دل کی بات کہہ دی تھی۔

"میں کسی کے بھی ساتھ جانا پسند نہیں کرتی۔ مجھے گاڑی میں بٹھا دو' میں اکیلی بھی جا سکتی ہوں۔ پاپا کو بھی تو پتا چلے تمہاری نام نہاد فرماں برداری اور اچھائی کا۔" وہ چیخی۔

عباد نے بے اختیار انگشت شہادت اٹھائی اور وارن کرنے والے انداز میں بولا۔

"بی ہیو یور سیلف ہانیہ۔۔۔ ایسا لہجہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

"تمہیں کرنا پڑے گا۔ میں تم سے ایسے ہی بات کروں گی۔" اس کا انداز ہٹیلا تھا۔

"میں نے تمہیں کیا سوچا تھا اور تم۔۔۔" بے اختیار متاسفانہ انداز میں کہتے ہوئے وہ ایک دم رک گیا۔ پھر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کافی تمیز سکھانی پڑے گی تمہیں۔"

"میرا بھی تمہارے بارے میں یہی خیال ہے۔" ہاتھوں کا مساج کرتے ہوئے ہانیہ کا لہجہ تپانے والا تھا مگر وہ یوں تپے گا ہانیہ کو ایک فیصد بھی اندازہ ہوتا تو بولنے سے پہلے سو دفعہ سوچ لیتی۔

جب وہ حواس میں آئی تب تک عباد اسے اسٹول سے اٹھا کر بیڈ پر پھینک چکا تھا۔ اس کے قریب جھکتے ہوئے عباد کا لہجہ کافی سلگتا ہوا تھا۔

"کافی سے زیادہ بدتمیز ثابت ہو سکتا ہوں میں۔" کہتے ہوئے وہ رکا۔ اس کی گرم سانسوں نے ہانیہ کے رخسار کو چھوا۔ وہ ساکت سی تھی۔ وہ دوبارہ بولا۔

"مگر تم میں ابھی وہ بات ہی نہیں" بے حد دھیما' نرم' مگر حقارت بھرا لہجہ یا شاید ہانیہ کو ہی اس کے لفظوں نے تحقیر کا احساس دلایا۔ وہ ہڑبڑا کر حواس میں لوٹی تھی۔

"تم۔۔۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھے ہاتھ لگانے کی۔"

"اندازہ کر لو اب کہ میں کیا کیا کر سکتا ہوں اور باہر جا کے امی سے کہہ دو کہ تم کسی قیمت پر میرے ساتھ لاہور نہیں جاؤ گی۔" اطمینان سے کہتا وہ اسے بستر سے اٹھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ جلتی کلستی وہ بستر سے اتری تو وہ تکیہ اٹھا کر بیڈ کے وسط میں رکھتا اوندھا سیدھا لیٹ گیا۔

"جاؤں گی تو میں ہر قیمت پر تمہارے ہی ساتھ۔" دانت پیستے ہوئے اس نے سوچا اور تیار ہو کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ لاؤنج میں زینی اور کرن باتوں میں مصروف تھی۔ زینی کی نگاہ کا کیٹلا پن ہانیہ کو صاف محسوس ہوا تھا مگر وہ نظر انداز کرتی کرن کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"پھپھو کہاں ہیں؟"

"امی تو نہا رہی ہیں۔ آپ بیٹھیں۔" کرن نے بتاتے ہوئے آفر کی تو وہ کچھ سوچ کر وہیں بیٹھ گئی کہ کرن اس کے دائیں جانب اور زینی بالکل سامنے بیٹھی تھی۔

"عالی کہاں ہے؟" ٹانگ پہ ٹانگ جمائے شاہانہ سے انداز میں بیٹھی زینی نے جس طرح اس سے پوچھا' اس نے ہانیہ کو جی بھر کے سلگایا۔

"کمرے میں ہے۔ تم نے نہیں دیکھا جاتے ہوئے؟" ہانیہ نے بھی قدرے تیکھا انداز اپنایا۔

"کمرے میں کیا کر رہا ہے؟ مجھے میری دوست کے گھر لے کے جانا ہے اس نے۔" زینی کا استحقاق بھرا تیز لہجہ۔

"اچھا تب ہی وہ لاہور نہیں جانا چاہ رہا۔" اس نے کلس کر سوچا۔

"میں دیکھتی ہوں شاید امی نہا چکی ہوں۔" کرن بعجلت اٹھی۔ اس کا ارادہ یقیناً" پھپھو کو جلدی سے یہاں بلانے کا تھا۔

"ابھی تو فی الحال وہ ریسٹ کر رہا ہے۔" ہانیہ بھی مقابلے پر اتر آئی۔

عباد سے دلی وابستگی نہ سہی' مگر زینی کے انداز بہت دل جلانے والے تھے۔ اسے تو وہ سیدھا کر کے ہی چھوڑتی۔

"یہ ریسٹ کرنے کا کون سا ٹائم ہے؟" زینی نے ناگواری سے کہا تو وہ آرام سے بولی۔

"وہ اب میرڈ ہے زینی! جب ٹائم ملے گا تب ہی ریسٹ کرے گا نا۔" لمحے بھر کو زینی کی بولتی بند ہوئی۔ یکدم وہ تیزی سے اٹھی۔

"میں ابھی دیکھتی ہوں اس کو۔ میں نے کہا بھی تھا اسے کہ آج مجھے لازمی جانا ہے۔" زینی کا انداز جارحانہ تھا۔

"بیڈ روم میں مت جانا زینی! ہاں وہ باہر آئے تو تم اس سے جو جی چاہے' بات کر سکتی ہو۔"

وہ بڑے اطمینان سے اس کی حدود واضح کر رہی تھی۔ زینی کے بگڑے ہوئے تاثرات دیکھ کر اس کے اندر سکون اترنے لگا۔

"نئی نئی شادی ہے نا اس لیے روٹین ڈسٹرب ہے۔ باتوں باتوں میں آدھی رات گزر جاتی ہے۔ بے وقت نیند تو آئے گی ہی۔"

اس نے مزید بے پر کی چھوڑی۔ انداز میں اترا ہٹ سی تھی مگر وہ ابھی جی بھر کے زینی کے تاثرات سے حظ بھی نہ اٹھا پائی تھی کہ عباد کی آواز نے بم کا سا دھماکا کر دیا۔

"ہاں۔ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ تمہیں بھی تو اتنی مشکلوں سے جگایا ہے میں نے۔"

بے تکلف سا لہجہ ہانیہ کو مذاق اڑاتا ہوا۔ محسوس ہوا وہ عباد سے نگاہ نہ ملا پائی تھی۔ اس پر مستزاد وہ ہانیہ کے بالکل ساتھ آکر بیٹھ گیا۔ ہانیہ کا بایاں پہلو جلنے لگا۔

"بیٹھو نا زینی! کہاں جا رہی ہو؟"

"میں نے تم سے کہا تھا آج مجھے ہر حال میں میمونہ کے گھر جانا ہے۔" زینی نے غصے سے کہا۔

"چیں۔۔۔ کم آن۔۔۔ لے چلتا ہوں نا۔ غصہ کیوں ہو رہی ہو؟" صوفے کی پشت پر اس نے بازو پھیلایا تو اس کا ہاتھ ہانیہ کی گردن چھونے لگا۔ ہانیہ کی دھڑکن منتشر سی ہوئی۔

زینی کے کھنچے ہوئے تاثرات کو مسکراہٹ نے ایک دم سے بدل دیا تھا مگر پھپھو وہاں آگئی تھیں۔

"فی الحال تو تمام پروگرام کینسل کرو کیونکہ ہانیہ نے میکے جانا ہے۔"

"امی پلیز! سعد بھی تو ہے نا۔" زینی نے یوں کہا جیسے وہ عباد کے نہیں سعد کے نکاح میں ہو۔

"تم اپنی فرینڈ کے گھر سعد کے ساتھ جا سکتی ہو مگر میں اپنے میکے اپنے شوہر کے بغیر نہیں جا سکتی۔" ہانیہ نے قطعیت سے کہا۔ زینی نے پاؤں پٹخے۔

"تم بدل گئے ہو عالی! آئی ہیٹ یو۔" وہ بھاگنے کے سے انداز میں پلٹ گئی۔

"زینی رکو۔ زینی۔۔۔" عباد نے اسے آوازیں دیں مگر اپنی جگہ سے اٹھا نہیں تھا۔

"جانے دو اسے۔ خوا مخواہ میں بات بڑھائے

گی۔" پھپھو نے عباد کو گھرکا۔

"آپ بھی نا۔ بے چاری کا دل رکھ لیتیں۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ ہانیہ کو اس کی آواز سے بنا دیکھے ہی پتا چل گیا۔

"جو دل تمہارے حوالے کیا ہے نا تم بس اسی کا خیال رکھو۔ اور ابھی تک تیار نہیں ہوئے تم؟" پھپھو نے تنبیہی انداز میں کہتے ہوئے اس کا جائزہ لیا۔

"ان کا تو پکا ارادہ تھا شاید "میمونہ صاحبہ" کے گھر جانے کا۔" ہانیہ نے طنزیہ کہا تو وہ زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"سوئٹ..." صوفے کی پشت پر پھیلے ہوئے ہاتھ کی انگلیوں نے ہانیہ کے رخساروں کو چھوا تو وہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھپھو تولیے سے رگڑ کر بال خشک کرتیں عباد کو ڈانٹ رہی تھیں۔

"اٹھ بھی جاؤ اب۔ بچی بے چاری گھر والوں سے ملنے کو تڑپ رہی ہے اور تم اپنے ڈراموں میں مگن ہو۔"

"بچی سے بھی پوچھ لیں۔ یہ بھی میرے ساتھ جانا چاہتی ہے یا نہیں ورنہ سعد ہی چھوڑ آئے گا۔"

وہ ماں سے مخاطب تھا۔ بظاہر سادہ لہجہ مگر طنز بھانپنے والی خوب بھانپ رہی تھی۔

"میں آپ جناب ہی کے ساتھ جاؤں گی۔ کیونکہ میں یہاں آپ ہی کے ساتھ آئی ہوں۔"

زینی کے حوالے تو ہرگز نہیں کروں گی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچ کر طنزیہ کہا تھا مگر وہ جھوم جھوم گیا۔

"واہ... امی! کیا باادب بھولائی ہیں۔ اس قدر عزت واحترام۔ ولی نہ ہو جاؤں کہیں میں۔"

پھپھو نے مسکراہٹ دباتے ہوئے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔ "دو منٹ میں تیار ہو کے آؤ۔ بھائی صاحب کا دوبار فون آچکا ہے۔"

پاپا کے فون کا سن کر وہ اندر تک مضطرب ہو گئی۔

پھپھو کا حکم نامہ پا کر عباد اٹھ کر تیار ہونے چلا گیا مگر کافی دیر پرانے میگزین کی ورق گردانی کرنے اور کرن کی چھوٹی چھوٹی باتوں کے جواب دیتی جب وہ الماری تو اٹھ کے کمرے میں آئی۔ صاحب بہادر نہا دھو کے فریش ہو کر ٹراؤزر اور بنیان میں ملبوس گیلے بالوں کو تولیے سے رگڑتے ہوئے فون کال بھی نپٹا رہے تھے۔

ہانیہ کا دل بے زار ہونے لگا۔ وہ اڑ کر میکے پہنچنا چاہتی تھی مگر یہاں فوری اڑان کے کوئی تاثرات دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ وہ باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ تازہ ہوا اور پھل دار درختوں اور پھولوں کی مہک نے موڈ قدرے بہتر کیا تھا۔

"کم آن یار... ایک تو تم لڑکیوں کے دل بڑے نازک ہوتے ہیں' بات بات پہ ٹوٹنے کو تیار۔"

ہانیہ کا دھیان ایک دم اس کی طرف گیا' جو بڑی بشاشت سے اپنا تجزیہ پیش کر رہا تھا۔

"دیکھو زینی! امی کا حکم ہے اور تمہیں پتا ہے نا ان کا حکم میں ٹال نہیں سکتا۔" کمرے میں چلتا پھرتا' شرٹ پہنتا' بال بناتا وہ اس انداز میں محو گفتگو تھا۔ جیسے کمرے میں اکیلا ہی ہو۔

ہانیہ کا دل سلگا۔ اور کبھی میں جو اسے ایزد سکندر کے بارے میں ایک لفظ بھی بتا دوں تو لمحہ بھر لگائے یہ مجھے میکے بھجوانے میں۔

وہ بیڈ پہ بیٹھ کے جھکا ہوا بوٹ پہن رہا تھا۔

"اب چھوڑ بھی دو یہ فضول کال۔ لیٹ ہو رہے ہیں ہم۔" اس نے عباد کے سر پہ کھڑے ہو کر اونچی آواز میں کہا۔ وہ تو چونکا ہی' مگر جس کو سنانا مقصود تھا' اس نے بھی اچھی طرح سن لیا۔

"بعد میں بات کروں گا زینی! ابھی مجھے نکلنا ہے۔"

اسے تنبیہی نگاہ سے دیکھتے ہوئے عباد نے بات ختم کرنا چاہی' مگر دوسری طرف زینی یقیناً" غصے میں تھی۔

"کم آن زینی... کسی کے کہنے سے تمہاری اہمیت ختم تو نہیں ہو جاتی نا۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

"او کے... او کے... سمجھاؤں گا میں۔ تم اپنا موڈ ٹھیک کرو پھر بات ہو گی' اللہ حافظ۔"

موبائل جیب میں ڈالتا وہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ہانیہ قطعاً" نہ گھبرائی۔

"ایٹی کیٹس' مینرز... کبھی ان کے بارے میں پڑھا تو ہو گا تم نے؟"

بہت نرمی سے پوچھا گیا۔

"مجھے ہر قسم کے لوگوں سے نپٹنا آتا ہے۔ انڈر اسٹینڈ؟" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس پر اپنی جرات عیاں کرنا چاہتی تھی۔

"اچھا..." وہ تمسخر سے ہلکا سا مسکرایا' پھر دفعتاً" اس کی کلائی تھام کر بولا۔

"مثلاً" اب مجھ سے کیسے نپٹ سکتی ہو تم؟" ہانیہ اس کی اس حرکت کے لیے تیار نہیں تھی۔ گھبرا سی گئی۔

"ہاتھ چھوڑو میرا..."

"نہ چھوڑا تو کیا کرو گی... شور مچاؤ گی؟" وہی مذاق اڑاتا انداز۔

ہانیہ نے خود کو پسینے میں ڈوبتا محسوس کیا۔ وہ تو ویسے ہی اس پینڈو پر رعب ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی مگر یہاں تو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔

"شوہر کے ساتھ ایسی ضد اور چیلنج کرنے والی باتیں نہیں کرتے مسز!" جتانے والے انداز میں کہہ کر اس نے ہانیہ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پلٹ کر اپنی باقی ماندہ تیاری مکمل کرنے لگا۔

وہ بے دم سی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

گھر پہنچ کر وہ ماما اور پاپا سے ایسے ملی جیسے صدیوں بعد لوٹی ہو۔

ماما کا انداز عباد کے ساتھ کھنچا کھنچا سا تھا۔ جس نے آج ہانیہ کو بڑا سکون پہنچایا۔

اچھا ہے... اسے اس کی اوقات پتا چلتی رہنی چاہیے۔

پاپا عباد کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تو وہ ماما کے ساتھ کچن میں آگئی۔

عباد کے کھانے پینے کے لیے ملازمہ کو ہدایت دے کر وہ ہانیہ کو اپنے کمرے میں لے آئیں۔

"اب بتاؤ... دیکھ لیا اپنی فضول فرماں برداری کا نتیجہ۔ کیسے جاہل اور گنوار لوگوں میں جا پھنسایا ہے تمہارے باپ نے تمہیں۔" ماما نے کھاتہ کھول لیا تھا۔

وہ دل چاہنے کے باوجود ماما کی غلط فہمی دور نہ کر پائی کہ کرن اور سعد دونوں اسکالر شپ لے کر پڑھ رہے تھے۔ اس کی خاموشی نے ماما کے غصے کو اور بڑھا دیا۔

"یہ سب اس شخص نے میری مخالفت میں کیا ہے اور بس۔ اگر میں اس رشتے پر راضی ہو جاتی تو وہ خود انکار کر دیتا۔" وہ عباد کو سو دفعہ کوستیں مگر پاپا کو ایک دفعہ بھی کوسا تو ہانیہ سے برداشت نہیں ہوا۔

"دفع کریں ماما! جو ہونا تھا ہو گیا۔ میری قسمت میں یہی لکھا تھا۔" وہ آزردہ تھی۔ ماما اسے جھڑکنے لگیں۔

"تم ہی بے وقوف ہو۔ ایک بار اسٹینڈ لے لیتیں پھر میں دیکھتی کوئی کیسے تمہاری مرضی کے بغیر فیصلہ کرتا ہے۔ باپ کی ایموشنل بلیک میلنگ کا شکار ہو گئیں تم۔"

ماما اب زونی کی خوشیوں کی تفصیل سنانے لگیں۔

"زونی کو دیکھو۔ اپنی مرضی کا ساتھی چنا اور اب عیش کر رہی ہے۔ ساس' نندوں کی ہمت نہیں اس کے مقابلے میں آنے کی۔ بیٹے کے ماتھے کے بل دیکھ کے چلتی ہیں وہ۔ اور علی تو اتنے ناز اٹھاتا ہے زونی کے کہ حد نہیں۔"

ہانیہ خود ترسی کا شکار ہونے لگی۔

اسے زینب عرف زینی یاد آئی۔ ابھی اس نے ماما کو اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ ورنہ ماما شاید اسی پھیرے میں اسے طلاق دلوا دیتیں۔

"خیر... ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ سعدیہ بڑی تعریفیں کرتی ہے ایزد کی۔ اس سے رابطہ کرو۔ فیوچر پلاننگ کرو کچھ۔" ماما کے مشورے مفت تھے۔

"ایک بار ہمت کرو اور نکل آؤ اس دلدل سے ہانی! چند دنوں میں چہرہ اتر کے رہ گیا ہے تمہارا۔ ایسا روپ ہوا کرتا ہے سہاگنوں کا بھلا۔"

ماما مسلسل اس کی نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے تھیں۔ ہانیہ کے دل میں موجود عباد کے خلاف بے زاری اور

بڑھی۔

عباد اسے چھوڑ کے جانے والا تھا۔ مگر پاپا نے اسے بصد اصرار رات روک لیا۔ وہ جی بھر کے بدمزا ہوئی۔

رات کھانا کھانے کے بعد وہ پاپا کے ساتھ آدھا گھنٹہ لان میں واک کرنے کے بعد سونے کے لیے کمرے میں چلا گیا' جبکہ ہانیہ' ماما کے ساتھ ٹی وی کے آگے بیٹھ گئی۔

"یہ ہوتے ہیں گاؤں کے گنوار۔ کھانا کھاتے ہی بستر پہ گر جانے والے۔"

پاپا ابھی ان کے پاس آکے بیٹھے ہی تھے کہ ماما نے حقارت سے کہا۔ ہانیہ خفیف سی ہو گئی مگر بولی کچھ نہیں۔ پاپا کے چہرے پر ناگواری چھا گئی۔

"رات دو بجے تک ٹی وی دیکھ کر صبح دس بجے اٹھنے والوں کو اگر ماڈرن کہا جاتا ہے تو لعنت ہے ایسے ماڈرن ازم پر۔ وہ صبح خیز بچہ ہے۔ رات جلد سونے اور صبح فجر کے لیے اٹھنے والا۔ حق حلال کمانے کے لیے دن بھر محنت کرنے والوں کو یوں ہی نیند آیا کرتی ہے۔"

"ہونہہ..." ماما نے کھسیا کر سر جھٹکا۔

"اگر ہانی وہاں خوش ہے تو پھر تمہیں اس طرح کے فضول فتوے دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ جو ہے' جیسا ہے اب ہانیہ کا شوہر ہے اور اس کے متعلق بات کرتے ہوئے تم اپنی بیٹی کے جذبات کا بھی خیال کرلیا کرو۔"

"پاپا پلیز... بس کریں نا... مما تو ایسے ہی... بات کر رہی ہیں۔"

ہانیہ نے ان کی طبیعت کے پیش نظر انہیں ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"رہنے دو تم... اپنے میکے والوں کا یہ ایسا ہی شیدائی ہے۔ سوتیلی بہن کے بچوں کے لیے پیار اُمڈ اُمڈ کے آتا ہے اور اپنے بچوں کی خوشیاں نظر نہیں آتیں۔" ماما چیخ کر بولیں۔

"تم بے فکر رہو۔ سوتیلا ہی سہی' مگر وہ علی اور معیز سے بڑھ کے سگا ثابت ہوگا۔" پاپا کو اس پر بھرپور اعتماد تھا۔

"پاپا پلیز... اٹھیں... ریسٹ کریں اب... تھک گئے ہوں گے۔"

ہانیہ نے اس طویل اور بے مقصد لڑائی سے گھبرا کر باپ کا بازو تھام لیا تو وہ بھی فوراً" اٹھ گئے۔

"واقعی... یہاں بیٹھ کر تو میں صرف تیسرے ہارٹ اٹیک کو ہی آواز دے رہا ہوں۔"

"دیکھا... دیکھا اپنے باپ کی زبان کو... بیوی نہیں دشمن ہوں میں اس کی اور باقی سب سگے ہیں اس کے۔" پاپا کے پیچھے وہ چلا رہی تھیں۔

ہانیہ نے بمشکل انہیں معتدل کیا۔

"تم بس فوراً" اس سے علیحدگی کا فیصلہ کرو ہانیہ...! میں مزید یہ ذلت برداشت نہیں کرسکتی۔"

ماما نے قطعیت سے کہا تو وہ بددلی کے ساتھ اٹھ آئی۔ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو نائٹ بلب کی سبز روشنی نے استقبال کیا۔

وہ ٹھٹک گئی۔

اس کے بیڈ پر عباد بڑے استحقاق کے ساتھ سو رہا تھا۔ اسے کچھ دیر پہلے لاؤنج کے سین یاد آئے۔ کس طرح اس شخص کی وجہ سے اس کے ماں' باپ کا رشتہ خراب ہو رہا تھا اور یہ بندہ کتنے مزے سے سو رہا تھا۔

ہانیہ کے دل میں انتقامی جذبات بیدار ہونے لگے۔ اس نے آگے بڑھ کے لائٹ آن کردی۔

نتیجہ حسب توقع تھا۔ وہ کسمسا کر جاگا' پھر ناگواری سے ہانیہ کو دیکھا۔

"اس وقت کون سے موتی پرونے لگی ہو تم؟"

"یہ میرا کمرا ہے..."

وہ جتانے والے انداز میں کہتی الماری کی طرف بڑھی اور اپنے کپڑے نکالنے لگی۔

"تو کیا کرنا چاہیے مجھے... کسی ہوٹل میں چلے جانا چاہیے؟" اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ ہانیہ کو سنبھلنا پڑا۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا مگر کم از کم میں یہاں تو اپنی مرضی کرسکتی ہوں۔"

"اچھا..." وہ تمسخر سے بولا۔ "وہاں تو جیسے تم میرے آرڈر میں ہو۔"

وہ کپڑے نکال کے پلٹی اور تنک کر بولی۔

"مجھ پہ رعب جمانے کا سوچنا بھی مت۔"

"میں رعب ڈال کے عزت کروانے پر یقین نہیں رکھتا اور نہ ہی تم سے توقع..."

وہ اطمینان سے کہتا رکا' پھر تیقن سے بولا۔

"تمہیں تمہاری ماما کی گھٹی ہے نا؟ بالکل ویسی باتیں کر رہی ہو۔"

ہانیہ کو غصہ آیا۔ "مجھے بدتمیزی پر مجبور مت کرو۔"

وہ اٹھا اور بیڈ سے پاؤں لٹکا کے بیٹھ گیا۔ "یعنی اپنی دانست میں ابھی تک تم میری عزت کرتی آرہی ہو؟"

وہ حیران ہونے کی اداکاری کر رہا تھا۔

"اور تم... تم جو میری عزت کروا رہے ہو۔" وہ پلٹ کر غرائی۔ "وہاں ایک عدد منگیتر پال رکھی ہے جو بیوی سے زیادہ حق جماتی ہے تم پر... یہ... یہ روپ ہوتا ہے سہاگنوں کا؟" اس نے تلخی سے کہتے ہوئے اپنی طرف اشارہ کیا۔

ماما کی جلی کٹی کا اثر تھا جو وہ الٹا سیدھا بول گئی۔

عباد کی آنکھوں میں حیرت اتری۔ ننگے پاؤں چلتا اس کے مقابل کھڑا ہوا تو ہانیہ کو اس کی مسکراہٹ بھی نظر آگئی۔

"صحیح کہا... یہ تو بالکل کنواریوں والا روپ ہے۔"

اس کی نظریں ہانیہ کو اپنے چہرے پر پھسلتی محسوس ہوئیں۔ اس کا کہا اچھی طرح سمجھ میں آیا تھا۔ چہرہ خفت سے لال پڑ گیا۔

"آئی مین... جو ٹینشن وہاں مل رہی ہے مجھے..."

اس نے بات بنانا چاہی' مگر عباد نے انگشت شہادت اس کے لبوں پر رکھ کر اسے روک دیا۔

"شش... اس رشتے کے کچھ حقوق اور کچھ فرائض ہوا کرتے ہیں مسز! سہاگن کا روپ پانے کے لیے سہاگن بننا ضروری ہوا کرتا ہے۔ یو نو واٹ آئی مین...؟"

اس کا لہجہ ٹھہرا ہوا اور دھیما تھا۔ پر حدت... لو دیتا ہوا۔

ہانیہ کو لگا لمحہ بھر بھی وہ یوں ہی اس کے قریب کھڑا رہا تو وہ جل کر بھسم ہو جائے گی۔

پلٹ کر تیزی سے واش روم میں چلی گئی اور دھڑ سے دروازہ بند کرلیا۔

پتا نہیں کیا ہوا... شاید اپنی کمزوری پہ... یا عباد کی اتنی جرات پر... مگر اسے ڈھیر سارا رونا آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

جب سے پاپا بیمار ہوئے تھے فیکٹری نہیں جا رہے تھے۔ سارا کام ٹھپ ہو رہا تھا۔ عباد کو ساتھ لیے وہ موقع غنیمت جان کر فیکٹری کے لیے نکل گئے۔

وہ ماما کے ساتھ ناشتا کرکے فارغ ہوئی تو سعدیہ آپی آگئیں۔ اس سے بڑے پیار سے ملیں۔ پھر تیکھے انداز میں عباد کا پوچھا اور ناگواری سے بولیں۔

"اسے کیوں دم چھلا بنا کے آئی ہو ساتھ؟"

"پاپا نے روکا ہے اسے۔ وہ تو مجھے چھوڑنے آیا تھا بس۔" ہانیہ نے صفائی پیش کی۔

"اب بتاؤ... کیا سوچا ہے تم نے اپنے فیوچر کے متعلق؟" سعدیہ آپی نے سیدھے سبھاؤ پوچھا تو ماما بے زاری سے بولیں۔ "اب کیا سوچے گی یہ۔ جب وقت تھا تب نہیں سوچا اس نے۔"

"اوفوہ... اب تو زیادہ آسان ہے۔ ان لوگوں کے بیچ رہ کے کوئی بھی الزام لگا کے نکل آئے وہاں سے۔"

انہوں نے چٹکیوں میں حل نکالا تو ہانیہ کے ذہن میں عباد اور زینی لہرا گئے۔

وہ دوپہر تک اسے اسی طرح کے مفید مشوروں سے نوازتی رہیں۔

"آتے ہی فیکٹری کے وزٹ پہ نکل گیا۔ قبضہ کرنے کا ارادہ ہے پورا... پتا ہے ان کا کوئی سا وارث بیٹھا ہے یہاں۔"

ہانیہ کا دل بُرا ہونے لگا۔ عباد اس کے باپ کو دھوکا دے رہا تھا۔

"میں ذرا کچن کی صورت حال دیکھ کے آتی ہوں۔" ہانیہ کا دل گھبرایا تو وہ اٹھ آئی۔

کھانا تقریباً" تیار ہی تھا۔ وہ ملازمہ کے ساتھ مل کر ٹیبل سیٹ کرنے لگی۔ پاپا کے آنے کا وقت بھی ہو چلا تھا۔ ماما اور سعدیہ آپی کو بلانے آئی تو۔۔۔ دروازے کی ناب پہ اس کا ہاتھ ٹھٹک سا گیا۔ ادھ کھلے دروازے سے سعدیہ آپی اور ماما کی تکرار سنائی دے رہی تھی۔

وہ ایزد کے نام پہ ٹھٹکی۔

وہ شخص جس سے سعدیہ آپی کے ہاں فنکشن میں ملاقات ہوئی تو اس کی دلنشین گفتگو نے ہانیہ کو سحر زدہ کر دیا اور وہ اس کی محبت میں مبتلا ہو گئی۔ ان کے مابین کوئی باقاعدہ وعدے نہ تھے۔ مگر ہانیہ اس ان کہی کو بھی سمجھتی تھی۔

مگر آج۔۔۔ یہ کیا ٹوٹا تھا کوئی شیشے کا برتن یا اس کا دل۔

"غضب خدا کا سعدیہ۔۔۔ ایک بیوی بھگتا چکا ہے۔ میں تو سمجھی تھی کنوارہ ہے ایزد۔۔۔" ماما بدک اٹھی تھیں۔

خود ہانیہ کا دل بھی رک سا گیا۔

"اوفوہ۔۔۔ تو یہ کون سا کنواری ہے اب۔۔۔ اور ویسے بھی دو سال ہوئے ایزد کو طلاق دیے' بلکہ دونوں بچیاں بھی اسی کو لکھ دی ہیں ایزد نے۔ کنوارہ کا کنوارہ ہے بالکل۔"

سعدیہ آپی ڈھٹائی میں کمال رکھتی تھیں۔

"تو پرپوزل بھیجتا نا وہ۔۔۔ ایسا ہی دل تھا ہانیہ پر اس کا تو۔" ماما نے تیز لہجے میں کہا۔

"آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ ایسے شان دار بندے اور بڑی آسامی کو پھانسنا پڑتا ہے ماما! ذرا سی ہمت کرتی ہانی تو آج کروڑوں میں کھیل رہی ہوتی۔"

سعدیہ آپی نے اسے یخ بستہ پانیوں میں دھکیل دیا تھا۔ اس کے آنسو آنکھوں ہی میں منجمد ہونے لگے۔

"میری بھی ساری پلاننگ برباد ہوئی۔ لاکھوں لگا رہا تھا وہ معیز کے بزنس میں۔ ہانیہ کے ذریعے تو اور بھی نکلوا لیتے اس سے۔ ابھی تک معیز میرے پیچھے پڑا ہے۔ ایزد کو ایسی دیسی لڑکیاں پسند نہیں آتیں۔ ہانیہ کو لفٹ کرائی تو اس میں کچھ دیکھا ہی ہو گا نا۔"

"اب کیا فائدہ ان باتوں کا۔ شادی شدہ ہے اب وہ۔" ماما نے بات ختم کرنا چاہی۔

"تو طلاق لے نا۔۔۔ اتنا ٹائم برباد کر دیا اس نے۔ ایزد کو تو اس کی شکل بھی بھول گئی ہو گی۔ اسے کون سا کمی ہے لڑکیوں کی۔" وہ سنگ دلی کی انتہا پر تھیں۔

"نہ تو وہ کس کے سر پہ طلاق لے بیٹھے؟" ماما نے ناگواری سے کہا۔

"کم آن ماما۔۔۔ میں کس لیے ہوں۔ دوبارہ سے ہانی اور ایزد کا پیچ اپ کراؤں گی اور شادی نہ سہی۔ دوستی تو کر سکتی ہے نا اس سے۔ اب بہن کا گھر بچانے کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتی۔"

اتنی گراوٹ۔۔۔ ہانیہ کا سر چکرانے لگا۔

"فضول باتیں مت کرو سعدی!"

ماما نے تیز لہجے میں انہیں ڈانٹا مگر وہ بے اثر تھیں۔

"اوفوہ۔۔۔ چلیں عباد سے طلاق نہ لے۔ لڑکیاں تو پتا نہیں شادی شدہ ہو کر بھی کیسے کیسے چکر چلا لیتی ہیں۔ تھوڑا سا فائدہ مجھے بھی پہنچا دے گی تو کیا فرق پڑ جائے گا۔"

"بکواس مت کرو سعدیہ!" ماما کو غصہ آنے لگا۔

ہانیہ بے دم سی پلٹ گئی۔ خود کو بمشکل گھسیٹتی وہ اپنے کمرے تک آئی۔

اس وقت وہ اپنے اندر کا غبار نکالنا چاہتی تھی۔

اپنی ماں جائی کا مکروہ چہرہ دیکھ لینے کے بعد تو اس کا مر جانے کا جی چاہنے لگا تھا اور ایزد سکندر۔۔۔ خوشبو جیسی باتیں کرنے والا چمکتی آنکھوں والا شخص۔

کیا چمک تھی اس کی آنکھوں میں۔۔۔ حرص و ہوس۔۔۔ اس کے آنسو بہہ نکلے۔

وہ تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی تو عباد سے جا ٹکرائی۔

"دھیان سے۔۔۔" دو مضبوط بانہوں کے گھیرے نے اسے سنبھالا تو وہ جو پہلے ہی کسی سہارے کی تلاش میں تھی۔ بکھر سی گئی۔ مچل مچل کے رو پڑی۔

عباد جیسا مضبوط اور بے نیاز شخص بھی گھبرا گیا۔ مگر وہ نہیں جانتا تھا اس کے سینے سے لگی اس کی پناہوں میں بھری وہ کس لو رو رہی ہے۔ کس کا سوگ منا رہی ہے۔

مگر اس وقت اس نے ہانیہ کو بھرپور سہارا دیا۔ اپنے لمس اپنے انداز اور توجہ سے۔ وہ رو رو کے تھک گئی تو عباد نے نرمی سے اسے اپنے سامنے کیا۔

"اتنی خوب صورت آنکھوں کا حشر کر دیا تم نے۔" وہ کوئی الگ سا عباد تھا۔

ہانیہ کی آنکھیں تیزی سے بھر آئیں' جو پہلے ہی رو رو کر سوج گئی تھیں۔

"مجھے۔۔۔ گھر لے چلو پلیز۔۔۔ ابھی۔" اس کا ہاتھ اپنی مٹھیوں میں بھینچتے ہوئے وہ التجائیہ انداز میں بولی۔

"او کے۔۔۔ ابھی کھانا کھا کے نکلتے ہیں۔" وہ ٹھٹکا مگر نرمی سے کہا۔

"تم کھا لو۔۔۔ میں پیکنگ کرتی ہوں۔" وہ آنکھیں رگڑنے لگی۔

"آہاں۔۔۔" عباد نے اس کے دونوں ہاتھ تھامے اور اپنا رومال نکال کر نرمی سے اس کی آنکھوں کو تھپتھپا کر خشک کیا۔

"ماموں جان سے اجازت لی؟ وہ تو تمہیں چند دن اور رکھنا چاہ رہے تھے۔"

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ تم ان سے کوئی بہانہ کر دو پلیز۔۔۔ ابھی میرا دل نہیں کر رہا رکنے کو۔۔۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو رہا ہے۔" وہ بے دم سی بستر پہ بیٹھ گئی۔

"او کے۔۔۔" لمحہ بھر اسے پُرسوچ نظروں سے دیکھنے کے بعد وہ مان گیا۔

"میں ماموں جان سے بات کر لیتا ہوں۔ تم پیکنگ کرو۔۔۔ لیکن۔۔۔ مزید نہیں رونا۔"

تنبیہی انداز میں کہتا وہ کمرے سے نکل گیا تو وہ پھر پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

اس نے پتا نہیں پاپا سے کس طرح اجازت لی' مگر غنیمت رہی کہ پاپا نے اسے روکنے پر اصرار نہیں کیا۔ البتہ ماما کچھ خاموش سی تھیں۔ سعدیہ آپی خوب بڑھ چڑھ کے اعتراض کرتی رہیں مگر عباد نے انہیں اسی طرح نظر انداز کیا' جیسے وہ عباد کو کرتی تھیں۔

سارے راستے وہ آنکھیں موندے بے دم سی پڑی رہی۔ سعدیہ آپی کی غلیظ باتیں اور سوچ اس کی پلکیں خشک ہونے نہیں دے رہی تھی۔

"جو بات دل پہ بوجھ بن رہی ہو اسے نکال کے باہر پھینک دینا چاہیے تاکہ دل کا بوجھ ہلکا ہو سکے۔"

سارے راستے میں بس ایک بار اسے مخاطب کیا تھا' جب اس نے ایک دکان پہ گاڑی روک کے زبردستی اسے جوس پلایا تھا۔

ہانیہ نے سوچا۔

وہ اپنی ماں جائی کی سوچ' اس کی گفتگو کسی دوسرے سے شیئر کر سکتی ہے بھلا؟ بعض بوجھ تاعمر دل پہ دھرے رہتے ہیں اور شاید ان کا بوجھ دل پہ اٹھائے رکھنے میں ہی بھلائی بھی ہوتی ہے اور عزت بھی۔

گھر آ کے وہ تیز بخار میں مبتلا ہو گئی۔

عباد سمجھ رہا تھا کہ وہ کچھ ان چاہا برداشت کرنے پر مجبور ہے' جب ہی برداشت جواب دے رہی ہے۔

ہفتہ بھر کے بخار نے اس کو اچھا خاصا نچوڑ کر رکھ دیا۔ مگر اس ایک ہفتے میں اس نے گھر والوں کو اپنے آس پاس پریشان اور نرم خو دیکھا۔

اور عباد رضا۔۔۔ وہ مفاد پرست شخص۔۔۔

وہ روتی تو کسی سہیلی کی طرح اسے اپنا کندھا پیش کرتا اور اس کے آنسو پونچھتا مگر شوہر والے رعب سے اس سارے معاملے کا سبب نہیں پوچھتا تھا۔ ہانیہ کو وہ ڈرامے باز لگا۔ تب ہی ایک دن اسے جھٹک کر چلا اٹھی۔

"چلے جاؤ یہاں سے۔ دل بے زار ہو گیا ہے میرا۔ بناوٹی پیار' محبت' توجہ۔۔۔ کیا میں نہیں جانتی رشتوں کے اصل چہرے۔" اور وہ دانت پیستا اٹھ کے گیا تو دو دن تک کمرے میں نہیں آیا۔

☼ ☼ ☼

بجھے دل اور ایک بے زار کن سی کیفیت لیے وہ عباد اور زینی کی بے تکلفی دیکھتی اور اندر ہی اندر کڑھتی رہتی سعدیہ آپی کا فون آیا تو اس نے نہ چاہتے ہوئے

اٹینڈ کیا۔

"جلدی کرو۔۔۔ ایزد تمہارے انتظار میں ہے۔۔۔"

بہت سی باتوں کے درمیان وہ بار بار اسے یاد دلا رہی تھیں۔ ہانیہ کی آنکھیں بھر آئیں اور آواز پھٹ سی گئی۔

"مت دیں مجھے لالچ سعدیہ آپی! بھلا دیا ہے میں نے اپنی پچھلی زندگی کو۔ خیانت لے کر عباد رضا کے نکاح میں نہیں آئی ہوں میں۔ اب بھی اگر کوئی فیصلہ کروں گی تو کسی لالچ میں نہیں، بلکہ اپنے دل کی خوشی اور ضمیر کے اطمینان کے لیے کروں گی۔ مجھے ایزد کے نام کا لالچ مت دیا کریں۔ اس سے میرا تعلق ہمیشہ کے لیے ختم ہوا۔"

"اور آپ سے بھی۔۔۔" یہ کہتے ہوئے اس نے خود کو بمشکل روکا تھا اور فون بند کرکے رونے لگی۔

موسم اچھا ہوا تو وہ کرن کے ساتھ چھت پہ ٹہلنے چلی آئی۔ گزرے دنوں میں گھر والوں کے ساتھ اس کے روابط کافی بہتر ہوئے تھے۔

خصوصاً" نرگس پھپھو نے اسے بالکل ماں کی طرح سنبھالا تھا اور وہ ان سب کے رویوں کو ماما کے تناظر میں دیکھتی خود پر شرمندہ ہوتی رہتی۔

کرن چائے لینے نیچے گئی تو وہ چھت سے ہوتی ٹیرس پہ چلی آئی، جہاں سے نیچے گیٹ اور پورچ کا سارا منظر دکھائی دیتا تھا۔

گاڑی اندر آتے اور اس میں سے عباد اور زینی کو نکلتے دیکھ کر اس کے احساسات عجیب سے ہونے لگے۔۔۔ پھر اسے یاد آیا، پچھلے دنوں کیسے اس نے عباد رضا کو دھتکار دیا تھا۔

اس کا دل بوجھل سا ہونے لگا۔ خدا جانے کیا صحیح تھا اور کیا غلط۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اندر کی طرف بڑھ گئے۔ اب وہ دونوں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہانیہ سلگ کر رہ گئی۔

کاش پاپا۔۔۔! آپ اس شخص کا اصل چہرہ دیکھ پاتے۔ وہ چلتی ہوئی پچھلی دیوار کے ساتھ آ کھڑی ہوئی اور باغ میں جھانکنے لگی۔

"اور اگر یہ سب عام حالات میں ہوا ہوتا تو۔۔۔؟" اس کے ذہن نے پلٹا سا کھایا۔

"تو۔۔۔" وہ بے اختیار سوچنے لگی۔

"اگر ماما اور پاپا کا آپس کا جھگڑا نہ ہوتا اور ہانیہ واقعی دل سے راضی ہو کر یہ شادی کرتی تو یقیناً" وہ اپنی قسمت پہ رشک کرتی۔ اسے یک لخت جھٹکا سا لگا۔

"یہ میں کیا فضول سوچ رہی ہوں۔" ہوا سے اڑتے بالوں کو ہاتھوں سے سمیٹتی وہ خود کو ڈانٹنے لگی۔ سیڑھیوں پر سے قدموں کی آواز اوپر آتی محسوس ہوئی۔ کرن چائے لے آئی تھی۔ اس نے ٹرے لا کر دیوار پر رکھی۔ ہانیہ باغ کی خوب صورتی سے محظوظ ہوتی قدرے بے توجہ سی تھی۔ پلٹے بغیر چائے کا مگ اٹھایا اور بولی۔

"یہ زینی کیا ہر وقت تمہارے بھائی کے ساتھ چپکی رہتی ہے؟" جواب لمحہ بھر کے توقف کے بعد ملا۔

"خیر! اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ کافی فاصلے پہ ہوتی ہے وہ۔" ہانیہ کا دل اچھل کر حلق تک آیا۔ ہاتھ لرزا تو چائے مگ سے چھلک گئی۔

"دھیان سے۔۔۔ کیا ہوا، جواب پسند نہیں آیا؟" وہ بڑی سادگی سے پوچھ رہا تھا۔ خود کو سنبھالتے ہوئے ہانیہ نے مگ واپس ٹرے میں رکھا اور اس کی طرف پلٹی۔ کاٹن کے گرے کرتا شلوار میں وہ شام کے اس وقت بہت فریش لگ رہا تھا۔ اس پر مستزاد لبوں کی تراش میں ہلکی سی مسکراہٹ۔

"یہ کون سا طریقہ ہے کسی کی پرائیویسی میں مداخلت کا؟" ہانیہ نے اسے لائن کے دوسری پار ہی رہنے کا اشارہ دیتے ہوئے کہا تو اس نے ٹیرس پہ نگاہ دوڑاتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"ٹیرس پہ پرائیویسی۔۔۔؟"

"کرن کہاں ہے۔ چائے تو وہ لا رہی تھی۔" وہ ناراض تھی۔ عباد نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"تمہیں تو اپنی خوش قسمتی کا یقین ہو جانا چاہیے۔ عباد رضا تمہارے لیے چائے لایا ہے۔"

وہ سراسر شرارت پر آمادہ تھا۔ ہانیہ نے سلگتی نگاہ اس پر ڈالی، پھر بڑے اطمینان سے بولی۔

"ایسے تو کتنی ہی دفعہ ہوٹل میں ویٹر میرے لیے چائے لائے ہیں۔" وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

ہانیہ کی نگاہ بے اختیار اس کی طرف اٹھی۔ وہ ان مردوں میں سے تھا جو چھا جانے والی شخصیت رکھتے ہیں۔ چاہے وہ بولیں، خاموش رہیں یا پھر مدھم سا ہنس ہی دیں۔ اس لمحے ہانیہ نے پوری شدت سے محسوس کیا تھا اور یہ بھی کہ اسے عباد رضا سے دور رہنا چاہیے۔

اچانک وہ سٹپٹا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگی، جہاں سے موٹی موٹی بوندیں گرنے لگی تھیں۔

"وہاں شیڈ کے نیچے آ جاؤ۔ ابھی بارش تیز ہو جائے گی۔" ٹرے اٹھانے کی غرض سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے عباد نے کہا تو وہ لاپروائی سے بولی۔

"میں یہیں ٹھیک ہوں۔" پھر اس نے جیسے ٹرے اٹھانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ بھاپ اڑاتی چائے میں بارش کے قطرے ٹپ ٹپ گر رہے تھے مگر وہ پوری طرح ہانیہ کی طرف متوجہ تھا۔

"اتنی نازک سی ہو۔ بیمار پڑ جاؤ گی۔"

"غلط فہمی ہے تمہاری۔ اتنی کمزور نہیں ہوں میں۔" وہ تنکی۔

"ارے۔۔۔" وہ ذرا سا ہنسا۔ "میں نے کمزور تو نہیں کہا، بلکہ میں نے تو تمہاری نازکی کی تعریف کی ہے۔"

بارش اب زور پکڑنے لگی تھی۔

"مجھے تمہاری تعریفوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اس کی نظروں نے ہانیہ کو قدرے نروس کر دیا تھا مگر اس کے لہجے کی بے رخی میں فرق نہیں آیا۔

بارش کا پانی اب اسے بھگونے لگا تھا۔

عباد کے سامنے اسے شرم سی آنے لگی تھی۔ خجل ہو کر اس نے دوپٹے کا پلو پکڑ کر نچوڑا۔

"بارش تیز ہو گئی ہے۔" اس کے قریب سے گزر کر کہتے ہوئے وہ شیڈ کی طرف بڑھی مگر ایک جھٹکے سے رکی۔ دل جیسے غوطہ کھا گیا۔ بے اختیار پلٹنا پڑا۔

بارش کی چادر کے پار وہ مسکرا رہا تھا۔ ہانیہ کا داہنا ہاتھ اس کی مٹھی میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ یوں ہی مسکراتا ہوا اس کے مقابل ہوا۔

"ابھی تو بڑی بہادری کے دعوے کر رہی تھیں۔"

"ہاتھ چھوڑو میرا۔" وہ اس کی بھوری ساحر آنکھوں میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی اور نہ ہی اس کی خوب صورت مسکراہٹ کو۔

"اور اگر نہ چھوڑوں تو۔۔۔ کیا کرو گی؟" نرمی سے کہتے وہ اس کے قریب ہوا تھا۔ اتنے قریب کہ ہانیہ کو اپنے حواس مختل ہوتے محسوس ہوئے۔

"عباد پلیز۔۔۔ کیا بدتمیزی ہے۔" وہ ڈھنگ سے غصہ بھی نہیں کر پائی۔

"تھوڑی دیر یہاں کھڑی رہو۔ ہو سکتا ہے کچھ غلط فہمیاں دُھل جائیں۔" وہ برجستہ بولا تو ہانیہ نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔

"عباد۔۔۔ عالی یہاں کیا کر رہے ہو؟"

زینی کی آواز نے منظر میں ہلچل سی مچا دی۔ وہ چھت پہ آ گئی تھی اور سیڑھیوں کے سرے پہ کھڑی یقیناً" انہیں اتنے قریب کھڑے دیکھ چکی تھی۔ گہری سانس بھرتا وہ پلٹنے لگا۔ اس کی مٹھی کھلی تو ہانیہ نے اپنا ہاتھ آزاد ہوتا محسوس کیا۔ مگر اگلے ہی پل جانے اس کے دل میں کیا سمائی، اس نے جاتے ہوئے عباد کا ہاتھ ٹھیک اسی طرح اپنی مٹھی میں جکڑ لیا جیسے اس نے ہانیہ کا جکڑا تھا۔

عباد حیران سا چہرہ موڑ کر اسے دیکھنے لگا تو وہ قصداً" مسکرائی۔

"ابھی کچھ غلط فہمیاں تو دُھلنے دو۔"

دور کھڑی زینی کے بدن میں شرارے دوڑ گئے۔ وہ انہیں سن تو نہیں سکتی تھی، مگر جو کچھ اسے دکھائی دے رہا تھا، وہ ناقابل برداشت تھا اور ہانیہ یہی چاہتی تھی۔ مجھے بے سکون کرنے والے ذرا خود بھی تو پریشان ہوں۔

"عالی۔۔۔ مجھے گھر جانا ہے۔ مجھے چھوڑ کے آؤ ابھی۔" وہ پاؤں پٹخ کے چیخی تھی۔

ہانیہ نے اطمینان بھری اونچی آواز میں کہا۔

"تم سعد کے ساتھ چلی جاؤ۔ ہم ابھی بارش انجوائے کریں گے۔"

عباد کچھ اس طرح حیران ہوا کہ غصے سے بھری زینی کو جاتے ہوئے روک بھی نہیں پایا۔ وہ تو بارش میں بھیگتی اس طلسمی مورت کو دیکھ رہا تھا۔ زینی کے جاتے ہی اس نے اپنے ہاتھ کو نرم سی گرفت سے آزاد ہوتے پایا۔

"بڑی ڈرامے باز ہو....." عباد نے متاثر ہونے والے انداز میں کہا تھا۔

"پہلے نہیں تھی مگر اب حالات کے مطابق ڈراما کرنا ہی پڑے گا۔" وہ تلخی سے کہتی سامنے شیڈ کی طرف چلی گئی۔

دوپٹا اتار کر نچوڑتے ہوئے ہانیہ نے دیکھا' دونوں بازو پھیلائے وہ بارش میں بھیگ رہا تھا۔

دوپٹا پھیلا کر اوڑھتی وہ سیڑھیاں اتر کے نیچے آئی۔ زینی تنے ہوئے تاثرات لیے لاؤنج میں کھڑی تھی۔ نرگس پھپھو اسے پتا نہیں کیا سمجھا رہی تھیں۔ ہانیہ کو دیکھ کر اس سے پوچھنے لگیں۔

"عالی کہاں ہے؟"

"وہ تو اوپر ہی ہیں۔" ہانیہ نے ایک تیکھی نظر زینی پہ ڈالتے ہوئے بتایا۔

"اسے رہنے دیں مامی! میں سعد کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی اور اسے کہیے گا آئندہ مجھے لینے نہ آئے۔" زینی تڑخ کر بولی۔

"ابھی تو بارش ہو رہی ہے۔ ٹھہر جاؤ تھوڑی دیر۔" کرن نے مصالحت آمیز انداز میں کہا۔

"تب تک کون سا تمہارے بھائی کا دماغ ٹھکانے پہ آجانا ہے۔" ہانیہ کپڑے تبدیل کرنے کے ارادے سے اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔

"ہونہہ..... اچھی شکل کا جادو سر چڑھ کے بول رہا ہے تمہارے بھائی کے۔"

اس نے اپنے پیچھے زینی کا زہریلا لہجہ سنا تھا۔ مگر وہ نظر انداز کرتی کمرے میں چلی آئی۔ وہ کپڑے تبدیل کر کے نکلی تو عباد کمرے میں

"زینی چلی گئی؟" ہانیہ نے بے اختیار پوچھا اور پھر پچھتائی۔

"ابھی بیٹھی ہے۔ چینج کر کے پھر ڈراپ کرنے جاؤں گا اسے۔" وہ نارمل سے انداز میں بولا تو وہ جو ابھی خود کو "مجھے کیا" کہہ کر لاپروا ظاہر کر رہی تھی' چونکی۔

"مگر وہ تو سعد کے ساتھ جانے والی تھی۔"

"میں اسے لے کر آیا تھا۔ اصولاً" مجھے ہی ڈراپ بھی کرنا چاہیے۔" وہ الماری سے ٹراؤزر شرٹ نکال کے پلٹا اور رسان سے بولا۔

"تم شادی کرنا چاہتے ہو اس سے؟" وہ اس کے راستے میں آکر بڑے چبھتے ہوئے انداز میں بولی۔ عباد ٹھٹکا' پھر معنی خیزی سے بولا۔

"روک تو مجھے پہلے بھی کوئی نہیں سکتا تھا..... مگر تم بتاؤ' تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

"ہاں..... مجھے اعتراض ہے مسٹر عباد! کہ جب تک میں تمہارے نکاح میں ہوں تم....." وہ بڑے جوش سے کہنے لگی تھی کہ وہ اونچی آواز میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"جب تک سے کیا مراد ہے تمہاری؟ تم میرے نکاح میں ہو اور اب رہو گی۔" آخری جملے پر زور دے کر بولا۔

"تو زینی کون ہے پھر.....؟" اپنی طرف سے ہانیہ نے بڑا کڑا وار کیا تھا۔

"وہ میری کزن ہے اینڈ دیٹس آل۔ تم اپنے دماغ کو فضولیات میں مت الجھاؤ۔"

"مائنڈ یو مسٹر عباد! یہ فضولیات یہاں آکے مجھے بھگتنی پڑ رہی ہیں' میکے سے نہیں لے کے آئی تھی میں۔" وہ تڑخ کر بولی۔

"لڑنا چاہتی ہو؟" عباد کے تیور بھی بدلے تھے۔

"میں ساری اصلیت جاننا چاہتی ہوں۔" اس کا ہٹیلا پن اپنی جگہ تھا۔ عباد نے لب بھینچے اور گھور کے اسے دیکھا' پھر بولا۔

"تمہارا صرف دماغ خراب ہے۔ اصلیت تمہارے سامنے ہے۔ تم سے شادی کر کے اس گھر میں لایا ہوں تمہیں۔"

"کیوں..... جبکہ زینی سے تمہاری منگنی ہو چکی تھی؟" وہ غصے سے بولی۔

"وہ میرا پرسنل میٹر ہے۔ میں ہر بات تم سے شیئر کرنے کا پابند نہیں ہوں۔"

عباد واش روم میں گھس گیا۔ ہانیہ مٹھیاں بھینچ کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

اس ان چاہی زندگی نے ہانیہ کو عجیب سے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ ماضی دامن پکڑ کے کھینچتا تو وہ گھبرا کر خود کو حال میں الجھانے کی کوشش کرتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا فیصلہ کرے اور کس طرح۔

عباد اس سے شادی کر کے بھی اس قدر انجان اور اجنبی تھا کہ حد نہیں۔ اوپر سے زینی..... ہانیہ نے حبس سے گھبرا کر کمرے کی کھڑکی کھولی تو حسین منظر نے نگاہوں کو جکڑ لیا۔

اتنے دنوں میں پہلی بار اس نے یہ کھڑکی کھولی تھی اور آج ہی اسے علم ہوا کہ یہ بڑی سی کھڑکی ملحقہ باغ میں کھلتی تھی۔ جہاں سے آم اور لیموں کی خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ رشک سے باغ کی خوب صورتی دیکھ رہی تھی۔ تب ہی نسوانی قہقہے نے اس کی سماعتوں کو متوجہ کیا۔

"عباد....." ہوا کے دوش پہ لہراتی زینی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو اس نے بے ساختہ کھڑکی کی چوکھٹ پہ ہاتھ جما کر جھک کر آگے ہوتے ہوئے باغ میں نظر دوڑائی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

"تم ہانیہ کو کب چھوڑ رہے ہو؟" زینی نے اس قدر آرام سے پوچھا کہ وہ سُن ہو کر رہ گئی۔

"یہ میں نے تم سے طے تو نہیں کیا تھا۔" عباد کی آواز بے حد پُرسکون تھی۔

"عالی پلیز..... معاف کر دو مجھے۔ غلطی ہو گئی مجھ سے۔ میں اب بہت بدل گئی ہوں۔ تم یہی چاہتے تھے نا۔" وہ روہانسی ہونے لگی۔

"تم بہت اچھی ہو زینی! بہت خوب صورت' بہت مکمل۔" وہ کہہ رہا تھا۔

ہانیہ عجیب سے احساسات کا شکار ہونے لگی مگر دل کچھ اس قدر بے زار ہوا کہ اس نے کھڑکی بند کر دی۔

"وہ اچھی ہے..... خوب صورت اور مکمل....."

وہ آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس کا تراشا ہوا سراپا اور دلکش نقوش واضح تھے۔ بالوں کی نئی کٹنگ اسے بے حد سوٹ کر رہی تھی۔

"کیا میں خاص نہیں ہوں۔ اتنی کہ عباد رضا میری بھی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ وہ جو بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری عورت کی تعریف کر رہا ہے۔ میں نے اسے اتنی چھوٹ کیوں دی کہ وہ اس بے ایمانی پہ اتر آیا ہے۔"

"اور تم جو اس سے بے ایمانی کرتی رہی ہو..... کسی اور کے خیالات۔" اس کا ذہن بھٹکا۔

"وہ معاملہ تو ختم ہوا۔ اب تو یہی میری زندگی ہے۔ پھر اس کی بربادی اتنے آرام سے کیسے دیکھوں۔"

☼ ☼ ☼

اس نے کرن اور سعد سے پکی دوستی گانٹھ لی۔ نرگس پھپھو کے ساتھ کچن میں گھسی نئے نئے کھانے سیکھتی رہتی۔ وہ اب عباد رضا کے پلٹنے کی دعا کرتی تھی۔

اتنا تو اسے کرن کی باتوں سے علم ہو ہی چکا تھا کہ عباد نے اس سے شادی کسی لالچ میں نہیں کی تھی۔

جو شخص اپنی زمینوں کے چاول وسیع پیمانے پہ کئی بڑے شہروں میں سپلائی کرتا ہو' جسے روپے پیسے کی کوئی کمی نہ ہو' وہ پاپا کی ایک چھوٹی سی فیکٹری اور گھر کا کیا لالچ کرتا؟

"امی کو زینی کی اکڑ اور غرور پسند نہیں۔ بھائی جان کی اس سے کوئی باقاعدہ منگنی نہیں ہوئی تھی۔ ابو کے دل کی خواہش تھی۔ انہوں نے سالوں پہلے بھی پھپھو

سے ذکر کیا تو بس ان کے تئیں منگنی ہو گئی سمجھو اور زینی نے تو یوں حق جمانا شروع کیا' جیسے سچ مچ ان کی منگیتر ہو۔ بھائی اپنی فطری نرم دلی کی وجہ سے اسے کچھ نہیں کہتے۔"

کرن نے تفصیل بتائی تو اس کا دل بے ترتیبی سے دھڑک اٹھا۔

"اچھی شکل کی ہے۔ اس سے شادی کر لیتے۔"

"زینی کو گھر بنانا نہیں آتا۔ وہ رشتے نبھانے میں اناڑی ہے۔ بھائی کی پسند ایک ایسی لڑکی تھی' جو اس گھر کو جوڑ کے رکھے اور ہم سب کو بھی۔ مگر جب امی نے انہیں آپ کے لیے کہا تو وہ ایک لفظ بھی اعتراض کا نہیں بولے۔"

ہانیہ کی سانس بڑے سبھاؤ سے چلنے لگی۔

☼ ☼ ☼

ماما کا فون آیا تھا وہ سخت پریشان تھیں۔

"زونی کی وجہ سے گھر میں فساد مچا ہوا ہے۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟"

"ہنی مون کے لیے ٹکٹوں کا انتظام کرنے کو کہہ رہی ہے۔ یورپ جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں دونوں۔"

"کیا مطلب۔۔۔ علی کی فیملی تو خود اتنی ویل آف ہے۔" اسے جھٹکا لگا۔

"نرے کنجوس' پیسہ خرچتے جان نکلتی ہے سب کی اور پھر بزنس کون سا علی کا ہے۔ باپ' بھائی کا کھڑا کیا ایمپائر ہے۔ لگا بندھا خرچ لیتا ہے۔ تنخواہ ہی سمجھ لو۔" ماما نے تفصیل بتائی تو وہ بولی۔

"تو زونی کو سمجھائیں نا۔"

"اسے کیا سمجھاؤں' وہ تو حق داری پہ اتر آئی ہے۔" ماما کے لہجے میں تھکاوٹ سی اتر آئی۔

"زونی کا تو حق مہر ہی ایک لاکھ تھا۔ اپنی ٹکٹ تو وہ کروا ہی سکتی ہے۔"

اسے یاد آیا تو ماما نے بتایا۔

"اس بے غیرت نے پہلی رات ہی حق مہر بخشوا لیا تھا۔" ہانیہ کو اپنے حق مہر کی رقم یاد آئی' جو اس نے لاپروائی سے اپنے پاؤچ میں ڈال رکھی تھی۔

"دل کا امیر ہونا چاہیے بندے کو۔ روپے پیسے کی دولت تو آنی جانی شے ہے۔ خدا کا شکر تم اچھے ہاتھوں میں چلی گئیں۔"

ماما پژمردہ سی تھیں اور متشکر بھی۔

اور اب ہانیہ کی آنکھوں پر سے بھی بدگمانی کی پٹی اتر چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

ہانیہ نے کھانا پکانے کے علاوہ بھی بہت سی ذمہ داریاں اٹھائیں۔ پھپھو کی تو وہ پسندیدہ بہو ٹھہری۔

اور عباد۔۔۔

اس دن کے بعد سے وہ ہانیہ کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھ رہا تھا۔ ہانیہ مضطرب و بے چین تھی۔

وہ زینی کو عباد جیسا پیارا شخص یوں دان کرنے کو تیار نہ تھی۔ خدا نے اسے ایزد جیسے شخص سے بچا کر عباد رضا جیسا بہترین شخص دیا تھا اور اسے اس تحفے کی قدر کرنا تھی۔

ایسے ہی ایک دن وہ اندر کمرے میں آنسو بہاتی اپنی بدگمانیوں اور غلط فہمیوں پر پچھتا رہی تھی۔

عباد اپنا والٹ اٹھانے کمرے میں آیا۔ سائیڈ ٹیبل پر سے اپنا والٹ اٹھا کر وہ اسی تیزی سے پلٹا۔ مگر پھر ٹھٹک کر رک گیا۔ واپس بیڈ کی طرف آیا۔

"تم پھر رو رہی ہو؟"

وہ جیسے نہ چاہتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا تھا۔ وہ سوں سوں کرتی اسے دیکھتے ہوئے بھرآئی ہوئی آواز میں بولی۔

"تو اور کیا کروں۔ جس لڑکی کا شوہر اتنی خوب صورت بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری لڑکیوں کو خوب صورتی کی سند دیتا پھرے' وہ روئے گی نہیں تو کیا کرے گی۔"

وہ متحیر سا اسے دیکھنے لگا۔ پھر بات سمجھ میں آئی تو رکھائی سے بولا۔

"اگر یہ سند بیوی ادب و احترام سے وصولتی تو شوہر ہنسی خوشی اسی کو اس عہدے پر فائز کرتا۔"

"اور وہ جو قائم مقام منگیتر ہونے کا دعوا کر رہی تھی۔" اسے یاد دلایا۔

"جھٹکے سے چھڑائیں تو دامن پھٹنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کسی کے دماغ کا فتور نکالنے کے لیے اپنا دماغ ٹھنڈا رکھنا پڑتا ہے۔ زینی کو بھی تمہاری طرح بہت کچھ سمجھ میں آگیا ہے اور باقی بھی جلدی سمجھ جائے گی۔"

وہ جانے کی جلدی میں تھا۔ ہانیہ اپنی تمام تر انا و خودداری کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اٹھ کر اس کے سامنے آئی اور بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"اور میں۔۔۔ میرا کیا؟"

"تم۔۔۔"

چند لمحے اسے گھورتے ہوئے وہ اس کی معصومیت بھری خوب صورتی کی تاب نہ لا سکا تو ہنس دیا۔

"تمہیں تو دل چاہتا ہے کچا چبا جاؤں۔"

وہ خفا ہونے لگی۔ دفعتاً" عباد نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"میرا دل' میرا چین' میرا ارتکاز سب ہی کچھ تو چھین لیا ہے تم نے۔"

وہ اس کی بے اختیارانہ بے تابیوں پر دم بخود تھی۔

اس نے تو یہ سوچا تھا کہ وہ اسے معاف کر دے گا مگر اس قدر محبت اور مان سے معاف کرے گا' یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

"آئم سوری عباد۔۔۔" اس کی نرم دلی عود کر آئی تو وہ شرمساری آنسو بہانے کو تیار ہو گئی۔

"خبردار۔۔۔ پھر دریا بہانے چلی ہو۔" اس نے ڈپٹ کر کہا۔

"میں سمجھی آپ کسی لالچ میں مجھ سے شادی کر رہے ہیں۔" سچ بول دینا مناسب سمجھا۔ منہ بسورتی سچی جھوٹی کہتی وہ سیدھی دل میں اترتی جا رہی تھی۔ عباد نے اسے دونوں بازوؤں سے جکڑ کر خود سے قریب کر لیا۔

"ہاں۔۔۔ لالچ تو تھا ہی۔۔۔ وہ پہلی نظر کی محبت' اسپتال کی ملاقات' مجھے کیا پتا تھا یہ چاند میرے ہی آنگن میں اترنے والا ہے۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

"ہاں۔" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔

"اور اب ان سب ضائع شدہ لمحوں کا حساب ہو گا جو تم اپنی بے وقوفی کی وجہ سے گنوا چکی ہو۔"

وہ شرارت سے بولا تو کمرے میں ہانیہ کی ہنسی کے ساتھ عباد کا ہلکا سا قہقہہ گونج اٹھا۔

آسمان پر چاند مسکرا رہا تھا اور ہانیہ کا دل خدا کے حضور سجدہ ریز تھا جس نے اسے ایسا ہمدم اور ایسا دوست عطا کیا تھا' جس کا دل خالص جذبوں سے لبریز تھا۔

"اور جو آپ نے کہا تھا کہ مجھ میں وہ خاص بات نہیں ہے جو آپ کو چارم کر سکے۔"

"وہ تو ایسے ہی' شوہرانہ رعب۔۔۔ سمجھا کرو نا یار!"

چاند مسکراتا ہوا ان کی سرگوشیاں سننے لگا۔

☼

WWW.PAKSOCIETY.COM

تہمینہ چوہدری

سنہری شامیں

بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے جب ہم تنہا ہوتے ہیں۔ بھاگتے دوڑتے سمے کے ساتھ چلنے سے قاصر۔ کسی بے بس بیمار مریض کی طرح جو زندگی کی آس توڑتے کسی بھی لمحے آنے والی موت کا منتظر ہوتا ہے۔ جیسے کوئی معصوم بچہ کبھی نہ پورے ہونے والے وعدے کے پورے ہونے کے بارے میں پُریقین ہوتا ہے۔

ایسے ہی کبھی محبت ہماری انگلی تھام لیتی ہے۔ سنہری شاموں میں جیسے جل ترنگ سے بج اٹھتے ہیں۔ محبت کیسے کسی پکے چور کی طرح گھات لگائے بیٹھی ہوتی ہے اور جیسے ہی کسی لمحے ہم غافل ہوتے ہیں ہم پر قبضہ جمالیتی ہے اور پھر ہمیں عمر بھر اس ایک غفلت کے پل کا قرض چکانا ہوتا ہے۔

محبت کا لالچ تو کم ہوتا ہی نہیں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اس کی زمین اتنی وسیع ہوتی ہے کہ اپنے اندر لاکھوں دلوں کو سمالیتی ہے۔ اور کسی راہی کے انتظار میں بیٹھی عروج کب یہ جانتی تھی کہ محبت گھات لگائے اس کی تاک میں بیٹھی تھی۔ اسے کہاں پتا تھا کہ راہی راستوں پر اپنے نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ کچھ اس طرح کہ پھر آپ لاکھ بھولیں لاکھ راستے بدلیں وہ مدھم مدھم مٹے مٹے نقوش جیسے آپ کے دل پر نقش ہوجاتے ہیں۔ محبت کو تو جیسے یہ ناز ہوتا ہے کہ وہ فاتح ہے وہ تسخیر کرنا جانتی ہے بھلے اس کی زد میں عروج جیسے لوگ ہی کیوں نہ آجائیں جو اس قدر خوف زدہ رہتے ہیں محبت کی کارستانیوں سے کہ ہر لمحہ کسی انہونی کا ڈر کسی حادثے کا گمان انہیں چین ہی نہیں لینے دیتا۔ اور جو انجانے اجنبی مسافر کبھی راستے میں ٹکرا جائیں جن کے لوٹ آنے کی کبھی امید بھی نہ جاگی ہو تو جسم کے اندر اس خون کے لوتھڑے کی کیا حالت ہوتی ہوگی...

سرِشام ہی وہ چائے کا مگ اٹھائے برآمدے کی گرل سے ٹیک لگائے اپنی زندگی میں در آنے والی اس اچانک واردات پر حیرت زدہ تھی۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی پوری زندگی کا حساب کتاب کرتے ہیں اور پھر گزارتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ کبھی کبھی یہ زندگی بندے کے ساتھ وہ مذاق کرتی ہے کہ بندہ تہی داماں کھڑا رہ جاتا ہے۔ اس نے کبھی یوں نہ سوچا تھا۔ کبھی ایک لحظ کو خیال بھی نہیں آیا تھا کہ محبت اس کی زندگی میں یوں اچانک در آئے گی کہ وہ خود اپنے سامنے بھربھری ریت بن کر ڈھے جائے گی۔ کبھی کبھی کچھ لوگ خود اپنے سامنے ہی ہار جاتے ہیں۔ وہ کتنا پتھر دل تھا کہ جاتے سمے مڑکر بھی نہیں دیکھا تھا کہ اس لمحے کسی دل نے شدت سے اس کے رک جانے کی دعا مانگی تھی۔ دعا کی قسمت میں تو مستجاب ہونا لکھا ہوتا ہے مگر کس وقت، کس شکل میں یہ طے نہیں ہوتا۔ اور شاید وقت نہیں آیا تھا کہ اپنے راستے کی طرف گامزن شاہ میر نے ایک لحظے کے لیے بھی مڑکر ان آنکھوں میں برستے پانی کو نہیں دیکھا تھا جن کی چمک اسے کبھی کبھی چیلنج کرتی محسوس ہوتی تھی۔ اسے ان آنکھوں کا کھوج لگانے پر مجبور کرتی تھی مگر اسے تو یہ زعم ہی بہت تھا کہ وہ بہت بے نیاز آدمی ہے اور اس کی یہی بے نیازی کسی کو اشکبار کرگئی تھی وہ جیسے جانتا ہی نہیں تھا۔

پر محبت بھی کتنی چالاک ہوتی ہے ناکہ یوں گھات لگائے بیٹھتی ہے کہ سوکھی زمین پر نہر بہادیتی ہے۔

جیسے سوکھی لکڑی کو خود بخود اچانک ہی گھن لگ جائے۔

دیے ہارے تو ہوں مگر آنگن پھر بھی خالی ہو۔ جیسے سنہری شامیں تو ہوں مگر اداس دن بھی ساتھ ہو۔

جیسے ساون کبھی تو صرف دھرتی کی پیاس بجھاتا ہے اور کبھی بغاوت کردیتا ہے۔ سب کچھ اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔

وہ بھی جیسے گھن لگی لکڑی کی طرح تھی۔ محبت نے اسے یوں چاروں شانے چت کیا تھا کہ وہ حیران پریشان اس کارگزاری پر بے بس کھڑی تھی۔

بھلا کبھی مسافر لوٹ کر آئے ہیں۔ جانے والے تو کبھی پلٹ کر نہ آنے کے لیے جاتے ہیں۔ دعائیں جانے والوں کو کب واپس لاتی ہیں۔ اور ہر روز یہی سوچتے سوچتے اس کی گلابی شامیں تنہا راتوں کی اوڑھنی اوڑھ لیتی تھیں۔ وہ کبھی کبھی نہر کے پاس سے گزرتی تو اسے یوں لگتا تھا جیسے ایک نہر اس کے اندر بھی بہتی تھی جس نے اس کے دل کی سرزمین کو جل تھل کردیا تھا۔ نہر پر چلتے ہوئے سوکھے خزاں رسیدہ پتے اسے بہت کچھ یاد دلاتے تھے۔ اسے اپنا وجود بھی خزاں رسیدہ پتا لگتا تھا۔

اور پھر ایسے ایک دن جب وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح نہر کے پاس نیچے جاتی سیڑھیوں پر گھٹنوں میں سر دیے تنہا بیٹھی تھی کوئی اس کے پاس آبیٹھا تھا۔

"کوئی مسافر بھلا پلٹا ہے کبھی؟" اس نے اسے اپنا واہمہ سمجھا تھا۔

"مسافر نہیں پلٹتے مگر دعائیں لے آتی ہیں۔"

شاہ میر نے مسکراتے ہوئے عروج کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ "میں مسافر نہیں تھا' میں اجنبی بھی نہیں تھا مگر تمہاری دعا ضرور تھا اور جب جب دعا محبت کو پکارتی ہے "اسے آنا پڑتا ہے۔ محبت کا دعا سے تو بہت پرانا رشتہ ہے۔"

وہ اپنے لہجے میں طلسم بھرے چہار سو پھونک رہا تھا۔ اور وہ اسے دیکھے جارہی تھی۔ اس کی ہنسی ایسے تھی جیسی مندر کی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔

جیسے ساون کے کن من کرتے قطرے۔

اور اسے لگا تھا کہ وہ شاہ میر نہیں تھا "اس کی دعا تھا جو پلٹ آئی تھی۔

فرحت اشتیاق

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو

شہریار خان معزز اور اعلا خاندان سے تعلق رکھنے والے بے مثال ذہانت اور سحر انگیز شخصیت کے مالک ایک مغرور شخص ہیں۔ ورلڈ بینک میں ایک اعلا عہدے پر فائز ہیں اور بیوی بچوں کے ساتھ واشنگٹن میں رہتے ہیں۔ ان کی بیوی آمنہ خوب صورت اور ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں مگر گھریلو زندگی گزار رہی ہیں۔ سکندر اور زین ان کے دو بیٹے ہیں۔ سکندر اپنے باپ کا عکس ہے اس لیے شہریار خان کی تمام تر توجہ اور امیدوں کا مرکز ہے۔ زین ذہانت میں سکندر سے کم ہے۔ باپ کے امتیازی سلوک کی وجہ سے سکندر سے خائف رہتا ہے۔

محمود خالد نے عیسائی عورت وثوریا سے شادی کی مگر دونوں میں نبھ نہ سکی اور لیزا اور سیم کی پیدائش کے بعد دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ سیم اپنے باپ کی طرح ذہین اور خوب صورت تھی۔ علیحدگی کی صورت میں اسے اپنی ماں کے ساتھ رہنا پڑا۔ لیزا محمود خالد کے پاس رہی۔ وثوریا نے ارب پتی بزنس مین سے دوسری شادی کی اور میلان چلی گئی۔ نشے کی حالت میں وثوریا کا دوسرا شوہر سیم پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد لیزا کو اپنے والدین سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ محمود خالد کو چھوڑ کر اپنی نینی کے ساتھ روم شفٹ ہو جاتی ہے۔ محمود خالد عائشہ سے دوسری شادی کر کے پاکستان شفٹ ہو جاتے ہیں۔ محمود خالد اپنا کاروبار بچانے کے لیے سیم کی شادی اس سے پندرہ سال بڑے ہاشم اسد سے کروا دیتے

مکمل ناول

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہیں۔ لیزا کو اپنے باپ اور بہنوئی کی وجہ سے پاکستانی مردوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ لیزا ایک مصورہ ہے۔ روم میں ملازمت کے سلسلے میں آئے ہوئے سکندر سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ سکندر کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوتی ہے اور اس کو پینٹ کرنا چاہتی ہے مگر سکندر انکار کر دیتا ہے۔

زین کی زندگی میں ذہین اور حسین ام مریم آتی ہے۔ زین اسے پرپوز کرتا ہے۔ شہریار خان بھی راضی ہو جاتے ہیں۔ یوں ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔ منگنی کے بعد زین ام مریم کو لے کر اپنے والدین کے پاس آتا ہے۔ وہاں ام مریم کی سکندر سے ملاقات ہوتی ہے۔ ام مریم سکندر کو بہت عزت دیتی ہے اور احترام سے پیش آتی ہے مگر سکندر اس سے بد اخلاقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس بات پر زین' سکندر سے مزید برگشتہ ہو جاتا ہے۔ اسی دوران گھر والوں کی عدم موجودگی میں سکندر ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے مگر بروقت زین اور شہریار خان کی آمد سے ام مریم بچ جاتی ہے۔

ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرنے پر شہریار سکندر کو اپنے گھر سے نکال دیتے ہیں اور اس سے ہر تعلق توڑ دیتے ہیں مگر کبھی کبھی آمنہ شہریار' سکندر کو فون کر لیتی ہیں۔ زین کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا ایک بیٹا علی ہے۔

سکندر کو احساس ہو جاتا ہے کہ لیزا بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ اسے اپنا پورٹریٹ بنانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ تصویر بنانے کے دوران دو مقامی لڑکے ان دونوں کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں مگر سکندر ان سے مقابلہ کر کے انہیں مار بھگاتا ہے۔ لیزا آہستہ آہستہ اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ سکندر روم سے ہمیشہ کے لیے چلا آتا ہے۔ آخری بار وہ لیزا کے گھر دعوت میں جاتا ہے۔ لیزا اس کے چلے جانے سے بہت غمگین ہو جاتی ہے۔ نینی کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ پاکستانی مردوں سے نفرت کرنے کے باوجود لیزا سکندر سے محبت کرنے لگی ہے۔ لیزا سیم کو فون کر کے اپنی ناکام محبت کے بارے میں بتا دیتی ہے۔

ام مریم' زین سے منگنی ختم کر کے واپس چلی جاتی ہے۔ سکندر دوسرے دن دوبارہ گھر آتا ہے مگر شہریار خان اسے دھکے دے کر نکال دیتے ہیں' اموجان رو' رو کر التجا کرتی ہیں کہ سکندر کو معاف کر دیں' وہ بہت چھوٹا ہے مگر شہریار خان ان کی ایک نہیں سنتے اور سکندر کو اپنی تمام جائیداد سے عاق کر کے' ہر رشتہ توڑ کر اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ زین غصے سے کھڑا دیکھتا رہتا ہے۔

سکندر دوہا چلا جاتا ہے لیزا کو ہر بات پر یاد کرتا ہے۔

سیم یعنی ام مریم اور لیزا یعنی کلثوم' محمود خالد کی بیٹیاں ہیں۔ ام مریم بچپن سے ہی بہت ضدی اور بدتمیز تھی۔ اپنے شوہر ہاشم سے بھی اس کا رویہ بہت خراب ہے ہاشم اسے منانے کے ہر وقت جتن کرتا رہتا ہے۔

سکندر دوہا آنے کے بعد غیر ارادی طور پر لیزا جیسے معمولات اختیار کرنے لگتا ہے۔ فلورنس میں لیزا کی نمائش پر پہنچتا ہے تو لیزا بہت حیران رہ جاتی ہے۔ بہت خوش ہو کر وہ اپنی ایگزیبیشن کا پہلا دن گزارتی ہے۔ شام کو وہ سکندر سے اپنی محبت کا اظہار کر دیتی ہے تو سکندر بہت مجبور ہو کر اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتاتا ہے کہ اس کا مردانہ وقار مضروب ہو چکا ہے۔ وہ ندامت محسوس کرتا ہے اور ہوٹل چلا جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنا ماضی یاد کرتا ہے کہ کس طرح اس کے بھائی کی منگیتر ام مریم نے ایک لڑکی ہوتے ہوئے' اسے رجھانے کی کوشش کی اور جب وہ اس کی باتوں میں نہ آیا تو انتہائی گھٹیا الزام لگا کر اسے اپنے گھر والوں کی نظروں میں ذلیل کر دیا۔

ام مریم ہاشم کی بیوی کو طلاق دلوا کر اس سے شادی کرتی ہے مگر بڑی ہوشیاری سے یہ بات چھپاتی ہے۔

سکندر نے لیزا کے لیے انگوٹھی خریدی۔ لیزا' خالد محمود کو اور سکندر اموجان کو اپنی شادی کے فیصلے سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ بہت خوش ہوتی ہیں۔ اموجان سکندر سے ملنے پر اصرار کرتی ہیں۔ وہ وعدہ کر لیتا ہے۔ لیزا کی ایگزیبیشن ختم ہو جاتی ہے۔ وہ دوہا میں پورا دن سکندر کے ساتھ گزارتی ہے۔ سکندر اس کو شاپنگ کرواتا ہے۔ دوہا سے وہ کراچی کے لیے روانہ ہوں گے۔ شہریار خان آمنہ بیگم سے لیزا کے لیے زیورات خریدنے کو کہتے ہیں تو وہ حیران رہ جاتی ہیں۔

قسط ۱۲

وہ گاڑی چلا رہا تھا۔ اسے خود پتا نہیں تھا' وہ کہاں جا رہا ہے۔ وہ تھا بھی کہ نہیں۔ کیا وہ زندہ تھا؟ کیا وہ سانس لے رہا تھا؟ کیا یہ سب کچھ سننے اور جاننے کے بعد بھی وہ زندہ تھا؟ اس کے کانوں میں آوازیں گونج رہی تھیں۔ بہت سی آوازیں۔ کسی کی خود کو پیار سے پکارتی بلاتی صدائیں۔

"تم نے میرے ساتھ کھیلنا کیوں چھوڑ دیا ہے زین؟"

"آؤ زین! ہم ساتھ مل کر کھیلتے ہیں۔"

"میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں زین۔"

"میری اسپورٹس کار تم لے لو زین۔ میرا چھوٹا بھائی اس سے کھیلے گا تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔"

اس نے خود کو بیک ویو مرر میں دیکھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا تھا' وہ رو رہا تھا۔ زین شہریار' سکندر شہریار کے لیے رو رہا تھا؟ اس کے لیے جس کے لبوں کی ہنسی اور اس کی ہر خوشی اس سے کبھی اس نے چھین لینی چاہی تھی اور پھر چھین بھی لی تھی۔ وہ جیسے کسی گہری کھائی میں گرتا چلا جا رہا تھا۔

بے خبری واقعی بہت بڑی نعمت تھی۔ اس سے نفرت کرتے ہوئے زندگی کے بارہ سال کس سہولت سے گزار دیے تھے۔ آج سب جان لینے کے بعد بارہ منٹ گزارنے مشکل ہو گئے تھے۔

"شکر! تم نے قسم تو توڑی۔ میرے پاس آئے تو سہی۔ مجھ سے بات کرنا کیوں چھوڑ دیا ہے تم نے زین؟ بھائی الگ الگ شہروں میں رہتے ہوں تو کیا ایک دوسرے سے فون پر بھی بات نہیں کرتے۔"

"مجھ سے جھوٹی محبت جتانے کے بجائے وہ کہو جو تمہارے دل میں ہے۔ ایک انتہائی حسین اور غیر معمولی ذہین لڑکی کا ساتھ تجھے کیوں مل رہا ہے۔ اسی بات کی تکلیف ہے ناں تمہیں؟"

اس کی پیار بھری صدائیں تھیں اور جواب میں اس کی اپنی نفرت سے پھنکارتی' زہریلی آواز۔ جیسے ایک فلم نگاہوں کے سامنے چل رہی تھی۔ ان دونوں بھائیوں کا بچپن' لڑکپن' نوجوانی۔ سکندر کی اس سے محبت اور جواب میں اس کی اس سے نفرت۔ بے تحاشا نفرت۔ سگے بھائی سے کوئی اتنی نفرت بھی کر سکتا ہے؟ اتنی نفرت۔ اتنا حسد۔ اتنی دشمنی۔ وہ کسی ننھے بچے کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔

نجانے کون سی شاہراہ تھی' کون سی سڑک۔ جس کے کنارے گاڑی کھڑی کر کے وہ اسٹیئرنگ پر سر ٹکا کر زار و قطار رو رہا تھا۔ باپ نے اسے صرف سکندر ہی کے بارے میں نہیں بلکہ ام مریم کے بارے میں بھی بہت کڑوی اور تلخ سچائیاں بتائی تھیں۔

وہ لڑکی جسے اس نے بے حد اور بے حساب چاہا تھا' جس کی محبت وہ آج تک اپنے دل سے نکال نہیں پایا تھا۔ اسے بھی ابھی بتایا گیا تھا کہ مریم کی وہ محبت جھوٹ تھی' دھوکا تھی' مکاری تھی۔ بہت کرب ناک تھی یہ سچائی مگر اسے ام مریم کی خود سے بے وفائی اور جھوٹ اس پل نہ یاد آ رہے تھے۔ نہ رلا رہے تھے اگر کچھ یاد آ رہا تھا تو سکندر۔ اگر کچھ رلا رہا تھا تو اس کی تباہی اور بربادی۔ سکندر اس کا اپنا' اس کا سگا بھائی۔ وہ بھائی جس کی زندگی اس کی نفرت اور دشمنی نے اجاڑ دی تھی۔ اس کا وہ بے مثال اور شان دار بھائی جس میں دنیا تسخیر کر لینے کی صلاحیتیں تھیں' اس کی حسد اور نفرت کا شکار ہو کر کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا؟

سکندر سے حسد؟ ہاں ہاں حسد۔ آج تو مان لے وہ یہ سچائی کہ سکندر سے اسے کوئی شکایت نہ تھی سوائے حسد کے۔ سکندر نے اس کا کبھی کوئی نقصان نہ کیا تھا۔

وہ اگر زیادہ ذہین تھا تو یہ اس کا قصور نہ تھا' باپ اس کی ذہانت کی وجہ سے اسے زیادہ اہمیت دیتے تھے تو یہ بھی سکندر کی غلطی نہیں تھی۔ اس کی ذہانت پر خوش ہونے اور اس کی کامیابیوں پر فخر کرنے کے بجائے اس نے بھائی سے حسد اور مقابلہ بازی شروع کردی تھی۔

وہ کبھی اعلا ظرفی کا مظاہرہ کرکے بھائی کی خود سے برتری کیوں تسلیم نہ کرسکا۔ اور اس کے بھائی کا کیریر' اس کا پروفیشن اور ان سب کے حوالے سے دیکھے اس کے خواب سب بکھر گئے اس کے حسد کی وجہ سے۔

سکندر کے ہارورڈ میں پڑھنے سے جلتا تھا ناں؟ خوش ہولے آج کہ وہ بھائی ہارورڈ سے ڈگری نہ لے سکا تھا۔ اس کی ذہانت سے حسد کرتا تھا تو جشن منالے آج کہ وہ بھائی اپنا کوئی بھی خواب پورا نہ کرسکا تھا۔ خود کو مظلوم سمجھتا کل وہ اسی بھائی سے کس نفرت سے فارم ہاؤس پر ملا تھا؟ کس دیدہ دلیری سے وہ اس کے سامنے جاکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اتنی جرأت' اتنی مجال کہاں سے آگئی تھی کہ جسے برباد کردیا اس کے سامنے نفرت سے کھڑا بھی ہوسکے؟

اس کا شدت سے مرجانے کو جی چاہ رہا تھا۔ یہ آگہی بہت کڑی تھی۔ یہ آگہی اسے اس کی اپنی بہت کریہہ اور بھیانک شکل دکھا رہی تھی۔

بارہ سال سکون سے رہ لیا مگر اب زندہ کس طرح رہ پائے گا۔ اپنے قدموں پر کھڑا کس طرح رہ پائے گا۔ خود کو بہت اچھا اور بہت مظلوم سمجھتے سمجھتے پتا چلا تھا۔ وہ دنیا کا سب سے سنگ دل اور کم ظرف انسان ہے۔

وہ اپنے ہی بھائی سے ساری زندگی حسد میں مبتلا رہا ہے۔ اس کا حسد' اس کی جلن' اجاڑ گئی اس کے بھائی کی زندگی کو۔ ساری زندگی مظلومیت کا ڈھول پیٹتا رہا تھا۔ مظلوم؟ کس بات کی مظلومیت؟

آخر اس کے ساتھ ظلم ہوا کیا تھا؟

وہ ایک بدکردار لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا اور یہ شادی ہو نہیں پائی تھی۔ یہ تھی اس کی مظلومیت؟

مظلوم حقیقت میں تھا کون؟ بدترین ظلم جس پر توڑا گیا تھا وہ کون تھا؟ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس کا دل نہیں کانپا۔ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس نے نہیں سوچا' میرا بھائی نجانے کہاں دربدر پھر رہا ہو گا؟ وہ کس حال میں ہو گا؟ میں آسائشوں میں جی رہا ہوں۔ نجانے اسے دو وقت کا کھانا بھی نصیب ہو رہا ہو گا یا نہیں؟ وہ آج بارہ سالوں بعد خوف' درد اور اذیت سے کانپ رہا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا رہا تھا۔ اس نے اپنے بھائی پر ہاتھ اٹھایا تھا' اسے بری طرح مارا تھا' گالیاں دی تھیں۔ اس کا بھائی دھکے مار مار کر ذلیل و رسوا کرکے گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ آخری وقت تک وہ چیخ چیخ کر' رو رو کر اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔

گھر سے نکال دیے جانے کے بعد وہ کہاں گیا ہو گا؟ وہ آج پورے بارہ سالوں بعد یہ بات سوچ رہا تھا۔ 31 دسمبر کی رات جب اپنے گھر کے پر آسائش کمرے میں بیٹھ کر وہ اس بدکردار لڑکی پر ٹوٹے ظلم کا ماتم منا رہا تھا تب اس کا وہ مظلوم بھائی کہاں رہا تھا؟ وہ رات اس نے کہاں بتائی تھی؟ اپنی زندگی کے گزرے بارہ سال اس نے کہاں گزارے تھے؟ کس طرح گزارے تھے' وہ کن مشکلات سے گزرا تھا۔

اسے دنیا نے کس کس طرح اپنی ٹھوکر پر رکھا ہو گا؟ بھائی کی خوشیاں' اس کے خواب چھین کر وہ خود آج کہاں کھڑا تھا؟ ماں' باپ' گھر' بہترین تعلیم' آسائشیں' کامیاب کیریر' بہترین پروفیشن' بیوی' بچہ' سکھ' چین اور اس کا بھائی؟ اس کے حسد کا نشانہ بن کر ماں' باپ سے دور' گھر سے دور نجانے کن مصائب سے گزرا تھا۔ نجانے کس طرح اس نے خود کو سنبھالا تھا۔ نجانے کیسے اپنی تعلیم پوری کی تھی۔ نجانے کس طرح وہ بالکل تنہا رہا تھا۔ سکندر کا کوئی ایک خواب بھی پورا نہیں ہوا تھا اور اس کے تمام خواب پورے ہوئے تھے۔

آج ہارورڈ کا ڈگری یافتہ زین شہریار ہے۔ سکندر شہریار نہیں۔

خوش ہو جاؤ زین شہریار! جشن مناؤ۔ تم نے سکندر کو ہرایا ہے۔ ٹھیک سوچا کرتے تھے تم' سکندر ہمیشہ ہی تو فاتح عالم نہیں ہوا کرتا۔ سکندر ہار بھی تو سکتا ہے۔ ہاں سکندر ہار سکتا ہے اگر اس کا زین شہریار جیسا حاسد اور کم ظرف بھائی ہو۔

☼ ☼ ☼

"تم میرے گھر نہیں آئیں ناں لز۔ بہت بری ہو۔"

سیم کا شام میں اس کے پاس فون آیا تھا۔ وہ آج دن بھر میں کئی بار اسے میسج کرکر کے اس سے پوچھ چکی تھی کہ وہ اس کے گھر کب آرہی ہے۔ وہ سیم کو یہ کیسے بتاتی کہ کل رات اسے پاپا نے منع کیا ہے سیم کے گھر جانے سے۔ وہ سیم کو یہ بھی نہیں بتا سکی تھی کہ کل رات محمود خالد اس کے کمرے میں اس کے پاس آئے تھے۔ انہوں نے اپنے دل کی بہت سی باتیں پہلی بار اس سے کی تھیں اور وہ ان کے سینے پر سر رکھ کر روئی بھی تھی۔

اس نے پہلی مرتبہ باپ سے اظہار محبت کیا تھا۔ ان کے لیے دل میں محبت محسوس کی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے خود کو ان کے قریب محسوس کیا تھا۔ یہ محسوس کیا تھا کہ اس کے پاپا ویسے نہیں' جیسا وہ برسوں سے انہیں سمجھتی آرہی ہے۔

وہ سیم کو بتانا چاہتی تھی کہ ان کے پاپا اندر سے ایک بڑے ہی دکھی انسان ہیں اور وہ اس سے بے حساب پیار کرتے ہیں۔ وہ اس کو ہمیشہ بہت خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کی اور سکندر کی شادی رکوانے کے لیے کچھ کرسکتے ہیں' ایسا تو اب وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی مگر سیم سے وہ یہ ساری باتیں کہہ نہیں پا رہی تھی۔ پر اتنا طے تھا' وہ پاپا کی بات مانے گی۔ وہ ان کا مان رکھے گی۔ اگر انہوں نے منع کیا ہے تو وہ سیم کے گھر نہیں جائے گی۔

"بس۔ اب میں کچھ بھی نہیں جانتی لز! تم کل میرے گھر آرہی ہو اور سکندر کو بھی وہیں بلا رہی ہو۔ میں کیا اپنے ہونے والے بہنوئی سے ملوں گی بھی نہیں؟"

اس کے یہ بتانے پر کہ وہ آج تقریباً" سارا دن سکندر کے ساتھ شاپنگ میں مصروف رہی تھی۔ سیم فوراً" بولی تھی۔ اپنے اسی مخصوص رعب بھرے انداز میں' جس سے وہ اپنی باتیں اس سے منوالیا کرتی تھی۔

"کل تو میں بالکل بھی نہیں آسکتی سیم! کل پاپا سے ملنے سکندر کی ممی آرہی ہیں لنچ پر۔" بہانہ اس کے پاس موجود تھا اور تھا بھی سچ۔ سو وہ فوراً" بولی تھی۔

"اوہ تو یہ بات ہے۔ کل تمہاری ہونے والی ساس صاحبہ تشریف لا رہی ہیں؟" سیم ہنس کر بولی تھی پُرمزاح سے انداز میں۔ مگر پھر بھی اسے اس کے لہجے میں کچھ مختلف سی بات محسوس ہوئی جسے وہ کوئی نام نہ دے سکی۔

"ہاں۔ کل لنچ پر سکندر اور اس کی ممی یہاں آرہے ہیں۔" وہ جواباً" مسکرا کر بولی تھی۔

"چلو پھر میں بھی کل وہیں آجاؤں گی۔ میں بھی تو ملوں تمہاری ساس صاحبہ اور مسٹر سکندر سے۔"

سیم شرارتی سے انداز میں بولی تھی۔ محمود خالد کو وہ گھر واپس آتے ہی سکندر کی امو جان کی کل ان کے گھر آمد کی بابت بتا چکی تھی۔

وہ اس بات کو سن کر بے حد خوش ہوئے تھے۔ شاید ان کے بھی دل میں چھپی خواہش یہی تھی کہ ان کی بیٹی کی بالکل روایتی انداز میں شادی ہو۔ انہوں نے اسی وقت ہی عائشہ کے ساتھ بیٹھ کر کل مہمانوں کی خاطر تواضع شاندار انداز میں کیے جانے کا پورا پروگرام بنا لیا تھا۔ سکندر کی والدہ کے ساتھ اور کتنے افراد نے آنا تھا وہ جانتے تھے' لیزا انہیں بتا چکی تھی مگر پھر بھی انہوں نے اہتمام اس طرح کرنا شروع کیا تھا گویا لیزا کی سسرال سے دس' پندرہ افراد نے آنا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز صبح ہی سے ان کے گھر پر اس طرح شور شرابا اور ہنگامہ تھا۔ جیسے آج ہی گھر پر لیزا کی شادی کی تقریب ہو۔ وہ باپ کی محبتوں کو محسوس کر رہی تھی' وہ ان محبتوں پر خوشی سے سرشار ہو رہی تھی اور دل میں یہ بھی سوچ رہی تھی' وہ ان سے ہمیشہ اتنی دور کیوں رہی کہ کبھی ان کے دل میں جھانک کر اپنی محبت دریافت

نہ کر سکی؟ پانچ سال پہلے تک وہ اپنے باپ ہی کے ساتھ لندن میں رہتی تھی۔ ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ کبھی ان کی محبت کو کیوں نہیں سمجھ پائی تھی؟ صبح وہ لوگ ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ سیم بھی آگئی۔ عائشہ کک اور ملازمہ کو ساتھ لگائے لنچ کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔

اس وقت وہ، محمود خالد کے ساتھ ٹیرس پر کھڑی تھی۔

سیم کی گاڑی پورچ میں رکتی دیکھ کر اگر اس کے لبوں پر مسکراہٹ آئی تھی، دل خوش ہوا تھا تو دوسری طرف محمود خالد کا سیم کو دیکھتے ہی موڈ آف ہو گیا تھا۔

وہ جیسے آج کے اس دن، اس موقع پر سیم کی اپنے گھر موجودگی کو پسند نہیں کر رہے تھے۔

"مریم کو تم نے انوائیٹ کیا ہے؟" انہوں نے قدرے ناراضی سے اسے دیکھا۔

"جی پاپا۔" وہ انہیں یہ نہیں بتا سکی تھی کہ میں نے انوائیٹ نہیں کیا۔ صرف اسے آج سکندر اور اس کی امّو جان کے آنے کا بتایا تھا۔ وہ یہاں خود آگئی ہے۔ اگر سیم آج یہاں آگئی تھی تو اس میں برائی کیا تھی؟ وہ باپ کی ناراضی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"پاپا! آپ کو کیا سیم کا آنا اچھا نہیں لگا؟ وہ میری اکلوتی بہن ہے پاپا۔ میں چاہتی ہوں۔ میری شادی سے جڑے ہر مقام پر وہ میرے ساتھ ہو۔ مجھے سیم کا اپنے پاس موجود ہونا اچھا لگے گا پاپا۔" وہ آہستگی سے بولی۔ اس کے لفظوں میں بہن کے لیے والہانہ پیار تھا۔

محمود خالد بغور اسے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے جیسے خود کو کچھ کہنے سے روکا تھا۔ پھر جیسے جملے پر نظر ثانی کر کے نرمی سے بولے۔

"ٹھیک ہے بیٹا! جیسی تمہاری خوشی۔" اسے یہ جواب دیتے ہی وہ فوراً" وہاں سے ہٹے تھے۔ وہ ٹیرس سے جا رہے تھے۔ ایک سیکنڈ حیرت سے انہیں دیکھتے رہنے کے بعد وہ بھی وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ وہ سیم سے ملنے نیچے جا رہی تھی۔ مگر سیم اوپر ہی چلی آئی تھی۔

"چلو، تمہارے کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔"

اسے گلے لگا کر پیار کرنے کے بعد سیم اس سے بولی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوب صورت سا شاپنگ بیگ تھا۔ وہ سیم کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔

سیم نے اس کے کمرے کو بہت غور سے دیکھا تھا جیسے گھر کے اس کمرے میں پہلی مرتبہ آئی ہو۔

"یہ روم تم نے خود سیٹ کیا ہے ناں؟" چاروں طرف نگاہیں گھماتے ہوئے سیم نے اس سے پوچھا۔ اس کی نگاہوں میں کمرے کی آرائش و سجاوٹ کے لیے ستائش کی تھی۔

"نہیں، میرے آنے سے پہلے ہی پاپا نے تیار کروا کر رکھا تھا۔" سیم نے ایک پل کے لیے اسے بغور دیکھا بہت سنجیدہ نگاہوں سے۔ پھر وہ مسکرا دی تھی۔

"چلو، انہیں زندگی میں پہلی بار اپنی بیٹیوں کے لیے کچھ کرنے کا خیال تو آیا۔" سیم کا لہجہ طنزیہ و استہزائیہ تھا۔

"پاپا بہت بدل گئے ہیں سیم! ہم انہیں جہاں جیسا سمجھتے ہیں۔ وہ اب ویسے بالکل بھی نہیں ہیں۔ ہم دونوں کے ساتھ بچپن میں جو کچھ بھی ہوا۔ اس پر وہ بہت گلٹی فیل کرتے ہیں۔"

وہ بے اختیار سنجیدگی سے بولی۔ اس کے لہجے میں باپ کی محبت تھی۔

"دو دن ابھی تمہیں یہاں آئے ہوئے ہیں ناں..... ذرا ٹھہر جاؤ۔ اتنی جلدی کوئی رائے مت قائم کرو۔ میں آج صرف آئی ہی اس لیے ہوں کہ پاپا سکندر یا اس کی ممی کے ساتھ کوئی الٹی سیدھی بات نہ کر سکیں۔"

"ایسا کچھ نہیں ہو گا سیم! تم فکر مت کرو۔" وہ دونوں ساتھ بیڈ پر بیٹھ گئی تھیں۔

"کیا پہن رہی ہو تم آج!" سیم نے گفتگو کا موضوع تبدیل کیا تھا۔ وہ مسکرا کر دلچسپی سے پوچھ رہی تھی۔

"شلوار قمیص۔ بلکہ چوڑی دار ہے، شلوار نہیں۔ کل شام ہی آنٹی ایمر جنسی میں میرے لیے خرید کر لائی ہیں۔ مجھے خود تو یہاں کی مارکیٹس کا زیادہ آئیڈیا نہیں ہے۔ کل میں نے اور سکندر نے برائیڈل ڈریسز خریدے تھے تو اس کی ممی ہمارے ساتھ تھیں۔"

وہ فوراً ہی اٹھی تھی تاکہ وارڈ روب سے نکال کر سیم کو اپنا آج پہنا جانے والا جوڑا دکھا سکے۔

"تم نے برائیڈل ڈریس بھی خرید لیے؟ بڑی اسپیڈ میں ہو تم دونوں۔ آج ہی نکاح مت پڑھوالینا۔"

وہ وارڈ روب سے ہینگر سمیت جوڑا نکال رہی تھی تب اس نے سیم کی ہنستی ہوئی آواز سنی۔ وہ مسکراتے ہوئے واپس بیڈ پر آگئی تھی۔

"یہ پہن رہی ہوں میں آج۔ شرارہ اور غرارہ تمہیں ابھی دکھاتی ہوں۔"

وہ بیڈ پر سیم کے سامنے پھر بیٹھ گئی تھی۔ بہت خوش ہو کر، مسکرا کر وہ سیم کو اپنا جوڑا دکھا رہی تھی۔ براؤن اور شاکنگ پنک رنگوں کے امتزاج والا بہت خوب صورت ڈریس عائشہ اس کے لیے خرید کر لائی تھیں۔

"تم یہ پہنو گی؟ اتنے فضول اور بورنگ کپڑے؟ حد کرتی ہو ناں۔" سیم نے برا سا منہ بنا کر جوڑے کو فوراً" ریجیکٹ کر دیا تھا۔

"اچھا خاصا خوب صورت تو ہے سیم۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے ایسے بورنگ کپڑے پہننے کی۔ اپنی ساسو ماں اور ہونے والے شوہر صاحب کا دل خوش کرنے کو تمہیں ایسٹرن Looks چاہئیں مجھے پتا تھا۔ اس لیے میں نے تمہارے لیے کل رات ہی جا کر یہ ساڑھی خریدی تھی۔ اسے پہن کر تم غضب ڈھاؤ گی۔ ساس صاحبہ آج ہی شادی کی ڈیٹ طے کر کے نہ جائیں تو کہنا۔"

سیم نے پاس رکھا شاپنگ بیگ اٹھایا تھا۔ اس نے باکس کھول کر اس میں سے ساڑھی باہر نکالی تھی۔ وہ لیمن کلر کی شیفون کی پلین ساڑھی تھی۔ جس کے ساتھ خوب صورت کام بنا سلیولیس بلاؤز انتہائی مختصر سا تھا۔

"تھینکس سیم! تم میرے لیے ساڑھی خرید کر لائی ہو۔ مگر پلیز مائنڈ مت کرنا۔ میں یہ نہیں پہن سکتی۔ بہت بولڈ ہے یہ۔"

اس نے آہستگی سے انکار میں سر ہلاتے ہوئے سیم سے کہا۔

"پاگل! آج کل پاکستان میں سب لڑکیاں اسی طرح کے کپڑے پہنتی ہیں۔ اس ساڑھی میں تمہارا فگر کیا غضب کا لگے گا۔ پوری قیامت لگو گی تم۔"

سیم اس کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر بات منوانے والے انداز میں بولی۔ مگر اس کا اس ساڑھی کو پہننے کا قطعاً" کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"آئم سوری سیم! میں یہ نہیں پہن سکتی۔ میں یہ والا ڈریس ہی پہن لوں گی۔"

وہ سیم کی ناراضی سے ڈر کر آہستگی سے بولی تھی۔ اسے دل ہی دل میں سیم کے اوپر تھوڑی سی کوفت بھی ہوئی تھی۔ آخر اس نے اسے کب اس طرح جسم کو نمایاں کرتے کپڑے پہنے دیکھا تھا جو اس کے لیے اتنی پتلی سی تھرو ساڑھی اس قدر مختصر بلاؤز کے ساتھ خرید لائی تھی۔ وہ سیم کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اس کا اس ساڑھی کو پہننے کا قطعاً" کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ سیم بہت شوق اور محبت سے یہ تحفہ اس کے لیے لائی تھی، شاید ہاشم سے شادی کے بعد وہ اس طرح کے بولڈ کپڑے پہننے لگی ہو گی مگر وہ تو ایسا نہیں کر سکتی تھی ناں۔ سیم کے چہرے پر ہلکی سی ناراضی آگئی تھی۔

ابھی وہ دونوں شاید اس موضوع پر مزید بھی کچھ بات کرتیں کہ اس کے موبائل پر سکندر کی کال آنے لگی۔ موبائل بیڈ پر ہی پڑا تھا اور اتفاقاً" جہاں سیم بیٹھی تھی وہیں رکھا تھا۔ اس کے فون اٹھانے سے پہلے سیم نے موبائل اٹھا لیا تھا۔ سکندر کالنگ۔ سیم نے با آواز بلند بولا تھا۔ وہ موبائل سیم کے ہاتھ سے لینے لگی تھی۔

"لاؤ مجھے دو سیم۔" سیم اسے چھیڑنے کو موبائل اپنے دوسرے ہاتھ میں لے گئی تھی۔

"یہ کال تو میں ریسیو کروں گی ناں ڈیئر۔ آخر اپنے Brother in law (بہنوئی) سے سلام دعا تو کرنی ہے ناں مجھے۔" سیم شرارت بھرے انداز میں بولتی کال ریسیو کرنے لگی تھی۔

”سیم! پلیز مجھے بات کرنے دو۔ اسے کوئی ضروری بات کرنی ہوگی۔“ وہ موبائل سیم سے لینے کی کوشش کرتے ہوئے لجاجت سے بولی۔

”یہ لو کرو بات۔“ آخر سیم نے اسے ہنستے ہوئے موبائل دے دیا۔ اس دوران موبائل مسلسل بجتا رہا تھا کہ اسے چھیڑنے کے باوجود سیم نے کال ریسیو نہیں کی تھی۔ موبائل ہاتھ میں آتے ہی اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔

”ہیلو! ہاں سکندر۔“ سیم شرارتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے بالکل برابر میں اس سے چپک کر بیٹھ گئی۔

”میں نے سوچا، تمہیں بتادوں، ہم تمہارے گھر کے لیے نکلنے والے ہیں۔ میں امو جان کا انتظار کر رہا ہوں۔ جیسے ہی وہ آئیں گی، ہم تمہارے گھر کے لیے نکل جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ سیم کی موجودگی کی وجہ سے سنبھل کر بولی۔ سیم اس کے ساتھ چپک کر بیٹھی فون پر سکندر کی باتیں سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ ساتھ ہی اسے چھیڑنے، زچ کرنے والے انداز میں دیکھ کر مسکرا بھی رہی تھی۔

”اور کچھ بھی نہیں کہو گی؟“ وہ ہنس کر بولا۔

”کیا؟“

”کچھ بھی..... ”آئی لو یو“ ہی کہہ دو۔ مجھے اچھا لگے گا۔“

سیم نے منہ پر ہاتھ رکھ کر جیسے اپنا قہقہہ روکا تھا۔ وہ آواز گھونٹ کر بری طرح ہنس رہی تھی۔ وہ سیم کو گھورتے ہوئے، اسے دھکا دے کر اس کے پاس سے اٹھی۔ بیڈ سے کچھ دور آ گئی اور فون پر بہت آہستہ سے بولی۔

”آئی لو یو! بہت بہت، بہت محبت کرتی ہوں میں تم سے۔“

وہ سیم سے خاصی دور ڈریسنگ ٹیبل کے پاس کھڑی تھی۔ قصداً“ اس نے اپنا رخ بھی سیم کی طرف سے موڑ لیا تھا۔ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

”میرے لیے پینٹنگ اور روما چھوڑ سکتی ہو..ں؟“ وہ جیسے اس وقت فارغ بھی تھا اور اچھے موڈ میں بھی۔

”میں تمہارے لیے. ب کچھ چھوڑ سکتی ہوں۔“

”پھر تم پینٹنگ، روما اور مجھے کبھی بھی مت چھوڑنا۔ اب کی بار ٹریوی فاؤنٹین کے پاس بٹھا کر میری پینٹنگ بنانا۔“ وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنسی۔

”ٹھیک ہے سینور سکندر!“ وہ سکندر سے بات کرتے ہوئے سیم کو بالکل بھول گئی تھی۔ فون بند کرنے کے بعد وہ واپس گھومی اور اس کی سیم پر نظر پڑی تو اسے سیم کے چہرے پر عجیب ناقابل فہم تاثر نظر آیا۔ وہ بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا اور اس کی آنکھیں؟

وہ سیم کی آنکھوں کے تاثر کو کوئی نام نہ دے سکی۔ پتا نہیں، سیم کی آنکھوں کا تاثر ایسا کیوں لگ رہا تھا، جیسے وہ اس وقت بہت غصے میں تھی۔ وہ بالکل بھی خوش نہیں تھی۔

”کیا ہوا سیم؟“ تعجب سے بولتی وہ اس کے پاس آ گئی۔

”ہو گیا تمہارا اظہار محبت؟“ سیم نے فوراً“ ہی اپنا موڈ تبدیل کیا اور ہنس کر پوچھا۔

”ہاں..... ! اور تم کتنی بد تمیز ہو۔ مجھے بات نہیں کرنے دے رہی تھیں۔“ سیم کو ہنستا دیکھ کر وہ بھی ہنسی تھی۔

سیم کی نگاہوں کا وہ پل بھر کا عجیب سا تاثر فوراً“ ہی اس نے سر جھٹک کر ذہن سے محو کیا تھا۔

”اور کیا فرما رہے تھے مسٹر سکندر؟“ سیم کا انداز اب پھر اسے چھیڑنے والا تھا۔

”وہ لوگ نکلنے والے ہیں تھوڑی دیر میں۔“

”پھر تم تیار ہو جاؤ جلدی سے۔“ وہ سر ہلاتی فوراً“ بیڈ سے اٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

آمنہ، لیزا کے گھر جانے کے لیے بالکل تیار تھیں۔

پہلے انہیں سکندر کے ہوٹل جانا تھا۔ وہاں سے پھر ان دونوں کو ساتھ لیزا کے گھر کے لیے روانہ ہونا تھا۔ شہریار خان نے بہت جوش و خروش سے لیزا کے گھر جانے کے لیے آمنہ کی تیاری کروائی تھی۔ آج اپنی ہونے والی بہو کے گھر بھجوانے کے لیے خریدی گئی تمام چیزوں میں ان کی اور آمنہ کی مشترکہ پسند اور مرضی شامل تھی۔

وہ خود آمنہ کے ساتھ پہلے ایک بوتیک اور پھر جیولر کے پاس گئے تھے۔ انہوں نے اور آمنہ نے باہمی پسند کے ساتھ لیزا کے لیے منگنی کا جوڑا اور انگوٹھی خریدی تھی۔ شہریار خان نے پھلوں اور مٹھائیوں کے ٹوکرے خود اپنی نگرانی میں تیار کروائے تھے۔ شہر کی بہترین دکان سے لیزا کے لیے پھولوں کا زیور منگوایا تھا۔ بہت سارے ہار پھول، کنگن اور گجرے اضافی بھی تھے۔ یوں جیسے انہوں نے اپنی ہونے والی بہو کے گھر کو پھولوں سے بھر دینا تھا۔ وہ آج ہر چیز بہترین اور شاندار چاہتے تھے۔ وہ سکندر سے جو کچھ نہیں کہہ سکتے تھے، کم از کم ان کی بھجوائی چیزوں سے جھلکتی محبت ہی کہہ جائے۔ انہوں نے آمنہ کو تاکید کی تھی کہ وہ لیزا کے گھر والوں کو کل یا پرسوں۔ ان کے گھر کھانے کی دعوت دے کر آئیں۔

وہ لوگ آتے ہیں یا نہیں، سکندر ان لوگوں کو آمنہ کی دعوت قبول کرنے دیتا ہے یا نہیں، مگر وہ لیزا کے گھر والوں کو پھر بھی اپنے گھر مدعو کرنا چاہتے تھے۔ سکندر انہیں اس بات کی کبھی بھی اجازت نہیں دے سکتا تھا، ورنہ آج لیزا کے والد سے اس کا ہاتھ اپنے بیٹے کے لیے مانگنے وہ خود جاتے۔ آمنہ تیار تھیں۔ وہ بہت خوب صورت اور بہت خوش بھی لگ رہی تھیں۔

"میرا خیال ہے اب تمہیں نکل جانا چاہیے۔" گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے انہوں نے آمنہ سے کہا۔

"زین ابھی تک گھر نہیں آیا شہریار۔" آمنہ نے قدرے تشویش سے کہا۔

"اس کا فون آ گیا تھا آمنہ! وہ شاید شام تک گھر واپس آئے گا۔"

زین کل ان کے چونکا دینے اور دل دہلا دینے والے انکشافات سننے کے بعد سے گھر سے غائب تھا۔ اس کا موبائل بھی بند تھا۔ انہوں نے آمنہ اور نوریہ کی تسلی کے لیے ان دونوں کو کل یہ کہہ دیا تھا کہ کسی کیس کے سلسلے میں زین کو ایمرجنسی میں لاہور جانا پڑ گیا ہے۔ مصروفیت بھی زیادہ ہے اور کیس کی نوعیت بھی حساس ہے، اس لیے اس نے سیل آف کر رکھا ہے۔ زین جہاں کہیں بھی تھا، خیریت سے تھا۔ اتنا ان کے دل کو یقین تھا۔ وہ اپنے ماں باپ سے بے تحاشا محبت کرتا تھا اور خود کو کوئی نقصان وہ اس لیے نہیں پہنچا سکتا تھا کہ اسے اپنے بوڑھے ماں باپ کو ایک مرتبہ پھر اولاد کا غم نہیں دینا تھا۔

زین کی تکلیف کا انہیں اندازہ تھا۔ وہ اس وقت کس کرب، کس احساس ندامت اور احساس گناہ سے گزر رہا تھا، وہ اندازہ کر سکتے تھے۔ کئی سال انہوں نے اسے اس احساس گناہ سے بچانے کے لیے سچ نہیں بتایا مگر اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ زین کو سچائی پتا چلے۔ اپنی بھی اور سکندر کی بھی۔ زین کو احساس گناہ میں مبتلا کروانا ان کی منشا نہ تھی، مگر سکندر کی بے گناہی کسی اور طرح وہ بتا ہی نہیں سکتے تھے سوائے اس کے کہ زین کو ام مریم کی ساری حقیقت بتا دیں۔

وہ جانتے تھے نوریہ، زین کے کل سے اب تک گھر نہ آنے سے پریشان ہے۔ آمنہ کا دل بھی بے چین تھا۔ انہوں نے سوچا تھا آمنہ لیزا کے گھر جانے کے لیے نکل جائیں، پھر وہ زین کو تلاش کریں گے۔ تمام سامان گاڑی میں رکھوایا جا چکا تھا۔ وہ پورچ میں آمنہ کے ساتھ خود چل کر آئے تھے۔ انہوں نے اطمینان کے لیے ایک بار پھر گاڑی میں رکھی تمام اشیا کا جائزہ لیا تھا۔ کہیں کوئی ٹوکرا، کوئی تھال گھر پر نہ رہ گیا ہو۔ اسی وقت پورچ میں زین کی گاڑی آ کر رکی۔ انہوں نے بے اختیار اللہ کا شکر ادا کیا۔

اللہ کا لاکھ لاکھ بار شکر تھا، زین بخیریت گھر واپس آ گیا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید پڑا ہوا تھا۔ اس کے

چہرے پر مردنی سی چھائی تھی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں، وہ بہت رویا تھا۔ وہ بہت تھکے ہوئے، بہت نڈھال قدموں سے چلتا گاڑی سے اترا۔ آمنہ جانے کی خوشی اور جوش میں تھیں۔ انہوں نے زین کی حالت پر زیادہ توجہ نہ دی۔

"شکر ہے زین! تم واپس آ گئے۔ اس طرح کہے سنے بغیر تو نہیں جانا چاہیے تھا بیٹا! یہ کیا کہ خالی اپنے پاپا کو فون کر کے بتا دیا اور چلے گئے۔ نوریہ کا سوچنا چاہیے تھا تمہیں۔ بچی بے چاری۔۔۔ تمہاری فکر میں اس نے صبح سے ڈھنگ سے کچھ کھایا تک نہیں ہے۔"

زین خاموشی سے ماں کو دیکھ رہا تھا جیسے اس میں کچھ کہنے سننے کی سکت ہی نہ ہو۔ زین کو آمنہ کے مزید سوال و جواب سے بچانے کے لیے انہوں نے فوراً" ہی انہیں وقت کا احساس دلایا تھا۔

"آمنہ! دیر ہو رہی ہے۔ وہ لوگ انتظار کر رہے ہوں گے۔"

آمنہ کو بھی فوراً" ہی وقت کا احساس ہوا تھا۔ وہ فوراً" گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ وہ کھڑے آمنہ کو جاتے دیکھتے رہے۔ گاڑی گیٹ سے باہر نکل گئی اور چوکیدار نے گیٹ بھی بند کر دیا، تب وہ واپس گھومے۔ اب زین وہاں پر نہیں تھا۔ وہ نجانے کس لمحے گھر کے اندر جا چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ سب تمام تر تیاریوں اور انتظامات کے ساتھ سکندر اور آمنہ کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ سکندر اپنی گاڑی میں آ رہا ہے اور اس کی امو جان اپنی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ۔ سکندر کی انا اور خود داری نے باپ کے گھر کے دروازے تک جانا گوارا نہیں کیا تھا اور اس کی امو جان نے اسے ایسی کسی آزمائش میں ڈالا بھی نہیں تھا۔

انہوں نے خود ہی یہ طے کیا تھا کہ وہ پہلے سکندر کے ہوٹل پہنچیں گی اور وہاں سے وہ دونوں اپنی اپنی گاڑیوں میں لیزا کے گھر جائیں گے۔

محمود خالد تھوڑی تھوڑی دیر بعد عائشہ سے مہمانوں کی تواضع اور لنچ کی تیاری کے حوالے سے مختلف باتیں پوچھ کر اپنی تسلی کر رہے تھے۔ عائشہ ان کی خوشی اور جوش و خروش کو محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر انہیں اطمینان دلا رہی تھیں کہ سب انتظامات مکمل ہیں۔

"لگتا ہے، وہ لوگ آ گئے ہیں۔"

محمود خالد کے جیسے کان گیٹ پر لگے تھے۔ گیٹ پر گاڑیوں کے ہارن اور پھر گیٹ کھولے جانے کی آواز انہوں نے اندر بیٹھے بیٹھے سن لی تھی۔ انہوں نے عائشہ کو بھی اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ مہمانوں کا گیٹ پر جا کر استقبال کرنا چاہتے تھے۔ سیم نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اسے تیار سیم نے کیا تھا۔ اس نے اس کا میک اپ کیا تھا اور اسے کون سی جیولری پہننی چاہیے، یہ انتخاب بھی سیم نے ہی کیا تھا۔

"تم بیٹھی رہو۔" سیم اس سے بولی۔

"مجھے پتا ہے۔ میں بیٹھی ہوئی ہی ہوں۔"

میں نے سوچا ایکسائٹمنٹ میں کہیں ساس صاحبہ کا استقبال کرنے تم بھی گیٹ پر نہ چل پڑو۔" سیم اسے چھیڑ رہی تھی۔ جواباً" مصنوعی خفگی سے اس نے سیم کو گھورا، یہ تو سچ تھا وہ واقعی بے تحاشا خوش تھی۔

☼ ☼ ☼

سکندر اور آمنہ کی گاڑیاں پورچ میں آگے پیچھے رکیں۔ وہ گاڑی سے اتر کر ماں کے پاس آ گیا۔ محمود خالد اور عائشہ اندر سے نکل کر روش پر چلتے نظر آ رہے تھے۔ وہ دونوں پورچ ہی کی طرف ان کے استقبال کے لیے آ رہے تھے۔ آمنہ ڈرائیور سے گاڑی میں سے پھلوں اور مٹھائیوں کے ٹوکرے نکلوا رہی تھیں۔

"امو جان! یہ سب کیا ہے؟" وہ ناپسندیدگی سے فوراً" بولا۔

"کیا بہو کے گھر رشتہ پکا کرنے خالی ہاتھ آ جاتی؟" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر قدرے رعب سے بولیں۔

ڈرائیور اب گاڑی میں سے ایک بڑا سا چاندی کا تھال نکال رہا تھا۔ جس میں پھولوں کا سارا زیور بڑی خوب صورتی سے سجا تھا۔ گلاب اور موتیا کے کنگن، ہار، کانوں کی بالیاں، انگوٹھی، پھولوں سے بنا ٹیکا اور ان پھولوں کے زیوروں کے بالکل درمیان نیلے رنگ کی مخملیں ڈبیا جس کے اندر منگنی کی انگوٹھی تھی۔

"پہلے یہ تھال اندر لے جا کر احتیاط سے رکھو۔ پھر یہ ٹوکرے اندر پہنچانا۔" وہ قصداً" اسے نظر انداز کر کے ڈرائیور سے مخاطب تھیں۔

ڈرائیور نے گاڑی کی پچھلی سیٹ سے دو بڑے بڑے ڈبے بھی نکالے۔ ان ڈبوں میں لیزا کے لیے خوب صورت ملبوسات تھے۔

"آپ مجھ سے کہہ دیتیں۔ جو آپ لانا چاہ رہی تھیں، میں خرید کر لے آتا۔" وہ بے تحاشا الجھن اور غصہ محسوس کر رہا تھا۔

"یہ سب چیزیں میں اپنی بہو کے لیے لائی ہوں۔ تمہارے لیے کچھ لاتی تو تم اعتراض کرتے۔"

وہ ماں سے اختلاف کرتا، اپنی ناراضی ظاہر کرتا، ان سے مزید بحث کرنا چاہتا تھا، مگر محمود خالد اور عائشہ کو دیکھ کر اسے چپ ہونا پڑا۔ بہت گرم جوشی سے مسکراتے ہوئے محمود خالد اور عائشہ اس کے اور آمنہ کے پاس آ کر رکے تھے۔

"السلام علیکم۔" محمود خالد نے آمنہ کو سلام کیا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کے چہروں پر ایسا تاثر آیا تھا، جیسے ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ چند سیکنڈ ان دونوں نے ایک دوسرے کو خاموشی سے پہچاننے میں لگائے تھے۔

"محمود صاحب آپ؟" چند سیکنڈز بعد اس نے اپنی امو جان کی حیرت میں ڈوبی آواز سنی۔ کیا اس کی امو جان، لیزا کے پاپا کو پہلے سے جانتی تھیں؟

"مسز شہریار؟" محمود خالد کے منہ سے بھی حیرت زدہ سے انداز میں نکلا تھا۔ صرف سکندر ہی نہیں، عائشہ بھی آمنہ اور محمود خالد کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

"لیزا آپ کی۔۔۔" آمنہ جیسے شدید حیرت کے عالم میں تھیں۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

"لیزا میری چھوٹی بیٹی ہے۔" محمود خالد جیسے بمشکل بول سکے تھے۔ وہ ان دونوں کے چہروں کو تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے یہ کوئی عجیب و غریب سی صورت حال تھی، جیسے وہ دونوں، جس بھی حوالے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے، کم از کم یہاں اس جگہ اس حیثیت میں ایک دوسرے سے ملنے کی ہرگز ہرگز امید نہ رکھتے تھے۔

پیچھے ان کا ڈرائیور بھاگا بھاگا ٹوکرے لے جا لے جا کر اندر رکھ رہا تھا اور یہاں یہ چاروں اسی طرح کھڑے تھے۔ محمود خالد جیسے کسی ایسی پریشانی میں آئے تھے کہ انہیں مہمانوں کو اندر لے جا کر بٹھانا بھی بھول گیا تھا۔ عائشہ نے صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اس تکلیف دہ اور عجیب و غریب خاموشی کو توڑا۔

"آپ لوگ اندر چل کر تو بیٹھیں۔" عائشہ مسکراتے ہوئے، مہمان نوازی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

"ہاں ہاں پلیز! آپ لوگ اندر چلیں۔" محمود خالد جیسے بدقت مسکرائے تھے۔

وہ اپنی ماں اور لیزا کے پاپا کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ محمود خالد اور عائشہ کی موجودگی میں وہ آمنہ سے کچھ پوچھ بھی نہیں پا رہا تھا، مگر اندر ہی اندر اس کا دل بری طرح پریشان تھا۔

اگر محمود خالد اس کی امو جان یا اس کے پاپا کے کوئی پرانے جاننے والے تھے تو اس میں پریشان ہونے والی کیا بات تھی؟ آخر اس کی امو جان اس طرح سے پریشان کیوں ہو گئی تھیں؟ یہاں آنے سے پہلے اور یہاں پہنچنے کے بعد جو جوش خروش اس نے ان کے چہرے پر دیکھا تھا وہ محمود خالد کو دیکھتے ہی ٹینشن، فکر اور پریشانی میں کیوں بدل گیا تھا؟

وہ چاروں اندر آ گئے۔ عائشہ نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ محمود خالد جیسے اپنی پریشانی چھپانے کو زبردستی مسکرا رہے تھے۔

"آپ لوگ پاکستان کب آئے؟"

"کافی عرصہ ہو گیا۔ شہریار کی ریٹائرمنٹ کے بعد ہی ہم واپس آ گئے تھے۔" آمنہ سنجیدگی سے بولیں۔ وہ خاموشی سے آمنہ اور محمود خالد کو دیکھ رہا تھا۔

"سکندر آپ کا بڑا بیٹا ہے؟" محمود خالد کی آنکھوں میں اسے اپنی امو جان سے بھی زیادہ پریشانی نظر آ رہی تھی۔ وہ کیوں پریشان تھے آخر؟ صرف وہی نہیں، عائشہ بھی آمنہ اور محمود خالد کے رویے اور انداز پر حیران سی بیٹھی تھیں۔

"جی! زین سے تقریباً" ایک سال بڑا ہے۔"

تو کیا وہ زین کو بھی جانتے تھے؟ وہ بے حد حیران تھا۔ مگر موقع اور صورت حال ایسی نہ تھی کہ وہ ماں سے کچھ پوچھ پاتا۔

"زین بھی پاکستان ہی میں ہے؟" محمود خالد نے قدرے جھجک کر پوچھا۔

"جی۔" آمنہ آہستگی سے بولیں۔ پھر جیسے کسی ایسی بات کی وضاحت کرنے لگیں جو یہاں پر ان سے کسی نے بھی پوچھی نہیں تھی۔

"شادی ہو گئی ہے زین کی۔ ایک بیٹا ہے اس کا۔"

"اچھا! ماشاء اللہ۔" یہ پہیلیوں کی طرح الجھی باتیں اسے بری طرح الجھا رہی تھیں۔ قبل اس کے کہ وہ مزید الجھتا ڈرائنگ روم میں ایک ہینڈسم اور باوقار سا مرد داخل ہوا۔ اس نے بہت گرم جوشی سے سب کو سلام کیا۔

"السلام علیکم۔" محمود خالد اور عائشہ اسے دیکھ کر مسکرائے۔

"وعلیکم السلام۔ آؤ ہاشم۔" محمود خالد نے مسکرا کر اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ ساتھ ہی وہ فوراً" آمنہ کو بتانے لگے۔

"یہ ہاشم اسد ہیں۔ میرے داماد۔"

تو یہ لیزا کا بہنوئی تھا۔ سیم کا شوہر۔ اس نے ہاشم کو گرم جوشی سے اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو خوش اخلاقی سے مسکرا کر فوراً" صوفے سے کھڑا ہو گیا۔ ہاشم گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملا رہا تھا اس نے بھی جواباً" خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

"آپ کا غائبانہ تعارف تو انکل نے کرا دیا تھا سکندر!" ہاشم مسکرا کر بولتا اس کے برابر ہی میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اسلام آباد سے کب آئے ہاشم؟" عائشہ نے اس سے مسکرا کر پوچھا۔

"بس ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی ہے آنٹی۔ ویسے تو مجھے آفس جانا تھا، لیکن میں نے سوچا، آج لیزا کا رشتہ طے ہو رہا ہے، مجھے یہاں آ جانا چاہیے۔ مجھے یہاں دیکھ کر انکل بھی خوش ہو جائیں گے اور میری بیگم بھی۔" وہ ہنس کر بولا۔

"پتا نہیں ہے بیگم صاحبہ کو میں یہاں آنے والا ہوں۔ حیران رہ جائے گی مجھے دیکھ کر۔" عائشہ اور ہاشم مسکرا رہے تھے۔ محمود خالد اور آمنہ اس طرح چپ سے تھے، جیسے اندر ہی اندر کوئی پریشانی لاحق ہو۔ وہ دونوں بظاہر اس پریشانی کا اظہار نہیں کر رہے تھے، مگر ان کی آنکھوں سے پریشانی چھلک رہی تھی۔

"محمود صاحب! اگر آپ کی اجازت ہو تو یہ پھول اور رنگ میں لیزا کو پہنانا چاہتی ہوں۔"

آمنہ نے محمود خالد کو مخاطب کیا۔ وہ بظاہر مسکرا رہی تھیں۔ ہاشم مسکراتا ہوا اس گفتگو پر دھیان دے رہا تھا۔ سب کی نظریں سامنے رکھے چاندی کے تھال پر تھیں۔

"کلثوم اب آپ کی ہی امانت ہے مسز شہریار! جو آپ کی خوشی ہے، وہی میری بھی خوشی ہے۔" محمود خالد جواباً" ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "کلثوم" پر آمنہ حیران ہوئی تھیں۔ وہ محمود خالد سے پہلے بھی مل چکا تھا۔ جانتا تھا، وہ اسے لیزا نہیں، کلثوم کہتے ہیں۔ آمنہ کی حیرت دیکھ کر عائشہ نے جلدی سے وضاحت کی۔

"محمود، لیزا کو کلثوم کہتے ہیں۔"

"اچھا اچھا۔" آمنہ نے جیسے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ جبراً" مسکرانے کی مسلسل کوشش صرف

وہی نہیں، محمود خالد بھی کرتے نظر آرہے تھے۔

"میں لیزا کو بلاتی ہوں۔" محمود خالد نے عائشہ کو اشارہ کیا تو وہ فورا" صوفے پر سے اٹھیں۔

"میری خواہش ہے، ہم شادی کی تاریخ بھی آج ہی طے کرلیں۔" آمنہ نے محمود خالد سے کہا۔

ماں کے چہرے پر اس نے یہ تاثر دیکھا، جیسے وہ لیزا کے پاپا سے پوچھ رہی ہوں کہ کیا اب یہ شادی ہوسکے گی؟ اس نے لیزا کے پاپا کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر جیسے ایک خاموش بے بسی سی تھی۔ جیسے وہ بھی نہیں جانتے تھے کہ اب یہ شادی ہوسکے گی یا نہیں۔

آخر معاملہ تھا کیا؟

وہ بری طرح پریشان ہو رہا تھا۔ ہاشم بھی ابھی آیا تھا۔ وہ کچھ سمجھ نہیں سکا تھا، مگر وہ اس خاموش اور الجھی ہوئی صورت حال پر حیران پریشان سا تھا۔

اسی وقت عائشہ ڈرائنگ روم میں واپس آئیں ان کے پیچھے پیچھے لیزا تھی۔ لیزا کو دیکھتے ہی وہ جیسے ساری کوفت بھولنے لگا۔ اسے اور لیزا کو ایک ہونے سے کون روک سکتا ہے؟ وہ کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ خوب صورت لباس پہنے اور سر سے دوپٹا لیے۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"السلام علیکم امو جان!" لیزا نے ایک نظر اسے دیکھا۔ سب کی موجودگی کی وجہ سے وہ اسے دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں مسکرائی نہیں تھی۔ وہ اسے دیکھے جارہا تھا۔

"وعلیکم السلام بیٹا!" آمنہ کا انداز محبت سے بھرپور تھا۔ وہ جانتا تھا بظاہر اس کی طرف نہ دیکھنے کے باوجود بھی لیزا اس کی نگاہوں کی پسندیدگی اور تعریف کو پوری طرح محسوس کررہی تھی۔ لیزا کے پیچھے پیچھے اس کی بہن ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

"السلام علیکم۔" اندر داخل ہوتے ہی اس نے سلام کیا تھا۔ اور سلام کرتے ہی وہ ٹھٹک کر اپنی جگہ پر رک گئی تھی۔ وہ لوگ بری طرح چونکے۔

ام مریم اور سکندر۔ آمنہ کے چہرے پر عجیب سی پریشانی پھیلی تھی۔ محمود خالد بھی متفکر سے نظر آئے تھے۔

"تم؟" مریم نے اسے شدید حیرت کے عالم میں دیکھتے ہوئے "تم" کہا تھا۔

وہ اس ناگن کو بارہ سالوں میں کیا بارہ صدیوں بعد بھی نہیں بھلا سکتا تھا۔ وہ یکدم ہی سخت غصے میں صوفے پر سے اٹھا۔ اسے غصے میں صوفے سے اٹھتا دیکھ کر آمنہ بھی بے اختیار صوفے پر سے اٹھیں۔

"سکندر!" انہوں نے اسے آواز دی۔ مگر اس وقت وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ وہ بارہ سال پہلے کی 31 دسمبر کی اسی شام میں پہنچ گیا تھا، جب اس سے اس کا سب کچھ اس ناگن نے چھین لیا تھا۔ وہ بھی اسے نفرت سے دیکھ رہی تھی۔ اسے نفرت سے دیکھتے ہوئے وہ اپنے برابر میں کھڑی لیزا سے مخاطب ہوئی۔

"واہ لیزا! واہ! ساری دنیا میں تمہیں شادی کرنے کے لیے ملا تو کون؟ سکندر شہریار؟" محمود خالد کے چہرے پر تناؤ تھا۔ آمنہ کے چہرے پر بھی پریشانی تھی جبکہ عائشہ، ہاشم اور لیزا دم بخود تھے جیسے "آنا" فانا" ماحول میں یہ تبدیلی ان میں سے کسی کی بھی سمجھ میں نہ آئی ہو۔

"مریم! اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ سکندر اس گھر کا ہونے والا داماد ہے۔"

محمود خالد نے تنبیہی انداز میں مریم سے کہا۔ وہ بھی صوفے پر سے اٹھ گئے تھے۔ اب وہاں صرف ہاشم اور عائشہ ہی تھے، جو ہنوز بیٹھے ہوئے تھے بے حد حیرانی کے عالم میں۔ لیزا سکتے کی سی حالت میں اسے اور مریم کو دیکھے جارہی تھی۔

"پاپا! آپ سے زیادہ اعلا ظرف بھی دنیا میں شاید ہی کوئی ہوگا۔ جس شخص نے آپ کی ایک بیٹی کی زندگی برباد کرنے کی کوشش کی، آپ اسی کے ہاتھ میں اپنی دوسری بیٹی کا ہاتھ دے رہے ہیں؟"

وہ مٹھیاں بھینچے، جیسے اپنے اشتعال اور غصے پر قابو پانے کی کوشش کررہا تھا۔

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس سکندر کے خلاف؟ سکندر اگر زین کا بھائی ہے تو یہ کوئی گناہ نہیں۔ زین کے ساتھ اپنی منگنی تم نے خود توڑی تھی۔"

محمود خالد نے مریم سے غصے سے کہا۔

"کیوں توڑی تھی وہ وجہ بھول گئے آپ؟" مریم اسے نفرت سے دیکھتی باپ سے بولی۔

"لیزا! یہ سکندر شہریار، زین کا بڑا بھائی ہے۔ زین جس سے میری امریکا میں منگنی ہوئی تھی۔ تمہیں یاد ہے میں وہ منگنی توڑ کر امریکا سے واپس آگئی تھی صرف اور صرف اس کی وجہ سے۔ اس نے میرا ریپ کرنے کی کوشش کی تھی اپنے گھر پر۔"

"مریم۔" محمود خالد بہت زور سے چلائے۔

"آپ کو میرا یقین نہیں ہے پاپا! تو پوچھیں اس کی امو جان سے۔ یہ عینی شاہد ہیں اس واقعے کی۔ انہوں نے ہی اپنی چادر سے میرے جسم کو ڈھانکا تھا۔ اسے اس گھناؤنی حرکت کے بعد اس کے پاپا نے اپنے گھر سے نکال تک دیا تھا۔ پوچھیں اس کی امو جان سے۔۔۔۔ پوچھیں ان سے۔"

مریم اپنے باپ سے بھی زیادہ بلند آواز میں چلائی تھی۔ وہ سکندر کو یہاں دیکھ کر اس طرح اشتعال میں آئی تھی کہ اسے اپنے شوہر کی یہاں موجودگی کی بھی پروا نہ رہی تھی۔

"مریم! بیٹا تم۔۔۔ خدا کے لیے اب یہ باتیں مت کرو۔ ماضی میں جو ہوا تھا، اسے بھول جاؤ۔ میں نہیں چاہتی، ماضی کی تلخیاں سکندر اور لیزا کی زندگی کی خوشیوں کو برباد کریں۔"

اس نے اپنے سے کچھ فاصلے پر کھڑی ماں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر شرمندگی تھی، غم تھا، خوف تھا۔ وہ جیسے اس بات کو ختم کرا دینا چاہتی تھیں مگر ان کے چہرے پر پھیلی شرمندگی یہ بتا رہی تھی کہ مریم جو کچھ کہہ رہی ہے، وہ سب حرف بہ حرف سچ ہے۔ وہ جو کچھ لمحوں کے لیے اپنی جگہ ساکت ہوگیا تھا، یکدم ہی اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ آمنہ کے مریم سے مزید کسی بھی التجائیہ جملے سے پہلے وہ اس کے مقابل جا کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے کسی بھی بات کی پروا کیے بغیر ایک بھرپور تھپڑ مریم کے منہ پر مارا۔

"سکندر! خدا کے لیے یہ تم کیا کررہے ہو بیٹا۔"

مریم نے تھپڑ لگنے کے بعد خود کو گرنے سے بمشکل بچایا تھا۔ اس کے کانوں میں اپنی ماں کی گھبرائی ہوئی آواز ضرور آئی تھی، مگر وہ پیچھے نہیں ہٹا۔ وہ اسی طرح ام مریم کے عین مقابل کھڑا تھا۔ عائشہ، ہاشم، لیزا سب کے سب اپنی جگہوں پر ساکت تھے۔ وہ نفرت اور حقارت سے مریم کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے تھپڑ کے بعد مریم کا ہاتھ ابھی تک اس کے گال پر تھا۔ یوں جیسے وہ اس تھپڑ کے لیے ہرگز تیار نہ تھی۔ اتنے سارے لوگوں کے بیچ تھپڑ لگنے پر وہ غصے اور نفرت سے پاگل سی ہورہی تھی۔

"یو باسٹرڈ۔" وہ غصے سے چلائی۔ وہ مزید کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی، مگر اس نے اسے بولنے نہیں دیا۔

"مزید ایک لفظ بھی تم نے کہا تو میں یہ بھول جاؤں گا کہ یہاں تمہارا شوہر اور والد موجود ہیں۔ بتا دوں کیا ان لوگوں کو تمہاری سچائی؟"

اس کی آنکھوں میں حقیقتا" خون اتر آیا تھا۔ یہ ناگن کسی آسیب، کسی بددعا کی طرح اس کے پیچھے تھی۔ اس کی زندگی کی ہر خوشی کے ختم ہونے کی وجہ کل بھی یہی تھی اور آج بھی یہی۔ مریم پیچ و تاب کھاتی کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے لگی تھی۔ مگر اس سے پہلے وہ بولا تھا۔ اس بار اس کے مخاطب محمود خالد تھے۔ ڈرائنگ روم میں کھڑے تمام لوگ جیسے سکتے کے عالم میں تھے۔ کسی ایک کے لبوں سے ایک لفظ تک نہیں نکل رہا تھا۔

"آپ کی بیٹی درست کہہ رہی ہے محمود صاحب! آج سے بارہ سال قبل واقعی ایک حادثہ ہوا تھا ہمارے گھر میں۔ بارہ سال پہلے میں نے اسے جو جواب دیا تھا، وہی جواب آج بھی دے کر جا رہا ہوں۔ تب بھی میں نے اس کے منہ پر ایک طمانچہ مارا تھا، آج بھی اس کے منہ پر تھپڑ مار کر جا رہا ہوں۔"

محمود خالد کی طرف دیکھ کر پرسکون سے لہجے میں بولنے کے بعد اس نے ایک نفرت بھری نگاہ مریم پر ڈالی اور پھر فورا" ہی وہ تیزی سے گھوما۔ وہ بڑی تیز رفتاری

سے 'مضبوط قدموں سے چلتا ڈرائنگ روم سے جا رہا تھا۔

"سکندر! رکو۔۔۔ سکندر۔" آمنہ نے گھبرا کر اسے آواز دی۔ مگر وہ ماں کی بات سننے کے لیے وہاں رکا نہیں، اسے اندازہ تھا کہ آمنہ اس کے پیچھے تیزی سے ڈرائنگ روم سے نکلی ہیں۔ اس نے اپنے قدموں کی رفتار مزید تیز کر دی۔ وہ آندھی 'طوفان کی رفتار سے اپنی گاڑی تک آیا۔ وہ فوراً" گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ گاڑی گیٹ سے باہر نکالتے ہوئے اس نے دیکھا 'آمنہ ہانپتی کانپتی بھاگتی ہوئی پورچ تک آئی تھیں۔ ان کے پیچھے محمود خالد بھی وہاں آئے تھے۔ وہ گاڑی گیٹ سے نکال چکا تھا۔ وہ اس بار کسی کے بھی پکارنے پر رکنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اس بار نہیں رکے گا۔ وہ اس بار ہرگز نہیں رکے گا۔ وہ جلد از جلد اس جگہ سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

ڈرائنگ روم میں کھڑے چاروں افراد پر موت کا سا سکوت چھایا ہوا تھا۔

"واہ لیزا! داد دیتی ہوں تمہارے انتخاب کی۔ اپنی بہن کی عزت لوٹنے کی کوشش کرنے والے کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانے چلی ہو؟ تمہاری جیسی بہن شاید ساری دنیا میں اور کوئی نہیں ہوگی۔"

سیم طنزیہ انداز میں اس سے مخاطب ہوئی۔ سیم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ باقی سب کو جیسے سانپ سونگھا ہوا تھا۔ سیم آنکھوں میں آنسو لیے ڈرائنگ روم سے جا رہی تھی۔ وہ اسے روک نہیں سکی تھی۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت کھڑی تھی۔

سیم اور سکندر 'سکندر اور سیم۔

وہ شاک کی ایسی کیفیت میں تھی کہ اسے اپنے اعصاب مفلوج ہوتے لگ رہے تھے۔

سیم کے ڈرائنگ روم سے نکلتے ہی اس نے دیکھا کہ ہاشم بھی ایک دم ہی وہاں سے جانے کے لیے مڑا تھا۔ فرق یہ تھا کہ سیم گھر کے اندر گئی تھی۔ ہاشم ڈرائنگ روم سے نکل کر گھر سے باہر جا رہا تھا۔ عائشہ حیرت اور دکھ میں مبتلا کھڑی تھال میں سجے پھولوں' منگنی کی انگوٹھی اور مٹھائی کے ٹوکروں کو دیکھ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

آمنہ گاڑی میں بیٹھی گھر واپس جا رہی تھیں۔ آنسو ان کی آنکھوں سے متواتر بہہ رہے تھے۔ ان کا دل جیسے شدت غم سے پھٹ سا رہا تھا۔

کیوں آخر کیوں؟ آخر کیوں زندگی ان کے سکندر ہی کی آزمائش کیے جاتی ہے؟ ساری دنیا میں لیزا کی بہن کسی کو ہونا تھا تو ام مریم کو؟ ساری دنیا میں لیزا کا باپ کسی کو ہونا تھا تو محمود خالد کو؟ بارہ سال پہلے کی وہ شام کیا ان کے سکندر کی زندگی سے نکل نہیں سکتی؟ سب کو معافی مل جاتی ہے۔

ان کے بیٹے کو کیوں نہیں؟ کیوں زندگی بار بار اسی کو آزمائے جا رہی ہے؟

کیا یہ سب جاننے کے بعد اب لیزا سکندر سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوگی؟

کیا محمود خالد سکندر کے ہاتھ میں لیزا کا ہاتھ دیں گے؟

اس سے تو کہیں اچھا تھا وہ سکندر کو لیزا کے ساتھ دوہا یا اٹلی ہی میں شادی کرنے دیتیں۔ یہاں پر بلاتی ہی نہیں۔ ایک بار شادی ہو گئی ہوتی تو شاید لیزا اور محمود خالد اپنے رویوں میں لچک لے آتے مگر اب۔۔۔ اب کیا ہوگا؟

"یا اللہ! میرے بیٹے کی زندگی میں خوشیاں کیوں نہیں آتیں؟ سب کو خوشیاں مل جاتی ہیں۔ میرے سکندر کو کیوں نہیں؟"

وہ بے آواز آنسو بہاتے ہوئے اللہ سے شکوے کر رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ ان کے اردگرد شادی کارڈز کے کئی طرح کے نمونے رکھے ہوئے تھے۔ ان میں

سے کوئی ایک کارڈ انہوں نے سکندر کی شادی کے کارڈ کے لیے منتخب کرنا تھا۔ آمنہ ساڑھے بارہ بجے گھر سے نکلی تھیں۔ ان کا اندازہ تھا ساتھ بیٹھ کر بات چیت کرنے، لنچ کرنے اور پھر شادی کی تاریخ وغیرہ طے کرنے میں کچھ وقت تو لگنا تھا۔ آمنہ کی واپسی تین ساڑھے تین بجے سے پہلے ممکن نہیں تھی۔

یہ وقت گزارنا انہیں کافی مشکل لگ رہا تھا۔ کب آمنہ واپس آئیں گی اور آکر انہیں یہ خوش خبری سنائیں گی کہ وہ لیزا کو منگنی کی انگوٹھی پہنا آئی ہیں۔ وہ سکندر کی شادی کی تاریخ ٹھہرا آئی ہیں۔ جوش میں ان کی بھوک پیاس بالکل ختم ہو گئی تھی۔ ان کا لنچ کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ سکندر کی شادی کا کارڈ منتخب کرنے اور اس کارڈ کا مضمون تیار کرنے میں آمنہ کی واپسی سے پہلے کا یہ سارا وقت گزارنا چاہتے تھے۔

زین آنے کے بعد سے اپنے کمرے میں نویرہ اور علی کے ساتھ تھا۔ شاید اس نے نویرہ سے یہ کہا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انہوں نے نویرہ کو زین کے لیے کمرے میں چائے لے جاتے دیکھا تھا۔ اپنی موجودہ حالت اور کیفیت کے بارے میں وہ نویرہ سے اور کہہ بھی کیا سکتا تھا؟ فی الحال ان کی یہ بالکل سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ زین سے کیا کہیں؟ جس احساس ندامت میں وہ مبتلا ہوا ہے، اس سے اسے کیسے نکالیں؟ انہوں نے زین کی طرف سے قصداً "اپنا دھیان ہٹا کر پھر سے شادی کے کارڈز کی طرف دیکھا۔ میز پر سامنے ہی رائٹنگ پیڈ اور قلم بھی انہوں نے رکھا ہوا تھا۔ آمنہ شادی کی تاریخ ٹھہرا کر آجائیں گی تو آج ہی انہوں نے یہ کارڈ چھپنے کے لیے بھجوانے تھے۔

وقت مختصر تھا۔ سکندر اور لیزا کو یہاں زیادہ دن قیام نہیں کرنا، شادی جلدی ہی کرنی ہو گی۔ انہوں نے فوراً "ہی رائٹنگ پیڈ اور قلم ہاتھ میں لیا تھا۔

"الحمد اللہ ہمارا بیٹا سکندر شہریار جناب محمود خالد کی صاحبزادی لیزا محمود کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو رہا ہے۔ ہمارے بیٹے اور بہو کو ان کی نئی زندگی کے اس حسین آغاز پر اپنی دعاؤں سے نوازیے اور ہمارے ساتھ ان کی دعوت ولیمہ۔۔۔۔"

زین وہاں آرہا تھا۔ انہوں نے قلم روک کر نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ انہوں نے آنکھوں پر سے پڑھنے والی عینک اتار دی۔ زین شکستہ قدموں سے چل رہا تھا۔ وہ بالکل نڈھال سے انداز میں ان کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے زین سے شادی کے کارڈز اور دعوت نامے کا مضمون چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ انہیں اندازہ تھا اس وقت زین کی نگاہیں ان کارڈز اور رائٹنگ پیڈ پر تھیں۔

"نویرہ کہاں ہے؟" انہوں نے زین کو بغور دیکھا۔

"علی کو سلا رہی ہے۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"تم نے کھانا نہیں کھایا؟"

"دل نہیں چاہ رہا۔"

انہوں نے دیکھا۔ زین ان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا، یوں جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ انہوں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ کیا بات ہے، کیونکہ جو بات تھی، وہ اسے جانتے تھے۔

"کسی اور سے نفرت کرتے ہوئے زندگی بڑی سہولت سے گزر جاتی ہے پاپا! مگر خود اپنے آپ سے نفرت کرتے ہوئے زندہ کس طرح رہا جاتا ہے؟"

وہ بہت بے بسی سے ان سے پوچھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ابھی وہ جواباً "کچھ بھی نہ کہہ پائے تھے کہ آمنہ لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ اگر آمنہ روتی ہوئی واپس نہ آتیں، وہ تب بھی ان کی اتنی جلدی واپسی پر حیران ہوتے۔ مگر اب جس طرح وہ آنسو بہاتی لاؤنج میں داخل ہوئی تھیں، اس نے تو ان کے اوسان خطا کر دیے تھے۔

"آمنہ! کیا ہوا؟" وہ یکدم ہی پریشان ہو کر صوفے پر سے اٹھے تھے۔

یوں لگ رہا تھا آمنہ کسی بھی لمحہ لڑکھڑا کر گر پڑیں گی۔ انہوں نے جلدی سے انہیں سہارا دے کر صوفے پر بٹھایا۔ زین بھی حیران پریشان سا ماں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی اٹھ کر ان کے پاس آگیا تھا۔ آمنہ کی سانسیں اکھڑی ہوئی سی تھیں۔ وہ مسلسل رو رہی تھیں۔

"کیا ہوا آمنہ؟ تم ٹھیک تو ہو؟ سکندر ٹھیک ہے ناں؟" ایک ہی پل میں نجانے کتنے برے برے خیال ان کے دل میں آگئے تھے۔ اندر ہی اندر ان کا دل بری طرح لرزا تھا۔ کیا آمنہ یا پھر سکندر کسی حادثے کا شکار ہو گئے تھے؟ آخر وہ اتنی جلدی واپس کیوں آگئی تھیں اور وہ بھی اس حالت میں۔ اس طرح زار و قطار روتی ہوئی؟ زین ان کے لیے بھاگ کر پانی لے آیا۔

"پانی پی لیں امو جان۔" آمنہ نے اس کے ہاتھ سے پانی کے دو گھونٹ لیے تھے۔ زین ان کے شانے کے گرد ہاتھ رکھ کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہو گئی امو جان؟" اس نے رسانیت سے ان سے پوچھا۔ صوفے پر آمنہ کے ایک طرف زین بیٹھا تھا اور دوسری طرف وہ۔ آمنہ نے زین کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ شہریار خان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"خوشیوں پر میرے بیٹے کا حق کیوں نہیں ہے شہریار؟ زندگی کا دامن صرف میرے سکندر ہی کے لیے کیوں تنگ پڑ جاتا ہے؟" وہ روتے ہوئے ان سے پوچھ رہی تھیں۔

سکندر؟ کیا پھر کچھ برا، کچھ غلط ہو گیا تھا ان کے بیٹے کی زندگی میں؟ ان کا دل اندر ہی اندر ڈوبا تھا۔ خوف اور اندیشوں کے سبب وہ آمنہ سے کوئی سوال تک نہ کر سکے۔ آمنہ روتے ہوئے خود ہی بولی تھیں۔

"آپ کو پتا ہے لیزا کی بہن کون ہے؟"

"کون؟" انہوں نے پریشانی سے آمنہ کو دیکھا۔

"ام مریم۔۔۔ ام مریم لیزا کی سگی بہن ہے۔"

صرف وہ ہی نہیں، زین بھی بہت بری طرح چونکا تھا۔

"ام مریم لیزا کی بڑی بہن ہے۔ وہ اس کی سگی بہن ہے۔" وہ روتے ہوئے بولیں۔

"بارہ سال پہلے جو ہوا تھا، آج مریم نے سب کے سامنے اس واقعہ کو پھر دہرا ڈالا۔ سب پرانے زخم اس نے ادھیڑ ڈالے۔ ماضی کی اس راکھ کو پھر آگ لگا کر اس نے ایک نئی قیامت بپا کر دی۔"

زین دم بخود ماں کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اور شہریار خان جیسے آندھیوں کی زد میں آئے ہوئے تھے۔ خاموش، مہر بہ لب وہ آمنہ کی گریہ زاری سن رہے تھے۔ لاؤنج میں موت کا سا سناٹا تھا۔ سوائے آمنہ کی سسکیوں کے، وہاں دوسری کوئی آواز نہ تھی۔

"بڑے سے بڑے مجرم کو، قتل تک کے مجرم کو جب وہ سزا کاٹ لیتا ہے تو معافی مل جاتی ہے۔ میرے بیٹے کی سزا کب ختم ہو گی؟ عمر قید تو وہ کاٹ آیا ہے، پھر اب یہ لوگ اسے معاف کیوں نہیں کر دیتے؟ اللہ معاف کر دیتا ہے پر ہم انسان سزا کاٹ چکے شخص کو بھی بار بار کیوں اس کی غلطی یاد دلاتے ہیں؟ کیا میرے سکندر نے بارہ سال کا بن باس کاٹ نہیں لیا؟ اب بھی اسے معافی کیوں نہیں مل رہی؟"

"کس بات کی معافی امو جان؟" زین سخت غصے میں بولا۔ زار و قطار روتی ہوئی آمنہ نے زین کو تعجب سے دیکھا، جیسے اس کی بات سمجھ نہ سکی ہوں۔ وہ چپ چاپ زین کو دیکھ رہی تھیں۔ لیزا، ام مریم کی بہن اور محمود خالد کی چھوٹی بیٹی ہے، یہ سچائی جانتے ہی وہ جیسے بالکل ہی ہمت ہارنے لگی تھیں۔

"کس جرم کی معافی مل جانی چاہیے سکندر کو؟ وہ جو اس نے کبھی کیا ہی نہیں تھا؟ جو عمر قید، جو بن باس اس نے کاٹا ہے، وہ میری وجہ سے۔ میں مجرم ہوں اپنے بھائی کا۔ امو جان! میں گناہ گار ہوں اپنے بھائی کا بھی اور آپ کا بھی۔ پاپا سے پوچھیں! یہ کئی سالوں سے یہ سچائی جانتے ہیں کہ سکندر کو جس جرم کی پاداش میں گھر بدری نصیب ہوئی تھی، وہ اس سے کبھی سرزد ہی نہیں ہوا تھا۔ اس بدکردار لڑکی کو میں لے کر آیا تھا ہم لوگوں کی زندگیوں میں۔ سزا اگر کسی کو ملنی چاہیے تو مجھے۔ سنگسار کیا جانا چاہیے تو مجھے۔ اپنے بھائی کی زندگی اجاڑ دی میں نے۔ اس کے جسم کو نہیں، اس کی روح کو مار ڈالا۔ اس بدکردار لڑکی کا دکھایا جھوٹ مجھے سچ نظر آیا تھا۔ اپنے بھائی کی چیخ چیخ کر سچ بتاتی آواز میری سماعتوں تک نہیں پہنچی تھی۔"

زین کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔ اس کی آواز بولتے بولتے بھر گئی تھی۔ اس کے لہجے میں خود اپنے لیے نفرتیں تھیں۔
آمنہ رونا بھلا کر جیسے شاک کی سی حالت میں زین کی باتیں سن رہی تھیں۔
زین کی طرح شہریار خان کے اندر بھی ایک مرتبہ پھر مایوسیاں اور احساس ندامت پھیل رہا تھا۔ جس بیٹے کے مجرم تھے اس کی زندگی میں تھوڑی سی خوشیاں لانے کی کوشش کی تھی، مگر اس کے تو پرانے زخم ادھیڑ کر پھر نئے دکھ بھی دے دیے گئے تھے۔ آمنہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔
"زین سچ کہہ رہا ہے آمنہ! میں ام مریم کی سچائی گزشتہ کئی برسوں سے جانتا ہوں۔ تمہارے سامنے بھی یہ اعتراف کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ جس جرم کی سزا میں، میں نے سکندر کو گھر سے نکالا تھا' وہ اس بدکردار لڑکی کا سکندر پر لگایا ایک بہتان تھا۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولے۔
"کاش! آپ نے امو جان کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہوتا پاپا! تو آج امو جان لیزا کے گھر سے یوں روتی ہوئی اور خاموش واپس نہ آتیں۔ وہ اس بیچ لڑکی کو اس کی اوقات یاد دلا کر اور اس کے منہ پر تھوک کر واپس آتیں۔"
جہاں جملے میں ام مریم کا ذکر آیا' وہاں زین بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ وہ سخت ترین اشتعال اور غصے میں آ گیا تھا۔ جیسے اگر ام مریم اس وقت اس کے سامنے ہوتی تو وہ اسے جان سے مار ڈالتا۔
"آمنہ کو اگر سب کچھ پتا ہوتا' یہ وہاں پر خاموش نہ رہی ہوتی۔ تب بھی اس سے سکندر کی زندگی میں خوشیاں تو واپس نہیں آجاتی تھیں زین؟ کیا محمود صاحب اور لیزا سکندر کا اعتبار کرتے؟ ان دونوں کے لیے زیادہ قابل اعتبار تو ان کی بیٹی اور بہن ہی ہوتی نا۔
میرے بیٹے کا مقدر ہی خراب ہے۔ تقدیر کو پھر اس کی آزمائش مقصود ہے۔ ورنہ اتنی بڑی دنیا میں کوئی بھی اور لڑکی لیزا کی بہن ہو سکتی تھی۔ مگر ہوئی تو ام مریم۔"
وہ تلخی سے بولتے ہوئے تقدیر سے [illegible]
جبکہ وہ سب کچھ ٹھیک کرنے کی کوششیں کر رہے تھے' تب سب کچھ پہلے سے بھی زیادہ غلط ہو گیا تھا۔
"آپ اتنی آسانی سے ہار مان رہے ہیں پاپا؟" زین نے افسوس بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ وہ جواباً شکست خوردہ سے انداز میں چپ رہے۔
"مگر میں ہار ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ماضی کو بدلنے سے میں قاصر ہوں۔ مگر اپنے بھائی کے حال میں اور اس کے مستقبل پر اب کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ اپنے بھائی کی اور ہمارے گھر کی خوشیوں کو تباہ کرنے والی اس ناگن کا میں سر کچل دوں گا۔ آپ محمود انکل کو فون کیجیے پاپا! انہیں بتائیں کہ سکندر پر لگایا مریم کا ہر الزام جھوٹا ہے۔ بارہ سال پہلے بھی اس نے سکندر پر بہتان لگایا تھا۔ وہ آج بھی اس پر بہتان لگا رہی ہے۔"
زین کے مضبوط اور دو ٹوک سے انداز نے ان کے اندر دم توڑتی امید اور آس کو نئے سرے سے جگایا تھا۔ انہیں کوشش تو کرنی چاہیے سچائی محمود خالد اور لیزا تک پہنچانے کی۔ وہ بے اختیار صوفے پر سے اٹھے تھے۔ زین ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔ انہیں ہمت سے کام لینا چاہیے۔ سکندر کو اس کے حصے کی خوشیاں دلوانے کے لیے اس بار انہیں دنیا سے لڑنا پڑ جائے تو انہیں لڑ جانا چاہیے۔ اس بار کوئی ان کے بیٹے کی خوشیوں کے راستے میں آئے تو انہیں اسے جان سے مار ڈالنا چاہیے۔ ان کے جیتے جی اب کسی میں یہ جرأت نہیں ہونی چاہیے کہ سکندر سے اس کی خوشیاں چھین سکے۔ وہ مضبوط قدموں سے چلتے ٹیلی فون تک آگئے۔
"آمنہ! لیزا کے گھر کا فون نمبر بتاؤ۔" انہوں نے ریسیور اٹھاتے ہوئے آمنہ سے کہا۔ آمنہ اب رو نہیں رہی تھیں۔ جیسے اتنے سارے حواس گم کر دینے والے انکشافات نے انہیں رونا ہی بھلا دیا تھا۔
"میرے پاس لیزا کے گھر کا تو نہیں' مگر اس کا موبائل نمبر ہے۔" وہ آہستگی سے بولیں۔
"ٹھیک ہے! دے دو۔" آمنہ نے پرس سے اپنا

موبائل نکالا... وہ لیزا کا فون نمبر بول رہی تھیں اور وہ اسے کال ملا رہے تھے۔ کال مل گئی تھی۔ وہ دوسری جانب لیزا کی آواز سننے کی توقع کر رہے تھے' مگر ان کی کال لیزا نے نہیں' محمود خالد نے ریسیو کی تھی۔ بارہ سال بعد ان کی آواز سنی تھی کیسے پہچان سکتے تھے۔
"ہیلو...... میں شہریار خان بول رہا ہوں۔" انہوں نے سنجیدگی سے اپنا تعارف کروایا تھا۔
"میں محمود بات کر رہا ہوں شہریار صاحب۔ آپ کیا لیزا سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہاں تھی نہیں' اس لیے کال میں نے ریسیو کر لی۔"
انہوں نے محسوس کیا کہ محمود خالد بہت محتاط ہو کر بولے تھے۔ جیسے بولنے سے قبل اپنے ایک ایک لفظ پر غور کیا ہو۔
"نہیں! مجھے آپ سے ہی بات کرنی تھی۔ آپ کے گھر کا نمبر نہیں تھا۔ اس لیے لیزا کے موبائل پر کال کی۔"
ان کا لہجہ سنجیدہ اور بہت مضبوط تھا۔
"آج جو کچھ ہوا شہریار صاحب! مجھے اس پر بہت افسوس ہے۔" محمود خالد آگے نہ جانے کیا کہنا چاہتے تھے' مگر وہ ان کی بات مکمل سنے بغیر فوراً" بولے۔
"میں آپ کی بیٹی ام مریم کے سکندر پر لگائے ہر الزام کی تردید کرتا ہوں۔ میں ام مریم کے متعلق زیادہ کچھ کہہ کر بات بڑھانا نہیں چاہتا۔ وہ جو کرتی ہے اور جو کچھ کر چکی ہے' وہ اس کا ذاتی فعل ہے۔ آپ سے میری فقط اتنی درخواست ہے کہ آپ لیزا اور سکندر کے رشتے کو اسی طرح برقرار رکھیں۔ کسی کی بھی باتوں میں آکر اس رشتے کو ختم نہ کیجیے گا۔ یہ سکندر اور لیزا کی خوشیوں کا سوال ہے۔ خدا کے لیے ان دونوں کو ان کی خوشیوں سے محروم نہ کیجیے گا۔"
درخواست کرتے ہوئے واقعی ان کا لہجہ التجائیہ ہی ہو گیا تھا۔
"آپ مجھے تھوڑا وقت دیجیے شہریار صاحب! ان شاء اللہ سب بہتر ہو گا۔"
محمود خالد کا بے حد سنجیدگی سے دیا گیا یہ جواب ان کی سماعتوں سے ٹکرایا اور پھر مزید کوئی بات کیے بغیر فوراً" ہی محمود خالد نے "خدا حافظ" کہہ کر فون بند کر دیا
وہ محمود خالد کے لہجے سے کچھ بھی اخذ نہ کر پائے۔ کیا ان کا لہجہ یہ اشارہ دے رہا تھا کہ وہ اب بھی سکندر اور لیزا کے رشتے کے حق میں ہیں؟ ان کا بے پناہ سنجیدہ انداز انہیں کسی بھی طرح کی رائے قائم کرنے سے روک رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سکندر کے جاتے ہی آمنہ بھی ان کے گھر سے چلی گئی تھیں اور اس کے فوراً" بعد ہی ہاشم بھی چلا گیا تھا۔ ان تینوں کے چلے جانے کے بعد وہ لاؤنج میں دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بالکل اکیلے بیٹھے تھے۔ عائشہ ان کے پاس آئی تھیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر انہوں نے تسلی آمیز انداز میں کچھ کہا بھی تھا شاید' مگر وہ اتنی الجھی بکھری حالت میں تھے کہ انہیں عائشہ کی وہاں موجودگی سے وحشت سی ہوئی تھی۔ معذرت خواہانہ انداز میں انہوں نے عائشہ سے فقط اتنا کہا تھا کہ وہ کچھ دیر بالکل تنہا رہنا چاہتے ہیں۔
عائشہ ان کی کیفیت سمجھتے ہوئے بغیر برا مانے وہاں سے چلی گئی تھیں۔ اسی طرح سر دونوں ہاتھوں میں تھامے انہیں نہ جانے کتنی دیر گزری تھی' جب وہاں صوفے پر پڑا لیزا کا موبائل بجا تھا۔ بے دھیانی میں انہوں نے کال ریسیو کر لی تھی اور شاید یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ یہ کال انہوں نے ریسیو کر لی تھی۔ ورنہ نہ جانے وہ کتنی دیر تک اسی طرح گم صم بیٹھے رہتے۔ یہ وقت اس بات پر بیٹھ کر افسوس کرنے کا تو نہیں تھا کہ سکندر' زین کا بڑا بھائی کیوں ہے۔ نہ اس بات پر افسوس کرنے کا کہ آج جو کچھ ہوا' وہ مریم نے کیوں کیا تھا؟ یہ وقت کلثوم کی فکر کرنے کا تھا۔ اس کی زندگی کی خوشیوں کو بچانے کا وقت تھا۔ کلثوم تھی کہاں؟ ایک ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا ان سب لوگوں کو ان کے گھر سے گئے۔ اس کے بعد سے انہوں نے کلثوم کو نہیں دیکھا۔ انہیں یکدم ہی اس کی بے طرح فکر لاحق ہوئی تھی۔ آج جو کچھ ہوا' اس نے

ان کی بیٹی پر کیا اثر ڈالا تھا۔ وہ ٹھیک تو تھی نا؟ وہ فوراً" ہی لیزا کا موبائل ہاتھ میں لیے صوفے پر سے اٹھے۔

وہ لاؤنج سے باہر جارہے تھے۔ نہ جانے وہ تھی کہاں؟ سب سے پہلے وہ اسے تلاش کرتے اس کے کمرے میں آئے اور وہاں پر وہ انہیں مل بھی گئی تھی۔ مگر وہاں وہ اکیلی نہیں تھی۔ مریم بھی تھی وہاں پر اس کے ساتھ۔ مریم کو لیزا کے پاس بیٹھا دیکھ کر ان کا دل بری طرح پریشان ہوا تھا۔ آج پھر —— زہر بھر رہی تھی وہ لیزا کے ذہن میں۔

وہ کمرے کے اندر آگئے۔ لیزا اور مریم نے انہیں نہیں دیکھا۔ وہ دونوں بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ لیزا بالکل گم صم سی بیٹھی تھی' جبکہ مریم زارو قطار رو رہی تھی۔ وہ روتے ہوئے لیزا سے کہہ رہی تھی۔

"میں سکندر کی منت کرتی رہی کہ میں تمہارے بھائی کی عزت ہوں' پر اس پر تو شیطان سوار تھا لیزا۔ اس نے میرے کپڑے... میں روتی رہی' چلا چلا کر مدد کے لیے پکارتی رہی' اس سے رحم کی بھیک مانگتی رہی' پر وہ اپنے نفس کا پجاری' ہوس میں اندھا ہو چکا تھا۔ اس نے میری عزت... پہلی بار پاپا کی وجہ سے گھر سے بے گھر ہونے کے بعد ممی کے فرنچ شوہر نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا اور دوسری بار سکندر شہریار نے۔ میری خوب صورتی ساری زندگی میری آزمائش بنی رہی۔ آج بھی ایک زبردستی کا بندھن محض پاپا کی خاطر نبھا رہی ہوں کہ پاپا کے بزنس فرینڈ ہاشم اسد کا دل میری خوب صورتی پر آگیا تھا۔ میری ہاشم کے ساتھ شادی کی وجہ سے پاپا مسلسل اس سے بزنس میں فائدے حاصل کرتے رہتے ہیں۔ میرے ساتھ تو جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے' میں سہہ رہی ہوں لیزا۔ پر میں تم پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔ میں پاپا یا سکندر کو تمہارے ساتھ کچھ برا نہیں کرنے دوں گی۔ تم کل ہی کی فلائٹ سے واپس لندن چلی جاؤ۔ چھوڑ دو سکندر شہریار کو... چھوڑ دو پاپا کو۔ یہ سب تمہیں اپنے مطلب کے لیے استعمال کرتے رہیں گے۔ تم لندن جا کر وہاں پر اپنی مرضی اور پسند سے کسی سے بھی شادی کر لو۔ پاپا کو اپنی شادی کے بارے میں بتانے کی تمہیں نہ کوئی ضرورت ہے' نہ ان سے اجازت لینے کی۔ تمہارا ہونے والا شوہر مسلمان ہو یا نہیں' بس اس کا اچھا انسان ہونا تمہارے لیے کافی ہونا چاہیے۔ تم پاپا کی اب بالکل بھی پروا مت کرنا۔ آخر دیا کیا ہے انہوں نے ہم دونوں کو...؟"

وہ مریم کی زہر اگلتی زبان خاموشی سے سن رہے تھے۔ مریم جو پوری طرح لیزا کی طرف متوجہ تھی۔ بولتے بولتے اسے یک دم ہی جیسے کسی کی وہاں موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ پہلے مریم اور پھر لیزا نے انہیں دیکھا۔ مریم یک لخت ہی گھبرا کر چپ ہوئی تھی۔ وہ شاید اس وقت یہاں ان کی موجودگی کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

"چپ کیوں ہو گئیں مریم؟ اگلو زہر۔ جتنا زہر تمہارے اندر ہے آج سب اگل ڈالو۔" انہوں نے طیش کے عالم میں مریم کو دیکھا۔

"پاپا! وہ میں... میں چاہتی تھی لیزا کو سکندر کی ساری سچائی بتادوں' تاکہ اسے اپنی غلط چوائس کا احساس ہو سکے۔" مریم بوکھلا کر فوراً" بولی۔

"کیسا رہے گا اگر آج میں بھی اسے ساری سچائی بتادوں؟ بہتر رہے گا کہ کلثوم آج اپنی تمام غلط چوائسز کا ادراک کرلے گی۔" وہ طنز اور غصے سے بولے۔

"پاپا! آپ..."

مریم کی بات انہوں نے مکمل نہیں ہونے دی۔ وہ آگے بڑھ کر اس کے بالکل سامنے آئے اور انہوں نے کھینچ کر ایک تھپڑ اس کے گال پر مارا۔

"پاپا! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" لیزا گھبرا کر فوراً" بیڈ پر سے اٹھی۔

"تم وہیں رکو کلثوم! آج میرے اور اس کے بیچ میں ہرگز مت آنا۔"

وہ غصہ کرنے اور چیخنے چلانے والے آدمی نہ تھے۔ مگر آج وہ چلا رہے تھے۔ انہیں اس قدر غصے میں دیکھ کر لیزا اپنی جگہ سہم کر رک گئی۔

"آپ نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا پاپا؟" مریم نے بے یقینی اور غصے سے منہ پر ہاتھ رکھے رکھے پوچھا۔ وہ بھی بیڈ پر سے اٹھ گئی۔ لیزا' مریم کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ ان

دونوں کے سامنے کھڑے تھے۔

"یہ تھپڑ تمہیں تمہارے منہ پر بہت پہلے مار دینا چاہیے تھا مریم۔ کاش! میں نے یہ تھپڑ تمہیں اس روز مار دیا ہوتا، جب تمہارے سوتیلے باپ کے ساتھ مجھے تمہارے تعلقات کا علم ہوا تھا۔"

وہ یہ تمام الفاظ بولتے ہوئے دکھ، کرب اور شرم سے زمین میں گڑے جا رہے تھے۔ برسوں پہلے جب یہ شرمناک باتیں پتا چلی تھیں، تب بھی اسی طرح وہ شرم اور غیرت سے زمین میں گڑ سے گئے تھے۔ لیزا ان کے انکشافات پر ساکت تھی، بے یقین تھی اور مریم تھپڑ لگنے کی ساری تکلیف اور غصہ بھلائے یوں کھڑی تھی، جیسے یہ توقع مر کر بھی نہیں کر سکتی تھی کہ باپ کو یہ تمام باتیں معلوم ہوں گی۔

"یہ جھوٹ ہے پاپا! یہ سب جھوٹ ہے۔ کسی نے یہ ساری بکواس کی ہے آپ سے میرے متعلق۔ آپ کا دل مجھ سے خراب کروانے کے لیے۔"

مریم بوکھلا کر بول رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور آنکھوں میں خوف تھا۔

"تمہاری ماں نے مجھے فون پر روتے ہوئے یہ بات بتائی تھی۔ اس نے کہا تھا، تم اس کا گھر خراب کرنا چاہتی ہو۔ میں نے اس کا یقین نہیں کیا تھا۔ تمہارے سوتیلے باپ نے یہ بات بتائی۔ میں نے یقین نہیں کیا تھا، مگر جب ان دونوں کو غلط ثابت کرنے کے لیے میں اس گائناکولوجسٹ کے پاس پہنچا جس کا پتا تمہاری ماں اور سوتیلے باپ نے بتایا تھا۔ اس نے تمام ثبوتوں کے ساتھ اس بات کی تصدیق کی تب میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا۔ میری بیٹی اتنی بدکردار کیسے ہو سکتی تھی؟ آخر کیسے؟ پھر اس کے بعد ایک کے بعد ایک تمہارے افیئرز کا مجھے پتا چلتا رہا اور میں اندر ہی اندر شرم اور ندامت سے گڑتا یہ سمجھتا چلا گیا کہ میری بڑی بیٹی جسے میں نے ہمیشہ چھوٹی بیٹی سے زیادہ چاہا تھا۔ اس نے میری صرف شکل لی تھی، کردار اپنی ماں کا لے لیا تھا۔"

بولتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ شرم، غیرت اور دکھ سے جیسے ان کا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ انہیں یکدم ہی چکر سا آیا۔ خود کو لڑکھڑا کر گرنے سے بچانے کے لیے انہوں نے پاس رکھی کرسی کا سہارا لیا تھا۔

"پاپا۔" لیزا پریشان ہو کر، دوڑ کر ان کے پاس آئی۔ ان کے اوسان خطا کر دینے والے ان انکشافات نے لیزا کی حالت بھی غیر کر رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ باقاعدہ کانپ رہے تھے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے انہیں تھام کر، سہارا دے کر صوفے پر بٹھایا۔ وہ اپنے دل کی پریشانی بھلا کر باپ کے لیے فکرمند ہوئی تھی۔ وہ ان کے برابر میں صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آپ ٹھیک تو ہیں پاپا؟" انہیں اپنے سینے پر دباؤ سا محسوس ہو رہا تھا۔ ان کا ہاتھ سینے پر جاتا دیکھ کر وہ بہت بری طرح پریشان ہوئی تھی۔

"میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں پاپا۔"

"میں ٹھیک ہوں بیٹا۔" اسے تسلی دینے کو وہ بدقت ہلکا سا مسکرائے تھے۔ دکھ اور کرب سے بھری مسکراہٹ۔

☼ ☼ ☼

وہ باپ سے دور کھڑی تھی۔ لیزا ان کے برابر میں بیٹھی تھی۔ وہ ان سے دور ہے۔ لیزا ان کے پاس ہے۔ وہ اپنے حواس کھونے لگی تھی۔ پاپا نے برسوں پہلے اسے خود سے دور کر کے لیزا کو اپنے نزدیک کر لیا تھا۔ اسے ممی کے ساتھ بھیج کر اپنے ساتھ رکھنے کے لیے لیزا کا انتخاب کیا تھا۔

باپ کے ساتھ بیٹھی لیزا پر اس کی نظر پڑی تو اس کے اندر نفرت کا وہی طوفان اٹھا، جو چاہتا تھا، لیزا باپ کی نظروں سے گر جائے۔ لیزا کی زندگی تباہ و برباد ہو جائے۔ وہ چودہ سال کی عمر سے اس لڑکی سے نفرت کرتی آئی تھی۔ اس نے ساری زندگی اتنی نفرت اور کسی سے بھی نہیں کی تھی، جتنی لیزا محمود سے کی تھی۔ اپنی زندگی کے چودہ برسوں تک اسے یہ بتایا گیا تھا کہ باپ اسے سب سے زیادہ چاہتا ہے، وہ اسے ساری دنیا میں سب سے زیادہ پیاری ہے۔ مگر ماں اور باپ میں طلاق کے وقت اسے اچانک ہی پتا چلا، جو کچھ وہ چودہ برسوں تک سمجھتی رہی، وہ غلط تھا۔ لیزا کو اپنے ساتھ رکھنے کا انتخاب اس کے پاپا نے کیا تھا۔ پاپا نے اسے نہیں، لیزا کو چنا تھا اپنے ساتھ لے جانے کے لیے۔ وہ تو پاپا کی محبت کی بلا شرکت غیرے مالک تھی نا! پر پاپا نے محبت کا فخر، مان اور لاڈلے ہونے کا تاج اس کے سر پر سے اتار کر لیزا کے سر پر پہنا دیا تھا۔ اس روز اسے لیزا سے شدید نفرت ہو گئی تھی۔ اس روز اسے اپنی ماں سے شدید نفرت ہو گئی تھی۔

اس کے اندر ایک آگ لگی تھی برسوں سے، جو کبھی کسی طرح ٹھنڈی نہیں ہو سکی تھی۔ اس نے اپنی ماں سے انتقام لینے کے لیے اپنے سوتیلے باپ کو اپنی جانب ملتفت کروایا تھا۔ ماں نے اس سے اس کا گھر اور باپ چھینا تھا۔ اس نے ماں سے اس کا گھر اور شوہر چھین لیا تھا۔ ماں سے انتقام کی آگ میں جلتی وہ تمام حدود عبور کر گئی تھی۔ اسے اس فیشن ڈیزائنر سے شادی نہیں کرنی تھی۔ اسے تو فقط ماں کا گھر اجاڑنا تھا۔ جب یہ کام کر چکی تو ہاسٹل چلی آئی۔

لیزا اس سے پیار بھی بہت کرتی تھی اور وہ بے وقوف بھی بہت تھی۔ وہ ہمیشہ سے اس کے اثر اور حصار میں رہی تھی۔ وہ شروع سے اس کی تابعدار رہی تھی۔ جب تک وہ دونوں ماں، باپ کے ساتھ اٹلی میں رہی تھیں، اس نے لیزا کی تابعداری اور سادگی کو کبھی اس کے خلاف استعمال نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ اس کے فائدے کے بارے ہی میں سوچا تھا۔ مگر جب محبت کا فخر اور عزیز از جان ہونے کا تاج پاپا نے اس کے سر سے اتار کر لیزا کے سر پر سجایا، تب اس نے لیزا کے نقصان کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اس نے ماں، باپ کی علیحدگی کے اول روز سے لیزا کا دل باپ سے خراب کروانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے محبت اور پیار کا نام لے کر لیزا سے ہر وہ کام کروایا، جس سے پاپا، لیزا سے دور ہو جائیں۔ اس سے خفا اور بدگمان ہو جائیں۔

وہ جانتی تھی کہ پاپا نے لیزا کو خود سے قریب کرنے کی بہت کوششیں کی تھیں، مگر اس کا حصار لیزا پر اتنا مضبوط تھا کہ پاپا، لیزا کو کبھی بھی خود سے نزدیک نہیں کر پائے تھے۔ اس نے ساری زندگی اسی کوشش میں گزاری تھی کہ لیزا کو پاپا سے دور کروا دے اور پاپا کو لیزا سے بدگمان کر دے۔ وہ پاپا کو لیزا سے بدگمان کبھی نہ کروا پائی تھی۔ ہاں! لیزا کو ان سے دور رکھوانے میں وہ بہت کامیاب رہی تھی۔ لیزا کسی مسلمان اور پاکستانی مرد سے شادی کرنا چاہتی ہے، یہ خبر اس پر بجلی بن کر گری تھی۔ وہ اس شادی کو کسی بھی طرح رکوا دینا چاہتی تھی۔ اگر لیزا کی شادی یہاں ہو گئی تو پاپا تو اس سے بہت خوش ہو جائیں گے۔ ان کی مرضی کے مطابق شخص سے شادی کر کے تو لیزا ان کے قریب ہو جائے گی۔

پتا نہیں کون تھا وہ شخص، جس سے لیزا محبت کر رہی تھی۔ اس شخص کی محبت اتنی زور آور تھی کہ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ لیزا پر اپنا حصار کمزور پڑتا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے لیزا کو منع کیا۔ پیار سے، غصے سے، ہر طرح اس نے لیزا کو پاکستان آنے سے روکا۔ کم از کم وہ خودسری دکھا کر، اکیلے شادی کر کے پاپا کے دل کو دکھا دے۔ مگر لیزا پاکستان آ گئی تھی۔ اس کی کوششیں ناکام جا رہی تھیں، پھر بھی آج دوپہر سے پہلے تک وہ مایوس نہیں تھی۔ اسے یقین تھا، وہ کچھ نہ کچھ ایسا ضرور کرنے میں کامیاب ہو جائے گی کہ لیزا کی یہاں شادی نہیں ہو سکے گی۔ وہ آج یہاں اسی امید پر آئی تھی کہ کسی بھی طرح لیزا، پاپا کا دل ان لوگوں سے خراب کروا دے، جہاں لیزا شادی کرنا چاہتی ہے۔ یہ شادی کر کے لیزا، پاپا سے قریب ہو جائے گی اور ایسا وہ مر کر بھی نہیں ہونے دے گی۔

سکندر شہریار کو لیزا کے ہونے والے شوہر کے روپ میں دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ وہ اپنے آپ میں نہیں رہی تھی۔ اس کا شوہر بھی وہاں موجود ہے، اسے اس بات کی بھی کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ جنون اور وحشت میں جو اس کے منہ میں آیا وہ بولتی چلی گئی تھی۔

آخر ایسا تھا کیا اس عام سی لیزا میں کہ جس کسی کو بھی وہ سچے دل سے چاہتی ہے، وہ اسے ٹھکرا کر لیزا کو اپنا لیتا ہے۔ اس کے پاپا بھی اور سکندر شہریار بھی۔ اس کی آنکھوں سے ابھی بھی شعلے نکل رہے تھے۔ یوں

لگ رہا تھا اس کا پورا وجود ایک ان دیکھی آگ میں جل رہا ہو۔ وہ شدید نفرت سے لیزا کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا' اس کے پاپا کا ہاتھ ابھی بھی ان کے سینے پر تھا۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہے تھے۔ لیزا اٹھ کر ان کے لیے پانی لے آئی تھی۔ وہ انہیں اپنے ہاتھ سے پانی پلا رہی تھی۔ یکدم ہی اس پر جنون سا سوار ہوا۔ وہ لیزا کے سامنے آئی۔ اس نے ہاتھ مار کر لیزا کے ہاتھ سے پانی کا گلاس گرا دیا۔

"بس کرو دو تم یہ ڈرامے لیزا! تم پاپا سے کتنی محبت کرتی ہو' یہ پاپا بھی جانتے ہیں اور میں بھی۔"

پانی سے بھرا گلاس چھناکے سے ٹوٹا تھا۔ وہ یکدم ہی باپ کے پیروں پر ہاتھ رکھ کر ان کے سامنے فرش پر بیٹھ گئی۔

"پاپا! یہ آپ سے نفرت کرتی ہے۔ اس کی مکاری کا یقین مت کریں۔ آپ سے محبت صرف اور صرف میں کرتی ہوں۔"

باپ کے پیروں پر مضبوطی سے ہاتھ جمائے وہ رو پڑی۔ پاپا کو یہ یقین تو نہیں کھونا چاہیے کہ وہ ان کی مریم ہے' وہ ان سے بہت پیار کرتی ہے۔

"دسیم" اس نے لیزا کی روتی ہوئی آواز سنی۔ اس نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ محمود خالد نے اپنے پیر پیچھے ہٹائے۔ انہوں نے اپنے پیروں پر سے اس کے ہاتھ جھٹک کر ہٹا دیے۔

"پاپا! آپ۔" اس نے روتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ اسے باپ کی آنکھوں میں ناراضی نظر آئی۔ ان کا ایک ہاتھ ابھی تک ان کے سینے پر تھا۔

"مجھے پتا ہے' اس نے کوئی زہر بھرا ہے آپ کے دل میں میرے خلاف۔ اسی نے آپ کو مجھ سے چھینا تھا۔" وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔ اس نے لیزا کو نفرت سے دیکھا۔

"دسیم! خدا کے لیے پاپا کی حالت کا خیال کرو۔ دیکھو! پاپا کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔"

اس نے دیکھا لیزا نے پاپا کے کندھے کے گرد ہاتھ رکھ کر ان کو سنبھالا ہوا تھا۔ وہ روتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئی۔ اس کی آنکھوں [illegible]

"ہٹو پاپا کے پاس سے۔ معصومیت اور سادگی سے ڈرامے کر کے تم پاپا کو مجھ سے نہیں چھین سکتیں۔"

وہ یکدم ہی جنونی انداز میں اٹھی۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر پوری قوت سے کھینچ کر لیزا کو پاپا کے پاس سے اٹھایا وہ لیزا کو نفرت سے دیکھ رہی تھی۔ پاپا کی آنکھوں میں اپنے لیے ناراضی اور بے اعتباری دیکھ کر وہ واقعی اپنے حواس کھونے لگی تھی' اس پر جیسے کوئی دورہ سا پڑا تھا' وہ جنونی انداز میں چلا رہی تھی۔ لیزا اس کے ساتھ کھنچتی صوفے سے اٹھ گئی۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔

"مریم! خدا کے لیے بس کرو۔ اب بس کرو۔" تکلیف اور درد میں مبتلا اس کے پاپا کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ ان تک جانا چاہتی تھی' مگر اس سے پہلے لیزا دوڑ کر پھر ان کے پاس چلی گئی۔

"پاپا! اسپتال چلیں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پلیز! پاپا چلیں۔" لیزا نے روتے ہوئے ان کی منت کی تھی۔

"ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے بیٹا! میں ٹھیک ہوں۔ شاید بی پی ہائی ہو رہا ہے۔ ابھی دوا لے لوں گا۔"

وہ اس طرح بول رہے تھے' جیسے انہیں سانس لینے میں دقت کا سامنا ہو۔ لیزا انہیں فکر سے دیکھ رہی تھی۔ لیزا ان کے پاس بیٹھی تھی اور وہ ان کے مقابل ان سے بہت دور' میلوں اور کوسوں دور۔

"میں ٹھیک ہوں کلثوم! تم میری فکر مت کرو بیٹا۔ بس میری ایک نصیحت سن لو' بہت غور سے اور اس پر عمل بھی کرو۔"

وہ جیسے اپنے باپ کو نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ انہیں اگر کوئی نظر آ رہا تھا تو لیزا۔

"جی پاپا!" لیزا سعادت مندی سے بولی۔ اس کی سعادت مندی اس کی آنکھوں میں پھر غیظ و غضب لے آئی تھی۔ اسے پھر نفرت کی انتہاؤں پر لے گئی تھی۔

"بیٹا! خود کو مریم سے دور کر لو۔ یہ تمہیں تباہ کر دے گی۔ یہ تمہاری زندگی برباد کر دے گی۔ یہ ساری زندگی میرے خلاف تمہارے اندر زہر بھرتی رہی ہے۔ میں سب سمجھتا تھا' سب جانتا تھا۔ پر چپ رہتا تھا۔ میں اپنی ایک بیٹی کے خلاف دوسری بیٹی سے کیا کہتا؟ سکندر کے والدین اور زین سب سکندر کو قصوروار سمجھتے ہیں۔ جب یہ زین سے منگنی توڑ کر آئی تھی تب میں نے امریکا فون کر کے شہریار خان سے بات کی تھی۔ وہ بے چارے مجھ سے بہت شرمندہ ہوئے تھے۔ اپنے بیٹے کی غلط حرکت پر مجھ سے انہوں نے معافی تک مانگی تھی۔ میں نہ تو تب سکندر سے کبھی ملا تھا' نہ اس واقعہ کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ پتا ہے' مگر میں بارہ سال پہلے بھی یہ جانتا تھا کہ بدکردار زین کا بڑا بھائی نہیں' میری بیٹی ہی ہے۔ جو اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ اتنا شرمناک رشتہ قائم رکھ سکتی ہے۔ وہ منگیتر کے بڑے بھائی کے ساتھ کیوں انوالو نہیں ہو سکتی؟ زین کے ساتھ اس کی منگنی میں نے خود کروائی تھی' یہ سوچ کر کہ چلو! ایک اچھے خاندان کا نیک' شریف اور مہذب لڑکا اس نے اپنے لیے چنا ہے۔ شاید اس کا ساتھ اس کے اندر تبدیلیاں لے آئے۔ یہ اپنی اصلاح کر لے۔ تب میں اس سے مایوس نہیں ہوا تھا۔ مجھے لگتا تھا' میری بیٹی راستہ بھول ضرور گئی ہے' بھٹک ضرور گئی ہے' مگر جلد وہ راہ راست پر واپس آ جائے گی۔ مگر اس کے بعد آنے والے برسوں میں اس کے غلط راستے پر آگے سے آگے بڑھتے قدم مجھے یہ جتاتے رہے کہ میری بیٹی نے اس بھٹکی ہوئی اور غلط راہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چن لیا ہے۔ میں لاکھ کوششیں کر لوں' اسے درست راستے پر واپس نہیں لا سکتا۔"

وہ لیزا سے مخاطب تھے۔ وہ اس کی طرف دیکھ تک نہیں رہے تھے۔ اب ان کی طبیعت قدرے سنبھل چکی تھی۔ وہ بہت دکھ اور کرب سے بول رہے تھے۔ مگر ان کی سانس نہیں اکھڑ رہی تھی۔ اس کی سماعتوں میں باپ کی اپنے متعلق باتیں گونج رہی تھیں۔ مگر اس کی نظریں لیزا پر تھیں۔ وہ پاپا کے ساتھ بیٹھی تھی۔ لیزا' پاپا کی عزیز از جان تھی اور وہ انتہائی قابل نفرت' جس کی طرف پاپا دیکھنا تک گوارا نہیں کر رہے تھے۔

"کلثوم! تم محسوس نہیں کر رہیں' مگر جس روز سے تم نے سکندر سے شادی کا فیصلہ کیا ہے' یہ تمہاری شادی کسی بھی طرح رکوا دینے کی فکر میں مبتلا ہے۔ جب سے تم پاکستان آئی ہو۔ میں اس کی شکل دیکھ کر محسوس کر رہا ہوں کہ یہ تمہاری شادی سے خوش نہیں ہے۔ چہرے پڑھنا سیکھو کلثوم! دلوں میں چھپی نفرتیں جاننا سیکھو۔ یہ بہن نہیں' تمہاری دشمن ہے۔ دور کر لو خود کو اس سے کلثوم!"

اس کے پاپا جیسے بالکل پھٹ پڑے تھے۔ جیسے برسوں کا لاوا باہر نکل آیا تھا۔ ان کے لہجے میں اس کے لیے دکھ بھی تھا' مایوسی بھی تھی اور ناراضی بھی تھی۔ یوں جیسے جو کچھ وہ بول رہے تھے' اسے بولتے ہوئے انہیں بہت تکلیف ہو رہی ہو' مگر پھر وہ سب کہہ دینا ضروری لگ رہا ہو' اپنی عزیز از جان لیزا کی زندگی کو تباہ ہونے سے بچانے کے لیے۔ اس نے اس بار اپنے پاپا کو بھی غصے سے دیکھا۔ لیزا کے لیے اس کی آنکھوں میں نفرت تھی اور پاپا کے لیے چہرے پر غصہ۔

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے پاپا! ہاں میں اس کی دشمن ہوں۔ اس سے نفرت کرتی ہوں۔ اسے میرے اوپر ترجیح دے کر آپ نے اس نفرت اور دشمنی کی بنیاد رکھی تھی۔ اگر میں بری ہوں تو مجھے برا بنایا کس نے تھا؟ آپ نے پاپا! صرف اور صرف آپ نے۔" وہ غصے سے چلائی۔

"آپ نے اپنے ساتھ لندن لے جانے کے لیے اسے چُنا تھا نا؟ بولیے چُنا تھا کہ نہیں؟" وہ روتے ہوئے حلق کے بل چلائی۔

لیزا اپنے لیے اس کا نفرت بھرا لہجہ سن کر اگر صدمے سے گنگ رہ گئی تھی تو اسے اس کی مطلق پروا نہیں تھی۔

"آپ نے اسے چُنا' سکندر شہریار نے اسے چُنا۔ آخر ایسا ہے کیا اس عام سی لیزا میں؟ جس کسی سے بھی میں محبت کرتی ہوں' وہ میرے بجائے اسی کو چاہتا ہے۔ آپ بھی' سکندر شہریار بھی۔ میں نے آپ سے بہت محبت کی ہے پاپا! اپنی جان سے بھی زیادہ' مگر آپ

مجھے ممی کے پاس چھوڑ کر اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ آپ نے اسی کو چاہا' مجھے نہیں اور سکندر نے بھی مجھے ٹھکرا دیا تھا۔ مجھے رد کر دینے کے بعد آج وہ اسے اپنانا چاہتا ہے اس عام سی لیزا محمود کو؟ جس میں مجھ جیسی کوئی ایک بات نہیں۔ ہاں! میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔ میں نے ساری زندگی اتنی نفرت کسی سے نہیں کی' جتنی اس سے کرتی ہوں۔"

وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح ہوش و حواس سے بے گانہ ہو کر بلند آواز میں چلا رہی تھی۔ اس کی زبان زہر اگل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ پاپا نے لیزا کے سامنے اس کے بارے میں اتنا کچھ بول دیا تھا تو اب اپنی نفرت چھپانے کی اسے کیا ضرورت تھی؟ وہ لیزا سے اپنی نفرت کا اظہار ببانگ دہل کر رہی تھی۔

"سیم! یہ کیا کہہ رہی ہو۔ پلیز! ایسا مت بولو۔" اس نے لیزا کی روتی ہوئی آواز سنی۔ "میں نے ساری دنیا میں سب سے زیادہ پیار تمہیں کیا ہے سیم۔ ممی سے بھی زیادہ' پاپا سے بھی زیادہ۔ میرے لیے میری فیملی' میری دوست' میری ماں' میرا باپ سب کچھ تم رہی ہو سیم!"

وہ روتے ہوئے اس سے بول رہی تھی۔ اس کے اوپر لیزا کے آنسو اثر کر رہے تھے' نہ اس کی باتیں۔ وہ اسے دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے پاپا کو دیکھ رہی تھی' جنہوں نے روتی ہوئی لیزا کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ اسے پیار کر رہے تھے۔ اس کا بڑی شدت سے دل چاہا تھا' وہ لیزا کو ان کے پاس سے ہٹا دے' اسے مٹا دے' اسے غائب کر دے' اسے جان سے مار ڈالے۔

"مریم! میں نے کلثوم کو تم پر فوقیت نہیں دی تھی۔ تم بھی جانتی ہو' کلثوم بھی جانتی ہے' میں تمہیں زیادہ چاہتا تھا اور یہ بات تمہاری ماں بھی جانتی تھی۔ تمہاری ماں سے شادی میری زندگی کا سب سے غلط فیصلہ تھی۔ میں اپنی اس غلطی کو ٹھیک کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنی دونوں میں سے کوئی ایک بیٹی بھی اس بدکردار عورت کے پاس چھوڑنے کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ مگر وثوریا ایک شاطر اور مکار عورت تھی۔ ... کرنے اور پریشان کرنے کے لیے اس نے تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ تمہیں اس لیے چنا تھا تاکہ مجھے تکلیف دے سکے۔ یہ خواہش بھی اسی کی تھی کہ ایک بیٹی اس کے پاس اور ایک میرے پاس رہے گی۔ اسے تم دونوں میں سے کسی سے بھی محبت نہیں تھی۔ مگر مجھے ٹف ٹائم دینا چاہتی تھی۔ اس لیے تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کی شرط عائد کر رہی تھی۔ میں اس گھٹیا عورت کے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا' کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ اگر وہ اپنی اوقات دکھانے پر آئی تو میری عزت اور نیک نامی تک کو رسوائی اور جگ ہنسائی میں تبدیل کروا دے گی۔ میری عزت کے ساتھ میری بچیوں کی عزت بھی جڑی تھی۔ اپنی اور تم دونوں کی عزت قائم رکھنے کے لیے میں اس وقت وقتی طور پر خاموش ہو گیا تھا۔ مگر میرا اول روز سے تمہیں اس کے پاس چھوڑ دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں تم دونوں میں سے ایک کو بھی وثوریا کے حوالے کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں تمہیں اپنے پاس لندن بلانے کی کوششیں کر رہا تھا اور اس دوران میں تم سے نہ تو غافل ہوا تھا' نہ بے پروا..... میں مسلسل تمہاری خبر گیری کرتا تھا۔ یاد کرو! میں تمہیں دن میں کتنی بار فون کرتا تھا؟ سال میں ایک بار تمہاری چھٹیوں میں تمہیں اپنے پاس لندن بلواتا تھا۔ کتنی بار اپنے جاننے والوں کو جو کسی کام سے اٹلی جا رہے ہوتے تھے' تم سے بطور خاص ملنے کی تاکید کرتا تھا۔ اس عرصے میں میری مسلسل یہ کوشش رہی تھی کہ تمہیں جلد از جلد وثوریا سے واپس لے سکوں۔ مگر قبل اس کے کہ میری کوششیں کامیاب ہوتیں' مجھے تمہارے مختلف افیئرز کی خبریں ملنی شروع ہو گئیں۔ میں تم سے ظاہری طور پر دور تھا مریم! مگر تمہاری ہر ہر حوالے سے خبر رکھتا تھا۔ ابھی میں تمہارے افیئرز ہی سے پریشان ہوا تھا کہ مجھے تمہارے سوتیلے باپ کے ساتھ تمہارے تعلقات کا پتا چلا۔ تمہاری ماں نے مجھے فون کر کے بتایا تھا۔ میرے جاننے والوں نے مجھے خبر دی

... میں اترنے سے بچانا چاہتا تھا' مگر تم مجھ سے اتنی دور جا چکی تھیں' اتنی پستی میں اتر چکی تھیں کہ تمہارے پاس واپسی کا کوئی راستہ بچا ہی نہیں تھا۔ تم مجھے لاعلم سمجھتی تھیں اور میں اکیلے میں تمہاری بدکرداری پر پھوٹ پھوٹ کر روتا تھا۔ تمہاری حرکتوں کا پتا چلنے کے بعد' چاہے میرا دل تم سے کتنا ہی شاکی کیوں نہ ہوا تھا' مگر میں نے تمہیں ہاسٹل میں رہنے سے منع کیا تھا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لندن لے جانا چاہتا تھا۔ یاد کرو! میں نے تمہیں اپنے ساتھ لندن لے جانے کی کتنی کوشش کی تھی۔ مگر تم میرے ساتھ نہیں گئی تھیں۔ آزادی اور بے راہ روی کے جس راستے پر تم چل پڑی تھیں' وہاں میرے ساتھ رہنا تمہیں بندش لگا تھا۔ میں تمہیں مزید پستیوں میں اترنے سے بچانا چاہتا تھا' مگر زور زبردستی کر کے تمہیں اپنے ساتھ کیسے لے جاتا؟ وہ مغربی معاشرہ جہاں میں نے اپنی بیٹیوں کو پروان چڑھایا تھا' وہاں باپ' اولاد پر زور زبردستی کر نہیں سکتا تھا۔"

وہ اب چپ چاپ ساکت کھڑی باپ کی غم زدہ آواز سن رہی تھی۔ وہ اب نہ تو اس پر چلا رہے تھے' نہ غصہ کر رہے تھے' وہ بس مدھم آواز میں درد اور کرب آنکھوں میں سموئے اس سے بول رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ان کی آنکھوں میں یہ دکھ جھلک رہا تھا کہ جس بیٹی کو انہوں نے دنیا کے تمام رشتوں اور تمام لوگوں سے زیادہ چاہا' اسی نے انہیں سب سے زیادہ دکھ دیے۔ اس کا دل چاہا' وہ دوڑ کر پاپا کے پاس جائے' ان کے سینے سے لگ جائے۔ مگر اس کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکی تھی۔

"تم اخلاقی لحاظ سے ہر برائی میں ملوث رہیں مریم! میں چپ رہا۔ تم کلثوم کے دل میں میرے خلاف زہر بھرتی رہیں' میں چپ رہا۔ اکیلے میں روتا تھا کہ میری دونوں بیٹیاں اپنی اپنی زندگیاں تباہ کر رہی ہیں۔ میں انہیں کیسے روکوں؟ کیسے بچاؤں؟ تم نے مجھے یہ بتانے کے لیے کہ تم مجھ سے بہت محبت کرتی ہو' ہاشم سے شادی کا فیصلہ کیا' تاکہ میں تمہیں ایک پاکستانی شخص سے شادی کرتا دیکھ کر خوش ہو جاؤں۔ مگر میں تمہارے اس فعل پر کیسے خوش ہوتا مریم؟ جانتی ہو تمہاری شادی کے چند دنوں بعد ہاشم کی پہلی بیوی مجھ سے آ کر ملی تھی۔ اس کی آہیں اور بددعائیں جو اس نے مجھے اور تمہیں دی تھیں' ہر لمحہ میرا تعاقب کرتی ہیں۔ میں ڈرتا رہتا ہوں کہ کہیں اس مظلوم عورت اور اس کے معصوم بچوں کی کوئی بددعا' کوئی آہ تمہیں نہ لگ جائے۔ جتنا بھی مجھے تم پر غصہ ہو' جتنا بھی تم نے مجھے مایوس کیا ہو' پر ہو تو تم میری اولاد مریم! تمہیں اگر کوئی تکلیف پہنچی تو سب سے زیادہ درد تو مجھ ہی کو ہو گا نا؟ میں تم سے درخواست کرتا ہوں مریم! خود کو بدلو۔ اتنی بددعائیں مت سمیٹو کہ میری دعائیں بھی تمہیں کسی پکڑ سے بچا نہ سکیں۔"

اس کے پاپا بھیگی ہوئی آواز میں اس سے بولے۔ وہ صوفے پر سے اٹھے اور وہاں سے جانے لگے۔ بغیر ان دونوں میں سے کسی کی بھی طرف دیکھے۔

وہ ان کے پیچھے جانا چاہتی تھی۔ مگر اس کے پاؤں تو زمین نے جکڑ رکھے تھے۔ وہ اپنے پاپا کو بہت شکستہ' بہت ہارے ہوئے قدموں سے کمرے سے جاتا دیکھ رہی تھی۔ کیا وہ پاپا کی نظروں سے گر گئی ہے؟ کیا انہوں نے اسے اپنے دل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال دیا ہے؟ وحشت زدہ ہو کر اس نے اپنے قدموں کو اٹھانا چاہا۔

اس بار اس کے قدم اٹھ گئے تھے۔ وہ تیزی سے کمرے سے باہر جا رہی تھی بغیر لیزا کی طرف دیکھے۔ وہ فوری طور پر اس گھر سے چلے جانا چاہتی تھی۔ وہ اپنے گھر واپس جا رہی تھی۔ اپنے گھر جا کر وہ سکون سے ساری صورت حال کو دوبارہ سے سوچے گی۔ سوچے گی کہ اب کیا' کیا جا سکتا ہے۔ وہ کمزور اور بزدل لڑکی نہیں ہے۔ وہ ام مریم ہے۔ وہ کبھی بھی ہار نہیں سکتی۔ خدا نے اس کی تخلیق اس مٹی سے کی ہے' جس کی فطرت میں ہار ہے ہی نہیں۔ صرف اور صرف جیت ہے۔ صرف اور صرف جیت۔

☼ ☼ ☼

"کیا کہا محمود صاحب نے؟" شہریار خان واپس صوفے پر آکر بیٹھے تو آمنہ نے ان سے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" انہوں نے بے بسی سے آمنہ کو دیکھا۔ "میں ان کے لہجے سے کچھ بھی سمجھ نہیں پایا۔ عجیب الجھا ہوا سا انداز تھا ان کا۔"

زین چپ چاپ باپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اندر ہی اندر اس کا دل پریشان تھا۔ اس کا دماغ مختلف سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ کسی بھی طرح' کسی بھی طرح سکندر کو لیزا کا ساتھ مل جائے۔ کم از کم اس کے بھائی کو زندگی میں یہ ایک خوشی تو مل جائے۔ کل سے پہلے وہ مظلوم تھا' سکندر ظالم تھا۔ کل جب اپنے مظالم اور جرائم کی فہرست سامنے آئی تو دل چاہا تھا' خود کو ختم کر ڈالے' اسی وقت موت کو گلے لگا لے۔ کل زندہ رہنا بہت دشوار لگا تھا اور آج.....

آج اسے پتا چلا تھا کہ اس کی وجہ سے' صرف اور صرف اس کی وجہ سے اس کے بھائی کی زندگی میں پھر اندھیرے اور مایوسیاں آگئی تھیں۔ اس لڑکی ام مریم کو وہ لے کر آیا تھا اپنے گھر میں۔ محبت میں اندھا اور پاگل وہ ہو گیا تھا۔ اس کے بھائی کے کردار پر تہمت لگائی گئی تھی۔ اسے گھر بدر کیا گیا تھا۔ مگر زین شہریار کے گناہ یہاں آکر ختم نہیں ہوئے تھے۔ ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو چکا وہ واقعہ پھر بیچ محفل دہرایا گیا تھا۔ اس کے بھائی کی عزت اور ناموس پر پھر انگلیاں اٹھائی گئی تھیں۔ برسوں بعد اسے ملنے والی ایک خوشی پھر اس کی وجہ سے اس سے چھن رہی تھی۔ اس کا حقیقتاً" دل چاہ رہا تھا' وہ کسی بلند عمارت سے کود جائے یا سمندر میں خود کو غرق کر دے۔ وہ کسی بھی تکلیف دہ اور اذیت ناک ترین انداز میں خود کو ختم کر لینا چاہتا تھا۔ مگر اس کی تو سزا ہی یہی تھی کہ اسے زندہ رہنا تھا۔ اس احساس گناہ کو ساتھ لیے ابھی اسے برسوں زندہ رہنا تھا۔ مُردوں سے بھی بدتر انداز میں' خوف سے نفرت کرتے ہوئے۔

بارہ سال سکندر سے نفرت کی تھی' اب زندگی کے باقی تمام عرصے میں اسے خود سے نفرت کرنی تھی۔

"اب کیا ہوگا شہریار؟" اس کے کانوں میں اپنی ماں کی آواز آئی۔ ڈر' خوف اور اندیشوں میں گھری ہوئی آواز۔

"پتا نہیں۔" گم صم سے انداز میں شہریار خان بولے۔ ان کے چہرے پر پریشانی ہی پریشانی تھی۔ وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ وہ بہت پریشان تھے۔ یکدم ہی انہوں نے آمنہ سے پوچھا۔

"آمنہ! سکندر کہاں ہے؟" باپ کے اس سوال پر وہ بھی بری طرح چونکا تھا۔

"شاید اپنے ہوٹل چلا گیا ہوگا۔ مجھے نہیں پتا۔ وہ مجھ سے پہلے لیزا کے گھر سے نکل گیا تھا۔" آمنہ رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔ جو اندیشے اس کے باپ کے دل میں پیدا ہو رہے تھے' وہی اس کے بھی دل میں پیدا ہونے لگے تھے۔

"سکندر ٹھیک تو تھا نا؟ وہ ٹھیک تو تھا نا؟" یکدم ہی بے چین ہو کر اس نے آمنہ کا موبائل اٹھایا۔ وہ اس پر سکندر کو کال ملانے لگا تھا۔

کال مل گئی تھی۔ بیل جا رہی تھی۔ مگر کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔ شہریار خان جیسے اس کے فون اٹھانے کے انداز سے ہی سمجھ گئے تھے کہ وہ کسے کال ملا رہا ہے۔

"کیا ہوا؟" اس کے چہرے پر مایوسی دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

"سکندر کال ریسیو نہیں کر رہا۔" وہ کئی مرتبہ کوشش کر چکا تھا۔

"تم اس کے ہوٹل فون کرو۔"

"پاپا! فون نہیں کریں۔ ہم اس کے ہوٹل خود چلے جاتے ہیں۔" وہ باپ سے سنجیدگی سے بولا۔

"شہریار! میرا بچہ خیریت سے تو ہوگا نا؟ مجھے اس کی بہت فکر ہو رہی ہے۔ وہ لیزا کے گھر سے بہت غصے میں نکلا تھا۔"

آمنہ خوف سے کانپتی' رندھی ہوئی آواز میں

...پر آرہا تھا' وہ اس کے اور شہریار خان کے دل اور دماغ میں پھیل رہا تھا۔ سکندر کی زندگی میں سب کچھ ٹھیک کر دینے کی فکر سے بھی زیادہ یکلخت ہی یہ فکر لاحق ہوئی تھی کہ وہ کہاں تھا؟ وہ خیریت سے تو تھا نا؟

☼ ☼ ☼

وہ گاڑی چلا رہا تھا۔ شہریار خان اس کے برابر میں بیٹھے تھے۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ وہ دونوں بہت پریشان تھے۔ اس کے بھائی کی زندگی ایک بار پھر آندھیوں کی زد میں تھی اور اس کی وجہ وہ تھا۔ کل بھی سکندر کی زندگی اسی کی وجہ سے تباہ ہوئی تھی' آج بھی اس کی تباہی کا سبب وہ ہی تھا۔ اس بدکردار لڑکی سے اندھی محبت میں مبتلا ہو کر اس نے بھائی کی زندگی ہی برباد کر ڈالی تھی۔

وہ باپ' بیٹا ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ اس کا بھائی اپنا گھر ہوتے ہوئے بھی برسوں بعد وطن آنے پر ایک ہوٹل میں کیوں رہ رہا ہے؟ اس ہوٹل میں قدم رکھتے ہوئے یہ سوچ اسے رلا رہی تھی۔ وہ کیسا بھائی ہے۔ وہ کیسا بھائی ہے۔ ایسی نفرت تو کوئی اپنے بدترین دشمن سے بھی نہیں کرتا ہوگا' جو حسد کی آگ میں جل کر اس نے اپنے بھائی سے کی تھی۔ وہ دونوں استقبالیہ پر آگئے تھے۔

"ہمیں سکندر شہریار سے ملنا ہے۔ روم نمبر نہیں پتا' مگر اتنا معلوم ہے کہ وہ یہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔" استقبالیہ پر موجود اس مہذب' خوش اخلاق لڑکی سے اس نے کہا۔ چند لمحے کہیں پر چیک کرنے کے بعد جو جواب اس لڑکی نے انہیں دیا وہ اس کے اور شہریار خان کے حواس گم کر دینے کے لیے کافی تھا۔

سکندر شہریار ہوٹل میں موجود نہیں تھا۔ وہ آج دوپہر سے کہیں گیا ہوا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

بے اختیار شہریار خان نے سہارے کے لیے اس کا بازو تھاما تھا۔ اس نے باپ کو سنبھال لیا تھا۔

"پاپا! سکندر ٹھیک ہوگا۔ آپ فکر مت کریں۔" وہ دونوں ہوٹل سے واپس نکل کر گاڑی میں آکر بیٹھے تو اس نے سکندر کے موبائل پر پھر کال کی۔ ایک' دو' تین نجانے کتنی مرتبہ اس نے کالز ملائی تھیں۔

"زین! میرا دل گھبرا رہا ہے۔ کہیں وہ خود کو کوئی نقصان نہ پہنچا لے۔" اس نے اپنے بہت مضبوط باپ کو پھر ٹوٹتا دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں نمی دیکھی۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا پاپا! آپ اللہ پر بھروسا رکھیں۔"

"زین! سکندر کو ڈھونڈو۔ کسی بھی طرح اسے ڈھونڈو۔ اس بار اگر ہم نے اسے کھو دیا تو دوبارہ کبھی تلاش نہیں کر پائیں گے۔ وہ یا تو خود کو کوئی نقصان پہنچا دے گا یا پھر خود کو دنیا کی بھیڑ میں گم کر دے گا کہ ہم اسے تلاشتے رہ جائیں گے۔ اسے ڈھونڈو زین!" شہریار خان اس کے بازو کو جکڑ کر روتے ہوئے بولے۔

"پاپا! پلیز' خود کو سنبھالیں۔ آپ اس طرح کریں گے تو امو جان تو بالکل ہی حوصلہ ہار دیں گی۔" اندر ہی اندر اس کا دل بری طرح لرز رہا تھا۔

"وہ بہت غیرت مند بیٹا ہے میرا۔ ایک بار میں نے اسے گھر سے نکالا' اس سے سب رشتے ناتے توڑ دیے تو وہ پلٹ کر پھر کبھی کوئی مدد مانگنے میرے پاس نہیں آیا۔ اس نے خود کو دنیا کے ہجوم میں گم کر لیا تھا زین! میں اسے ڈھونڈ پایا تھا' یہ میری خوش قسمتی ہے۔ مگر اب کی بار جو پھر سے اس کی عزت اور آبرو کا تماشا لگایا گیا ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ میں اور تم اس بار اسے ڈھونڈ نہیں پائیں گے۔ اگر اس نے خود کو کہیں گم کر دیا تو۔"

وہ اپنے روتے ہوئے باپ کو بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں واپس گھر پہنچ چکے تھے۔ جتنے اشک بہانے تھے' جتنے خوف اور اندیشوں کا اظہار کرنا تھا' وہ شہریار خان راستے میں کر چکے تھے۔ گھر پہنچتے ہی انہوں نے خود پر جبر کر کے' بہت کوشش کر کے اپنا آپ سنبھالا تھا۔

"آمنہ کو یہ مت بتانا زین! کہ سکندر ہمیں نہیں ملا ہے۔"

انہیں جیسے سکندر کے ساتھ ساتھ بیوی کی صحت کی بھی فکر تھی۔ اس نے خاموشی سے محض سر اثبات میں ہلایا تھا۔ اندر ہی اندر اس کا ذہن بہت تیز رفتاری سے کام کرتا یہ سوچ رہا تھا کہ وہ اب سکندر کو کہاں ڈھونڈے؟ کیا وہ ایئر پورٹ جائے؟ کیا وہ آج دوہا اور امریکا جانے والی فلائٹس کا پتا کرے؟

☆ ☆ ☆

وہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی تھی۔ اسی طرح جس طرح محمود خالد اور سیم کی یہاں موجودگی کے وقت بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے ٹوٹے ہوئے گلاس کے ٹکڑے اسی طرح فرش پر بکھرے تھے۔ وہ بالکل ڈری اور سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ دوپہر سے شام ہو چکی تھی' اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔

وہ بالکل خالی خالی نگاہوں سے اپنے کمرے کو دیکھ رہی تھی۔ اسے دنیا' زندگی' رشتے' ہر شے بے معنی لگ رہی تھی۔ سیم کی نفرت کی نظریں' اس کے زہر میں بجھے الفاظ اسے اس طرح سہا گئے تھے کہ خوف کے مارے وہ رو بھی نہیں پا رہی تھی۔ اس نے ساری زندگی سیم سے محبت کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے عمر بھر اپنی حسین اور ذہین بہن پر فخر کیا تھا' اس کو ہمیشہ خود سے برتر تسلیم کیا تھا۔ اس سے بے تحاشا محبت کی تھی۔ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں اسے فیصلے کرنے کا حق دیا تھا۔ سیم اس سے جو کہتی' وہ آنکھیں بند کر کے کیے جاتی۔ سیم کہہ رہی ہے تو اسی میں اس کی بہتری ہے۔ اس لیے کہ سیم سے زیادہ تو اس کا بھلا کوئی چاہ ہی نہیں سکتا۔ وہ عمر بھر اپنے باپ کو اپنا دشمن سمجھتی رہی۔ اس کی اگر کوئی دوست تھی' اگر کسی ایک رشتے میں وہ اپنا ہر رشتہ دیکھتی تھی تو وہ اس کی پیاری بہن تھی۔ اس کی پیاری سیم تھی اور سیم کہہ رہی تھی' وہ اس سے نفرت کرتی ہے۔ آج سے نہیں' بلکہ ہمیشہ سے۔ وہ اسے تباہ و برباد کرنا چاہتی ہے۔ وہ اس سے اس کی ساری خوشیاں چھین لینا چاہتی ہے۔

اپنی سب سے عزیز' جان سے بڑھ کر پیاری بہن کا یہ بھیانک روپ وہ دیکھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ واقعی سہم گئی تھی۔ وہ اس تیرہ سال کی لیزا کی طرح ڈر گئی تھی' جس سے اس کا گھر اور بہن چھینی جا رہی تھی۔ محبت' وفا' اعتبار' چاہت' بھروسا' رشتے کیا سب بے معنی ہیں؟ جان سے عزیز شخص بھی اگر قابل اعتبار نہیں تو پھر انسان اعتبار کس پر کرے؟ وہ درد کی ان انتہاؤں پر تھی کہ اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں بہہ رہا تھا۔ وہ رونا چاہتی تھی' وہ سیم کی نفرتوں پر چلا چلا کر رونا چاہتی تھی' پر اس سے رویا نہیں جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے کنارے بالکل خشک تھے۔

اس کا دل بالکل بنجر و ویران ہو رہا تھا۔ اسے اس وقت دنیا کا کوئی شخص یاد نہیں آ رہا تھا۔ کوئی رشتہ یاد نہیں رہا تھا۔ یاد رہا تھا تو اتنا کہ سیم اس سے نفرت کرتی ہے۔ سیم کا وہ پیار جس پر وہ فخر کیا کرتی تھی' جھوٹ تھا۔ سیم کی نفرت وہ سہہ نہیں پا رہی تھی۔ یہ تلخ ترین سچائی وہ برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کی محبت' اس کا بھروسا' اس کا یقین بے یقین ہو رہے تھے۔ یہ درد اس کی برداشت سے بہت زیادہ تھا۔ کوئی آ کر اسے بتا دے کہ سیم نے جو کچھ کہا' وہ سب جھوٹ تھا یا پھر سیم ہی واپس آ جائے۔ آ کر ہنستے ہوئے اسے گلے لگا لے۔

"مجھے ایسا سمجھتی ہو تم؟ پاگل! میں تم سے اپنی جان سے بھی زیادہ محبت کرتی ہوں۔ کیا میں نے تمہیں ممی اور پاپا سے بھی زیادہ پیار نہیں دیا تھا؟ پھر تم میری محبت پر شک بھی کس طرح کر سکتی ہو لزا؟"

پیار سے ڈانٹتے ہوئے وہ اسے گلے لگا لے۔ اسے پیار کرے۔

"سیم! آ جاؤ... سیم! پلیز آ جاؤ۔ آ کر کہو جو تم نے ابھی کہا' وہ سب جھوٹ تھا۔ سیم! آ جاؤ۔ مجھے بے یقین ہونے سے بچا لو سیم! میں کبھی کسی رشتے پر بھروسا نہ کر پاؤں گی' اگر تم نہ آئیں تو۔"

اس کا دل چاہ رہا تھا' وہ چلا چلا کر سیم کو پکارے۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عتیقہ محمد بیگ

جو سحر

"سحرش بہو... سحرش بہو...!" فاطمہ نے زلیخا کے گھر میں قدم رکھتے ہی اس کی بہو کو پکارا اور سیدھی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ سحرش عام طور پر اسے یہیں ملتی تھی۔ مگر آج وہاں زلیخا تھی۔ وہ اپنے لیے کھانا نکال رہی تھی... فاطمہ اور زلیخا کزنز تھیں اور دونوں میں بہت گہری دوستی تھی۔ زلیخا اسے دیکھ کر خوش ہو گئی۔

"آؤ! آؤ...

سحرش باتھ روم میں ہے۔ وہ ہنڈیا پکا کر نہانے چلی گئی ہے۔ بولو! کیا بات ہے؟" زلیخا نے دیکھا' فاطمہ کا

چہرہ بجھا ہوا ہے اور اس کے ہاتھ میں آٹے کی پرات تھی۔

"فریج خراب ہو گیا ہے کیا؟" زلیخا نے فکر مندی سے پوچھا۔

"نہیں... نہیں... فریج خراب نہیں ہوا... میری قسمت خراب ہو گئی، جو میں نے اپنے اکلوتے لاڈلے بیٹے ہارون کی شادی اپنی بھتیجی نور سے کر دی... وہ میم "جونا" اچھی تھی۔ اگر وہ میری بہو ہوتی تو شاید آج مجھے سحرش بہو سے روٹی بنوانے یہاں نہ آنا پڑتا۔" فاطمہ نے کانپتی آواز سے جواب دیا اور اسٹول پر بیٹھ گئی۔

"اوہو... آٹا لانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔" زلیخا نے اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھام کر تسلی دی۔

"بس زلیخا بہن! اس نور نے تو میری مت مار دی ہے۔ مجھے غصے میں اندازہ ہی نہیں ہوا... اور یہ آٹے کی پرات ہی اٹھا لائی۔" اس نے شرمندہ ہو کر بات بتائی۔

"اچھا... اچھا! لیکن تم اتنی پریشان کیوں ہو۔ بات کیا ہے؟" زلیخا نے فکر مندی سے پوچھا۔

فاطمہ کانپتی آواز سے بولی۔ "مجھے جونا میم کی بددعا لگ گئی ہے۔ نور میری بھتیجی اب پہلے جیسی نہیں رہی۔ شادی سے پہلے تو میرے گھر کا سارا کام کر جاتی تھی۔ اب جب سے بہو بنی ہے۔ کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی... اور شکایت کرو تو زبان چلاتی ہے... یا اللہ! مجھے معاف کر دے۔ میں نے جونا میم کو اپنے ہارون سے جدا کیا۔ اس کا دل توڑا۔ بدلے میں تو مجھے دکھ دے رہا ہے۔" فاطمہ نے ہاتھ جوڑ کر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی۔

"اری پگلی! تمہیں کسی کی بددعا نہیں لگی... نور ابھی بچی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ بہتر ہو جائے گا۔ سحرش نے دال اور کدو بنائے ہیں۔ کھانا کھا لو۔ پھر باتیں کرتے ہیں۔" زلیخا نے اس کے لیے بھی کھانا نکالا اور پھر اس کے سامنے رکھی چھوٹی ٹیبل پر کھانا رکھ دیا۔

"میری تو بھوک اس نور کی بچی نے اڑا دی... خود بازار کو نکل گئی۔ میں نے ہنڈیا کا پوچھا تو بدلے میں جواب دیا۔ "کل کا سالن فریج میں پڑا ہے۔ آج اسی سے گزارہ کر لیں۔" فاطمہ نے اپنی بہو کی نقل کرتے ہوئے کہا۔

بس بچی ہے' معاف کر دو۔ اسے تھوڑا وقت دو۔ سب بہتر ہو جائے گا۔ تم کھانا کھاؤ۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" زلیخا نے نوالہ چباتے چباتے اسے تسلی دی۔ فاطمہ نے کھانا شروع کیا اور پھر بولی۔

"آج تو میرا دل کر رہا ہے' دارالامان میں چلی جاؤں... روز بہو کے ہاتھوں ذلیل تو نہیں ہونا پڑے گا۔ کل دوائی کے پیسے مانگے تو بولی "اب بڑھاپے میں تو روز ہی بخار ہو گا... بیٹے کی کمائی دوائیوں پر ضائع نہ کریں۔" فاطمہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"اوہو فاطمہ! حوصلہ کرو... تم بچی تھوڑا ہی ہو۔" زلیخا نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا۔

"بس زلیخا! میں اپنی بہو سے، بہت تنگ آ چکی ہوں۔ ہارون سے شکایت بھی نہیں کر سکتی۔ وہ تو الٹا مجھے ہی برا بھلا سنائے گا... میں نے اس کی پسند جونا میم کو قبول جو نہیں کیا تھا اور پھر نور جیسی تباہی خود ہی گھر لے آئی۔ اس نے میرا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ ایسا سلوک کرتی ہے جیسے میں اس کی ساس نہیں' کوئی ملازمہ ہوں۔ سعد کو رات کے وقت میرے کمرے میں چھوڑ جاتی ہے... اب چھوٹے سے بچے کو رات میں ماں کے پاس ہونا چاہیے۔ اسے کبھی بھی بھوک لگ سکتی ہے... یہ بات سمجھاتی ہوں تو الٹا جواب ملتا ہے کہ اپنے پوتے کی بھوک کی فکر ہے' میری نیند کی نہیں۔ بس چھوٹی سے چھوٹی بات پہ بحث کرتی ہے... اور پھر مجھ سے جھگڑ کر کے کمرا بند کر لیتی ہے۔" فاطمہ اپنے گھر کی حالت بیان کرتی چلی گئی۔

"تم اپنی بھابھی سے بات کرو... وہ شاید اپنی بیٹی کو سمجھا سکے۔" زلیخا نے سوچ کر مشورہ دیا۔

"دکھ تو اسی بات کا ہے... بھابھی بھی تو یہ ہی چاہتی

ہیں کہ ان کی بیٹی کا سارے گھر پر راج ہو۔ اب تو ہارون نے باہر سے پیسے بھی اسی کے نام پر بھیجنے شروع کر دیے ہیں... میں نے اس بارے میں بہو سے بات کی تو الٹا جواب ملا... میرا شوہر ہے... میرے نام پر ہی پیسے بھیجے گا... کسی اور کے نام پر تو نہیں بھیج سکتا... لو بھلا! شادی کے بعد جیسے وہ میرا بیٹا نہیں رہا اور نہ میں اس کی ماں رہی۔" فاطمہ کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے وہ اپنی قسمت پر رو رہی تھی کہ اس نے انسانوں کو پہچاننے میں غلطی کی ہے' اب اسے جونا میم یاد آ رہی تھی۔ وہ ہارون کی لندن میں دوست بنی تھی۔ ہارون اسے پاکستان ماں سے ملوانے لایا تھا۔ وہ جونا سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر فاطمہ نے زہر کھانے کی دھمکی دے کر اسے جونا سے الگ کیا۔ ایک ہفتے میں ہی اس نے جونا میم کو لندن واپس بھجوا دیا اور جیسے تیسے کر کے ہارون کو نور کے ساتھ شادی کرنے پر رضامند کر لیا۔

ایک سال نور نے گھر میں فرماں برداری سے گزارا مگر پھر بیٹے سعد کی پیدائش کے بعد اس نے اپنے رنگ دکھانے شروع کر دیے۔ اس کا رویہ فاطمہ سے اکھڑا اکھڑا رہنے لگا اور پھر ہارون کے لندن چلے جانے کے بعد اس نے زبان چلانا بھی شروع کر دی۔ اور پھر گھر میں روز ایک نیا تماشا ہونے لگا۔ فاطمہ سارا دن یہ سوچتی رہتی کہ اس نے جونا میم کا دل دکھایا ہے اللہ تعالیٰ اسے اسی بات کی سزا دے رہا ہے۔ زلیخا سے اپنے دکھڑے رو کر اس کے دل کا بوجھ کافی ہلکا ہو گیا اور وہ تھوڑا پرسکون ہو گئی۔ زلیخا نے بھی اسے اچھے مشورے دیے کہ جس سے گھر کا سکون تباہ نہ ہو اور دونوں ساس بہو خوشی خوشی گھر میں رہیں مگر شاید فاطمہ کے نصیب میں سکھ نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

جس وقت وہ زلیخا کے گھر سے اپنے گھر پہنچی تو شام کے چھ بج رہے تھے گھر کا دروازہ کھلا تھا اور اندر اونچی آواز میں گانا بج رہا تھا۔

"توبہ توبہ... یہ دن رہ گیا تھا... سو... نور نے یہ بھی پورا کر دیا۔"

فاطمہ غصے سے گھر میں داخل ہوئی۔ صحن میں تین چار بچے کھیل رہے تھے اور ڈرائنگ روم میں کچھ عورتیں بیٹھی تھیں۔ فاطمہ نے غور سے دیکھا تو یہ نور کی وہی سہیلیاں تھیں جو ایک ہفتہ پہلے اس کے گھر پر کھانا کھا کر گئی تھیں۔ نور اپنی سہیلیوں میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ فاطمہ نے اپنے قدم باورچی خانے کی طرف بڑھا دیے۔

وہ باورچی خانے میں گنگنا گنگنا کر پلیٹوں میں لوازمات سجا رہی تھی۔ کسی پلیٹ میں شامی کباب تو کسی میں تکہ بوٹی... ایک ڈش بریانی سے سجی ہوئی تھی اور ایک ڈونگے میں مٹن قورمہ تھا۔ یہ سب دیکھ کر فاطمہ کا پارہ اونچا ہو گیا۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی اس نے یہ سب اہتمام دیکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ لب کھولتی' نور نے اس کی آہٹ محسوس کر لی... وہ فوراً" منہ بسور کر بولی۔

"اماں! بس... اب پلیز مجھے نصیحتیں مت کیجیے گا کہ میں پیسوں کو ضائع کر رہی ہوں... بازار شاپنگ کے لیے گئی تھی تو راستے میں سہیلیاں مل گئیں۔ یوں وہ میرے گھر آ گئیں۔ میں ان لوگوں کو منع نہیں کر سکی۔" اس نے اپنی بات ختم کر کے فاطمہ کی طرف سے رخ موڑ لیا اور اپنا کام کرنے لگی۔ فاطمہ خفگی سے بولی۔

"میری دوائیاں گھر میں آئیں تو تب پیسے ضائع ہوتے نظر آتے ہیں اور اب یہ چار چار کھانے فضول خرچی نہیں کیا؟"

"خدا کے لیے اماں! میرا موڈ آف مت کریں' ورنہ..." اس نے تلخی میں کہا۔

"کیا ورنہ...؟ ورنہ سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" فاطمہ نے اسے بازو سے جھنجھوڑ کر پوچھا۔

"ورنہ میں ہارون سے کہہ کر اپنے لیے ایک الگ

گھر بنوالوں گی۔ پھر اپنے اس گھر میں اکیلی حکمرانی کرتی رہیے گا۔ میری تو جان چھوٹے گی۔" اس نے خفگی سے برے اٹھائی اور باورچی خانے سے پاؤں پٹختے ہوئے نکل گئی۔

فاطمہ اس کے تیور دیکھتی رہ گئی۔

وہ بجھے دل سے اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ ڈرائنگ روم سے نور کی سہیلی کرن کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"یار! تمہاری ساس صاحبہ گھر آگئی ہیں۔ انہیں بھی کھانے پر بلالو۔ کہیں برا نہ مان جائیں۔"

"اوہو۔ یار۔ کیوں پارٹی کا مزا خراب کرنا چاہتی ہو۔ ان کا معدہ کمزور ہو گیا ہے۔ اب وہ یہ سب کچھ ہضم نہیں کر سکتیں۔ اپنے وقت پر انہوں نے بہت عیاشی کی ہے۔ چلو! تم کھانا شروع کرو۔" نور نے تلخ انداز سے جواب دیا۔

اس کی بات سن کر فاطمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ اپنے کمرے آگئی۔ اس رات وہ پھر سو نہ پائی اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گھر کے حالات بہتر ہونے کی دعائیں مانگتی رہی۔

☼ ☼ ☼

زلیخا اگلی صبح اس کے لیے کھیر بنا کر لے آئی۔ وہ بھی اپنی سہیلی کی پریشانی کا سوچ کر رات سو نہ سکی تھی۔ وہ فاطمہ کے گھر آئی تو نور اسے دروازے پر مل گئی۔

"السلام علیکم آنٹی!" نور نے پیار سے سلام کیا۔ اس نے سعد کو گود میں اٹھایا ہوا تھا۔

"کہیں جا رہی ہو؟" زلیخا نے شائستگی سے پوچھا۔

"جی خالہ جان! اماں کا فون آیا ہے۔ ان کا دل مجھ سے ملنے کو چاہ رہا تھا۔ کافی دنوں سے جا نہیں پائی ہوں ناں۔" زلیخا جانتی تھی کہ وہ۔ جھوٹ بول رہی ہے کیونکہ فاطمہ نے اسے کل ہی بتایا تھا کہ نور ہفتے میں تین مرتبہ اپنے میکے جا بیٹھتی ہے اور گھر کا سارا کام اسے دیکھنا پڑتا ہے۔

"اچھا بیٹی! خوش رہو اور اپنی ماں کو میرا سلام دینا۔" زلیخا نے اسے پیار سے رخصت کیا اور فاطمہ کے کمرے میں آگئی۔ وہ چارپائی پر بے جان سی پڑی دکھائی دی۔

"السلام علیکم!" وہ اس کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

فاطمہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ زلیخا نے فکر مندی سے اسے دیکھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا فاطمہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"خود کو سنبھالو فاطمہ! اور سمجھ داری سے اپنے بگڑے گھر کو خوش حال بناؤ۔ یوں اداس رہ کر اپنا خون جلانے سے تو بات نہیں بنے گی۔" زلیخا نے کھیر کا ڈونگا ٹیبل پر رکھ دیا اور اس کے آنسو پونچھے۔ فاطمہ روتے روتے بولی۔

"زلیخا بہن! میں تو ہارون سے شکایت بھی نہیں کر سکتی۔ وہ تو جونا کے معاملے پر مجھ سے ناراض ہو گیا تھا۔ کافی دنوں تک اداس بھی رہا تھا۔ اس کی خوشیاں میں نے چھین لی تھیں۔ اب نور کی شکایت کر کے میں اسے دوبارہ اداس نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے تو جونا میم نے ایسی بد دعا دی ہے۔ میں تو روز اسے یاد کرتی ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتی ہوں کہ مجھے اس کا دل دکھانے پر معاف کر دے۔" فاطمہ نے پھر جونا میم کی بات چھیڑ دی۔

"فاطمہ! بھول جاؤ جونا میم کو۔ اور اپنے رب سے دعا مانگو۔ وہ تمہاری ہر مشکل آسان کر دے گا۔" زلیخا نے اسے پیار سے سمجھایا۔

"ہاں! تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ مجھے اپنے لیے، اپنے گھر کے سکون کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگنی چاہئیں۔" فاطمہ نے اپنے پلو سے آنسو پونچھے اور قدرے مطمئن دکھائی دینے لگی۔

"لو! کھیر کھاؤ سحرش نے بنائی ہے۔ حیدر کو کھیر پسند ہے نا۔ میری بہو حیدر کی پسند کا بہت خیال رکھتی ہے اور اس کی ناراضی سے بہت ڈرتی ہے۔ میں تو دعا کرتی ہوں کہ تمہاری نور میں سحرش کی روح آ بسے۔" زلیخا نے اسے ڈونگا تھمایا۔

"ماشاء اللہ۔ بہت سلیقے سے سجایا ہے اس نے کھیر کو باداموں سے۔" فاطمہ نے ڈونگے سے پلیٹ ہٹا کر دیکھتے ہوئے تعریف کی۔

"اچھا۔ اب چمچے اور پلیٹیں تو لاؤ۔ چلو اٹھو!" زلیخا نے اس کا موڈ بدلنا چاہا۔ فاطمہ چہرے پر مسکراہٹ سجا کر اٹھی۔

"ابھی لاتی ہوں۔"

فاطمہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ کر اسے سکون سا ملا۔ پانچ منٹ کے بعد فاطمہ پلیٹیں لے آئی۔ زلیخا نے اسے ایک پلیٹ میں کھیر ڈال کر تھمائی۔

"تمہیں شبو یاد ہے؟" زلیخا نے کھیر کھاتے ہوئے فاطمہ سے پوچھا۔

"کون شبو؟" فاطمہ نے ذہن پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

"کلثوم کی بیٹی شبو۔ وہ ہی جو میرے حیدر پر۔" اس نے بات ادھوری چھوڑی۔

"ہاں۔ ہاں۔ مجھے یاد آیا۔ وہ حیدر کو پسند کرتی تھی۔ مگر حیدر اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ کیوں کیا ہوا اسے؟" فاطمہ نے تجسس سے پوچھا۔

"تو سمجھ لو۔ یہ لذیذ کھیر جو ہم مزے لے لے کر کھا رہے ہیں۔ یہ اسی کی وجہ سے ہے۔" زلیخا نے ہنستے ہنستے بتایا۔

"کیا مطلب؟ یہ کھیر شبو نے بنائی ہے کیا؟ مگر تم تو کہہ رہی تھیں کہ سحرش نے بنائی ہے۔"

"اوہو۔ ایک ہفتہ پہلے شبو ہمارے گھر کھیر دینے آئی تھی۔ حیدر نے خوب تعریف کی۔ بس پھر کیا۔ سحرش کو یہ بات بالکل پسند نہ آئی کہ اس کا میاں کسی اور کی تعریف کرے۔ سو آج اس نے بہت محنت

سے کھیر پکائی ہے اور دیکھ لو! کتنی مزے کی ہے۔"

"کوئی بیوی اپنے شوہر کے منہ سے کسی کی تعریف برداشت نہیں کر سکتی۔" فاطمہ ہنسی۔

"تو اور کیا۔۔۔" زلیخا نے بھی قہقہہ لگایا۔

"اوہو۔۔۔ یہ بات میرے ذہن میں پہلے کیوں نہیں آئی۔" یکدم فاطمہ کے چہرے پر معنی خیز سوچ ابھری اور پھر اس کا چہرہ کھل سا گیا۔

☼ ☼ ☼

"اماں۔۔۔! ہارون کا فون آیا ہے۔۔۔ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔" نور نے منہ بسور کے سیل فون اسے تھمایا۔ اس کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ ہارون کی بات ماں سے ہو۔۔۔ مگر وہ ہارون کو منع بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے فاطمہ کو فون دے کر کمرے سے باہر آ گئی، مگر پھر دروازے کے پیچھے چھپ گئی۔ وہ ہمیشہ ایسا کیا کرتی تھی۔ فاطمہ کو اس بات کا علم تھا کہ جب وہ ہارون سے بات کرتی ہے تو نور چھپ کر سنتی ہے۔

"ہارون بیٹا! میں ٹھیک ہوں۔ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

"بس بیٹا! دل پر بہت بڑا بوجھ محسوس ہوتا ہے۔" فاطمہ نے ہلکی آواز میں کہا۔ دروازے کے پیچھے چھپی نور منہ میں بڑبڑائی۔

"اب یہ میری شکایت کریں گی۔ اگر انہوں نے ہارون کو میرے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی تو میں واقعی یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔" اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا۔

مگر یہ کیا؟ اس کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ جو بات اس نے فاطمہ کے منہ سے سنی۔

"بیٹا! جونا سے مل کر اس سے معافی مانگو۔۔۔ اور میری طرف سے بھی معافی مانگنا۔ ہم نے اس لڑکی جونا کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" فاطمہ نے افسردگی سے سمجھایا۔

"مگر اماں! اب میں کیسے اس سے دوبارہ بات کروں؟" ہارون ماں کی بات پر افسردہ سا ہو گیا۔ وہ خود کو جونا کا گناہ گار سمجھتا تھا۔

"بس بیٹا! تم جونا سے ملو۔۔۔ اس سے ابھی جا کر معافی مانگو۔" فاطمہ نے بچوں کی طرح ضد کی۔ نور کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

"یا اللہ۔۔۔ یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ اماں تو جونا سے سخت نفرت کرتی تھیں۔۔۔ اور اب ہارون اگر جونا کے پاس معافی مانگنے چلے گئے تو ان دونوں میں دوستی۔۔۔ اور پھر کہیں شادی۔۔۔ توبہ توبہ..... یہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔" اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ فاطمہ نے رونا شروع کر دیا تھا۔

"بس بیٹا! وعدہ کرو کہ تم اس سے معافی مانگنے اس کے گھر جاؤ گے۔۔۔ مجھے اس کو بے عزت کر کے اپنے گھر سے نہیں نکالنا چاہیے تھا۔" فاطمہ نے روتے روتے جونا والا واقعہ یاد کیا۔

"اچھا! اماں میں ضرور جاؤں گا۔"

"شکر ہے! تو نے میری بات مان لی۔۔۔ آج ہی آفس سے چھٹی کے بعد سیدھا چلے جانا۔" فاطمہ نے اسے تاکید کی۔

"اچھا۔۔۔ اماں۔" ہارون نے پھر پیار سے فون بند کیا۔ فاطمہ نور کو سنانے کے لیے زور سے بولی۔

"جونا! تو بہت اچھی لڑکی تھی۔۔۔ مجھے ہی سمجھنے میں دیر ہو گئی۔"

نور یہ سن کر چکرا گئی اور روتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

☼ ☼ ☼

رات کے آخری پہر نور اور کرن سیل فون پر باتیں کر رہی تھیں۔ نور پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور کرن اسے دلاسا دے رہی تھی۔

"نور۔۔۔ پلیز خود پر قابو پاؤ۔۔۔ بچوں کی طرح رونا بند کرو۔" کرن نے پیار سے اسے سمجھایا۔

"ہارون، جونا سے محبت کرتے تھے۔۔۔ مگر اماں کی وجہ سے انہوں نے اپنی محبت کی قربانی دے دی اور مجھ سے شادی کر لی۔۔۔ مگر اب تو اماں نے خود انہیں جونا کے

پاس بھیجا ہے۔ جونا بہت پیاری لڑکی تھی۔ کہیں ہارون کا دل پھر اس کے لیے دھڑکنے لگا، تو میرا کیا ہو گا۔" وہ روتے روتے بولی۔

"یار! تمہیں اپنی ساس کے دل میں جگہ بنا لینی چاہیے، تاکہ کبھی بھی کوئی برا وقت آئے تو وہ تمہارا ساتھ دیں، مگر تم تو۔۔۔" کرن نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"نہیں۔۔۔ میں۔۔۔ اماں کے دل میں بہت جلد پھر جگہ بنا لوں گی۔ میں اب کبھی ان سے جھگڑا نہیں کروں گی۔۔۔ میں ان سے معافی مانگ لوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے معاف کر دیں گی۔" نور نے اچانک فیصلہ کیا تھا۔

"یہ تمہارے لیے بہتر رہے گا۔ اگر تمہاری ساس تم سے خوش ہوں گی۔۔۔ تو وہ تمہاری جگہ کبھی کسی کو نہیں لینے دیں گی۔"

"مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی۔۔۔ یا اللہ! جلدی سے صبح کر دے، میں اماں جی کے لیے آلو کے پراٹھے بنا کر ان سے معافی مانگ لوں گی۔۔۔ انہیں آلو کے پراٹھے بہت پسند ہیں۔" نور نے بے تابی سے کہا۔

"ساس کی خدمت کرو۔۔۔ اسی میں بہتری ہے۔۔۔ اچھا، اب سو جاؤ۔ کہیں میرے میاں نہ جاگ اٹھیں۔" کرن نے اسے سمجھا کر فون بند کر دیا اور وہ کروٹیں بدلتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

فاطمہ اس رات مزے سے سو گئی۔ صبح اس کی آنکھ تب کھلی، جب نور نے ناشتے کی ٹرے میز پر رکھی۔

وہ آنکھیں مسلتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ نور نے جھٹ فاطمہ کے پاؤں پکڑ لیے۔

"ارے۔۔۔ نور۔۔۔ یہ کیا کر رہی ہو۔" فاطمہ بظاہر گھبرا کر بولی، مگر دل ہی دل میں وہ بہت خوش تھی، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ نور اس سے کیوں معافی مانگنے آئی ہے۔

"اماں۔۔۔ اماں۔۔۔! مجھے معاف کر دیں۔۔۔ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔"

"نور بیٹی۔۔۔! بس بس۔۔۔ تمہیں پاؤں پڑنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ اور کس گھر میں ساس بہو کے جھگڑے نہیں ہوتے؟"

"اماں۔۔۔! تو کیا آپ نے مجھے معاف کر دیا؟" وہ روتے روتے بولی۔

"تو اور کیا... اور یہ کیا۔۔۔؟ آلو کے پراٹھے۔۔۔ واہ۔۔۔ واہ!"

"اماں۔۔۔! آپ کو راضی کرنے کے لیے آپ کے من پسند آلو کے پراٹھے بنائے ہیں۔" اس نے مسکرا کر ٹرے اٹھا کر فاطمہ کو تھمائی۔ فاطمہ نے پراٹھے کا ایک نوالہ توڑا اور نور کے منہ میں ڈالا۔

"اماں۔۔۔! آپ تو کھائیے۔" وہ نوالہ چباتے چباتے محبت سے بولی۔

"ایسا کرو۔۔۔ پراٹھے ٹفن میں پیک کر دو۔ میں زلیخا کی طرف ناشتا کروں گی۔" فاطمہ بستر سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"جو آپ کا حکم اماں۔۔۔!" نور فوراً اٹھ گئی۔

"اور ہاں۔۔۔ نور بیٹی! اگر ہو سکے۔۔۔ تو کل کھیر بنا دینا۔۔۔ زلیخا کی بہو کچھ نہ کچھ بھیجتی رہتی ہے۔۔۔ مجھے بھی تو زلیخا کو دکھانا ہے۔۔۔ کہ میری بہو بھی کسی سے کم نہیں ہے۔"

"میں کل کیا، آج شام ہی بنا دوں گی۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"سعد رو رہا ہے۔۔۔ اوہو۔۔۔ لگتا ہے اٹھ گیا ہے۔" فاطمہ نے پوتے کے رونے کی آواز سنی۔

"اماں۔۔۔ میں دیکھتی ہوں۔" وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

"واہ ری جونا میم! تو مجھے ایسے ہی یاد نہیں آتی تھی۔۔۔ اللہ نے تیری وجہ سے میری بہو کو سیدھے راستے پر لانا تھا۔۔۔ اس لیے تو تیرا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا۔۔۔" فاطمہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی میں ایک ساس کا غرور تھا۔۔۔ جس نے اپنے گھر کی بہو کو بڑی سمجھ داری سے اپنا بنا لیا تھا۔

☼

نگہت عبداللہ

میرے خواب لوٹا دو

توصیف احمد اور یاسمین کا ایک بیٹا حماد اور دو بیٹیاں، سارہ اور اریبہ ہیں۔ یاسمین کی مستقبل بد مزاجی اور بد زبانی سے تنگ آکر توصیف احمد نے اپنے بڑے بھائی کی سالی، خالدہ سے دوسری شادی کرلی۔ اس بات پر یاسمین اپنے جیٹھ، جٹھانی سے بھی شاکی ہے۔ اریبہ ماں سے قریب ہے، جب کہ سارہ اپنے باپ سے محبت کرتی ہے۔ اریبہ کی منگنی اس کے تایا زاد، اجلال رازی سے ہو چکی ہے جو اعلا تعلیم کے لیے امریکا گیا ہوا ہے۔ یاسمین، اریبہ کو باپ اور ددھیالی رشتے داروں کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے۔ اریبہ کو جب باپ کی دوسری شادی کا پتا چلتا ہے تو وہ اپنے تایا اور تائی سے بھی بدظن ہو جاتی ہے اور اجلال سے منگنی بھی توڑ دیتی ہے۔ اجلال تعلیم مکمل کرکے واپس آتا ہے تو اسے منگنی ٹوٹنے کا پتا چلتا ہے۔ وہ اریبہ سے محبت کرتا ہے اور یہ رشتہ ختم نہیں کرنا چاہتا۔

اجلال رازی اس بارے میں اریبہ سے بات کرتا ہے، مگر وہ خاصی روکھائی سے پیش آتی ہے، تاہم وہ تحمل سے کام لیتا ہے کیونکہ وہ یہ مسئلہ بردباری کے ساتھ حل کرنا چاہتا ہے۔ اریبہ بے حد خود سر ہوتی جا رہی ہے۔ وہ ماں کی شہ پر سب کی مرضی کے خلاف موٹر سائیکل لے لیتی ہے۔ سارہ کا کزن سمیر اس سے اظہار محبت کرتا ہے۔ سارہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔ مگر سارہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتی۔

شمشیر علی شہر میں ملازمت کرتا ہے۔ اسے گاؤں میں مقیم اپنی بہن تاجور کی فکر رہتی ہے کیونکہ وہ وہاں سوتیلی ماں کے ظلم و ستم اور باپ کی عدم توجہ کا شکار ہے۔ وہ تاباں کو پسند کرتا ہے۔ وہ اپنے باپ کو فون کرتا ہے کہ تاباں کے باپ سے

رشتے کی بات کرے تاکہ وہ شادی کے بعد تاجور کو اپنے ساتھ رکھ سکے۔

تاباں کا باپ بدلے میں اپنے لیے تاجور کا رشتہ مانگ لیتا ہے۔ شمشیر غصہ میں تاباں سے اپنا راستہ الگ کرلیتا ہے۔ شمشیر تاجور کو اپنے ساتھ شہر لے آتا ہے۔ تاجور کو ٹی بی ہوتی ہے۔ وہ اسے ہسپتال داخل کروادیتا ہے۔

اریبہ یاسمین کو شہباز درانی کے ساتھ گاڑی میں دیکھ لیتی ہے۔ اسے ناگوار لگتا ہے مگر یاسمین جھوٹی کہانی سنا کر اسے مطمئن کردیتی ہے۔ ٹی بی کے مریض کی کیس ہسٹری تیار کرنے کے سلسلے میں اریبہ کی ملاقات تاجور سے ہوتی ہے۔

اجلال رازی اریبہ سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے۔ سارہ کو کھڑکی میں مگن کھڑے دیکھ کر شرارت سے ڈرا دیتا ہے۔ وہ اپنا توازن کھو کر گرنے لگتی ہے تو اجلال اسے بازوؤں میں تھام لیتا ہے۔

یاسمین اور شہباز درانی کی نازیبا گفتگو سن کر اریبہ غصے میں بائیک لے کر نکل جاتی ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے۔ شمشیر علی بروقت اسپتال پہنچا کر اس کی جان بچالیتا ہے۔ اسی اسپتال میں تاجور بھی داخل ہے۔ اریبہ ہوش میں آنے کے بعد اپنے رویے اور سوچ پر نادم ہوتی ہے۔ شمشیر علی، توصیف احمد کے آفس میں کام کرتا ہے۔ توصیف احمد اسے سیف سے ایک ضروری فائل نکال کر جیلانی صاحب کو دینے کے لیے کہتے ہیں۔ بعد میں انہیں پتا چلتا ہے کہ سیف میں سے فائل کے ساتھ ستر لاکھ روپے بھی غائب ہیں۔

وہ شمشیر پر رقم چوری کا الزام لگاتے ہیں تو وہ پریشان ہوجاتا ہے۔ اریبہ ماں کی اصلیت جان کر بالکل بدل جاتی ہے۔ اور مضطرب رہنے لگتی ہے۔

رازی، اریبہ سے ملنے جاتا ہے تو اریبہ اس کی باتیں سن کر کچھ الجھ سی جاتی ہے۔

تاجور کو اسپتال سے باہر روتے دیکھ کر اریبہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آتی ہے۔

توصیف احمد کے سابقہ چوکیدار الیاس کی نشاندہی پر شمشیر کی بے گناہی ثابت ہوجاتی ہے۔ وہ رہا ہو کر دل گرفتہ سا اسپتال جا کر تاجور کا معلوم کرتا ہے مگر اسے صحیح معلومات نہیں مل پاتیں۔ اسپتال کا چوکیدار فضل کریم اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ وہاں سے شمشیر اپنے گاؤں جاتا ہے مگر ابا کو تاجور کی گمشدگی کے بارے میں نہیں بتاتا۔ تاباں کی شادی ہوجاتی ہے۔ تاباں کو دیکھ کر شمشیر پچھتاتا ہے اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے اپنے ساتھ چلنے کا کہتا ہے مگر تاباں منع کردیتی ہے۔

یاسمین، اریبہ کی جلد از جلد شادی کرنے کی فکر میں پڑجاتی ہے مگر اریبہ دوٹوک انداز میں منع کردیتی ہے۔ یاسمین چالاکی سے اپنے گھر تمام رشتے داروں کو دعوت پر مدعو کرتی ہے۔ اجلال مضطرب سا دعوت میں شریک ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر اریبہ مزید الجھن کا شکار ہوتی ہے۔

بلال اسٹڈی کے لیے امریکہ چلا جاتا ہے۔ اجلال، اریبہ سے محبت کا اظہار کرتے کرتے اچانک گریزاں ہوجاتا ہے۔

اجلال بے حد نادم ہوتا ہے۔ سارہ اسے سب کچھ بھولنے کا کہتی ہے۔ وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں سمیر سے بات کرتی ہے مگر اس کی طرف سے سخت جواب ملتا ہے۔ شمشیر کو اسپتال میں اریبہ نظر آجاتی ہے وہ اس سے شدید نفرت محسوس کرتا ہے اور کالج سے واپسی پر اسے اغوا کرلیتا ہے۔

اریبہ کے اغوا ہوجانے پر سب پریشان ہوجاتے ہیں۔ اجلال ساجدہ بیگم سے کہہ دیتا ہے کہ اب وہ اریبہ سے شادی نہیں کرے گا۔ شمشیر، اریبہ سے تمیز سے پیش آتا ہے۔ کچھ دن بعد اریبہ کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے شمشیر کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

14

چودھویں قسط

''کہاں چلے گئے تھے شام۔ مجھے یوں بے آسرا چھوڑ کر کیا تمہیں ذرا بھی احساس نہیں کہ تم کیا کررہے ہو۔'' اریبہ اس کے قریب آکر تاسف سے بول رہی تھی۔

''تمہاری باتوں سے اتنا تو میں جان گئی ہوں کہ تمہاری دشمنی میرے ڈیڈی سے ہے تو جاکر ان سے لڑو پلیز۔۔۔ مجھے حبس بے جا میں رکھ کر تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

شمشیر علی خاموش تھا اور اس کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کررہا تھا کیونکہ یہ لڑکی اچانک اس کے لیے آزمائش بن گئی تھی۔

''کیا ہوا ہے تمہیں، تم ٹھیک تو ہو؟'' اریبہ کو اس کی خاموشی اور انداز دونوں کھٹکے تھے۔

''ہوں۔۔۔ ہاں۔'' شمشیر علی تیزی سے کچن میں جا گھسا اور اگر اریبہ کو یہ معلوم ہوجاتا کہ رات وہ کس قیامت سے گزرا تھا تو ہرگز اس کے سامنے نہ آتی، لیکن وہ بے خبر تھی، جب ہی اس کے پیچھے چلی آئی تھی۔

''تم ہٹو۔۔۔ میں چائے بنادیتی ہوں۔''

''نہیں! تم جاؤ، تمہاری طبیعت۔۔۔''

''میں اب ٹھیک ہوں۔'' وہ فوراً بولی تھی۔

''پھر بھی آرام کرو۔'' وہ اپنی پشت پر اس کی موجودگی محسوس کررہا تھا۔

اریبہ نے یوں کندھے اچکائے جیسے وہ کچھ سمجھ نہ پارہی ہو پھر پلٹ کر کمرے میں آبیٹھی۔

کچھ دیر بعد شمشیر علی چائے کا مگ لیے کمرے کے دروازے میں آن کھڑا ہوا اور جیب سے اپنا موبائل فون نکال کر اس کے سامنے بیڈ پر پھینک دیا۔

اریبہ ششدر کبھی موبائل فون کو دیکھتی، کبھی اسے، جبکہ دل کا یہ عالم تھا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

''بلالو اپنے باپ کو، لے جائے تمہیں۔''

شمشیر علی کہہ کر وہیں سے پلٹ گیا تھا، تب بھی کتنی دیر وہ غیر یقینی سے موبائل فون کو دیکھتی رہی، پھر ایک دم اٹھ کر دروازہ اندر سے لاک کردیا اور پھر موبائل اٹھا تو لیا لیکن فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ اس کا دل قابو میں نہیں آرہا تھا۔ تب وہ صوفے میں دھنس کر بیٹھ گئی اور گھٹنوں کے گرد کس کے بازو لپیٹ لیے۔ اسے پرسکون ہونے میں پندرہ، بیس منٹ لگ گئے اور اتنا ہی وقت یہ سوچنے میں گزر گیا کہ کسے فون کرے کیونکہ اتنے دن ہوگئے تھے کہ اب وہ خود خائف ہوگئی تھی کہ جانے اس کی گمشدگی کو وہاں کیا نام دیا جارہا ہوگا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ سب نے اسے مردہ سمجھ لیا ہو۔ ایسے میں اس کا اچانک فون اس کے ماں، باپ، بہن، بھائی کے لیے بے شک خوشی کا باعث سہی، لیکن کسی کی جان بھی لے سکتا تھا۔ موبائل ہاتھ میں لیے اس نے ایک ایک کو سوچا اور پھر اجلال رازی کا نمبر ملالیا۔

دوسری طرف جاتی بیل کے ساتھ اس کی دھڑکنوں کا تانا جڑ گیا تھا۔

''ہیلو۔۔۔!'' اجلال رازی کی آواز کے ساتھ ہی اس کا سارا دھیان ادھر منتقل ہوگیا تھا۔ وہ بے تابی سے بولی۔

''رازی۔۔۔ مم۔۔۔ میں اریبہ بول رہی ہوں۔''

دوسری طرف خاموشی چھاگئی۔ چند لمحوں کی خاموشی میں صدیوں کا سناٹا تھا۔

''رازی۔۔۔!'' اس نے ڈوبتے دل کے ساتھ پکارا تھا۔

''ہاں اریبہ! تم زندہ ہو۔'' اجلال رازی کے لہجے میں جانے کیا تھا۔ حیرت، افسوس یا کچھ اور۔۔۔ مگر وہ کچھ نہیں تھا، جو وہ سننا چاہتی تھی۔ جب ہی اس سے بولا ہی نہیں گیا۔

''ہیلو اریبہ! کہاں ہو تم، کہاں سے بات کررہی ہو؟'' اجلال رازی نے اب پکار کر پوچھا تھا۔

"پتا نہیں۔" اس کی آنکھیں روانی سے چھلک گئی تھیں۔

"بتاؤ اریبہ۔ یہاں سب پریشان ہیں' اسی شہر میں ہو یا کہیں اور... کس کے ساتھ ہو؟" اجلال رازی تیز تیز بول رہا تھا۔

"کس کے ساتھ...؟" وہ پل میں کسی اتھاہ میں اتر گئی تھی۔ کیا کوئی ایسا بھی گمان کر سکتا ہے۔

"ہیلو... ہیلو اریبہ!" جس بے قراری کی وہ اولین لمحوں میں منتظر تھی' وہ اب بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے بٹن دبا کر سلسلہ منقطع کر دیا اور صوفے کی پشت پر سر رکھ دیا۔ موبائل بجنے لگا۔ اسکرین پر اجلال رازی کا نمبر تھا۔ اس نے دوبارہ کال کاٹ دی اور سیل فون ہی آف کر دیا' پھر ہتھیلیوں سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کمرے کا دروازہ کھولا تو شمشیر علی جو تصویر بنانے کے شغل میں مصروف تھا' ایک دم گھوم کر اسے دیکھنے لگا۔

"تمہارا احسان میرے کسی کام نہیں آیا۔" وہ چند قدم آگے آکر موبائل فون اسے دکھا کر بولی۔

"کیوں...؟"

"کیونکہ میں اپنے گھر والوں کو یہ نہیں بتا سکی کہ میں کہاں ہوں۔ مجھے پتا ہی نہیں ہے۔" اس نے کہا تو شمشیر علی قریب آگیا اور اس کے ہاتھ سے موبائل فون لے کر پہلے نمبر چیک کیا' پھر اسے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"یہ کس کا نمبر ہے' میرا مطلب ہے تمہارے باپ کا تو نہیں ہے۔"

"تمہارے باپ کا ہے۔" وہ سلگ کر بولی۔ شمشیر علی انگلی اٹھا کر رہ گیا۔ وہ سر جھٹک کر پھر کمرے میں بند ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

اجلال رازی وہیں بیٹھے بیٹھے تقریباً" آدھے گھنٹے تک مسلسل اسی نمبر کو ملاتا رہا' جس سے اریبہ نے فون کیا تھا مگر مسلسل پاور آف کا ٹیپ بج رہا تھا۔ آخر اس کا ضبط جواب دے گیا۔ مزید کوشش ملتوی کر کے اس نے کچھ دیر سوچا' پھر اپنے آفس سے اٹھ کر توصیف احمد کے آفس چلا گیا اور گو کہ اس نے سوچا تھا کہ وہ توصیف احمد کو اس طریقے سے اریبہ کے بارے میں بتائے گا کہ وہ خود پر قابو رکھ سکیں اور شاکڈ بھی نہ ہوں لیکن ان کا سامنا ہوتے ہی وہ سب بھول کر بے اختیار پوچھ گیا۔

"چچا جان... آپ کے پاس اریبہ کا فون آیا تھا؟"

"اریبہ کا فون؟" توصیف احمد واقعی بے قابو ہو گئے تھے۔ "کیا تمہارے پاس آیا ہے۔"

"جی..." وہ اپنی بے اختیاری پر جزبز ہونے لگا۔

"ک... کیا' کہا اریبہ نے... کہاں ہے۔ کچھ بتایا اس نے۔ بتاؤ رازی! میری اریبہ..." توصیف احمد کی بے قراری خطرناک حدوں کو چھونے لگی تھی۔

"ریلیکس چچا جان! میں بتاتا ہوں' آپ بیٹھیں پلیز۔" اجلال نے توصیف احمد کا بازو تھام کر انہیں بٹھایا اور خود بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا' پھر تفصیل بتانے لگا۔

"کوئی گھنٹہ بھر پہلے اریبہ کا فون آیا تھا چچا جان! لیکن وہ بتا نہیں سکی کہ وہ کہاں ہے۔ میں پوچھتا رہ گیا' پھر فون بند ہو گیا۔ اس کے بعد میں اس نمبر پر مسلسل کال کر رہا ہوں لیکن سیل آف جا رہا ہے۔"

"کیسی تھی اریبہ... اس کی آواز سے تمہیں کیا لگا۔" فطری بات تھی کہ توصیف احمد اس وقت کچھ اور سوچ ہی نہیں سکے۔ انہیں صرف اریبہ کی فکر تھی۔

"جی... میں کچھ کہہ نہیں سکتا چچا جان! کیونکہ اریبہ نے زیادہ بات نہیں کی۔" اجلال رازی نے سنبھل کر کہا۔

"اریبہ کو بات کرنے نہیں دی گئی۔" توصیف احمد نے گویا تصحیح کی تھی۔

"جی میرا وہی مطلب تھا۔ اریبہ سے فون کروایا گیا تھا' لیکن بات نہیں کرنے دی گئی۔" اجلال رازی فوراً" ان کی تائید کر کے کہنے لگا۔

"چلیں چچا جان! اتنا تو ہوا کہ اریبہ کی خبر ملی' ورنہ تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔"

"ہاں...!" توصیف احمد نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا۔ پھر ٹیبل سے اپنا فون اٹھا کر بولے۔

"رازی! نمبر بتاؤ' جس سے اریبہ نے فون کیا تھا۔"

"جی..." اجلال رازی فوراً" اپنے سیل فون سے نمبر دیکھ کر بتانے لگا۔ توصیف احمد نے نمبر پش کرتے ہی ڈائل کا بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا۔ دوسرے پل ٹون بجنے لگی تھی۔

"بیل جا رہی ہے۔" توصیف احمد کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی' جس سے ان کی اندرونی کیفیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ دل کی دھڑکنیں بہت تیز ہیں یا پھر دل بند ہوا جا رہا تھا۔

اجلال رازی نے چاہا کہ ان کے ہاتھ سے فون لے لے مگر اسی وقت کسی نے دوسری طرف سے فون ریسیو کر لیا تھا۔

"ہیلو... میں توصیف بات کر رہا ہوں۔ توصیف احمد... مجھے پتا ہے میری بیٹی اریبہ تمہارے قبضے میں ہے۔ دیکھو! تم جو بھی ہو' میں تمہیں وارننگ دے رہا ہوں۔ میری بیٹی مجھ تک پہنچا دو' ورنہ......"

ادھر سے فون بند کر دیا گیا تو توصیف احمد ایک دم اجلال کو دیکھنے لگے۔ جس سے وہ سمجھ کر کہنے لگا۔

"آپ کو اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی چچا جان!"

"پھر کیا پیار سے بات کرتا؟" وہ غصے سے بولے۔

"پیار سے نہیں' آرام سے... کیونکہ ابھی ہم بے بس ہیں۔ اگر ان کے خلاف اسٹینڈ لینے کی بات کریں گے تو وہ اریبہ کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ہمیں پہلے اریبہ کو ان کے چنگل سے نکالنا ہے۔ آپ پلیز خود پر قابو رکھیں اور اب آپ بات نہیں کریں گے۔"

اجلال رازی نے انہیں دھیرج سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ سمجھ نہیں رہے تھے' مگر... مجبور تھے۔ کیا کرتے بیٹی کی خبر سن کر خود پر اختیار نہیں رہا تھا۔

"رازی... بیٹا کیا تم معلوم کروا سکتے ہو کہ یہ نمبر کس کا ہے؟" کتنی دیر سوچنے کے بعد توصیف احمد نے اسے پکار کر پوچھا تھا۔

"یہ معلوم کروانا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے چچا جان... میں سب معلوم کر لوں گا لیکن شاید کوئی فائدہ نہ ہو' کیونکہ مجرم اپنے نمبر سے فون کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔" اجلال رازی کی بات سن کر توصیف احمد پھر مایوس ہو گئے تھے۔

"پھر اب کیا کریں؟"

"انتظار ہی کرنا ہے چچا جان! اور کیا کر سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے اب وہ جلدی رابطہ کریں گے۔"

"اللہ کرے۔" توصیف احمد دل گرفتہ نظر آنے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

اریبہ کو اب افسوس کے ساتھ اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا کہ اس نے اجلال رازی کو کیوں فون کیا' جسے اس کے جینے مرنے کی پروا نہیں رہی۔ اسے توصیف احمد یا پھر یاسمین کو فون کرنا چاہیے تھا۔ بے شک وہ انہیں یہ نہ بتا سکتی

تھی کہ وہ کہاں ہے، لیکن اپنی طرف سے اطمینان تو دے سکتی تھی۔ قسمت سے موقع ہاتھ آیا تھا۔ اب پتا نہیں وہ سیل فون دے گا کہ نہیں۔

"پاگل ہوں میں بھی۔۔۔ سیل فون واپس کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ رکھ لیتی اپنے پاس۔۔۔ غصے میں واقعی بندے کی مت ماری جاتی ہے۔"

کتنی دیر غصے اور جھنجلاہٹ میں وہ خود کو کوستی رہی، پھر یہ سوچ کر کہ شاید وہ دے ہی دے، وہ کمرے سے نکل آئی۔

"سنو۔۔۔" شمشیر علی تصویر سازی میں اس قدر مگن تھا کہ اریبہ کی آہستہ آواز پر بھی بری طرح چونک گیا، پھر خشمگیں نظروں سے اسے گھورنے لگا تو وہ جلدی سے بولی تھی۔

"مجھے فون کرنا ہے۔"

"اب کسے فون کرو گی؟" شمشیر علی کے تیکھے لہجے میں حد درجہ ناگواری تھی۔ اصل میں اسے اس وقت اریبہ کی مداخلت سخت گراں گزری تھی۔

"اپنے ڈیڈی کو۔۔۔" اس نے تہیہ کرلیا کہ اب غصہ نہیں کرے گی۔

"ڈیڈی کو۔۔۔ پھر کہو گی ممی کو، پھر بہن بھائیوں کو پھر۔۔۔" وہ بولنے کے ساتھ غالباً "موبائل کے لیے ادھر ادھر اپنی جیبوں پر ہاتھ مار رہا تھا۔

اریبہ کا دل اچھلنے لگا لیکن خود کو انجان ظاہر کرنے کی خاطر اس کی بنائی تصویر دیکھنے لگی۔ کچھ جانا پہچانا چہرہ لگ رہا تھا۔

"یہ لو۔۔۔" ادھر شمشیر علی نے تخت سے سیل فون اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا اور ادھر وہ بے اختیار چلا اٹھی۔

"تاجور۔۔۔" شمشیر علی کے ہاتھ سے موبائل پھسل کر فرش پر گرتے ہی بکھر گیا اور اگلے پل وہ اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ رہا تھا۔

"ہاں تاجور۔۔۔ یہ تاجور ہے۔ تم جانتی ہو۔ تم نے دیکھا ہے تاجور کو؟"

"ہاں لیکن۔۔۔" وہ پریشان ہو گئی۔

"کیا لیکن۔۔۔ بتاؤ کہاں ہے تاجور؟" وہ اپنے آپ میں نہیں رہا تھا۔ اسے جھنجوڑنے کے ساتھ تاجور، تاجور کی رٹ لگا دی تھی۔ آخر وہ چیخ پڑی۔

"تم پاگل ہو گئے ہو شام۔۔۔ کچھ نہیں بتاؤں گی میں تمہیں۔" وہ یک دم تھم گیا لیکن اریبہ چکرا گئی تھی۔ اس نے ہاتھ جھٹک کر سر تھام لیا تو وہ بھاگ کر اس کے لیے پانی لے آیا۔

"آئی ایم سوری اریبہ! لو پانی پیو۔" اریبہ اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر تخت پر بیٹھ گئی اور گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگی، جبکہ اس کا ذہن تیزی سے سوچنے لگا تھا۔

"ہاں اب بتاؤ؟" شمشیر علی اس کے سامنے پنجوں پر بیٹھ کر بے قراری سے اسے دیکھنے لگا۔

"کیا بتاؤں۔۔۔" اریبہ نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ سمجھی نہیں۔

"میں تاجور کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔" شمشیر علی خود پر قابو رکھنے میں ناکام ہوا جا رہا تھا۔

"کیوں۔۔۔ میرا مطلب ہے تم تاجور کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو۔ کیسے جانتے ہو تم اسے؟" اریبہ نے کھوجی نظریں اس پر جما کر پوچھا تو وہ فوراً "بول اٹھا۔

"میری بہن ہے تاجور۔۔۔"

"تمہاری بہن۔۔۔" اریبہ کی نظروں میں تاجور آن سمائی، جو اپنے بھائی کے لیے روتی تڑپتی تھی۔

"ہاں سگی بہن، میری ماں جائی۔۔۔ اب خدا کے لیے بتاؤ وہ کہاں ہے؟" شمشیر علی کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ پھر اسے جھنجوڑنا چاہتا تھا کہ وہ ایک دم اٹھ کر پرے ہٹ گئی اور آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلانے لگی تو وہ جانے کیا سمجھ کر چیخ پڑا۔

"تم جھوٹ بولتی ہو۔ تم جانتی ہو تاجور کو۔ تم نے دیکھا ہے اسے۔۔۔ دیکھا ہے نا۔۔۔؟"

"ہاں دیکھا ہے، جب ہی تو تصویر سے پہچان لیا۔" وہ اب سکون سے بولی تھی۔

"پھر بتاتی کیوں نہیں ہو۔" شمشیر علی کو اس کا سکون کھٹک رہا تھا۔

"کیونکہ جب تک مجھے نہیں پتا چلے گا کہ میں یہاں کیوں لائی گئی ہوں تب تک تم بھی۔۔۔" اریبہ نے قصداً بات ادھوری چھوڑ دی اور وہ یک دم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔

"وہ میں۔۔۔ بتاؤں گا۔۔۔ سب بتاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے، بتا دینا آرام سے۔ مجھے بھی جاننے کی جلدی نہیں ہے۔" اریبہ کو بدلہ لینے کا موقع مل گیا تھا۔ بے نیازی سے کندھے اچکا کر کمرے کی طرف بڑھی تھی کہ وہ تیزی سے سامنے آگیا۔

"تاجور ٹھیک ہے؟" اس اونچے پورے مرد کی بے چارگی اریبہ سے دیکھی نہیں گئی۔ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ نظریں چرا گئی تھی۔

"کہاں ہے؟" وہ مبہم ہو کر بھی واضح تھا۔ اریبہ نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر خود کو بولنے سے باز رکھا تھا۔

"مجھے اس کے پاس لے چلو۔" اس کے لہجے میں بلا کی عاجزی تھی۔ اریبہ نے سر اونچا کر کے اسے دیکھا، پھر پیچھے ہٹتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں کہ پل میں تمہیں مطمئن کر دوں۔ مجھ سے رحم کی توقع مت رکھو، کیونکہ تمہیں بھی مجھ پر رحم نہیں آیا تھا۔ میں تب تک تمہیں تاجور کے بارے میں نہیں بتاؤں جب تک تم میری عدالت سے بری نہیں ہو جاتے۔"

"تمہاری عدالت سے؟" وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"ہاں۔۔۔ میری عدالت میں تم مجرم کی حیثیت سے کھڑے ہو۔ من گھڑت داستان سنا کر مجھے دھوکا دینے کی کوشش مت کرنا۔ میں صرف سچ سنوں گی۔ اس کے بعد میں فیصلہ کروں گی کہ آیا تم معافی کے قابل ہو کہ نہیں۔"

وہ ٹھہرے ہوئے لیکن تپتے لہجے میں کہہ کر تخت پر جا بیٹھی۔ شمشیر علی کتنی دیر ہونٹ بھینچے وہیں کھڑا رہا۔ اس لڑکی کے سامنے وہ کتنا بے بس ہو گیا تھا۔ اگر تاجور کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ اس لڑکی کو مزا چکھا دیتا، لیکن اب سچائی بیان کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ سچ کہنے سے ہرگز خائف نہیں تھا مگر اس کے بعد وہ کیا فیصلہ سناتی ہے، معافی یا ناقابل معافی۔

اور بظاہر اطمینان سے بیٹھی اریبہ اس کی طویل خاموشی سے اندر ہی اندر بے چین ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے کی طرف بڑھی تھی کہ وہ ایک دم حلفیہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر بول پڑا۔

"سنو۔۔۔ میں جو کہوں گا سچ کہوں گا۔ اس کے بعد تم جو فیصلہ سناؤ گی، مجھے وہ بھی منظور ہو گا لیکن وعدہ کرو کہ مجھے تاجور سے ملوا دو گی۔"

"نہیں۔۔۔ میں کوئی وعدہ نہیں کروں گی۔ پہلے تم اصل بات کرو، باقی ساری باتیں اس کے بعد آتی ہیں۔" وہ اب اس کے سامنے کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔

"اصل بات۔۔۔ اصل بات کہاں سے شروع کروں۔۔۔ ہاں برسات کی اس شام جب تمہاری بائیک سلپ ہوئی

تھی اور میں تمہیں وہاں سے اٹھا کر اسپتال لے گیا تھا۔" وہ یاد کرتے ہوئے بولنا شروع ہوا تو پھر بولتا چلا گیا تھا۔

اریبہ دم سادھے کھڑی تھی۔ جب کہیں وہ رکتا تو اریبہ کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ پھر آخر میں وہ کہنے لگا۔

"اگر اس سارے قصے میں تاجور نہ ہوتی تو یہاں بھی میں تقدیر کے سامنے سرنگوں ہو جاتا۔ تم جانتی ہو، میری بہن کتنی معصوم ہے۔ اس کی دربدری کا خیال مجھے خون کے آنسو رلاتا تھا اور تب میں نے عہد کیا تھا کہ میں اس شخص توصیف احمد کو بھی اسی طرح رلاؤں گا اور میں نے اپنا عہد پورا کیا۔ اب تم یہ مت کہنا کہ اس میں تمہارا کیا قصور۔۔۔ اب کیونکہ قصوروار تو میں بھی نہیں تھا، پھر بھی میں نے سزا کاٹی اور میری بہن نے بھی۔۔۔ بتاؤ میری بہن کہاں ہے۔" اس کی تان پھر وہیں ٹوٹی تھی۔

اریبہ چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ غالباً" اس کی داستان سنتے ہوئے بھول گئی تھی کہ وہ کہاں ہے۔

"دیکھو۔۔۔ میں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ نہ میرا ایسا کوئی ارادہ تھا، پھر بھی میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔" شمشیر علی نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ بہت عاجز نظر آ رہا تھا۔

اریبہ نے اس کی طرف سے رخ موڑ لیا کیونکہ اس کا ذہن بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔

"اریبہ۔۔۔!" وہ بے تابی سے اس کے سامنے آگیا۔ "میرا یقین کرو، میں نے جو کہا ہے، سچ کہا ہے۔"

"میں تمہارے سچ کو جھٹلا نہیں رہی۔" اریبہ کی آواز میں، لہجے میں دکھ کی آمیزش تھی۔ شمشیر علی یک دم ساکت ہو گیا تھا۔

"میں مانتی ہوں تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے لیکن بدلے میں تم نے جو کچھ کیا۔۔۔" اریبہ رک کر اسے یوں دیکھنے لگی جیسے اس کی اپنی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا کہے۔

"میری جگہ تم ہوتیں تو کیا کرتیں؟" شمشیر علی نے بہت احتیاط سے پوچھا تھا۔

"پتا نہیں۔۔۔ لیکن میں توصیف احمد سے اتنا ضرور کہتی کہ میرے پیچھے میری ایک بہن ہے، اس کا خیال رکھنا۔" اریبہ نے یہ بات سراسر اپنے باپ کی محبت میں کہی تھی، وہ نہیں جانتی تھی لیکن شمشیر علی سمجھ گیا تھا مگر اب بحث کا وقت نہیں رہا تھا، جب ہی اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

"تمہاری بہن تاجور، توصیف احمد کے گھر میں ہی ہے۔" اریبہ نے ابھی بھی توصیف احمد کا سر اونچا کیا تھا۔

"کیا۔۔۔؟" وہ اچھلا تھا۔ "توصیف احمد کے گھر۔۔۔ کیسے؟ میرا مطلب ہے۔۔۔ میری رہائی کے وقت توصیف احمد نے مجھے تاجور کے بارے میں کیوں نہیں بتایا تھا۔"

"کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ تاجور تمہاری بہن ہے۔ تاجور مجھے اسپتال کے باہر بینچ پر بیٹھی روتی ہوئی ملی تھی۔ شاید اسی وقت اسے اسپتال سے ڈسچارج کیا گیا تھا۔"

اریبہ، شمشیر علی کے لیے معافی کی گنجائش نکال کر بولنا شروع ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

توصیف ولا میں ایک بار پھر انتظار کا موسم در آیا تھا۔ فون کی بیل بجتی یا ڈور بیل۔۔۔ دل ڈوب کر ابھرتے تھے۔ دن میں کتنی بار توصیف احمد کبھی یاسمین اور کبھی سارہ کو فون کر کے پوچھتے تھے کہ اریبہ کا فون تو نہیں آیا اور ادھر سے بھی یہی سوال ہوتا تھا۔

اس وقت سارہ فون پر اجلال رازی سے الجھ رہی تھی کہ ضرور اس نے اریبہ سے کوئی ایسی بات کہہ دی ہو گی، جو اس نے دوبارہ فون نہیں کیا۔

"پاگل ہو تم۔۔۔ میں کیا کہوں گا اریبہ سے اور یہ کون سا موقع تھا ادھر ادھر کی باتیں کرنے کا۔ میں یہی پوچھ سکتا

تھا کہ وہ کہاں ہے۔" اجلال رازی جھنجلا گیا تھا۔
"پھر اس نے بتایا کہ کیوں نہیں؟" سارہ ابھی بھی شاکی تھی۔
"اس لیے کہ وہ خود نہیں جانتی تھی' وہ یہی کہہ رہی تھی کہ اسے نہیں پتا۔"
"پھر اب کیسے پتا چلے گا۔" وہ روہانسی ہو کر بولی تو اجلال رازی نرم پڑ گیا۔
"میں کوشش کر رہا ہوں اور تم پلیز جہاں اتنا انتظار کیا ہے وہاں تھوڑا اور صبر سے کام لو۔"
"صبر' صبر' صبر۔۔۔ مجھ سے نہیں ہوتا صبر۔" سارہ نے فون پٹخ دیا اور آنکھوں میں ٹھہرے آنسو ہتھیلیوں سے رگڑ کر پلٹی تو سمیر کو کھڑے دیکھ کر خواہ مخواہ اس پر بگڑ گئی۔
"تم کیا جاسوسی کرتے پھر رہے ہو۔ یہاں کیا ہو رہا ہے' وہاں کیا ہو رہا ہے۔"
"اگر میں بتا دوں وہاں کیا ہو رہا ہے تو ہوش ٹھکانے آجائیں گے تمہارے۔" سمیر اس کے خواہ مخواہ بگڑنے پر سلگ گیا تھا۔
"وہاں سے کیا مطلب ہے تمہارا؟" سارہ کا انداز ہنوز تیکھا تھا۔
"رازی بھائی کے گھر۔۔۔ سب سے بڑے ہمدرد اور بہی خواہ وہی ہیں نا تمہارے۔" سمیر کے طنزیہ انداز پر وہ تلملائی ضرور' لیکن اس سے زیادہ ٹھٹکی تھی' جب ہی سر جھٹک کر بولی تھی۔
"کوئی نہیں ہے میرا ہمدرد اور رازی بھائی تو بالکل بھی نہیں ہیں۔"
"ہاں۔۔۔ یہی میں تمہیں سمجھانے آیا ہوں۔ خود کو تماشا مت بناؤ۔ رازی بھائی بھی صرف تمہارے منہ پر تم سے ہمدردی کرتے ہیں' ورنہ ان کے گھر میں اریبہ کا ذکر جس انداز میں ہو رہا ہے میں نہیں سمجھتا کہ اس سے رازی بھائی بے خبر ہوں گے۔"
سمیر یہی بات اسے طریقے سے سمجھانے آیا تھا' لیکن سارہ نے چھوٹتے ہی اس سے بدتمیزی کر کے اسے غصہ دلا دیا تھا۔
"ک۔۔۔ کس انداز میں ہو رہا ہے اریبہ کا ذکر؟" سارہ اندر سے سہم گئی تھی۔
"تمہیں خود سمجھ لینا چاہیے۔" سمیر سر جھٹک کر بولا۔
"ہاں میں سمجھ گئی ہوں' پھر بھی تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔"
"کیوں میرا منہ کھلوانا چاہتی ہو۔ ویسے بھی میں تمہارے سامنے وہ باتیں دوہرا نہیں سکتا۔ لہٰذا اس بات کو ختم کرو اور آئندہ محتاط رہو۔" سمیر نے بات ختم کر دی' لیکن وہ جان گئی تھی کہ بات ختم نہیں ہوئی۔ ابھی تو شروع ہوئی ہے آگے جانے کیا کچھ سننے کو ملے گا۔
"یاسمین آنٹی کہاں ہیں اور وہ لڑکی۔۔۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا؟" سمیر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا' تو وہ تپ کر بولی۔
"میں نے تو اس کا نام نہیں بتایا تھا۔"
"اچھا تو اب بتا دو۔" سمیر نے محظوظ ہو کر مزید چھیڑنے کی غرض سے کہا تھا۔
"کیوں تم کیا اس کے نام کی مالا جپنا چاہتے ہو؟"
"ہاہاہا۔۔۔" سمیر کا قہقہہ بے ساختہ تھا' پھر سونگھنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔ "کچھ جلنے کی بو آرہی ہے۔"
"وہ تو اس وقت بھی آتی ہے' جب میں رازی بھائی کی بات کرتی ہوں۔" سارہ کے منہ سے بلا ارادہ نکل گیا تھا۔
"بالکل غلط! رازی بھائی سے جلنے کی کوئی تک نہیں بنتی۔" سمیر ایک دم سنجیدہ ہو گیا تو وہ بات بدلتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"اچھا تمہیں پتا ہے' اریبہ کا فون آیا تھا۔"
"نہیں۔۔۔ تم نے بتایا ہی نہیں' کب آیا تھا؟" سمیر نے شاکی ہو کر بے صبری سے پوچھا تھا۔
"پرسوں۔۔۔ رازی بھائی کے پاس آیا تھا اس کا فون' لیکن وہ کچھ بتا نہیں سکی۔ اس کے بعد سے ہم سب اسی انتظار میں بیٹھے ہیں کہ پھر کب اس کا فون آتا ہے۔" وہ بتا کر سمیر کو دیکھنے لگی کہ وہ کیا کہتا ہے۔
"اریبہ کچھ بتا نہیں سکی۔" سمیر نے پرسوچ انداز میں دوہرایا' پھر اسے دیکھ کر کہنے لگا۔ "اس کا مطلب ہے اریبہ سے فون کروایا گیا تھا لیکن اتنے عرصے بعد کیوں۔۔۔؟ تاوان والے اتنا وقت تو نہیں لیتے۔"
"مجھے یہ تاوان کا کیس نہیں لگ رہا۔" سارہ کو تاوان والی بات سن کر کوفت ہوئی تھی۔
"پھر۔۔۔؟"
"مجھے نہیں پتا۔۔۔ میں اب کوئی بات فرض نہیں کرنا چاہتی۔ میں بس یہ چاہتی ہوں کہ اریبہ آجائے۔" وہ جس طرح تنگ ہو کر بولی تھی' اس سے سمیر کو یہی مناسب لگا کہ اس کی ہاں میں ہاں ملا دے۔
"تم ٹھیک کہتی ہو' ہمیں صرف اریبہ کی فکر کرنی چاہیے' بلکہ میں تو کہوں گا اب تم فکر بھی مت کرو' اریبہ ان شاء اللہ جلدی آجائے گی۔"
"اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔" سارہ نے کہا تو وہ فوراً" بولا۔
"میری زبان مبارک ہی ہے۔"
"اچھا! پھر تو تمہیں چائے پلانی پڑے گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
"صرف چائے نہیں' کچھ کھانے کو بھی۔" سمیر باقاعدہ پیر پسار کر بیٹھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اجلال رازی نے بے حسی کا لبادہ تو اوڑھ لیا تھا' لیکن یہ وہی جانتا تھا کہ وہ کس کرب سے گزر رہا ہے۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں ایسا موڑ آجائے گا کہ اسے خود اریبہ سے تعلق توڑنے کا فیصلہ کرنا پڑے گا۔ وہ تعلق جو بڑے ارمانوں سے جوڑا گیا تھا اور اس کے بعد کتنے عہد و پیمان ہوئے تھے۔ اسے ایک ایک بات یاد تھی اور وہ جانتا تھا کہ اریبہ بھی کچھ نہیں بھولی تھی۔ وہ سارے خواب جو اس نے اریبہ کی آنکھوں میں سجائے تھے۔ وہ سب اس نے سینت سینت کر رکھے تھے اور اب جب ان خوابوں کے شرمندۂ تعبیر ہونے کا وقت آیا تھا تو حالات نے کیسا پلٹا کھایا تھا کہ وہ مجبور اور بے بس ہو گیا تھا۔ جانے اس کی قسمت میں ایسی بے بسی کیوں لکھی گئی تھی۔
وہ مصلحتیں نہیں سوچتا تھا' اسے خود پر غصہ آتا تھا کہ وہ جو دیار غیر میں کبھی اریبہ سے غافل نہیں ہوا تھا۔ یہاں آکر کیسے اسے بھول گیا۔ بس ایک پل کی بھول تھی جس کا خمیازہ اسے عمر بھر بھگتنا تھا۔
"اریبہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔" جب سے اریبہ کا فون آیا تھا اس کی بے چینی سوا ہو گئی تھی اور ایک مجرمانہ احساس بھی تھا کہ اریبہ نے کتنی آس سے اسے فون کیا ہو گا اور جواب میں وہ کیسا نروٹھا بن گیا تھا۔
"اریبہ! تم زندہ ہو؟" اس کی سماعتوں میں اپنی ہی آواز کی بازگشت گونجتی تھی اور اس کا دل چاہتا' خود کو کسی کھائی میں گرا دے۔
"کیوں کیا میں نے ایسا۔ وہ لڑکی جانے کن اذیتوں سے دوچار ہے اور میں نے مزید اس کا دل چھلنی کر دیا۔ پتا نہیں اب وہ آئے گی بھی کہ نہیں۔۔۔
کیوں نہیں آئے گی۔۔۔ اسے آنا ہے' وہ ضرور آئے گی۔"
وہ اب خود سے لڑ رہا تھا۔

زندگی اسے عجیب دوراہے پر لے آئی تھی۔ گو کہ وہ اریبہ سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ سنا چکا تھا لیکن یہ تو وہی جانتا تھا کہ اس فیصلے نے اس کی جان لے لی تھی۔ کاش! وہ وقت کا پہیہ الٹا گھما سکتا یا اپنی کتاب حیات پر اسے اختیار ہوتا تو وہ چپکے سے چند اوراق یوں پھاڑ ڈالتا کہ جیسے وہ تھے ہی نہیں۔ کسی کو شبہ نہ ہوتا لیکن وہ بے اختیار تھا۔ کتاب حیات کے وہ اوراق جنہیں وہ پھاڑنا چاہتا تھا ان پر پھیلی سیاہی خود اسے بڑی بدنما لگتی تھی اور اسے اسی کے ساتھ سمجھوتا کرنا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو خبر بھی ہو۔ اس لیے اس نے اریبہ کا دل توڑ دیا تھا یہ کہہ کر کہ تم زندہ ہو...؟ جبکہ اس کی زندگی کے لیے تو وہ اپنی زندگی دان کرنے کو تیار تھا۔ ان تین دنوں میں اس نے اریبہ کے لیے جانے کیا کچھ سوچ ڈالا تھا اور پھر ایک نیا فیصلہ کر کے وہ جانے مطمئن ہوا تھا یا خود کو بہلا رہا تھا۔ بہرحال ابھی اسے خاموش ہی رہنا تھا۔

☼ ☼ ☼

شمشیر علی کو تاجور کی طرف سے اطمینان ہوا تو پھر وہ بے صبرا ہو گیا تھا۔ فوراً" تاجور کے پاس جانا چاہتا تھا۔ یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ اریبہ کو اغوا کرنے کے جرم میں پھنس سکتا ہے۔ جبکہ اریبہ یہی سوچ رہی تھی۔ گو کہ شمشیر علی کے اس اقدام نے اس پر زندگی تنگ کر دی تھی۔ اس کے باوجود وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ شخص دوبارہ سلاخوں کے پیچھے جائے کیونکہ ابھی اس میں انسانیت باقی تھی اور وہ ایک انسان کو درندہ نہیں بننے دینا چاہتی تھی۔ جب ہی اس سے متفق نہیں ہو رہی تھی۔ اس وقت وہ بری طرح جھنجلا رہا تھا۔

"آخر تم چاہتی کیا ہو۔ کیوں روک رکھا ہے مجھے اور خود کو بھی؟"

"دیکھو شام! تم سے زیادہ گھر جانے کی جلدی مجھے ہے لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔" اریبہ پر اس کے جھنجلانے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"پھر...؟" وہ سوالیہ نشان بن گیا۔

"پھر کچھ ایسا سوچو کہ تم پر بھی کوئی بات نہ آئے۔" وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ شمشیر علی غور سے اسے دیکھنے لگا۔ تفکر اس کی آنکھوں میں ڈیرہ جمائے بیٹھا تھا۔ تب وہ دھیرے سے پوچھنے لگا۔

"تم پریشان ہو ڈر رہی ہو گھر جانے سے؟"

"پریشان تو ہوں لیکن گھر جانے سے نہیں ڈر رہی گھر تو جانا ہے۔" وہ جانے کہاں کھوئی ہوئی تھی۔ خود ہی چونکی پھر ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ایسا کرو تم سوچو میں چائے بناتی ہوں۔"

"ایک منٹ!" وہ اسے روک کر پوچھنے لگا۔ "یہ بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں کیا چاہوں گی۔ مجھے یہ بتاؤ کہ میں اپنے گھر والوں سے کیا کہوں گی مجھے کس نے کڈنیپ کیا۔ کہاں رکھا کڈنیپ کرنے والوں کا مقصد کیا تھا۔ میری واپسی پر یہ سب سوال اٹھیں گے اس لیے مجھے ان سب کے جواب معلوم ہونے چاہئیں۔"

وہ اپنی بات پہ زور دے کر چائے بنانے چلی گئی تو شمشیر علی نے یوں سر ہلایا جیسے سمجھا نہیں لیکن پھر سوچنے بھی لگا تھا۔

کچھ دیر بعد جب اریبہ چائے لے کر آئی تو وہ دو انگلیوں پہ اپنی پیشانی ٹکا کر سر گرائے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے اس کے ذہن میں باقاعدہ کوئی منصوبہ بن رہا ہو۔ اریبہ نے اس خیال سے کہ کہیں اس کی سوچ منتشر نہ ہو۔ احتیاط سے چائے کا مگ اس کے قریب رکھا اور پلٹ کر کرسی پر جا بیٹھی۔

کتنے لمحے چپ چاپ سرک گئے۔ پھر وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔

"چائے!" اریبہ نے فوراً "کچھ پوچھنے کے بجائے اس کے قریب رکھے مگ کی طرف اشارہ کر دیا۔

"شکریہ... تم چائے بہت اچھی بناتی ہو۔" اس نے چائے کا مگ اٹھا لیا' پھر ایک گھونٹ لے کر بولا۔ "بہت یاد آئے گی۔"

"دیکھو! یہ مذاق کا وقت نہیں ہے' اب جو کرنا ہے' جلدی کرو۔" اس نے سنجیدگی سے اسے ٹوکا۔

"نہ نہ... جلدی کا کام شیطان کا' سکون سے خود بھی چائے پیو اور مجھے بھی پینے دو۔" اس کے اطمینان پر وہ سلگ کر رہ گئی۔ جبکہ شمشیر علی مزے سے چائے پیتا رہا' پھر خالی مگ ایک طرف رکھ کے اپنی نشست کا انداز بدلتے ہوئے کہنے لگا۔

"اچھا تو سنو! میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے' لیکن پہلے یہ بتاؤ تم مجھے اس سارے معاملے سے الگ کیوں رکھنا چاہتی ہو۔ تم کیوں چاہتی ہو کہ کہیں بھی میرا نام نہ آئے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے' مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے؟" اس کے چبھتے سوال پر وہ ایک لمحہ کو گڑبڑا گیا۔

"نہیں' میں ایسا کچھ خیال نہیں کر رہا۔"

"پھر اصل بات کرو۔" اریبہ نے جھڑکا۔

"اصل بات... ہاں میں نے سوچا ہے کہ میں تمہیں بے ہوش حالت میں کسی اسپتال میں ایڈمٹ کروا دیتا ہوں' پھر تمہارے فادر کے پاس جا کر کہوں کہ تم مجھے کسی جگہ بے ہوش پڑی ملی تھیں' میں نے تمہیں اسپتال پہنچا دیا۔ اس کے بعد کی صورت حال تم خود سنبھال لینا۔" شمشیر علی نے چند جملوں میں بات ختم کر دی تو وہ جو لمبا چوڑا منصوبہ سننے کی منتظر تھی' اسے دیکھتی رہ گئی۔

"نہیں...؟" شمشیر علی یہی سمجھا کہ اسے یہ بات ہضم نہیں ہوئی۔

"نہیں... میرا مطلب ہے' بالکل ٹھیک ہے۔ اس طرح میرے ڈیڈی پر تمہارا ایک اور احسان ہو جائے گا۔" اس نے کہا تو وہ چڑ کر بولا تھا۔

"میں نے پہلے بھی کوئی احسان نہیں کیا تھا۔"

"میری بات تو وہیں رہ گئی۔ میں کیا بتاؤں گی' کون لوگ تھے۔" اریبہ پھر اس بات پر آ گئی تو وہ سر جھٹک کر بولا۔

"یہ سب مجھے نہیں پتا۔ بلکہ تمہیں بھی نہیں پتا۔ یہی کہہ دینا' تمہیں کچھ پتا نہیں ہے۔ ویسے بھی جاتے ہی تم پر جرح شروع نہیں ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے پہلے تمہیں آرام کرنے دیا جائے گا۔ یوں تمہیں سوچنے کو وقت مل جائے گا۔"

"ہوں..." وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"کوئی الجھن ہے؟" قدرے رک کر شمشیر علی نے ٹوکا تو وہ نفی میں سر ہلا کر پوچھنے لگی۔

"پھر کب چلنا ہے؟"

"ابھی تو رات زیادہ ہو گئی ہے' کل دن میں ٹھیک رہے گا' کیونکہ مجھے پھر توصیف صاحب کے پاس ان کے آفس بھی جانا ہو گا۔ ان کا فون نمبر بھی' جو میرے پاس نہیں ہے۔" وہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں... یہ نمبر تو تم اب استعمال کرنا بھی مت' بلکہ ابھی اسے ضائع کر دو۔" اس نے کہتے ہوئے خود ہی اس کا سیل فون اٹھا لیا اور سم نکال کر دانتوں سے چبانے لگی۔ شمشیر علی خاموشی سے اس کی کارروائی دیکھتا رہا' جب اس نے سم کا کچومر منہ سے نکال کر پھینکا' تب ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

"یہ سم میرے نام نہیں تھی۔"

وہ اسے گھورتے ہوئے اٹھ کر کمرے میں آ گئی اور دروازہ بند کرنے کے ساتھ لائٹ بھی بند کر دی اب وہ سو جانا چاہتی تھی تاکہ تھکے ہوئے ذہن کو آرام ملے لیکن نیند جانے کہاں جا چھپی تھی۔ کروٹیں بدل بدل کر اس کا بدن درد کرنے لگا اور ذہن مزید چٹخنے لگا تھا۔ متضاد سوچیں تھیں جن کی ہیبت اسے لرزا رہی تھی۔ گھر جانے کی خوشی کہیں کونے کھدروں میں جا چھپی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ گردن تک زمین میں دھنسی ہے اور ادھر ادھر سے نوکیلے پتھر اس کا چہرہ لہولہان کیے دے رہے ہیں۔

"اف!" اس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ "کیا سچ مچ میرے ساتھ ایسا ہو گا۔ کیا مجھے اپنی پارسائی کی قسمیں کھانی پڑیں گی۔ اگر اس کے بعد بھی میرا یقین نہ کیا گیا تو..."

"نہیں۔" وہ جھٹکے سے اٹھی۔ "میں جانتی ہوں میرے ساتھ کچھ برا نہیں ہوا۔ میرا اندر مطمئن ہے۔ کوئی مانے نہ مانے' میں اپنی صفائیاں پیش نہیں کروں گی۔ میں قسمیں نہیں کھاؤں گی۔ رازی کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔ اگر وہ اپنی محبت میں سچا ہے تو بنا کہے اسے میرا یقین کرنا پڑے گا۔"

ان ہی پریشان کن سوچوں اور اندیشوں میں رات بیت گئی۔ فجر کی اذان کی آواز کہیں دور سے آ رہی تھی۔ اس نے بستر چھوڑا اور وضو کر کے جاء نماز پر کھڑی ہو گئی۔ پھر نیت باندھتے ہی اس کی آنکھوں سے ایسی جھڑی لگی کہ نماز کے بعد بھی کتنی دیر وہ سجدے میں گری ہچکیوں سے روتی رہی تھی۔ اس کے اندر کوئی ایک احساس نہیں تھا' بہت سارے احساسات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ پھر ایک احساس سب پر حاوی ہو گیا۔ جس نے اسے سجدے سے اٹھا دیا۔ ایک کٹھن مسافت کا احساس تھا' جو بہرحال اسے طے کرنی تھی۔

پھر اجالے کی پہلی کرن اترتے ہی اس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ رت جگے' رونے اور ذہنی انتشار کے باعث سر پھٹا جا رہا تھا۔ اپنے تئیں اس نے بہت احتیاط برتی اور کچن میں آ کر چائے کا پانی چولہے پر رکھا تھا کہ عقب سے شمشیر علی کی آواز آئی۔

"سنو...!" وہ بلا ارادہ اس کی طرف پلٹی تھی اور شمشیر علی جو کچھ کہنا چاہتا تھا' اس کی بے تحاشا سرخ اور سوجی ہوئی آنکھیں دیکھتا رہ گیا۔

"تم کچھ کہہ رہے تھے۔" اس نے رخ موڑتے ہوئے کہا تو شمشیر علی سنبھلنے کی کوشش میں ناکام ہو کر کچھ کہے بغیر واپس پلٹ گیا۔ اریبہ کو تعجب نہیں ہوا' نہ ہی جب چائے لے کر اس کے پاس آئی تو کچھ جتایا تھا۔

ایک نئی صبح کا آغاز ہو چکا تھا۔ شمشیر علی چائے کا مگ تھامے گم صم بیٹھا تھا۔ اریبہ نے چائے پیتے ہوئے اسے غور سے دیکھا۔ پھر خود کو بولنے پر آمادہ کر کے کہنے لگی۔

"میرا خیال ہے شام! یہ جو کچھ ہوا' واقعہ تھا یا حادثہ... اس بات سے قطع نظر کہ میری آئندہ زندگی پر کس طرح اثر انداز ہو گا' تمہارا بہرحال کچھ نہیں بگڑا۔"

شمشیر علی ایک دم اسے دیکھنے لگا تھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ تم آرام سے اپنی زندگی وہیں سے شروع کر سکتے ہو' جہاں سے تم اپنے مقصد سے ہٹے تھے اور دیر بھی مت کرنا۔ تمہاری منزل دور نہیں ہے۔ ایک سال گزرتے پتا بھی نہیں چلے گا' تمہارے خواب کو تعبیر مل جائے گی۔"

"اور تمہارے خواب؟" وہ کہیں دور سے بولا تھا۔

"میرے خواب..." اریبہ کے ہاتھوں میں چائے کا مگ لرزا تھا۔ "لڑکیوں کے خواب تو کانچ کی طرح ہوتے ہیں شام! ان کی پائیداری کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی۔ ذرا سی ٹھیس لگے' ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے قدرت نے لڑکیوں کی فطرت میں خاص وصف رکھا ہے۔ خواب ٹوٹ جائیں تو دنیا تیاگ کے نہیں بیٹھتی ہیں نہ مرتی ہیں' بس

جیسے جاتی ہیں۔"

"تم بھی کیا بس جیسے جاؤ گی۔" شمشیر علی کی حیرت میں انتہائی غیر یقینی تھی۔

اریبہ نے چونک کر اسے دیکھا' پھر نظریں جھکا لیں تو جانے کیسے پلکوں سے دو موتی ٹوٹ کر گر پڑے' شمشیر علی بے چین ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"سنو اریبہ! میں تمہارے خوابوں کی ضمانت نہیں دے سکتا لیکن تمہارے سامنے عہد کرتا ہوں کہ جب تک تم اپنی منزل کو نہیں پہنچو گی شمشیر علی برباد پھرے گا۔ منزل پانا تو دور کی بات' منزل کو جانے والے راستے پر قدم بھی نہیں رکھے گا۔"

"شام۔۔۔" وہ اپنی جگہ ساکت ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

دن کے گیارہ بجے تھے۔ توصیف احمد میٹنگ کے بعد اپنے کمرے میں آکر بیٹھے تھے کہ چوکیدار نے آکر شمشیر علی کی آمد کی اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

"سر! مسٹر شمشیر کہہ رہے ہیں' آپ سے بہت ضروری کام ہے۔ وہ آپ کے لیے کوئی پیغام لائے ہیں۔"

"بھیج دو۔" توصیف احمد نے نہ سمجھنے کے انداز میں بھنویں اچکا کر کہا تو چوکیدار فوراً" چلا گیا اور فوراً" ہی شمشیر علی اندر آگیا تھا' جسے دیکھ کر ہی توصیف احمد اسے پہچانے تھے۔ جب ہی بے اختیار ان کے منہ سے نکلا۔

"او۔ وہ تم۔۔۔"

"سر وہ۔۔۔" شمشیر علی اچانک خائف ہو گیا تھا۔

"ہاں کہو۔۔۔ چوکیدار بتا رہا تھا تم میرے لیے کوئی پیغام لائے ہو۔" توصیف احمد نے اسے دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔

"نو سر۔۔۔ آئی مین' اچھی خبر نہیں ہے' لیکن اب پریشانی کی بات بھی نہیں ہے۔ میں نے انہیں اسپتال پہنچا دیا ہے۔" شمشیر علی جتنا سوچ کر آیا تھا' اسی قدر بے ربط تھا۔

"کسے۔۔۔ کسے اسپتال پہنچا دیا ہے؟" توصیف احمد نہ سمجھنے کے باوجود ٹھٹکے تھے۔

"وہ سر! آپ کی بیٹی۔۔۔"

"میری بیٹی۔۔۔" توصیف احمد ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ "کون سارہ؟"

"سوری سر! میں نام نہیں جانتا۔ وہ جو پہلے بھی بائیک سے گری تھیں۔" وہ اب کافی سنبھل چکا تھا۔

"اریبہ۔۔۔" توصیف احمد کسی طرح خود پر قابو نہیں رکھ سکے۔ "تمہیں کہاں ملی اریبہ۔۔۔ کون سے اسپتال میں ہے' مجھے لے چلو فوراً"۔"

"جی سر! میں آپ کو لینے ہی آیا ہوں' آیئے!" اس نے کہنے کے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا تو توصیف احمد کے اندر جیسے بجلی دوڑ گئی تھی۔ اس سے پہلے باہر نکلے تھے۔

تقریباً" پچیس منٹ بعد بیڈ پر بے سدھ پڑی اریبہ کو دیکھتے ہوئے توصیف احمد کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ بس نہیں چل رہا تھا اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیں۔ جانے کیسی کیسی مصیبتیں برداشت کی تھیں ان کی بیٹی نے۔ وہ سوچنا نہیں چاہتے تھے لیکن اریبہ کا غیر معمولی سرخ چہرہ اور بھاری پپوٹے پوری داستان سنا رہے تھے۔ یہ رت جگے اور شدت گریہ کا اعجاز تھا جو' وہ مظلومیت کی تصویر نظر آ رہی تھی۔

"ڈونٹ وری' کچھ دیر میں انہیں ہوش آجائے گا۔" ڈاکٹر اپنے پیشہ ور انداز میں کہہ کر چلا گیا' تب وہ آگے بڑھے۔ جھک کر اریبہ کی پیشانی چومی' پھر کمرے سے نکل آئے۔

شمشیر علی راہ داری میں بینچ پر بیٹھا تھا۔ توصیف احمد کو آتے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا تو وہ اس کے پاس آکر پوچھنے لگے۔

"تمہیں کہاں ملی تھی اریبہ؟"

"جی ہائی وے پر۔ میں نے انہیں بے ہوش حالت میں دیکھا تھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ تب میں انہیں گاڑی میں ڈال کر یہاں لے آیا۔" شمشیر علی اب سہولت سے بول رہا تھا۔

"تھینک یو شمشیر علی! تم نے ایک بار پھر۔۔۔"

"نو سر۔۔۔!" وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑا۔ "میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ بحیثیت انسان یہ میرا فرض تھا۔"

توصیف احمد خاموش ہو گئے' تو قدرے رک کر وہ پوچھنے لگا۔

"میرے لیے کیا حکم ہے سر۔۔۔؟"

"ہاں تم جاؤ۔" توصیف احمد چونک کر بولے۔ "اور سنو! میں تم سے دوبارہ ملنا چاہوں گا۔"

"او کے سر! میں کسی دن آفس آجاؤں گا۔"

"ضرور۔۔۔" توصیف احمد نے خود اس کی طرف ہاتھ بڑھایا' جسے تھام کر اسے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ پھر وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

توصیف احمد نے کچھ دیر سوچا' پھر اجلال رازی کو فون کر کے فوراً" اسپتال آنے کا کہہ کر اریبہ کے پاس آبیٹھے اور اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر جیسے اسے تحفظ کا یقین دلانے لگے اور شاید یہ ان کا دیا ہوا یقین تھا' جو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"اریبہ میرے بچے!" توصیف احمد فوراً" اس پر جھک گئے۔ "آپ ٹھیک تو ہو بیٹا۔"

اریبہ کی جلتی ہوئی آنکھوں سے پھر لاوا ابل پڑا تھا۔

"نہ نہ بیٹا! رو نہیں۔" توصیف احمد نے اریبہ کی گردن کے نیچے بازو ڈال کر اسے اونچا کر کے اپنے سینے میں بھینچ لیا۔ وہ خود بھی رو رہے تھے۔ آواز بوجھل ہو گئی تھی۔

"میری جان! میرا بیٹا۔۔۔ میں آپ کے پاس ہوں۔ آپ روؤ نہیں۔" وہ اس کی کمر سہلاتے ہوئے کبھی اس کا سر چومتے' کبھی پیشانی اور اریبہ آنسوؤں کے باعث کچھ بول ہی نہیں پا رہی تھی۔

"پانی۔۔۔ میں آپ کے لیے پانی لاتا ہوں۔" توصیف احمد کو ایک دم احساس ہوا۔ اریبہ کے حلق میں گولہ اٹک رہا تھا۔ فوراً" خود کو سنبھال کر اٹھے تھے کہ اسی وقت اجلال رازی کمرے میں داخل ہوتے ہی یوں رکا' جیسے اس کے قدم زمین نے جکڑ لیے ہوں۔ جبکہ نظریں اریبہ پر ساکت ہو گئی تھیں۔

"رازی! اریبہ۔۔۔" توصیف احمد عجلت میں اسی قدر کہہ کر باہر نکل گئے اور پانی کی بوتل لے کر واپس آئے تو اجلال اسی طرح کھڑا تھا۔

توصیف احمد کو اس وقت صرف اریبہ نظر آ رہی تھی۔ اجلال رازی کی طرف ان کا دھیان ہی نہیں گیا۔ فوراً" بوتل کھول کر اریبہ کے منہ سے لگائی' تب وہ چونک کر بیڈ کے قریب آگیا۔

"کہاں تھی اریبہ؟" بے ساختہ سوال تھا۔ توصیف احمد نے نوٹس نہیں لیا' جبکہ اریبہ کے حلق میں پانی بھی اٹک گیا تھا۔ اس نے ابھی تک اجلال کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ سائیڈ میں کھڑا تھا۔

"آپ ڈاکٹر سے ملے چچا جان!" اجلال رازی نے اب موقع کی نزاکت کا احساس کر کے پوچھا۔

"ہاں اللہ کا شکر ہے کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ بس ابھی اریبہ کو گھر لے چلتے ہیں۔" توصیف احمد نے کہا تو گھر کے نام پر اریبہ کا دل دھڑکنے لگا تھا۔

"ٹھیک ہے میں ڈاکٹر سے مل کر آتا ہوں۔" وہ اریبہ پر گہری نظر ڈال کر کمرے سے نکل گیا۔ توصیف احمد نے پانی کی بوتل ایک طرف رکھی پھر جیب سے رومال نکال کر اریبہ کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ صاف کر کے کہنے لگے۔

"بیٹا! میرے لیے سب سے اہم اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اللہ نے آپ کو مجھ سے ملا دیا ہے۔ باقی ساری باتیں بے معنی ہیں۔ آپ اپنے دل پر کوئی بوجھ رکھو نہ پریشان ہو۔ میں گھر میں سب کو اسپیشلی آپ کی مما کو سمجھا دوں گا کہ وہ آپ سے سوال جواب نہ کریں۔ آپ کی مما کا نام میں نے اس لیے لیا ہے کہ وہ حق رکھتی ہیں جبکہ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ آپ سے کوئی جواب طلب کرے۔"

"ڈیڈی!" اسے باپ کی شفقت نے پھر رلا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اریبہ سے مل کر پہلے سب روئے تھے۔ یاسمین، سارہ، حماد، بی بی اور تاجور بھی۔ اس کے بعد فضا یکدم بدل گئی تھی۔ جیسے گھنگھور گھٹائیں برسنے کے بعد نہ صرف مطلع صاف ہو جاتا ہے بلکہ ہر شے پر نکھار بھی آجاتا ہے۔ توصیف احمد نے سوال جواب سے سب کو منع کر دیا تھا اور گو کہ اریبہ بھی یہی چاہتی تھی لیکن وہ معمہ بھی نہیں بنے رہنا چاہتی تھی۔ کب کون کیا پوچھ لے' ہر پل کا دھڑکا خود اسے بھی چین سے نہ رہنے دیتا۔ اس لیے فرضی سہی اسے کوئی کہانی سنانی تھی۔ لیکن فی الوقت اس کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا اور ابھی وہ قصداً" زیادہ بولنے سے گریز کر رہی تھی کہ کہیں بے دھیانی میں اس کے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو سنبھالنے میں اسے مشکل ہو۔ دوپہر کے کھانے تک سب اس کے پاس موجود رہے پھر یاسمین نے اسے آرام کرنے کو کہا اور خود اسے لے کر اس کے کمرے میں آئی تو وہ بے اختیار رائٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"مما! میرا ایک سال کا نقصان ہو گیا۔"

"کوئی بات نہیں بیٹا! شکر ہے اللہ نے کسی بڑے نقصان سے بچا لیا۔" یاسمین کے لہجے میں تشکر واضح تھا۔

"کیا واقعی وہ بڑے نقصان سے بچ گئی ہے۔" اس کی ذہنی رو بھٹکنے لگی تو وہ سر جھٹک کر بیڈ پر آ گئی۔

"ٹھیک ہے بیٹا! اب تم آرام کرو۔" یاسمین نے اس کا گال چھوا پھر پیشانی چوم کر چلی گئی تو اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ احساس اطمینان بخش تھا کہ وہ اپنے گھر میں ہے' پھر بھی سونے کو دل نہیں چاہا اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا چاہ رہی ہے۔ ایک بے نام سی کسک دل میں کروٹیں لینے لگی تھی تب وہ اٹھی اور کمرے سے نکل آئی۔ ہمیشہ کی طرح دوپہر خاموش اور سنسان تھی۔ اس نے لاؤنج سے سارے گھر کا جائزہ لیا پھر تاجور کے کمرے سے باتوں کی آواز سن کر ادھر ہی آ گئی۔ تاجور' سارہ سے کہہ رہی تھی۔

"اریبہ باجی آ گئی ہیں۔ اب میرے بھائی بھی مل جائیں گے ناں؟"

"ان شاء اللہ ضرور ملیں گے۔" سارہ نے کہا پھر اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔ "کیا ہوا تم سوئی نہیں۔"

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے سارہ کے پاس آ بیٹھی اور بے اختیار تاجور کا ہاتھ تھام کر بولی تھی۔

"تمہارا بھائی آ جائے گا۔ میں اسے ڈھونڈ لاؤں گی۔"

"نہیں اریبہ باجی! اب آپ کہیں نہ جانا۔" تاجور اس کے پھر کھو جانے کے خیال سے خائف ہوئی تھی۔ وہ بے ساختہ مسکرائی پھر سارہ سے مخاطب ہو گئی۔

"سارہ... میرے کالج سے کوئی آیا تھا؟"

"ہاں تمہاری فرینڈز آئی تھیں لیکن تم ابھی یہ سب مت سوچو۔" سارہ نے بتانے کے ساتھ ٹوکا بھی لیکن وہ ان سنی کر گئی۔

"کیا کہا تم لوگوں نے میری فرینڈز سے کہ میں کہاں ہوں؟"

"مری..... آئی مین مما نے ان سے یہی کہا تھا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے ڈاکٹر نے چینج کے لیے کہا تو ڈیڈی تمہیں مری لے گئے' جہاں سے تمہاری واپسی تب ہی ہوگی' جب تک مکمل صحت یاب ہو جاؤ گی۔" سارہ نے بتایا تو پھر وہ اس موضوع سے ہٹ کر بولی تھی۔

"اچھا سنو! مجھے سیل چاہیے ابھی۔"

"ابھی مما کا لا دوں؟" سارہ نے اب بمشکل خود کو ٹوکنے سے باز رکھ کر پوچھا تو وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

"نہیں حماد سے کہو نیا سیٹ لا دے اور سم بھی۔"

"اچھا....." سارہ اٹھ کر چلی گئی تو وہ تاجور کو دیکھنے لگی۔ بہت بدل گئی تھی تاجور۔ جب وہ اسے اسپتال سے لائی تھی تو بہت کمزور تھی۔ چہرے کی رنگت زرد اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بھی نمایاں تھے اور اب تو اس کے گالوں پر گلاب کھل رہے تھے۔

"شام تو شاید اسے پہچان بھی نہیں سکے گا۔"

وہ سوچ کر مسکرائی اور اس کا دل چاہا ابھی تاجور کو یہ نوید دے کہ اس کا بھائی مل گیا ہے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ شمشیر علی سے اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ گھر پہنچ کر اسے تاجور کی خیریت سے آگاہ کرے گی اور اسی لیے اس نے موبائل منگوایا تھا۔ آتے ہوئے شمشیر علی نے اسے اپنا پرسنل نمبر بتا دیا تھا۔ جسے یاد کرتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں آگئی اور حماد کا انتظار کرنے لگی' جو ایک گھنٹے بعد آیا تھا۔

"تھینک یو حماد! تمہیں پتا ہے اب سیل فون کے بغیر تو کھانا ہضم نہیں ہوتا۔" اس نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

"جی آپی! دیکھیں اس سیل فون میں آپ کے لیے سب کچھ ہے۔" حماد پر جوش ہو گیا تھا۔

"ہاں مجھے یہی چاہیے تھا۔ تھینک یو! پتا نہیں میرا آئی ڈی کارڈ کہاں ہے۔" اس سے پہلے کہ حماد اسے موبائل کے سسٹم بتانے کھڑا ہو جاتا وہ کارنر کی دراز میں اپنا آئی ڈی کارڈ تلاش کرنے میں لگ گئی۔

حماد چلا گیا تب اس نے پہلے دروازہ بند کیا پھر سیل فون نکال لیا اور نمبر ایکٹویٹ کروا کر ابتدا شمشیر علی کا نمبر ملا کر کی تھی۔ چند لمحوں بعد شمشیر علی کی محتاط آواز آئی تھی۔

"ہیلو.....!"

"ہاں شام! اریبہ بات کر رہی ہوں۔" اس نے کہا تو شمشیر علی نے فوراً پوچھا۔

"کیسی ہو کہاں ہو؟"

"ٹھیک ہوں گھر آگئی ہوں۔"

"کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟"

"نہیں سب ٹھیک ہے اور تاجور بھی ٹھیک ہے۔ میری آمد پر یوں خوش ہو رہی ہے جیسے تم آگئے ہو۔" اس نے سادہ انداز میں جو محسوس کیا تھا' وہی کہہ دیا۔

"اچھا! ہو سکتا ہے اسے تمہارے وجود سے میری خوشبو ملی ہو۔" شمشیر علی کے لہجے میں جانے کیا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی تو قدرے اٹک کر وہ پوچھنے لگا۔

"اریبہ! میں کب ملوں گا اپنی بہن سے؟"

"ابھی کچھ دن صبر کرو شام! کیونکہ میں جانتی ہوں اب تمہارے لیے صبر بہت مشکل ہے لیکن جلد بازی کوئی مسئلہ کھڑا کر سکتی ہے۔ تم سمجھ رہے ہو ناں۔" اس نے کہا تو شمشیر علی کی سوچ میں ڈوبی آواز ابھری تھی۔

"ہوں۔"

"ٹھیک ہے' پھر بات کروں گی۔" اس نے کمرے کے باہر آہٹ محسوس کر کے سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اریبہ کی صحیح سلامت واپسی کسی معجزے سے کم نہیں تھی۔ کیونکہ صرف اجلال رازی ہی نہیں' باقی سب بھی اریبہ کا بھیانک تصور لیے بیٹھے تھے۔ لیکن اسے تو کہیں خراش تک نہیں آئی تھی۔ صحت بھی ٹھیک تھی البتہ چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ اجلال اسے دیکھ کر بہر حال بے چین ہو اٹھا تھا۔ اس کی محبت جس سے دستبرداری کا وہ فیصلہ سنا چکا تھا' سر چڑھ کر بولنے لگی تھی۔ وہ اس تمام عرصے میں متضاد کیفیات میں گھرا رہا۔

کبھی اسے اریبہ پر غصہ آتا کہ وہ بغیر بتائے کیوں چلی گئی تھی۔ کبھی اپنے آپ پر جھنجلاتا کہ اب وہ کیوں اس کی فکر کر رہا ہے۔ کبھی انتہائی پریشان کہ اریبہ نہ ملی تو کیا ہو گا۔

کبھی دل چاہتا کائنات کا چپہ چپہ چھان مارے اور اسے ڈھونڈ نکالے۔

اکثر اس کی محبت میں رویا بھی تھا۔

یعنی ہر کیفیت میں اریبہ ساتھ تھی اور اب یہ ساری باتیں اریبہ سے کہنے کو اس کا دل مچلنے لگا تھا اور دل یہ بھی چاہ رہا تھا کہ وہ اسے سامنے بٹھا کر کہہ دے۔

"اریبہ! مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم اتنا عرصہ کہاں رہیں۔ تم پر کیا بیتی کیونکہ میں جان گیا ہوں' قدرت کو میری محبت کا امتحان مطلوب تھا اور میں یقیناً اس امتحان میں سرخرو ہوا ہوں' جب ہی تو انعام کی صورت تم مجھے لوٹائی گئی ہو۔ ہاں اریبہ..... تم آگئی ہو اب اور مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

اور اسے لگا جیسے اریبہ اس کے اعتراف پر کھل اٹھی ہو۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

پس آئینہ کچھ اور ہے

عنبرین اعجاز

حسب معمول وہ آج بھی کچن میں ماربل شیلف کے کنارے پہ ہاتھ رکھے سر جھکائے خاموش کھڑے آنسو بہائے جارہی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ آنسو اس کے دل پہ گر رہے تھے۔ وہ جو ہمیشہ کی طرح آج بھی اپنے قصور سے لاعلم تھی، ندامت کے مارے چلو بھر پانی میں ڈوبنے کو تیار بیٹھی تھی۔

"وردہ! تم کیوں آئے دن اپنے میاں کو غصہ دلاتی رہتی ہو؟ آخر تم ایسی بات کہتی ہی کیوں ہو یا ایسا کام کیوں کرتی ہو جس سے تمہارا شوہر بھڑک جائے اور بغیر ناشتا کیے دفتر روانہ ہو جائے؟ صبح سویرے نحوست۔ دن کا آغاز ہی جب ایسا ہو گا تو باقی کاموں میں کیا خاک خیر و برکت ہو گی۔"

اماں نے روز کی طرح آج بھی اسے ہی مورد الزام ٹھہرایا تھا۔ وردہ کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ یہ "ایکشن ری پلے" روز ہوتا تھا۔ ڈرامے کی یہی ایک قسط روزانہ "ری ٹیلی کاسٹ" ہوتی رہتی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ رمیض ہر معاملے میں اکھڑ، بد مزاج، ضدی یا حساس تھا۔ بس صرف صبح کے وقت وہ ایسا برتاؤ کرتا تھا اور کسی نہ کسی غیر اہم بات پر وردہ سے الجھ پڑتا۔ اگر کوئی وجہ نہ ملتی تو خود ہی کوئی عذر تراش لیتا اور بغیر کچھ بتائے، بغیر کسی سے بات کیے، غصے میں منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا گھر سے باہر آفس وین کے انتظار میں اسٹاپ کی طرف چل دیتا۔

بقول رمیض کے وہ دوپہر میں لنچ میں صرف بسکٹ اور چائے لیتا تھا کیونکہ وہ وہم کی حد تک صفائی پسند تھا۔ انسانوں سے زیادہ اسے جراثیموں کی فکر رہتی تھی۔ حتی کہ اس کی گفتگو میں بھی بیماریاں اور ان کی علامات و نتائج، وجوہات، سدباب اور کوڑا کرکٹ، کچرے اور غلاظت کا ہی ذکر رہتا تھا۔ دفتر میں نائب قاصد کی شامت آئی رہتی اور گھر میں وردہ کی۔ گھر کے دیگر افراد اس کی اس عادت کی ذرہ بھر پروانہ کرتے تھے لیکن وردہ چونکہ اس کی بیوی تھی، سوائے تاحیات یہ سب کچھ برداشت کرنا ہی تھا۔ وردہ کے لیے اس کا سسرال کوئی اسپتال ہرگز نہ تھا لیکن اس کا کمرا اسپتال کے وارڈ بلکہ آئی سی یو سے کم نہ تھا۔

بارش میں نہانے والی، گھاس پہ پیدل چلنے والی، ساحلوں سے سیپیاں چننے والی، درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کے اپنے من پسند ناول پڑھنے والی لڑکی جس کی زندگی پھول، چاندنی، تتلی، رنگ اور خوشبو کا استعارہ تھی، اب ہمہ وقت ڈیٹول زدہ فضا میں گھٹی گھٹی سانسیں لینے پر مجبور تھی۔

ٹی وی پہ کوکنگ چینلز میں دکھائی جانے والی ہر ترکیب کو آزمانے والی وردہ اب دن رات اپنے شوہر کے لیے پینے کا پانی ابالتی، اسے ٹھنڈا کرتی اور چھان چھان کر بوتلوں میں بھرتی رہتی تھی۔ اول و آخر کھولتے ہوئے پانی سے بوتلوں کی صفائی بھی اس کی روٹین کا لازمی حصہ تھی لیکن مسئلہ پھر وہیں کا وہیں تھا۔ رمیض کو آئے دن کسی نہ کسی بیماری نے گھیرا ہوتا۔ موسمی بیماریاں تو ایک طرف، زیادہ تر کا تعلق نظام انہضام کے مسائل سے ہوتا۔

پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، وزن میں زیادتی، بلڈ پریشر اور شوگر لیول بھی ہائی ہو گیا۔ کولیسٹرول کی سطح بھی بڑھ گئی تھی۔ دوسری طرف وفا کی پتلی وردہ کا وزن خطرناک حد تک کم، خون میں آئرن کی شدید کمی، بلڈ پریشر اور کیلشیم کی کمی بھی دیکھنے میں آئی تھی کیونکہ میاں جی جب بغیر ناشتے کے آفس روانہ ہوں گے تو بیوی بھلا کیونکر ایک نوالہ بھی حلق سے نیچے اتار سکے گی اور اگر اس جرأت یا جرم کی مرتکب ہو گی تو کون ساری عمر سسرال کے طعنے سہے گا۔

بہرحال قدرت نے اس مسئلے کا بھی نہایت عمدہ حل نکالا۔ وردہ کا بیٹا اگرچہ پیدائش کے وقت بہت کمزور تھا لیکن آہستہ آہستہ صحت پکڑنے لگا اور جب وہ ٹھوس غذا کے قابل ہوا تو ماں کی نقل کرنے لگا۔ اب اگر ماں کھاتی تو وہ کھاتا اور وہ بھی یوں کہ ایک لقمہ ماں اپنے منہ میں ڈالتی تو صاحبزادے دوسرا لقمہ اپنے منہ میں، ورنہ مجال ہے کہ ایک چمچ بھی فالتو منہ میں چلا جائے۔

اس بہانے قدرت نے وردہ کی صحت کی بحالی کا بھی خوب انتظام کر دیا تھا۔ ویسے بھی ماں کے لیے اس کی اولاد بہت بڑی طاقت اور حوصلہ ہوتی ہے۔ اب وردہ کی تمام تر توجہ کا مرکز اس کا بیٹا سمیر تھا۔ مجازی خدا کی کج ادائیاں نہیں۔

☼ ☼ ☼

جب سے سمیر کی اسکول وین کا روٹ تبدیل ہوا تھا، وہ کچھ ناخوش سا دکھائی دیتا تھا۔ سی این جی مہنگی ہونے اور پھر ہڑتال کی وجہ سے ڈرائیور نے ایک متبادل اور مختصر راستہ ڈھونڈ نکالا تھا۔ سمیر نے بتایا تھا کہ اندرون شہر سے گزرنے والی یہ سڑک انتہائی تنگ اور ٹوٹی پھوٹی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف میں کھانے پینے کی دکانیں، چھپر ہوٹل اور جا بجا کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے۔ بارش ہو جاتی تو تعفن اور بڑھ جاتا لیکن لوگ صبح، دوپہر، شام ان ہی اوپن ایئر ہوٹلوں میں چارپائیوں پہ بیٹھے مزے سے چائے کی چسکیاں بھرتے۔ حلوہ پوری، چنے بھتورے، نان چھولے، کلچے، کھوئے والی لسی، نہاری، دوپہر میں ماش کی دال اور چکن کڑاہی۔ چپلی کباب اور چائے کے اوقات میں گرما گرم جلیبی، سموسے، پکوڑے، کچوریاں یہاں کی خاص سوغات تھیں۔

مردوں کا رش کم ہوتا تو شاپنگ کے لیے آنے جانے والی خواتین وہی بریوں، چنا چاٹ، فروٹ چاٹ، گول گپوں کے اسٹالوں اور ریڑھیوں کو گھیر لیتیں۔ المختصر یہ بازار انتہائی پُر رونق اور مصروف ترین تھا۔ صفائی ستھرائی کا نہ تو کسی کے پاس وقت تھا نہ ہوش۔

اسکول سے واپسی پر جب سمیر یونیفارم بدل کے کچن میں ٹیبل پہ آیا تو اپنا من پسند کھانا دیکھ کے خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ سنگاپورین رائس اور بریڈ پڈنگ۔ اس نے محبت بھری نظروں سے ماں کو دیکھا۔ وردہ بھی وہیں ٹیبل پہ کرسی کھینچ کے قریب بیٹھ گئی۔ کیونکہ کھانا کھاتے ہوئے ہی سمیر اسے دن بھر کی کارگزاری اور خاص خاص خبریں سناتا تھا لیکن آج اس کی خاموشی کے وقفے طویل ہو رہے تھے، جسے وردہ

واضح طور پر محسوس کر رہی تھی۔ آخری لقمہ حلق سے اتارنے کے بعد اس نے بے اختیار ہی ماں کا ہاتھ چوم لیا۔

"جو مزا میری مام کے ہاتھوں میں ہے' وہ دنیا کے کسی کوکنگ آئل میں نہیں۔ آئی لو یو مام!"

سمیر نے فرط محبت سے ماں کا ہاتھ چوم کے آنکھوں سے لگالیا۔ وردہ کی آنکھیں بیٹے کی محبت دیکھ کے تشکر کے آنسوؤں سے جھلملانے لگیں۔ وہ بہت پیار سے سمیر کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

سمیر جو اندر ہی اندر سخت اضطراب میں مبتلا تھا' کافی حد تک خود کو پرسکون محسوس کرنے لگا۔

"مام! آپ سے ایک بات شیئر کرنا تھی۔" سمیر نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جی بیٹا! کہیے۔" وردہ نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے جواب دیا۔ سمیر سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ وردہ ہمہ تن گوش تھی۔

"مام! کیا آپ یقین کریں گی کہ پچھلے دو ماہ سے' جب سے ہماری اسکول وین کا روٹ چینج ہوا ہے' پاپا کو "حاجی نذیر کلچہ ہاؤس اینڈ حلوہ پوری مرکز" اور کسی کسی دن "نہاری پیلس" اور کبھی کبھی "ککنگ شاہی لسی سینٹر" کے باہر گندے برتنوں' میلی کچیلی میز اور ٹوٹی پھوٹی چارپائی پہ' مکھیوں کے انبار میں باقاعدگی سے ناشتا کرتے دیکھتا ہوں۔ اف! مام.....

سمیر نے دھیرے دھیرے اپنی بات مکمل کی اور پھر یوں لب بھینچ لیے جیسے اسے قے آرہی ہو۔ وردہ ناقابل یقین حیرت سے سمیر کو دیکھ رہی تھی۔

"مام! میں روزانہ پاپا کی گاڑی کو وہاں دیکھتا تھا لیکن اگنور کر دیتا تھا کیونکہ دنیا میں ایک ہی رنگ اور ماڈل کی بہت سی گاڑیاں ہوتی ہیں لیکن پھر ایک دن رش زیادہ تھا' اس لیے وین کی اسپیڈ کافی کم تھی' تب میں نے گاڑی کی نمبر پلیٹ غور سے دیکھی' وہ ہماری ہی گاڑی تھی۔ پچھلے شیشے پر پاپا کی یونیورسٹی کا اسٹیکر اور کشنز' ٹشو پیپر باکس اور ٹیڈی بیئر سب چیزیں وہی تھیں۔ پھر ایک دن ہماری وین کا ٹائر پنکچر ہو گیا تو مجھے ذرا تفصیل سے اردگرد کو دیکھنے کا موقع مل گیا۔ ہم سب لڑکے وین سے اتر گئے اور وہیں میں نے پاپا کو کافی دیر تک دیکھا۔"

سمیر نے مزید تفصیلات سے آگاہ کیا۔ سمیر چودہ سالہ ٹین ایجر' اولیول کا طالب علم تھا۔ چودہ دن کا بچہ نہ تھا جسے کوئی غلط فہمی ہوتی۔ وہ خود ایک عرصے سے شاکڈ تھا اور باپ کی دوہری شخصیت کا آج صبح تک مشاہدہ کرتا رہا تھا۔ وردہ گم صم بیٹھی تھی۔ رمیض کی بڑھتی بلکہ ڈھلکتی ہوئی توند' سرخ و سپید فربہ چہرے اور لٹکتی جھولتی ہوئی دوہری گردن بارہا اس کی نظروں میں گھوم رہی تھی۔

سمیر نے مزید بتایا کہ اس نے رمیض کے موبائل میں شہر کے تمام بڑے اور نامور ریسٹورنٹ اور فاسٹ فوڈ پوائنٹس کے فون نمبرز بھی محفوظ دیکھے ہیں۔ یقیناً" ممبر شپ بھی لے رکھی ہوگی اور دوپہر کے کھانے میں یقیناً "ڈیل آرڈر کرتے ہوں گے۔

سمیر کو حیرت' غصہ اور گلہ تھا کہ اس کے پاپا آج تک اسے اور ماما کو کبھی اپنے ساتھ باہر نہیں لے کر گئے۔ سمیر اپنے کلاس فیلوز اور کزنز کی زبانی جس ڈش کا نام سنتا' فوراً" ماں کو آگاہ کرتا اور فرمائش کرتا۔ وردہ کسی نہ کسی طرح سے' کہیں نہ کہیں سے ریسپی حاصل کرلیتی اور گھر پہ ہی بیٹے کو بنا کر کھلاتی رہتی۔

سب سے زیادہ دکھی وہ اس وجہ سے تھا کہ کیا باہر کا ناشتا کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ سب گھر والوں کے سامنے روز روز اس کی ماں کو ذلیل کیا جائے۔ وہ اپنے باپ کی دوہری شخصیت پر شدید الجھن کا شکار تھا اور خاص طور پر ماں کی ذلت و رسوائی کو بھی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔

دوسری طرف وردہ آج بھی یعنی پندرہ برس بعد بھی اسی کچن میں ماربل شلف کے کنارے سے ٹیک لگائے سر جھکائے خاموشی سے آنسو بہاتے ہوئے یہ سوچ رہی تھی کہ اپنے اکھڑ مزاج شوہر کی محبت میں بھوکی رہنے والی وہ ایک وفا شعار بیوی تھی یا بے وقوفی کی حد تک سادہ لوح عورت.....

☆

نگہت سیما

زمین کے آنسو

ایک فلک شاہ کو خوابوں میں اکثر ایک خوب صورت اور نشیلی آنکھوں والی لڑکی روتے ہوئے نظر آتی ہے۔ اس نے اسے فرضی نام "حورعین" دے رکھا ہے۔ وہ اس پر کچھ تحریر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

"الریان" کے سربراہ عبدالرحمٰن شاہ ہیں۔ مصطفیٰ، مرتضیٰ، عثمان اور احسان (شانی) ان کے بیٹے ہیں۔ عمارہ (عمو) اور زارا ان کی بیٹیاں ہیں۔

"مراد پیلس" کے سربراہ مراد شاہ کے بیٹے سلجوق، عبدالرحمٰن کے گہرے دوست ہیں۔ سلجوق کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے فلک شاہ (موی) "الریان" آجاتے ہیں۔ وہاں ان کی سب سے دوستی ہو جاتی ہے۔ احسان سے ان کی دوستی زیادہ گہری ہو جاتی ہے اور عمارہ سے محبت کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ فلک شاہ کالج میں سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگتے ہیں۔ فلک شاہ کو سلجوق کے انتقال کے بعد ان کی والدہ زریں جائیداد کے چکر میں لے جاتی ہیں مگر وہاں اس کا شوہر فیروز فلک سے چڑنے لگتا ہے۔ سلجوق کے انتقال کی وجہ سے جائیداد کے شرعی حق سے محرومی کے بعد وہ فلک شاہ کو واپس مراد شاہ کے پاس چھوڑ جاتی ہے اور چھ ماہ بعد فوت ہو جاتی ہے۔

عبدالرحمٰن شاہ کی بہن مروہ کی سسرالی رشتے دار مائرہ سے ملاقات میں احسان اسے پسند کرنے لگتے ہیں۔ عبدالرحمٰن، فلک شاہ سے اپنے بیٹوں کی طرح محبت کرنے لگتے ہیں اور اپنی بیٹی عمارہ کی شادی کر دیتے ہیں۔ ایک جھگڑے میں فلک شاہ "الریان" والوں سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کرکے بہاول پور چلے جاتے ہیں۔ بہت عرصے بعد ان کے بیٹے ایبک کی "الریان" میں آمد ہوتی ہے۔ احسان کی بیوی مائرہ اور بیٹی رائبل کے علاوہ سب ایبک کی آمد پر خوش ہوتے ہیں جبکہ عمر احسان ایبک کا فین ہے۔ "الریان" میں رہنے والی اریب فاطمہ جو کہ مروہ پھپھو کے شوہر کی رشتے کی بھانجی ہے، ایبک سے کافی متاثر ہے۔

عمارہ اور فلک شاہ "الریان" آنے کے لیے بہت تڑپتے ہیں۔ عمارہ کو انجائنا اٹیک ہوتا ہے تو عبدالرحمٰن شاہ بھی بیمار ہو جاتے ہیں۔

احمد رضا اور سمیرا، حسن رضا اور زبیدہ بیگم کے بچے ہیں۔ احمد رضا بہت خوب صورت اور ہینڈسم ہے۔ وہ خوب ترقی، کامیابی اور شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ رضا کا دوست ابراہیم اسے ایک بزرگ اسماعیل خان سے ملواتا ہے۔ ان سے مل کر رضا کو حسن بن صباح کا گمان گزرتا ہے۔

مکمل ناول

ریسیپشن کاؤنٹر پر کہنی ٹکائے صبا احمد سے بات کرتے کرتے اچانک اریب فاطمہ کے اندر کوئی احساس جاگا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ایبک فلک شاہ کو تیز تیز چلتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار ایک قدم آگے بڑھی۔ شاید وہ اسے پکارنا چاہتی تھی لیکن وہ اس کی طرف دیکھے بغیر دوسرے کوریڈور کی طرف مڑ گیا۔

ایک گہرا سانس لے کر واپس صبا احمد کی طرف مڑتے ہوئے اس نے دل میں اعتراف کیا کہ بلاشبہ ایبک فلک شاہ دنیا کے خوب صورت ترین مردوں میں سے ایک ہے اور اس میں ایسا کچھ خاص ہے کہ اسے دیکھنے اور اسے سننے کو جی چاہتا ہے۔ عمر احسان نے کینٹین سے باہر آتے ہوئے ایبک شاہ کو دیکھا اور تقریباً "دوڑ کر اس کے ہم قدم ہو گیا۔

"ایبک بھائی!" اس نے اس کے قدم کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے پھولے سانسوں کے ساتھ کہا۔ ایبک فلک شاہ کے قدم مدھم پڑ گئے۔ اس نے عمر احسان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بابا جان کیسے ہیں؟"

"کچھ بہتر ہیں لیکن بالکل ٹھیک نہیں ہیں۔"

عمر احسان کی آنکھوں میں نمی پھیلتی چلی گئی۔ ایبک فلک شاہ نے چلتے چلتے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گویا اسے تسلی دی۔

"ڈونٹ وری عمر! ان شاء اللہ بابا جان بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

عمر احسان کا جی چاہا تھا کہ وہ ایبک کے کندھے پر سر رکھ کر بہت سارا روئے اور وہ اپنے اسی نرم اور پر اثر لہجے میں اسے تسلی دیتا رہے تاکہ کئی دن سے اس کا ڈوبا ڈوبا دل سنبھل جائے۔ وہ بابا جان کا بہت لاڈلا تھا۔

عاشی کے گھر آنے سے پہلے وہ ہی گھر میں سب سے چھوٹا تھا اور بابا جان اس کے بہت لاڈ اٹھاتے تھے لیکن زارا پھپھو کی وفات کے بعد جب بابا جان عاشی کو لے آئے تو گھر میں سب سے چھوٹی وہ ہو گئی تھی۔ گو بابا جان اپنا بہت سا وقت اسے دینے لگے تھے اور اس کے بہت لاڈ اٹھاتے تھے لیکن عمر احسان کی اہمیت اس کے آنے سے کم تو نہ ہوئی تھی۔

بابا جان کی مسلسل بے ہوشی کے دوران پتا نہیں کیسے اس نے خود کو سنبھالا ہوا تھا۔ ورنہ اس کا تو چیخیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا نازک دل، بچپن سے ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر آنسو بہانے لگتا تھا۔ الریان کی ساری لڑکیاں اس کا مذاق اڑاتی تھیں اور رابیل نے تو اس کا نام ہی "روتے ہیں چھم چھم نین" رکھ چھوڑا تھا۔

ایبک شاہ کے قدموں میں پھر تیزی آ گئی تھی اور پھر وہ کمرا نمبر 9 کے سامنے جا کر ہی رکا تھا۔

"بابا جان کے پاس کون ہے عمر؟"

"اس وقت تو صرف میں اور ہومی بھائی ہی ہیں۔"

ایبک فلک شاہ نے ناب پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"میں چائے لینے کینٹین گیا تھا۔ ہومی بھائی اندر ہیں۔"

عمر نے فوراً "وضاحت کی تھی۔ حالانکہ ایبک نے تو یونہی سرسری انداز میں اسے دیکھا تھا لیکن وہ پتا نہیں کیوں ایبک کے سامنے نروس ہو جاتا تھا۔ ایبک ناب گھما کر اندر داخل ہوا تھا۔ عبدالرحمٰن شاہ کے بیڈ کے پاس کرسی پر بیٹھے ہمدان مصطفیٰ نے مڑ کر اندر آتے ایبک شاہ کو دیکھا تو بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

"ایبک تم!"

اور عبدالرحمٰن شاہ جو آنکھیں موندے نیم دراز تھے۔ یکدم آنکھیں کھول دیں۔ ایبک شاہ بے تابی سے ان کی طرف بڑھا۔

"بابا جان!"

انہوں نے بھی بے اختیار اپنے بازو پھیلا دیے اور

وہ ان کے پھیلے بازوؤں میں سما گیا تھا اور شاید اس وقت اس کے سینے میں عمارہ فلک شاہ کا دل دھڑکنے لگا تھا کہ ان کے سینے سے لگے لگے اس پر اس طرح رقت طاری ہو رہی تھی کہ اسے لگتا تھا جیسے اس کا دل پانی بن کر بہہ جائے گا۔

اور شاید اس وقت عبدالرحمٰن شاہ نے بھی اس کے لمس میں عمارہ کی خوشبو پائی تھی کہ جب وہ ان کے بازوؤں سے نکلا تو بے اختیار ہی انہوں نے اپنے بوڑھے ہاتھوں میں اس کا چہرہ لیتے ہوئے اس کی روشن پیشانی چوم لی ان کی آنکھوں میں نمی بھی پھیل گئی تھی۔ وہ کتنی ہی بار ان سے ملا تھا لیکن اتنے والہانہ انداز میں وہ پہلی بار اس سے ملے تھے اور اس لمحے اسے ایک دم ہی عمارہ کا خیال آ گیا تھا لیکن اپنے جذبات پہ قابو پاتے ہوئے ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اس نے بہت محبت سے پوچھا۔

"آپ کیسے ہیں؟"

"میری عمو کیسی ہے؟ کیا ہوا تھا اسے؟" ان کی آنکھیں چھلکنے کو بے تاب تھیں۔

"ماما اب ٹھیک ہیں۔ معمولی سا انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔"

"یا اللہ! میری بچی کو لمبی زندگی دینا۔" انہوں نے بہت آہستگی سے دعا کی تھی۔

اور عمر احسان کا جی چاہا کہ وہ شرم سے ڈوب مرے۔ ایبک کے ساتھ بابا جان کے کمرے تک آتے آتے اسے ایک بار بھی خیال نہیں آیا تھا کہ وہ ایبک سے پھپھو جان کا احوال ہی پوچھ لے۔ وہ شرمندہ شرمندہ سا کمرے میں پڑے دوسرے بیڈ پر بیٹھ گیا تھا جبکہ ایبک شاہ وہیں بابا جان کے بیڈ پر ہی بیٹھ گیا تھا اور ہمدان سے بابا جان کے متعلق تفصیل پوچھ رہا تھا۔ تفصیل بتانے کے بعد ہمدان مصطفیٰ نے اس سے بے حد نرمی سے کہا تھا۔

"ایبک! تمہیں پھپھو جان کو چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہاں انکل کیسے اکیلے ہینڈل کریں گے۔ اگر طبیعت پھر خراب ہو گئی تو۔ جبکہ یہاں تو ہم سب ہیں۔"

عبدالرحمٰن شاہ نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

"میں بابا جان کا سن کر رہ نہ سکا۔ کل صبح ہی واپس چلا جاؤں گا یا ہو سکتا ہے آج ہی اگر بہاول پور کی کوئی فلائٹ مل جائے تو ویسے وہاں جواد، انجی، صالحہ اور طاہر بھائی ہیں۔"

عبدالرحمٰن شاہ کی سوالیہ نظریں ایبک فلک شاہ کی طرف اٹھی تھیں ایبک فلک شاہ کو الریان آتے کتنے دن ہو گئے تھے لیکن انہوں نے کبھی اس سے اس کی فیملی کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ ہمدان کے ساتھ ایک روز اچانک الریان آ گیا تھا تو ہمدان نے اس کا اتنا ہی تعارف کروایا تھا۔

"یہ ایبک ہے عمارہ پھپھو کا بیٹا۔"

اور بس۔ اس سے زیادہ انہوں نے کبھی کچھ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ شاید انہیں خوف تھا کہ کہیں ان کا بھرم نہ ٹوٹ جائے۔ انہیں لگتا تھا جیسے انہوں نے عمارہ اور فلک شاہ کا نام لیا تو وہ بھر بھری مٹی کی طرح ڈھتے چلے جائیں گے۔ پتا نہیں کیسے انہوں نے خود کو سنبھالا ہوا تھا اور زارا کے بعد تو انہیں لگتا تھا جیسے کسی روز اچانک بھر بھری مٹی کا یہ ڈھیر زمیں بوس ہو جائے گا۔

ایبک فلک شاہ کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ اس نے شاید ان کی آنکھوں کا سوال پڑھ لیا تھا۔

"صالحہ، انجی کی نند ہے اور طاہر دیور۔ سب لوگ بہت مخلص ہیں۔ انجی سے بہت پیار کرتے ہیں۔ بالکل غیر ہیں لیکن اپنوں سے بڑھ کر۔"

عبدالرحمٰن شاہ کے سامنے یکدم زارا آ گئی تھی۔ ان کا ہاتھ تھامے ان سے التجا کرتی ہوئی۔

"انجی بہت پیاری ہے بابا جان! بالکل عمو آپی کی کاپی۔ اگر ہم ہمدان مصطفیٰ۔"

اور انہوں نے اس کی پوری بات سنی ہی نہ تھی اور اس کے معنی جان کر اسے منع کر دیا تھا۔

"نہیں! ایسا سوچنا بھی مت۔"

"لیکن باباجان، ہومی۔۔۔"

وہ جانتے تھے ہمدان، عمارہ کے گھر جاتا رہتا ہے۔ انہوں نے اسے کبھی وہاں جانے سے منع نہیں کیا تھا لیکن اب انہوں نے سختی سے زارا سے کہا تھا۔

"اسے سمجھا دینا زارا! ناممکن خواب اپنی آنکھوں میں مت بسائے۔"

ان کی نگاہیں، ہمدان مصطفیٰ کی طرف اٹھی تھیں جس کے چہرے پر یکدم ایک پتھر سی سنجیدگی اتر آئی تھی۔

انہیں یکدم دل میں ایک چبھن سی ہوئی اور پھر پورے وجود میں درد کی ایک لہر سی پھیلتی چلی گئی۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں۔ ایک نے گھبرا کر انہیں پکارا۔

"باباجان! کیا ہوا؟"

پھر انہیں بازوؤں سے تھام کر آہستگی سے لٹا دیا۔ ہمدان مصطفیٰ کے چہرے پر بجی سنجیدگی کا خول یکدم چٹخا اور وہ بھی گھبرا کر ان کی طرف جھکا۔

"باباجان! باباجان! کیا ہوا؟"

"یکدم نقاہت سی محسوس ہوئی ہے۔ ٹھیک ہوں میں اور ایک بچے! ہومی صحیح کہہ رہا ہے۔ آپ کو اس طرح اپنی ماما کو چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ مومی تو بہت جلد ہمت چھوڑ دیتا ہے۔ یوں بڑا جی دار ہے لیکن جہاں رشتوں کی بات ہو، بہت کمزور ہو جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے جب کبھی چچا جان یا چچی جان ذرا سے بھی بیمار ہوتے تھے تو ان کا سرہانہ پکڑ کر بیٹھ جاتا تھا اور ان سے زیادہ اس کی حالت خراب ہو جاتی تھی۔"

آج کتنے سالوں بعد فلک شاہ کا نام ان کے لبوں پر آیا تھا۔ ہمدان مصطفیٰ نے تو اپنے ہوش میں پہلی بار انہیں فلک شاہ کے حوالے سے کوئی بات کرتے سنا تھا۔ یہاں الریان میں احسان، عثمان، مصطفیٰ وغیرہ جب کبھی بھی فلک شاہ کا ذکر کرتے تو انہیں مومی ہی کہا کرتے تھے۔

"جی باباجان! آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ بابا کا دل تو بہت کمزور ہے۔ بچپن سے ہی میں نے دیکھا ہے۔ مجھے، انجی یا ماما کو کچھ ہو جاتا تو ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ ہماری تکلیف خود لے لیں اور ہمیں منٹوں میں اچھا کر دیں۔ حتیٰ کہ فلو بھی ہوتا تو پوری پوری رات ہمارے سرہانے بیٹھے جاگتے رہتے ہیں۔"

"ہاں وہ ایسا ہی ہے بیٹا!"

عبدالرحمٰن شاہ کی آنکھوں میں ماضی کے کئی مناظر نمایاں ہوئے تھے۔

بچپن میں ماں باپ کو کھو دیا تو رشتوں کے معاملے میں بہت حساس ہو گیا تھا۔ مجھ سے کہتا تھا "باباجان! اگر رشتے بازار میں ملتے ہوتے تو میں اپنے اردگرد رشتوں کا ڈھیر لگا لیتا تھا۔۔۔ سارے خوب صورت رشتے منڈی سے خرید کر لے آتا۔ چچا، ماموں، پھپھو، خالہ، نانی، نانا۔۔۔ پھر میں اتنا تہی دست نہ ہوتا مجھے یاد ہے، میں نے کہا تھا۔

"تم اب بھی تہی دست نہیں ہو میری جان! ہم سب ہیں تمہارے اپنے۔"

ان کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"ان دنوں وہ یو ای ٹی میں تھا اور یو ای ٹی چھوڑ کر گورنمنٹ کالج لاہور میں جانا چاہتا تھا جس پر میں نے تھوڑی سی خفگی کا اظہار کیا تھا تو اس نے کہا تھا۔

"میں سوچتا ہوں باباجان اگر کبھی یہ سارے رشتے مجھ سے بچھڑ گئے تو میں تو ایک دن بھی جی نہیں پاؤں گا۔۔۔ اس خیال سے ہی میرا دم گھٹنے لگتا ہے تو اگر ایسا ہو گیا تو میں سچ کہتا ہوں میں مر جاؤں گا باباجان!"

اور میں نے اسے گورنمنٹ کالج جانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ افسردہ ہوئے "یہ مجھے کب گوارا تھا۔"

ایک اور ہمدان مصطفیٰ بہت خاموشی سے انہیں سن رہے تھے اور وہ جیسے بہت ساری یادوں کے ڈھیر میں سے ایک ایک یاد چن کر نکال رہے تھے۔

"وہ کہتا تھا میں الریان سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔"

"اور وہ کبھی الریان سے جدا ہوئے ہی نہیں الریان تو کبھی ان کے دل سے نکلا ہی نہیں۔ اب بھی ان کے دل میں ہی بستا ہے۔"

ایک نے سوچا۔

"مگر اس نے الریان کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا اور سب کے بغیر زندہ رہنا سیکھ لیا۔"

"نہیں۔۔۔!" ایک نے یکدم تڑپ کر انہیں دیکھا تھا۔ "باباجان آپ کو کیا خبر، وہ زندہ کب ہیں۔ پل پل مرتے ہیں وہ۔ ان کی صبحیں اور شامیں ان کے دن اور رات سب "الریان" کے مکینوں کو یاد کرتے گزرتے ہیں۔"

عبدالرحمٰن شاہ نے شاید اس کی بات نہیں سنی تھی۔ یکدم ہی ان کا سانس اکھڑنے لگا۔

ہمدان اور ایک دونوں کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔

"باباجان!" اور عمر احسان، جو کچھ فاصلے پر بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا، یکدم گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

ہمدان مصطفیٰ نے ان کا سینہ ملتے ہوئے چیخ کر کہا۔

"عمر! ڈاکٹر کو بلا کر لاؤ جلدی۔" عمر تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔

کچھ دیر بعد ان کی طبیعت سنبھل گئی اور دوائی کے زیر اثر وہ پرسکون ہو کر سو گئے تو ایک نے ہمدان مصطفیٰ سے جانے کی اجازت چاہی۔

"اگر میں کسی وجہ سے واپس بہاول پور نہ جا سکا تو رات کو پھر چکر لگاؤں گا۔"

اور جب وہ باہر نکلا تو اریب فاطمہ ابھی تک وہیں کاؤنٹر پر کہنی رکھے کھڑی تھی۔ صبا احمد جب ذرا فارغ ہوتی تو وہ اس سے بات کرنے لگتی۔ صبا احمد کو اس نے ہمیشہ ہی سراہا تھا۔ گاؤں میں صبا احمد کا گھر اس کے گھر کے بالکل ساتھ تھا۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد صبا نے بڑی بہادری کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا تھا اور چھوٹے بہن بھائیوں کی کفالت کے لیے گھر سے باہر نکلی تھی۔ وہ کالج سے سیدھی اسپتال آئی تھی باباجان کو دیکھنے اور یہاں صبا کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ صبا نے اسے بتایا تھا کہ تین چار روز قبل ہی وہ گاؤں گئی تھی اور اس کی اماں سے ملی تھی۔ وہ بہت اشتیاق سے اماں کے متعلق پوچھنے لگی تھی۔ کتنے سارے دن ہو گئے تھے اسے اماں سے ملے۔ اماں سے ملنے کو وہ ہمیشہ ہی بے تاب رہتی تھی۔

وہ مروہ کی رشتے کی نند کی بیٹی تھی۔ اس کی اماں کی شادی گاؤں میں ہوئی تھی۔ اس کے ابا لڑکیوں کی تعلیم کے بالکل حامی نہ تھے جبکہ اماں اسے پڑھانا چاہتی تھیں۔ اس سے بڑے دو بھائی تھے اور ایک اس سے چھوٹا تھا۔۔۔ اماں کی مروہ مامی سے کوئی بات ہوئی تھی اور مروہ بہت بچپن میں ہی اسے اپنے ساتھ رحیم یار خان لے گئی تھیں۔

مروہ مامی نے اسے کبھی اپنے بچوں سے الگ نہیں سمجھا تھا۔ بہت محبت کرتی تھیں وہ اس سے۔ پھر بھی جب وہ چھٹیوں میں گھر جاتی تھی تو ہر بار اس کے لیے اماں سے بچھڑنا بڑا اذیت ناک ہوتا تھا۔ ابا ہر بار ہی اماں سے کہتے کہ اسے واپس نہ بھیجو، بہت پڑھ لیا لیکن ان کی ہر بات پر سر جھکا لینے والی اماں نے صرف اس ایک بات پر ان سے کبھی سمجھوتا نہیں کیا تھا۔

پھر جب مروہ مامی مسقط جانے لگیں تو انہوں نے اسے "الریان" میں چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ بی اے فائنل میں تھی اور پھر مامی کی خواہش تھی کہ وہ اپنی تعلیم ادھوری نہ چھوڑے۔ اماں کو تو کوئی اعتراض نہ تھا لیکن ابا اور بھائیوں نے خوب شور مچایا۔

"کیا ہم ایسے گئے گزرے ہیں کہ ہماری بچی اب غیروں کے گھر میں رہے گی۔"

"غیر کیوں ہیں۔ میرے بھائی کا گھر ہے۔ عبدالرحمٰن بھائی کے گھر میں اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

مروہ مامی کی بات کو ابا نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

"نہیں بھابھی جی! آپ بس اسے گاؤں بھجوا دیں واپس۔ بہت پڑھ لیا ہے اس نے۔ زیادہ پڑھ کر کون سا اسے استانی لگنا ہے کہیں۔"

تب دبلی پتلی کمزور سی اماں، ابا کے سامنے ڈٹ گئی تھیں لیکن ابا تھے کہ مسلسل انکاری تھے اور اس محاذ پر

ڈٹی اماں پر اس وقت اسے اتنا پیار اور ترس آیا تھا کہ اس کا جی چاہا، اماں سے کہہ دے کہ وہ اس کی خاطر جھگڑا نہ کریں۔ اس نے پڑھ لکھ کر کون سے پہاڑ ڈھا لینے ہیں۔ لیکن اماں بھی ابا کو راضی کرنا جانتی تھیں۔

"آپ کو عبدالرحمٰن بھائی کے گھر رہنے پر اعتراض ہے نا تو ٹھیک ہے ہم اسے ہاسٹل میں داخل کروا دیتے ہیں لیکن یہ پڑھے گی ضرور۔"

پھر ابا خاموش ہو گئے تھے۔

یوں مروہ ماں جانے سے پہلے اسے الریان چھوڑ گئی تھیں۔

وہاں کاؤنٹر کے پاس کھڑے کھڑے اسے اپنی اماں اتنی یاد آئیں کہ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ پتا نہیں کیوں وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی اور بابا جان کے کمرے میں جانے کی ہمت نہ کر سکی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہاں ایبک فلک شاہ بھی تھا۔ پتا نہیں وہ اس کی شخصیت کے سحر سے ڈرتی تھی یا پھر اپنے دل سے جو ایبک شاہ کو سامنے دیکھ کر کئی دھڑکنیں مِس کر جاتا تھا۔ شاید میں بھی عمر احسان کی طرح اس کی فین ہو گئی ہوں لیکن مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ وہ ہے کیا۔

عمر احسان کی کسی بات کا جواب دیتے ہوئے اس کے پاس سے گزرتا ہوا ایبک ٹھٹک کر رکا تھا۔ اریب فاطمہ نے یکدم نظریں ملنے پر رخ موڑ لیا۔ ایبک شاہ کے لبوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ آکر ٹھہر گئی۔

عمر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"اوکے ڈیر! اب جاؤ بابا جان کے پاس۔ ان شاءاللہ پھر ملاقات ہو گی۔"

اور عمر احسان کے لیے تو اس کی ہر بات گویا حکم کا درجہ رکھتی تھی، سو وہ وہیں سے ہی واپس مڑ گیا۔ اس نے کاؤنٹر کے پاس کھڑی اریب فاطمہ کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ ہولے ہولے چلتا ہوا کاؤنٹر کے پاس آیا عین اسی لمحے اریب فاطمہ نے مڑ کر دیکھا..... اس کی پلکیں ابھی تک بھیگی ہوئی تھیں۔ ایبک فلک شاہ کی نظروں نے اسے چھوا اور اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"حورعین! تم جب بھی ملتی ہو خوابوں میں خیالوں میں، حقیقت میں، تمہاری پلکوں پر اتنا نم کیوں ہوتا ہے۔"

اریب فاطمہ کو اتنی آہستگی سے کہی گئی بات ذرا سمجھ میں نہیں آئی اس نے بے حد گھبرا کر کہا۔

"وہ میں بابا جان کو دیکھنے آئی ہوں۔"

ایبک شاہ کی آنکھوں میں یکدم جگنو سے چمکے تھے۔ اسے خیال آیا کہ جب وہ یہاں سے گزرا تھا تو اس نے اس کے کپڑوں کی جھلک دیکھی تھی لیکن وہ بابا جان کی پریشانی میں ادھر ادھر دیکھے بغیر آگے نکل گیا تھا۔ تو کیا تب سے اب تک وہ یہاں کھڑی ہے۔ ایک خوشگوار سی حیرت کے ساتھ اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

"یہاں کھڑے ہو کر کیا آپ میرا انتظار کر رہی تھیں؟"

"نہیں....."

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کاؤنٹر کے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ جانے کب صبا احمد وہاں سے چلی گئی تھی۔

ایبک شاہ نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور اس کی آنکھوں کی بے تحاشا چمک سے گھبرا کر اریب فاطمہ نے آنکھیں جھکا لیں۔

"آپ مجھ سے اتنا ڈرتی کیوں ہیں اریب فاطمہ!"

"وہ صبا ابھی تو یہاں تھی۔" اس نے گھبرا کر پھر پیچھے دیکھا۔

"لیکن میں صبا کے متعلق تو نہیں پوچھ رہا۔" اس کی نظریں اریب فاطمہ کے چہرے پر جمی تھیں اور اس کی نظروں کی حدت سے اس کے رخسار تمتما رہے تھے۔

"کیا آپ میری وجہ سے اندر بابا جان کے کمرے میں نہیں آئیں۔ حالانکہ....."

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کی لرزتی کانپتی پلکوں کو دلچسپی سے دیکھا۔

"آپ آجاتیں تو اسپتال کے اس کمرے میں بن موسم کے بہار آجاتی۔"

وہ اپنی بات کہہ کر چلا گیا۔ لیکن اریب فاطمہ کے دل کی دھڑکنوں کو اتھل پتھل کر گیا تھا اور وہ وہیں کھڑی اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کے درست ہونے کا انتظار کرنے لگی تھی جب عمر احسان کچھ پریشان سا اسے آتا دکھائی دیا تھا۔

"عمر.....!" اس نے بے اختیار ہی اسے آواز دی تھی اور عمر احسان نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اس کی طرف قدم بڑھائے تھے۔

"تھینک گاڈ ربا آپی! کہ آپ یہیں مل گئیں ورنہ پتا نہیں کہاں کہاں خوار ہونا پڑتا مجھے۔" اس کے قریب آکر عمر نے کہا۔

"کیوں کیا ہوا؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں وہ جو ہم سب کی گاڈ فادر ہیں نا موفی آپا..... ان کے دو فون آچکے ہیں کہ تم ابھی تک کالج سے گھر نہیں پہنچیں۔ لہٰذا میں خود جا کر کالج سے پتا کروں کہ خدانخواستہ آپ کا کہیں کوئی حادثہ وغیرہ تو نہیں ہو گیا۔"

"موفی آپا" کون؟" اسے کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔

"منیبہ شاہ... وہی تو ہیں الریان کے سب چھوٹے بڑے بچوں کی گاڈ فادر۔"

یہ بھی عمر احسان کی ایک عادت تھی کہ اس نے الریان کے سب لوگوں کے نام مختصر کر رکھے تھے سوائے ایک فلک شاہ کے... ایک شاہ بھلا "الریان" کا کب تھا۔ وہ تو "مراد پیلس" کا باسی تھا۔ یہ الگ بات کہ "الریان" والوں کے ساتھ اس کا بہت قریبی رشتہ تھا اور اس قریبی رشتے کا علم عمر احسان کو چند ماہ قبل ہی ہوا تھا۔ جبکہ اس سے عقیدت کا رشتہ کافی پرانا تھا۔ جب وہ پہلی بار ان کے کالج آیا تھا تب سے۔

"میں باباجان کو دیکھنے آئی تھی۔ کیسے ہیں وہ؟"

"ٹھیک ہیں۔"

عمر احسان بتا کر منیبہ شاہ کو فون کرنے لگا۔ ورنہ منیبہ شاہ سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ چھوٹوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کو بھی اس کی گم شدگی سے مطلع کر دیتی اور عین ممکن تھا اب تک وہ ایسا کر بھی چکی ہو۔

عمر احسان کو فون پر مصروف دیکھ کر اریب فاطمہ نے باباجان کے کمرے کی سمت قدم بڑھا دیے۔

دھوپ کی کرنیں جب مراد پیلس کے جھروکوں سے تاک جھانک کرتی فلک مراد شاہ کے بیڈ روم کی کھڑکی کے شیشوں سے اٹکھیلیاں کرنے لگیں تو فلک مراد شاہ نے بے اختیار ہی اپنی وہیل چیئر کو کھڑکی کے قریب لا کر کھڑکی کھول دی۔ یکدم تیز روشنی اندر در آئی تو ایک لمحہ کے لیے فلک شاہ کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ انہوں نے چمکتی دھوپ کو دیکھ کر سوچا۔

آج کا دن کتنا روشن اور چمک دار ہے اور یہ ایسے ہی دن تھے جب دھوپ کی حدت اچھی بھی لگتی تھی مگر زیادہ دیر دھوپ میں بیٹھا بھی نہیں جاتا تھا۔ انہوں نے مڑ کر عمارہ کی طرف دیکھا' جو سنبل کے نرم تکیے پر سر رکھے بہت پرسکون نیند سو رہی تھیں۔ سورج کی ایک دو شرارتی کرنوں نے ان کے ماتھے کو بوسہ دیا تو انہوں نے کسمسا کر کروٹ بدل لی تھی۔ فلک شاہ نے کھڑکی کا وہ پٹ بھیڑ دیا جس سے راستہ پا کر کرنیں عمارہ کو ڈسٹرب کرنے چلی آئی تھیں... اور ایک بار پھر سوچا۔ آج کا دن بہت روشن ہے۔ انہوں نے کھلے پٹ سے باہر جھانکا۔

مالی گوڈی کر رہا تھا۔ وہاں سے نظریں ہٹا کر انہوں نے اپنے بیڈ روم کا جائزہ لیا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر معمول کے مطابق پڑی تھی۔ کچھ نیا نہ تھا لیکن پھر بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت ساری گھٹن کے بعد کہیں کسی روزن سے ہوا کا کوئی ننھا سا جھونکا آکر اس گھٹن کو کم کر گیا ہو یا پھر بہت گہری تاریکی اور اندھیرے کے بعد کہیں کوئی روشن صبح طلوع ہوئی ہو۔ حالانکہ ابھی تک کہیں کچھ تبدیل نہیں ہوا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ پھر پتا نہیں کیوں انہیں یہ احساس ہوا تھا کہ آج کا دن بہت روشن اور چمک دار ہے....

اس روز بھی تو ایسا ہی روشن اور چمک دار دن تھا اور فروری کے وسط میں بھی دھوپ کی حدت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ گورنمنٹ کالج میں ڈاکٹر فاروق کے ساتھ ہونے والے میوزک کنسرٹ اور ڈراما فیسٹول کے

متعلق بات کر رہے تھے... نرم گرم دھوپ میں کھڑا ہونا انہیں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ حالانکہ لاہور میں بہت زیادہ سردی نہیں پڑتی تھی لیکن پچھلے ایک ہفتے سے مسلسل چھائے رہنے والے بادلوں اور ہلکی بارش نے اچھی خاصی خنکی پیدا کر دی تھی۔ سو آج انہیں دھوپ اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ ڈاکٹر فاروق کے جانے کے بعد بھی ان کا کسی کلاس میں جانے کا موڈ نہیں بنا۔ وہ وہیں سنگی بنچ پر بیٹھ گئے جب مائرہ ان کے پاس آکر رکی تھی۔

"ہیلو.....!"

انہوں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ شولڈر بیگ دائیں کندھے پر لٹکائے بے حد اشتیاق سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ مائرہ کو دیکھ کر انہیں رات احسان سے ہونے والی گفتگو کیا یاد آئی تھی کہ لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہو گئی وہ احتراماً" کھڑا ہو گئے۔

"کیسی ہیں آپ؟"

"فائن....." اس نے بے حد گہری نظر ان پر ڈالی تھی۔

"آپ ہمارے کالج میں آتے ہیں لیکن کبھی آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"میرا کبھی ادھر آپ کے ڈپارٹمنٹ کی طرف جانا ہی نہیں ہوتا۔"

"اگر ملنا مقصود ہو تو کسی بہانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"ایکچوئلی مجھے علم ہی نہیں تھا کہ آپ بھی یہاں ہیں۔" وہ شرمندہ ہوئے تھے۔

حالانکہ ان کی کامیابی کی خوشی میں دی جانے والی دعوت میں چند لمحوں کی ملاقات اور مختصر سی گفتگو کے بعد ایسا ضروری نہیں تھا کہ وہ اس سے ملتے ہی چلے جاتے۔ ان کے لیے تو وہ اجنبی ہی تھی۔

وہ محض اتنا ہی تو جانتا تھا کہ وہ مروہ پھپھو کی کسی نند کی بیٹی ہے۔

لیکن یہ شرمندگی شاید احسان عبدالرحمٰن کی وجہ سے تھی جو اس مائرہ حسین پر مرمٹا تھا اور جو ان کا یار غار تھا۔ اس روز وہاں کھڑے کھڑے مائرہ حسین سے انہوں نے بہت ساری باتیں کر ڈالی تھیں۔ لیکن ان ساری باتوں میں اسی فیصد گفتگو احسان عبدالرحمٰن کے متعلق تھی۔

احسان ذہین ہے۔ احسان بہت مخلص ہے۔ بہت محبت کرنے والا ہے۔ بہت کیئرنگ ہے۔ بہت لونگ ہے۔

اور وہ اس احسان نامے سے خاصی بیزار ہونے لگی تھی۔

تب فلک شاہ کو لگا تھا کہ کہیں کچھ غلط ہو گیا ہے۔ یہ احسان عبدالرحمٰن کہاں دل لگا بیٹھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ مائرہ حسین کو احسان عبدالرحمٰن شاہ میں کوئی دلچسپی نہیں۔ غرور سے گردن اونچی کیے ایک عجیب سے تفاخر کے ساتھ فلک شاہ کی طرف دیکھتی اور فلک شاہ سے اس کی ذات کے حوالے سے سوال کرتی مائرہ حسین کو فلک شاہ نے یکدم رد کر دیا تھا۔ یہ لڑکی مائرہ ہرگز بھی شانی کے قابل نہیں ہے۔

وہ اتنا مخلص' سچا' کھرا انسان۔

اور یہ.....

ان کا دل چاہا تھا کہ وہ احسان سے کہیں۔

"تمہیں محبت کرنے کے لیے کوئی اور لڑکی نہیں ملی تھی' اس میں ہے ہی کیا سوائے بے تحاشا حسن کے؟"

لیکن وہ یہ بات احسان عبدالرحمٰن سے نہیں کہہ سکے۔ مائرہ کا نام سن کر ہی اس کے چہرے پر رنگوں کی برسات اتر آئی تھی۔ وہ ایک دم ہی کتنا خوش ہو گیا تھا۔

"تم اس سے ملے تھے موی! کیسی لگ رہی تھی؟ کس کلر کے کپڑے پہنے ہوئے تھے.... اس پر تو ہر کلر ہی سوٹ کرتا ہے' ہے نا؟ لگتا ہے سارے رنگ اسی کے لیے تخلیق کیے گئے ہیں؟"

اس نے ایک ہی سانس میں کتنے ہی سوال کر ڈالے تھے۔ اس کی یہ دیوانگی دیکھ کر فلک شاہ کچھ نہیں کہہ سکے۔ البتہ دل میں دعا ضرور کی تھی کہ اللہ احسان شاہ کے دل کو ہر دکھ سے بچائے اور مائرہ حسین کے دل میں احسان شاہ کی محبت پیدا کر دے۔

لیکن اس وقت وہ ہرگز نہیں جانتے تھے کہ آنے والے دنوں میں مائرہ حسین ان کے لیے کتنی بڑی آزمائش بن جائے گی۔ وہ جو پورے خلوص کے ساتھ مائرہ کو احسان شاہ کی طرف متوجہ کرانے کی کوشش کر رہے تھے' اس وقت ششدر رہ گئے' جب مائرہ حسین نے کیفے ٹیریا میں ان کے سامنے بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے بڑی بے باکی سے کہہ ڈالا۔

"فلک شاہ! تم احسان عبدالرحمٰن کی اتنی وکالت کیوں کرتے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہاری اس وکالت کی وجہ سے میں اس سے محبت کرنے لگوں گی؟"

"اور اگر آپ اس سے محبت کرنے بھی لگیں تو اس میں کیا حرج ہے۔ احسان شاہ ایسا ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔"

اس وقت احسان شاہ کی محبت سے فلک شاہ کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ وہ اس سے اتنی ہی محبت کرتے تھے۔

"ہے بی! وہ ایسا ہی ہو فلک شاہ! جیسا تم کہتے ہو۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے تھے۔ "لیکن جس دل میں محبت پہلے ہی بسیرا کر چکی ہو' اس دل میں کسی اور کی محبت کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔"

فلک شاہ کا دل ڈوب سا گیا انہوں نے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ کیا احسان عبدالرحمٰن ایسا تھا کہ اسے اس کی محبت نہ ملتی۔

نہیں وہ تو بہت نازک دل تھا۔ وہ محبت کو نہ پا سکنے کے دکھ کو سہہ نہ سکے گا لیکن محبت کے معاملے میں تو کسی پر جبر نہیں کیا جا سکتا..... وہ سر جھکائے ہاتھ گود میں دھرے اس دکھ کو برداشت کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ جو ان کے جان سے زیادہ پیارے دوست کو ملنے والا تھا۔

"تم نے یہ نہیں پوچھا فلک شاہ! کہ میرے دل میں کس کی محبت نے بسیرا کر رکھا ہے۔"

وہ اس طرح تھوڑا سا آگے کو جھکی کہ فلک شاہ نے فوراً اپنی نظریں جھکا لیں۔ فلک شاہ کو لڑکیوں کے ایسے پہناوے ہرگز پسند نہیں تھے' جو انہیں اس طرح عیاں کر دیں۔ عورت تو ڈھکی چھپی ہی اچھی لگتی ہے۔

"فلک شاہ! کیا تم جاننا نہیں چاہو گے کہ میں مائرہ حسین....." اس نے اپنے کندھوں پر جھک آنے والے بالوں کو اک ادا سے جھٹکا۔ "کس کی محبت میں اسیر ہو چکی ہوں۔"

"میں جان کر کیا کروں گا۔" انہوں نے جھکا سر نہیں اٹھایا تھا۔

"نہ تو میں آپ کے حلقہ احباب کو جانتا ہوں اور نہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی ہے کہ وہ کون ہے۔ میرے لیے تو میرا دوست' میرا بھائی اہم ہے' جو آپ سے محبت کرتا ہے۔ مجھے تو اس وقت صرف اس کا خیال آ رہا ہے۔"

انہوں نے بے حد دل گرفتی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"مائرہ حسین! میرا دوست آپ سے بے حد و بے حساب محبت کرتا ہے۔ اس کی صبح کا آغاز آپ کے ذکر سے اور رات کا اختتام آپ کے ذکر سے ہوتا ہے۔"

"مجھے تمہارے دوست کے لیے افسوس ہے فلک شاہ! مائرہ حسین کے دل نے تو تمہیں چنا ہے۔ تم نے اسیر کیا ہے مائرہ حسین کے دل کو۔ فلک شاہ! میں تم سے محبت کرتی ہوں۔"

فلک شاہ لمحہ بھر کے لیے تو ششدر رہ گئے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اپنی طرف بے باکی سے دیکھتی مائرہ حسین کو دیکھ کر ان کے اندر غصے کا ابال اٹھا تھا۔ مٹھیاں بھینچ کر انہوں نے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔

"لیکن میں آپ سے محبت نہیں کرتا۔" وہ یکدم کھڑے ہو گئے۔

"مجھے علم ہے....." وہ بڑی پرسکون سی بیٹھی تھی۔ "ابھی ہم ملے ہی کتنی بار ہیں' شاید آج چوتھی مرتبہ۔ اور چاروں مرتبہ میں ہی تم تک آئی ہوں تم نہیں آئے۔"

اس نے تفاخر سے گردن اونچی کی۔ اس کے تراشیدہ لبوں پر بڑی دلکش سی مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی۔

"لیکن مجھے یقین ہے کہ اب تم میری طرف آؤ گے فلک شاہ! اور ایک دن میری محبت کے اسیر ہو جاؤ گے۔"

ان کی آنکھیں غصہ ضبط کرنے کی کوشش میں خوں رنگ ہو رہی تھیں۔ انہوں نے بے حد حیرت سے مائرہ حسین کو دیکھا تھا۔ کیا اسے اپنے حسن پر اتنا ناز ہے مگر فلک شاہ کا دل ایسا نہیں ہے کہ صرف ظاہری شکل و صورت کے اسیر ہو جائیں اور پھر انہوں نے تو عمارہ عبدالرحمٰن شاہ کو دل کی مسند پر بٹھا کر دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے تھے۔

"ایسا نہیں ہو سکتا مائرہ حسین! ابھی نہیں۔ آپ دنیا کی حسین ترین لڑکی بھی ہوتیں تو فلک شاہ اتنا کمینہ ہرگز نہیں ہے کہ اپنے دوست کی محبت کو کسی غلط نظر سے دیکھے۔"

مائرہ حسین کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی اور آنکھوں میں ایک مغرورانہ سی چمک نظر آئی تو فلک شاہ نے چونک کر اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔

"آج کے بعد میں نہ آپ سے ملنا چاہوں گا' نہ دیکھنا۔"

وہ اپنی بات مکمل کر کے تیز تیز چلتے ہوئے کیفے ٹیریا سے باہر نکل گئے۔

یہ احسان عبدالرحمٰن کہاں دل لگا بیٹھا ہے' بے حد دل گرفتی سے سوچتے ہوئے وہ کالج گیٹ سے باہر نکل گئے۔ پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے خیال آیا تھا کہ انہیں تو ڈاکٹر فاروق سے اپنے ڈرامے کے اسکرپٹ پر ڈسکس کرنا تھا' جو انہوں نے ڈراما فیسٹول کے لیے لکھا تھا۔ لیکن پھر وہ واپس نہیں مڑے۔ ان کا دل یکدم ہی گھبراہٹ کا شکار ہو گیا تھا۔ بلا سے مائرہ حسین احسان شاہ سے محبت نہ کرتی' وہ کسی بھی شخص سے محبت کر لیتی لیکن انہیں اس امتحان گاہ میں کھڑا نہ کرتی۔

وہ مائرہ حسین کو سخت ناپسند کرتے تھے۔

انہوں نے پہلی ہی نظر میں اسے ریجیکٹ کر دیا تھا۔

وہ صرف احسان کی خاطر اس کا لحاظ کرتے تھے۔ پھر بھی انہیں لگ رہا تھا جیسے وہ احسان عبدالرحمٰن سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہے۔

انہوں نے احسان شاہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ حق نواز کی پارٹی میں شامل نہیں ہوں گے۔ اور سیاست وغیرہ سے دور رہیں گے لیکن اس وقت وہ اتنے اپ سیٹ تھے کہ بغیر سوچے سمجھے گاڑی حق نواز کے گھر کی طرف جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ حق نواز انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔

"یار! بہت موقعے پر آئے ہو۔"

"کیسا موقع؟"

"یار! آج ہماری پارٹی ایک احتجاجی ریلی نکال رہی ہے۔"

"کیوں؟" فلک شاہ خالی الذہن تھے۔

"یار! ہم لوگ بڑے بیوقوف ہیں' کم عقل۔ ہم نے ان لوگوں کو حکمران بنا رکھا ہے اور ان کے سامنے سجدے کر رہے ہیں' جنہوں نے اس ملک کو دولخت کیا۔ محض اقتدار کے لالچ میں اپنے ذاتی فائدے کے لیے پوری قوم کا گلا کاٹ دیا۔"

وہ ہمیشہ کی طرح جذباتی ہو رہا تھا۔ لیکن فلک شاہ کچھ نہیں سن رہے تھے یا سمجھ نہیں پا رہے تھے۔

"تو تم چلو گے نا میرے ساتھ؟"

فلک شاہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے حق نواز! سر بھاری ہو رہا ہے۔ میں تو بس یونہی چلا آیا تھا تمہاری طرف۔ بہت دن ہو گئے تھے تم سے ملے۔"

"میں تو سمجھا تھا تم ڈر گئے ہو' اس روز لاٹھی چارج جو ہو گیا تھا ہماری تنظیم کے کارکنوں پر۔"

فلک شاہ خاموش رہے۔

"ریلی تو عصر کے بعد ہے تم کچھ دیر آرام کر لو۔ چائے کے ساتھ ٹیبلٹ لے لو۔ میں چائے بنواتا ہوں۔"

حق نواز یوں ہی سب پر مہربان رہتا تھا۔ خصوصاً اپنی تنظیم کے کارکنوں کے ساتھ۔ اور تب ہی وہ اندر آ

گیا تھا ڈرائنگ روم میں۔ اس کی شخصیت میں کچھ ایسا تھا جو متوجہ کرتا تھا۔

"یہ شیر دل ہے میرا کزن۔ کاکول سے ابھی ابھی فارغ ہوا ہے۔ لیفٹیننٹ شیر دل۔"

شیر دل کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے فلک شاہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ فلک شاہ ہے میرا دوست۔"

"دوست یا تمہاری پارٹی کا کارکن؟"

"فی الحال دوست۔" حق نواز ہنسا۔

"ممکن ہے آنے والے دنوں میں اسے میں اپنی پارٹی میں شامل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ یہ ایک محب وطن شخص ہے اور ہر محب وطن آدمی ایک روز میری پارٹی کا کارکن ہو گا۔"

وہ بات کر کے گھر کے اندر چلا گیا تھا اور شیر دل ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کیا حق نواز واقعی تمہارا دوست ہے؟" فلک شاہ نے سر ہلا دیا۔

"تو پھر تم اسے سمجھاتے کیوں نہیں۔ یہ سیاست کا کھیل اس جیسے متوسط طبقے کے لوگوں کو سوٹ نہیں کرتا۔ ماں باپ نے اس کے لیے کتنے خواب دیکھ رکھے ہیں لیکن اسے ان خوابوں کو چکنا چور کرتے ہوئے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ جو بندہ ایک چھوٹے سے گھر کے چند افراد کو مطمئن نہ رکھ سکتا ہو۔ وہ بھلا پورے ملک اور قوم کو کیسے مطمئن کرے گا۔"

"آپ کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟"

"مجھے سیاست سے دلچسپی ہے فلک شاہ! جتنی ایک فوجی کو ہو سکتی ہے۔ ایک فوجی ہونے کے ناتے مجھے اپنے ملک سے بھی شدید محبت ہے۔

ایک سال پہلے کاکول میں جب مجھے پتا چلا کہ میرا ملک دو ٹکڑے ہو گیا ہے تو میں ساری رات دھاڑیں مار مار کر رویا تھا اور وہاں رونے والا میں اکیلا نہ تھا۔ میرے بیچ میٹ مجھ سے سینئر مجھ سے جونیئر میرے افسر۔ سب رو رہے تھے۔ کوئی چھپ کر کوئی سامنے۔ مجھے بھی اس کٹ جانے والے بازو کی اتنی ہی اذیت اور تکلیف ہے جتنی حق نواز کو ہے۔

مجھے بھی ترانوے ہزار فوجیوں کے ہتھیار ڈالنے کی اذیت راتوں کو جگا دیتی ہے اور پھر میں سو نہیں پاتا۔ لیکن میں حق نواز کی طرح سڑکوں اور شاہراہوں پر آ کر اپنی ہی املاک کو نقصان پہنچانے کے خلاف ہوں۔

میں سڑکوں پر نکل آنے والے ان نوجوانوں کی خون بہاتی لاشوں کو دیکھ نہیں سکتا۔ جن کے والدین نے نہ جانے کیسے کیسے خواب ان کے لیے اپنی آنکھوں میں سجا رکھے ہوں گے۔ سانپ گزر گیا لکیر پیٹنے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔

کس نے کیا کیا؟

کون مجرم ہے۔

بغیر کسی ثبوت کے کسی کے خلاف نعرے لگانے سے ہو جانے والا نقصان پورا نہیں ہو سکتا۔

دکھ کا یہ کانٹا ہمیشہ کے لیے ہمارے دل میں چبھ گیا ہے۔ ہمیں پچھلی باتیں بھلا کر اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنا چاہیے۔" شیر دل بے حد جذباتی ہو رہا تھا وہ حیران سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔

"تمہیں پتا ہے حق نواز میرے ماموں کا اکلوتا بیٹا ہے تین جوان ہوتی بہنوں کا بھائی۔ میرے ماموں سترہ گریڈ کے افسر ہیں۔ سفید پوش حق حلال رزق کھانے والے۔ حق نواز جب پیدا ہوا تھا تو شاید تب ہی سے میری مامی نے اس کے لیے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے۔ اکیلے میری مامی نے نہیں، میری ماموں زاد بہنوں نے بھی، ماموں نے بھی حتی کہ میری ماں بھی ان خوابوں میں حصے دار بن گئی تھی اپنے اکلوتے بھتیجے کے لیے لیکن حق نواز کو پتا نہیں کہاں سے اور کیسے یہ لوگ مل گئے ہیں کہ وہ کسی کی نہیں سنتا۔ ان کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ صرف وہی صحیح ہے ہم سب غلط ہیں۔ صرف وہی ملک کی تقدیر بدل سکتا ہے۔ صرف اسے ہی وطن سے محبت ہے۔ باقی سب صرف اس ملک کو لوٹ کر کھا رہے ہیں۔

تم جانتے ہو! آج صبح سے مامی نے کچھ کھایا پیا نہیں۔ جب سے حق نواز نے بتایا ہے کہ آج اسے ریلی میں شامل ہونا ہے۔ تب سے مامی جاء نماز بچھائے بیٹھی ہیں اور اس کی زندگی اور سلامتی کی دعا مانگ رہی ہیں۔ وہ جوان بیٹے کو روکنے پر قادر نہیں ہیں۔ صرف آنسوؤں پر اور دعاؤں پر ان کا اختیار ہے، سو وہ آنسو بہائے جاتی ہیں اور دعائیں کیے جاتی ہیں۔ شہر میں دفعہ 144 لگی ہوئی ہے۔ حکومت نے ریلی کو روکنے کے لیے کئی شہروں سے پولیس منگوالی ہے۔ سو گولی بھی چلے گی اور لاٹھی چارج بھی ہو گا۔ کون جانے کون گولی کس کے نصیب کی ہو گی۔"

اس روز شیر دل بہت بولا تھا اور اس روز فلک شاہ اس نوجوان فوجی سے ازحد متاثر ہوئے تھے۔ دونوں کے درمیان دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا تھا۔ وہ اس روز حق نواز کے ساتھ ریلی میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ لیکن گھر بھی نہیں گئے تھے اور جب تک حق نواز واپس نہیں آیا تھا، وہ شیر دل کے ساتھ اس کے ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھے رہے تھے۔

حق نواز آیا تو اس کی آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں اور ان سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا۔ اس کے کندھے میں شدید درد تھا۔

پولیس نے آنسو گیس اور لاٹھی چارج سے ہجوم کو منتشر کیا تھا۔ رات آٹھ بجے کے بعد وہ گھر آئے تو سب نے ہی اطمینان کا سانس لیا۔ تاہم کمرے میں آ کر خود ہی احسان شاہ کو بتا دیا تھا کہ وہ حق نواز کے گھر گئے تھے اور وہیں پھنس گئے تھے۔

"کیا تم۔۔۔ آج ان کی جماعت نے ایک ریلی نکالی تھی۔" احسان پریشان سا پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔ میں اس کے کزن شیر دل کے ساتھ تھا۔" وہ بے حد بے چین تھے۔ کتنی ہی دیر اپنے بستر پر کروٹیں بدلنے کے بعد اٹھ بیٹھے۔

"شانی! کیا تمہیں محبت کے لیے مائرہ حسین کے علاوہ کوئی اور لڑکی نہیں ملی تھی؟"

"کیوں مائرہ حسین میں کیا برائی ہے؟"

مائرہ کے ذکر پر اس کی سنجیدگی یکدم مسکراہٹ میں ڈھل گئی تھی اور اس نے کتاب اوندھی کر کے تکیے کے پاس رکھی اور پوری فرصت سے فلک شاہ کی طرف متوجہ ہو گیا فلک شاہ نے سٹپٹا کر اسے دیکھا۔

"نہیں! بس ویسے ہی کہہ رہا تھا۔ تم ایک کام کیوں نہیں کرتے۔ اپنا رشتہ بھجوا دو اس کے لیے۔"

"کیوں؟" احسان شاہ مشکوک ہوا۔

"ابھی تو مجھ سے بڑے بھائی موجود ہیں۔ میں اماں جان سے کیسے کہہ سکتا ہوں میرا رشتہ کر دیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ تم مجھے اصل بات بتاؤ تم نے یہ کیوں کہا۔ کیا مائرہ کسی اور میں انٹرسٹڈ ہے؟"

فلک شاہ لمحہ بھر کو سٹپٹائے۔

"میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں شانی! میرا ڈپارٹمنٹ بالکل الگ ہے اس سے۔ میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ چند ماہ کی بات ہے اس کا ماسٹرز کمپلیٹ ہو جائے گا تو لازمی بات ہے اس کے پیرنٹس اس کی شادی کے متعلق ہی سوچیں گے۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ مردہ پھپھو کے کان میں بات ڈال دو تاکہ وہاں گھر میں کوئی ایسا سلسلہ ہو تو وہ بروقت کچھ کر سکیں۔ مردہ پھپھو کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا۔"

"نہیں۔۔۔ ایک ہی اعتراض ہو گا اور جو سب کو ہو سکتا ہے اور وہ عمر کا ہے لیکن میں چند سال کی بڑائی چھوٹائی کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔"

"تو پھر تم مردہ پھپھو سے بات کر لینا۔"

"میں نہیں، تم۔۔۔ تم یہ بات کرو گے پھپھو سے۔"

احسان شاہ سارا بوجھ ان کے کندھوں پر ڈال کر خود اطمینان سے سو گیا تھا لیکن فلک شاہ کو ساری رات نیند نہیں آئی۔ کروٹیں بدل بدل کر انہوں نے صبح کی تھی اور صبح جب احسان شاہ جاگا تھا تو وہ اپنے بیگ میں سامان رکھ رہے تھے۔

"کہیں جا رہے ہو کیا؟"

"بہاول پور۔" انہوں نے مختصر جواب دیتے ہوئے اپنے بیگ کی زپ بند کی تھی۔

"واپسی کب ہو گی؟"

"دو تین روز تک۔"

اور دوسرے دن وہ بہاول پور میں دادا جان کے پاس

بیٹھے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے التجا کر رہے تھے۔

"دادا جان! میں چاہتا ہوں' میرا اور عمارہ کا رشتہ اناؤنس ہو جائے۔"

"وجہ؟" انہوں نے بہت غور سے کارپٹ پر اپنے پاؤں کے پاس بیٹھے فلک شاہ کو دیکھا تھا۔ یہ ان کی عادت تھی وہ ہمیشہ ایسے ہی بیٹھا کرتے تھے۔

"کیا وجہ بتانا ضروری ہے دادا جان! اتنا کافی نہیں ہے کہ میں ایسا چاہتا ہوں۔"

پھر انہوں نے اصرار نہیں کیا تھا' پھر وہ ان کے ساتھ ہی لاہور آئے اور عبدالرحمٰن سے درخواست کی کہ وہ عمارہ اور فلک کی منگنی کرنا چاہتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا فنکشن ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔

"لیکن ابھی بچے پڑھ رہے ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ انہیں ڈسٹرب کیا جائے۔" عبدالرحمٰن شاہ کو اعتراض ہوا تھا۔ "کیا آپ کو میری بات پر اعتبار نہیں ہے چچا جان! عمارہ آپ کی بیٹی ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے بیٹا! تم میرے سلجوق کی جگہ ہو۔ بس زندگی میں مومی کی کوئی خوشی دیکھنا چاہتا ہوں۔ پتا نہیں' اس کی شادی تک ہم ہوں گے یا نہیں۔ تمہاری چچی کی بڑی خواہش ہے کہ مومی کے حوالے سے کوئی خوشی ہو۔"

"اللہ آپ کو لمبی زندگی دے چچا جان! آپ مومی کی ساری خوشیاں دیکھیں۔"

"بس ایک خواہش تھی۔ تم سے کہہ دی۔ اب تمہاری مرضی۔"

اور عبدالرحمٰن شاہ نے بے اختیار ان کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

"چچا جان! آپ کی خواہش میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔"

مراد شاہ کا دل یکدم بھر آیا تھا۔ "کاش! آج میرا سلجوق ہوتا تو۔"

پھر دونوں ہی سلجوق کی یاد میں کھو گئے۔

"ایک اور بات بھی ہے عبدالرحمٰن! اگر تم برا نہ مانو تو منگنی کے بعد مومی کا یہاں رہنا مناسب نہیں ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ منگنی کے بعد مومی ہاسٹل منتقل ہو جائے۔"

"کیوں چچا جان! ایسی کیا برائی ہے مومی کے یہاں رہنے سے۔" عبدالرحمٰن نے تڑپ کر کہا تھا۔ "مصطفیٰ اور مرتضیٰ کے باہر جانے کے بعد مومی سے ہی تو میرے گھر کی رونق ہے۔ شانی اور عثمان تو کتابی کیڑے ہیں۔ مومی ہی تو ہے۔ جو میرے پاس بیٹھتا ہے اور گھر میں رونق لگائے رکھتا ہے۔"

"عبدالرحمٰن بیٹا! بزرگ جو کہتے ہیں' وہ ان کی زندگی کے تجربوں کا حاصل ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے چچا جان....!" عبدالرحمٰن' مراد شاہ کی کسی بات سے انکار کر ہی نہیں سکتے تھے۔

بڑی دھوم دھام سے عمارہ اور فلک شاہ کی منگنی ہوئی تھی اور فلک شاہ بے حد مطمئن ہو کر ہاسٹل منتقل ہو گئے جبکہ احسان شاہ نے ان کے ہاسٹل جانے پر بہت واویلا کیا تھا۔

"یار! تیرا کام کر تو دیا ہے۔ مروہ پھپھو کے کان میں بات ڈال دی ہے۔ مگر انہیں یہ بات کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔"

"زندگی میں نے گزارنی ہے' مروہ پھپھو نے نہیں۔"

احسان شاہ بہت مطمئن تھا۔ خوش اور مطمئن تو فلک شاہ بھی تھا لیکن اس کا سارا اطمینان اس وقت رخصت ہو گیا تھا جب مائرہ حسین کالج میں داخل ہوتے ہی ان سے ٹکرا گئی۔

"تم کیا سمجھتے ہو فلک شاہ! کہ تمہاری اس ایمرجنسی میں کی جانے والی منگنی کا مطلب میں نہیں سمجھتی۔ اپنے ماتھے پر منگنی کا لیبل لگا کر تم سمجھتے ہو کہ میں احسان شاہ سے محبت کرنے لگوں گی.... محبت زندگی میں ایک بار کسی ایک بندے سے ہی ہوتی ہے.... اور مائرہ حسین نے صرف تم سے محبت کی ہے۔"

اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے فلک شاہ نے کہا۔

"میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ محبت زندگی میں صرف ایک بار ہی ہوتی ہے۔"

"تمہارا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم عمارہ سے محبت کرتے ہو؟" مائرہ حسین نے تیزی سے ان کی بات کاٹی تھی۔

"میں آپ کے سامنے کسی بھی قسم کی وضاحت کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ پلیز میرے راستے سے ہٹ جائیں۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اپنے دوست کی خاطر۔"

اور فلک شاہ کا غصہ یکدم ہی عود کر آیا تھا۔ "میں زندگی میں دوبارہ کبھی آپ کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ آئندہ میرے سامنے مت آئیے گا۔"

انہوں نے مائرہ حسین کے یکدم سرخ ہو جانے والے چہرے اور آنسوؤں سے بھیگتے رخساروں کو نہیں دیکھا تھا۔

عمارہ کے لبوں سے سوتے میں کراہ نکلی تو وہ یکدم چونک کر عمارہ کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ سوتے میں بھی ان کے چہرے پر کسی اذیت کے آثار تھے' ہونٹ بھنچے ہوئے تھے کیا وہ کوئی اذیت ناک خواب دیکھ رہی تھی۔

تیزی سے وہیل چیئر گھماتے وہ بیڈ کے قریب آئے اور نرمی سے اپنا ہاتھ عمارہ کی پیشانی پر رکھا۔

"عمو....!"

یہ ان کے ہاتھ کے لمس کا اعجاز تھا یا ان کی آواز کا کہ عمارہ نے جھٹ آنکھیں کھول دیں۔ اور پھر انہیں بیڈ کے قریب دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹی رہو عمو....!"

فلک شاہ ان کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ عمارہ نے کمرے میں پھیلی روشنی کو دیکھا۔

"بہت دیر ہو گئی ہے۔ آپ مجھے جگا دیتے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"آپ اتنے سکون سے سو رہی تھیں۔ کیوں جگاتا بھلا۔" وہ مسکرائے تھے۔

"میں نے تو نماز پڑھ کے یونہی ٹیک لگائی تھی۔ سونے کا ارادہ نہیں تھا۔ تسبیح پڑھتے پڑھتے آنکھ لگ گئی۔ آپ نے ناشتا کر لیا؟"

"ہاں! انجی اور میں نے اکٹھا ناشتا کیا ہے۔"

"انجی کہاں ہے؟"

"وہ گھر گئی ہے' دوپہر تک آجائے گی۔"

میں تو اب بالکل ٹھیک ہوں۔ انجی کے یہاں رہنے سے جواد کو پریشانی ہوتی ہو گی۔ وہ چلی جاتی گھر۔"

"میں نے جواد سے کہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا ایبک آجائے لاہور سے تو چلا جاؤں گا۔"

"ایبک کا فون آیا؟"

"ہاں! آج شام تک پہنچ جائے گا۔"

"اس نے کچھ بتایا وہاں الریان میں تو سب ٹھیک ہیں نا.... بابا جان اور۔" بے اختیار ہی ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

انہیں بغور دیکھتے ہوئے فلک شاہ نے پوچھا تھا۔

"آپ کچھ پریشان لگ رہی ہو عمو!"

"نہیں تو۔"

پھیکی سی مسکراہٹ عمارہ کے لبوں تک آکر معدوم ہو گئی تھی۔ لیکن فلک شاہ جانتے تھے کوئی بات تو ہے جو انہیں پریشان کر رہی ہے۔ ورنہ عمارہ نے کبھی ان کے سامنے الریان کا ذکر نہیں کیا تھا۔ کہیں بابا جان کی بیماری کے متعلق تو کوئی سن گن نہیں مل گئی انہیں۔ ایبک شاہ نے جاتے ہوئے بڑی سختی سے منع کیا تھا کہ ماما کو بابا جان کے متعلق مت بتائیے گا۔

"وہ دراصل....!" عمارہ نے انہیں سوچ میں ڈوبے دیکھ کر کہا۔

"ابھی ابھی میں نے خواب میں اماں جان کو دیکھا۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھیں۔ میں نے انہیں پکارا بھی تھا۔ ان کے پیچھے بھی بھاگی تھی لیکن انہوں نے نہ میری پکار سنی' نہ مجھے مڑ کر دیکھا۔" عمارہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"وہ.... میرے لیے کتنا تڑپی تھیں مومی! زارا کہتی تھی میرا دکھ انہیں چاٹ گیا ہے۔ دیمک کی طرح اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہا ہے انہیں اور میں کتنی بدنصیب بیٹی ہوں کہ اپنی ماں کے آخری لمحوں میں ان کے پاس

نہ تھی۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی تھیں۔ فلک شاہ نے انہیں رونے دیا تھا۔ یہ چھبیس سالوں میں پہلی بار تھا کہ وہ ان کے سامنے اس طرح رو رہی تھیں۔ چھپ چھپ کر تو ہزاروں بار روئی ہوں گی لیکن ۔۔۔ چہرے سے ہاتھ ہٹا کر انہوں نے فلک شاہ کو دیکھا۔

"اماں جان میری راہ دیکھتی رہیں۔ ان کی نظریں دروازے کی طرف ہی لگی رہیں اور پھر میرا انتظار کرتے کرتے ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ کسی نے مجھے خبر تک نہ کی موی! کوئی مجھے بتاتا تو میں اڑ کر ہسپتال پہنچ جاتی۔ اسپتال کے دروازے تو مجھ پر بند نہیں ہوئے تھے نا۔ زارا یہاں ہوتی تو وہ مجھے ضرور خبر کرتی لیکن اسے تو خود موت کے بعد اطلاع دی گئی تھی۔ صرف اس لیے کہ دیار غیر میں وہ پریشان نہ ہو۔"

"لیکن میں ۔۔۔ کیا وہ میری ماں نہ تھیں۔ کیا میرا ۔۔۔"

بے شمار آنسوؤں نے ان کا حلق بند کر دیا تھا۔ بے حساب احساس پشیمانی میں ڈوبے۔ فلک شاہ ہولے ہولے ان کا بازو سہلا رہے تھے۔ کہنے کے لیے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔

دو حرف تسلی بھی نہیں۔

"عمو! بس کرو۔ میرا دل پھٹ جائے گا۔" عمارہ نے آنسو پونچھتے ہوئے شرمندگی سے کہا۔

"سوری موی! میں نے آپ کو پریشان کر دیا۔ پتا نہیں کیوں خواب دیکھنے کے بعد مجھے وہم سا ہونے لگا ہے کہ کہیں بابا جان۔"

"عمو! کوئی فضول بات منہ سے مت نکالیے گا۔ اللہ بابا جان کو بہت لمبی اور طویل زندگی دے اور یہ اس وقت کے خواب تو بس یونہی ہوتے ہیں۔ آپ ان دنوں بہت سوچتی رہی ہیں اماں جان کے اور بابا جان کے بارے میں۔"

"میں نے کب ان کے متعلق نہیں سوچا موی!" عمارہ نے دل گرفتی سے کہا تو بے اختیار فلک شاہ کے لبوں سے نکلا۔

"میں ایسا کیا کروں عمو! کہ گزرا ہوا وقت لوٹ آئے۔"

عمارہ نے اپنے بازو پر رکھے ان کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ رکھ دیے اور نم آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

"ہمارے ساتھ ۔۔۔ ہمارے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا موی ۔۔۔!" اور فلک شاہ کے ہاتھوں سے اختیار کی لگامیں چھوٹ گئیں۔ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر زور زور سے رونے لگے۔

عمارہ نے ان کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھوں کی گرفت سخت کر دی تھی لیکن خود ان کی آنکھوں سے دریا بہہ نکلے تھے۔

باہر دن ایسا ہی چمک دار اور روشن تھا اور اندر دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے آنسو بہا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

"پولیس!"

حسن رضا کو لگا جیسے انہوں نے غلط سنا ہو۔

"جی پولیس۔ احمد رضا کا یہی گھر ہے نا؟" باہر سے آواز آئی تھی۔

بے اختیار مڑ کر احمد رضا کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے دروازے کا لاک کھولا۔ احمد رضا خود حیران کھڑا پولیس کے ان تین بندوں کو دیکھ رہا تھا جو دروازے پر کھڑے تھے۔

"کہیں پولیس کی وردی میں یہ ڈاکو ہی نہ ہوں۔" سوچتے ہوئے غیر ارادی طور پر دو قدم آگے بڑھ کر وہ حسن رضا کے برابر اس طرح کھڑا ہو گیا تھا کہ دروازے سے اندر آنے کا راستہ مسدود ہو گیا۔

"آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ آپ پولیس کے افراد ہیں؟"

احمد رضا نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا لیکن اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے وہ حسن رضا سے مخاطب ہوا تھا۔

"میاں صاحب! یہاں کھڑے کھڑے ہی بات

کریں یا ۔۔۔"

"آئیے پلیز اندر آئیے۔" حسن رضا نے انہیں راستہ دیا۔

متذبذب سا احمد رضا بھی ان کے ساتھ تھا۔ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد بھی احمد رضا بڑا چوکنا سا بیٹھا تھا۔

"جی فرمائیے۔"

حسن رضا بے حد پریشان سے کبھی ان تین پولیس والوں کو دیکھتے تھے اور کبھی احمد رضا کو۔

"احمد رضا آپ میں سے کون ہے؟"

ایک پولیس نے کچھ دیر ان کا جائزہ لینے کے بعد پوچھا۔

"میں ہوں احمد رضا!" احمد رضا نے اپنا تعارف کروایا۔

"یہ میرا بیٹا ہے۔ اس نے کیا جرم کیا ہے جناب!" حسن رضا کی آواز کانپ گئی تھی۔

"جرم تو کوئی نہیں جناب! لیکن ایک شخص ہے اسماعیل خان اس کے خلاف چند معزز لوگوں نے درخواست دی ہے کہ وہ خلاف دین کاموں میں ملوث ہے۔"

"لیکن وہ تو بہت اچھے اور نیک انسان ہیں۔ بہت بڑے صوفی اور عالم ہیں۔" بے اختیار ہی احمد رضا کے لبوں سے نکلا تھا۔

پوچھنے والے کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی تھی۔

"آپ جانتے ہیں انہیں؟"

"کچھ دن پہلے ان سے تعارف ہوا تھا۔ دو چار بار ان کی محفل میں گیا ہوں۔" احمد رضا اب قدرے مطمئن سا ہو کر اعتماد سے بات کر رہا تھا لیکن حسن رضا بے حد مضطرب تھے۔

"مجھے بھی بتائیے سر! بات کیا ہے۔"

"میاں صاحب یہ شخص اسماعیل جو ہے' اس کے متعلق رپورٹ ہے کہ یہ لوگوں کو دین سے بھٹکا رہا ہے بلکہ خود کو اللہ کا بھیجا ہوا خلیفہ کہتا ہے۔ زیادہ تو نہیں لیکن کچھ لوگ اس کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو رہے ہیں۔ رپورٹ ہے کہ چند دن قبل اپنے ہاں ہونے والی ایک مجلس میں اس نے خود کو اللہ کا نبی کہا ہے۔ نعوذ باللہ۔ رپورٹ ملنے پر آج رات ہم نے اس کے گھر چھاپا مارا ہے لیکن وہاں صرف ایک چوکیدار تھا۔ وہاں سے تلاشی لینے پر ایک نام اور فون نمبر ملا۔ جب ہم اس بندے سے ملے جس کا وہ نمبر تھا تو اس نے بتایا کہ وہ تو اب وہاں نہیں جاتا۔ البتہ اس نے احمد رضا کے متعلق بتایا کہ وہ بھی اس کے عقیدت مندوں میں شامل ہے۔ تو میاں صاحب! ہم اسی سلسلے میں حاضر ہوئے ہیں۔ ایس پی صاحب کا حکم ہے کہ احمد رضا کو لے کر آئیں۔ اسماعیل کے متعلق تفتیش کرنی ہے۔ شاید احمد رضا کو اس کے کسی اور ٹھکانے کا علم ہو تو اگر آپ اجازت دیں تو ہم احمد رضا کو ساتھ لے جائیں۔"

حسن رضا نے اپنی زندگی میں ایسا سلجھا ہوا پولیس انسپکٹر نہیں دیکھا تھا۔

"جی ۔۔۔ جی ضرور۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ اندر بتا دوں ذرا۔"

تینوں پولیس مین اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

حسن رضا اور احمد رضا ان کے ساتھ پولیس وین میں بیٹھ گئے۔

جب وہ گھر واپس آئے تو رات کے دو بج رہے تھے۔ سمیرا اور زبیدہ بیگم جاگ رہی تھیں۔ حسن رضا نے احمد رضا سے نہ کچھ پوچھا تھا نہ بات کی تھی۔ البتہ اس کے بیان کو خاموشی سے سنا تھا۔ راستے میں بھی انہوں نے احمد رضا سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس نے دو تین بار کن اکھیوں سے انہیں دیکھا تھا لیکن وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

"کیا ہوا' خیریت تھی؟ کیوں لے گئے تھے وہ آپ دونوں کو۔"

زبیدہ بیگم نے گیٹ کھولتے ہی بے چینی سے پوچھا اور وہ انہیں تسلی دیتے ہوئے اندر آ گئے۔

"تم جاؤ آرام کرو زبیدہ! اور سمیرا کو بھی کہو' سو جائے' دو بج رہے ہیں۔"

لاؤنج میں بیٹھتے ہوئے انہوں نے زبیدہ بیگم سے

کہا۔
"لیکن مجھے بھی تو پتا چلے کہ بات کیا تھی؟" زبیدہ بیگم پریشان سی کھڑی تھیں۔
"کہنا نا کچھ خاص نہیں۔ تمہارے بیٹے کے کسی دوست کے متعلق معلومات چاہیے تھیں پولیس کو۔" ان کے لہجے میں ہلکا سا طنز محسوس کرتے ہوئے احمد رضا جز بز ہوا۔
"ابو! وہ میرے دوست نہیں ہیں۔"
"اوہ ہاں! تم تو ان کے عقیدت مند ہو۔"
"ابو پلیز۔ میری پوری بات تو سنیں۔ آپ ان سے مل کر تو دیکھیں۔"
"تمہاری بات میں نے وہاں سن لی تھی لیکن اس کے علاوہ بھی تمہارے پاس کچھ کہنے کو ہے تو صبح بات کرنا۔" وہ جو اسے سمجھانے کے ارادے سے بیٹھے تھے اٹھ کھڑے ہوئے۔
"اب جا کر آرام کرو۔ صبح یونیورسٹی بھی جانا ہے۔" وہ زبیدہ بیگم اور اس کی طرف دیکھے بغیر اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے انہوں نے مڑ کر سمیرا کو دیکھا تھا۔ جو ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر ازحد پریشان بیٹھی تھی۔
"بیٹا! جاؤ آرام کرو، فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔" بے حد نرمی سے کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ٹی وی لاؤنج میں اب زبیدہ بیگم اور احمد رضا کھڑے تھے۔ احمد رضا کچھ دیر یونہی کھڑا رہا پھر یکدم مڑا اور برآمدے میں آکر سمیرا کی طرف دیکھے بغیر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔
کمرے میں آکر اس نے لائٹ جلائی اور سوچا ابھی اور اسی وقت ابراہیم کو فون کرے کہ آخر اس کا نمبر دینے کی کیا ضرورت تھی۔ خواہ مخواہ اب ابو کا لیکچر سنو اور.....
لیکن یہ پولیس والے کیا کہہ رہے تھے اور وہ ایس پی۔

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اسماعیل صاحب اس طرح کے نہیں ہو سکتے۔ وہ تو اس قدر عالم شخص ہیں۔ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے محبت کرنے والے ہیں۔ یہ الزام ہے ان پر اسے یقین تھا۔
اسماعیل خان نے اسے بتایا تھا کہ کچھ کٹر قسم کے مولوی ان کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں دین پر صرف ان کی اجارہ داری ہے۔
اسے یکدم یاد آیا تھا کہ یہ پرسوں شام کی ہی بات تھی جب اسماعیل خان نے اسے بتایا تھا اور شاید وہ جانتے تھے کہ ایسا کچھ ہونے والا ہے، تب ہی انہوں نے گھر خالی کر دیا ہے..... اور اب پتا نہیں پھر کبھی ان سے ملاقات ہو سکے گی یا نہیں۔ وہ افسردہ ہوا تھا۔
قسمت کی دیوی مجھے چھو کر چلی گئی ہے۔
اس نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے جوتوں کے تسمے کھولے اور ابھی سیدھا ہوا ہی تھا کہ سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون کی بیل ہوئی۔ اس نے پہلی بیل پر ہی ریسیور اٹھا لیا تھا نیچے لاؤنج میں اس کا ایکس ٹینشن سیٹ پڑا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ابو جو ابھی لیٹے ہی تھے اٹھ جائیں اور ہو سکتا ہے یہ فون تھانے سے آیا ہو۔ آتے ہوئے اس نے ان کے کہنے پر اپنا فون نمبر دیا تھا۔ کہیں اسماعیل خان گرفتار تو نہیں ہو گئے۔ اس کا دل بڑے زور سے دھڑکا تھا۔
"ہیلو.....!" اس نے دھڑکتے دل سے کہا۔
"ہیلو.....!" دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز سنائی دی تھی۔ "احمد رضا.....؟"
"یس۔"
"ام..... الوینا!" (میں الوینا ہوں)
"کون الوینا؟" وہ الجھا۔
شاید رانگ نمبر..... اس نے سوچا لیکن پھر چونکا۔
نہیں ابھی اس نے اس کا نام لیا تھا۔
"کیا اس فون کا کوئی ایکس ٹینشن ہے؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"ہاں ہے تو....."
"تو پلیز پہلے چیک کرو کہ کوئی ایکس ٹینشن پر موجود تو نہیں۔" گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔
"اوکے....." اس نے ریسیور ٹیبل پر رکھا اور دروازہ کھول کر سیڑھیوں تک گیا۔ چند سیڑھیاں اتر کر اس نے ریلنگ سے جھانکا۔ نیچے اندھیرا تھا۔
وہ یونہی دبے قدموں اوپر آیا اور دوبارہ ریسیور اٹھایا۔
"نیچے کوئی فون نہیں سن رہا۔"
"میں حضرت جی کے کہنے پر آپ کو فون کر رہی ہوں۔"
"حضرت جی!" وہ چونکا اور پھر یکدم خوش ہو کر بولا۔ "کہاں ہیں خیریت سے تو ہیں؟"
"سنو احمد رضا! تم اس وقت گھر سے باہر نکل سکتے ہو؟" وہ جو اس دلکش آواز کی نغمگی میں کھویا ہوا تھا، چونکا۔
"اس وقت....." وہ پریشان ہوا۔ "بہت مشکل ہے۔"
"کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا احمد رضا! اگر ارادہ پختہ ہو۔ حضرت جی تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں اس وقت تمہارے گھر سے باہر مین روڈ پر سگنل کے قریب گاڑی میں ہوں۔ پندرہ منٹ تمہارا انتظار کروں گی۔ اگر آسکو تو آجاؤ۔ صبح ہونے سے پہلے تمہیں یہیں چھوڑ دیا جائے گا۔"
فون بند کر دیا گیا تھا۔ چند لمحے وہ یوں ہی متذبذب سا بیٹھا رہا۔
سمیرا اگر جاگ رہی ہوئی تو ضرور پوچھے گی کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور کیوں..... وہ ابو کو بتا دے گی۔ کم از کم یہ بات وہ ابو سے نہیں چھپائے گی اور پھر ممکن ہے ابو بھی جاگ رہے ہوں۔
اس نے سامنے گھڑی کی طرف دیکھا۔
اڑھائی بج رہے تھے۔ ابھی صبح ہونے میں بہت دیر تھی۔ سردیوں کی راتیں طویل ہوتی ہیں اور..... اس نے جھک کر بیڈ کے نیچے سے اپنے جاگرز نکالے اور

تھوڑی دیر بعد وہ ٹیرس کا دروازہ کھول رہا تھا۔ یکدم ٹھنڈی ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی تو اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔
اس نے ٹیرس پر قدم رکھا۔ یہ چھوٹی سی گیلری یا ٹیرس تھا جو گلی کے پچھلی طرف تھا۔ اس نے ٹیرس کا دروازہ بند کر کے نیچے گلی میں جھانکا۔ پول پر مدقوق سا بلب جل رہا تھا۔ بچپن میں کئی بار وہ پتنگ لوٹنے کے لیے آس پاس گھروں کے ٹیرس پر اترا چڑھا تھا۔ اس نے ایک بار پھر گلی میں جھانک کر دیکھا۔ گلی ویران تھی۔ رات کے اڑھائی بجے سب ہی سو رہے تھے۔
اس نے ٹیرس کے جنگلے پر ہاتھ رکھ کر اس کی مضبوطی کا جائزہ لیا اور دوسرے ہی لمحے وہ جنگلے سے جھول رہا تھا۔ چند لمحے جھولنے کے بعد ہی اس کے پاؤں نیچے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے شیڈ پر ٹک گئے تھے۔
اس نے آہستہ آہستہ پہلے ایک ہاتھ چھوڑا اور پھر دوسرا۔ ہلکا سا جھٹکا لگا تھا لیکن وہ سنبھل گیا تھا۔ پھر وہ پہلے شیڈ پر بیٹھا اور پھر شیڈ کا کنارا پکڑ کر لٹک گیا۔ زمین اس کے قدموں سے ایک دو فٹ ہی نیچے تھی۔ پھر اللہ کا نام لے کر اس نے شیڈ کا کنارا چھوڑ دیا۔ دھپ کی آواز آئی۔ گھٹنے ذرا سے مڑے تھے لیکن وہ گرا نہیں تھا۔ لمحہ بھر وہ یونہی کھڑا رہا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ سارے گھر اندھیرے میں ڈوبے تھے لیکن کہیں کہیں کسی گھر سے نائٹ بلب کی مدھم روشنی کی لکیریں درزوں سے جھانک رہی تھیں۔
وہ بہت احتیاط سے چلنے لگا۔ دس منٹ بعد وہ مین روڈ پر سگنل کے پاس سڑک سے نیچے کھڑی گاڑی کے پاس تھا۔ اسے آتے دیکھ کر ڈرائیور نے جو گاڑی کا بونٹ اٹھائے جھکا ہوا تھا جیسے گاڑی میں کوئی خرابی ہو اور وہ چیک کر رہا ہو، سیدھا ہو گیا اور گاڑی کا بونٹ گرا کر ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھا۔ پچھلا دروازہ کھل گیا تھا۔
"آئیے احمد رضا.....!"
وہ دلکش نسوانی آواز سنائی دی تو وہ اندر بیٹھ گیا۔ گاڑی میں مسحور کن خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سفید

میکسی والی لڑکیوں میں سے ایک تھی۔ اس نے کچھ پوچھنا چاہا لیکن لڑکی نے اپنا مومی انگلیوں والا ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر دیا اور ذرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کے گلابی لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"حضرت جی آپ کے منتظر ہیں' وہیں چل کر باتیں ہوں گی۔"

اس نے اپنا خوب صورت ہاتھ اس کے بازو پر رکھا اور احمد رضا کے اندر جیسے بجلیاں سی کوند گئی تھیں۔ اس نے بڑی شدت سے تمنا کی۔ یہ ہاتھ کچھ دیر اور یونہی اس کے بازو پر رکھا رہے اور وہ اس ہاتھ سے نکلنے والی حدت اپنے رگ و پے میں دوڑتی محسوس کرتا رہے۔ لیکن چند لمحوں بعد ہی اس نے اپنا ہاتھ اٹھا لیا تھا اور اب اسے اپنی گود میں دھرے سامنے دیکھ رہی تھی۔

تقریباً" بیس منٹ بعد وہ ایک کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو رہے تھے۔ گاڑی پورچ میں رکی تو ڈرائیور نے اتر کر دروازہ کھولا۔ دونوں گاڑی سے باہر نکل آئے تھے۔ پورچ میں مدھم لائٹ جل رہی تھی۔

اس نے اب غور سے دیکھا۔ یہ ان تین لڑکیوں میں سے' جو حضرت جی کی کرسی کے پیچھے کھڑی ہوتی تھیں' ایک تھی۔ درمیان والی۔ اس وقت وہ ہلکے گلابی رنگ کا میکسی نما لبادہ پہنے ہوئی تھی جس کے اوپر اس نے ایک قیمتی شال لے رکھی تھی۔ سر کے بال کھلے تھے اور بالوں کا آبشار سا اس کے کندھوں پر بکھرا تھا۔ وہ مبہوت سا اسے دیکھ رہا تھا کہ اس نے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھام لیا وہ مرکزی دروازے سے جانے کے بجائے پچھلے لان کی طرف جا رہی تھی۔

احمد رضا کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا اور احمد رضا کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا دل اس کے ہاتھ میں دھڑک رہا ہو۔ وہ سحر زدہ سا اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ پچھلے لان میں وہ یونہی اس کا ہاتھ پکڑے سرونٹ کوارٹر کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ یہ سرونٹ کوارٹر پچھلے لان میں تھا۔ لوہے کی سیڑھیاں چڑھ کر چھوٹا سا کوریڈور تھا۔ جس میں بمشکل ایک آدمی ایک وقت میں کھڑا ہو سکتا تھا اور سیڑھیوں کے بالکل سامنے کمرے کا دروازہ تھا۔ اس نے سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ آگے تھی اور احمد رضا اس کے پیچھے۔ اس نے دروازے کو ہلکا سا دھکیلا۔

دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اندر ایک لوہے کے پایوں والا بیڈ تھا۔ بالکل سامنے دائیں طرف ایک لکڑی کی الماری تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر الماری کو ایک طرف دھکیلا۔ وہ سلائیڈنگ ڈور تھا' جو بظاہر الماری کی طرح دکھتا تھا۔ وہ اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اندر چلی گئی۔

یہ دروازہ ایک کمرے میں کھل رہا تھا۔ غالباً" یہ اس کوٹھی کا فرسٹ فلور تھا۔ کمرے میں صوفے اور ٹی وی تھا اور ایک کم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ اس ٹی وی لاؤنج سے نکل کر اس نے بیڈ روم کے دروازے پر دستک دی اندر سے کسی نے کچھ کہا تھا پھر وہ دروازے کو ہلکا سا دھکا دے کر کھولتے ہوئے اسے بھی اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے اندر داخل ہو گئی۔

یہ ایک شاہانہ قسم کا بیڈ روم تھا۔ جس میں موجود فرنیچر کی قیمت کا دل ہی دل میں اندازہ لگاتے ہوئے احمد رضا نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے اسماعیل خان کو دیکھا۔ ان کے پاؤں کی طرف ان تین لڑکیوں میں سے ایک بیٹھی ان کے پاؤں دبا رہی تھی۔ اس نے بھی آج گلابی لبادہ پہن رکھا تھا۔ جو اتنا باریک تھا کہ اس کا خوب صورت جسم اس میں سے جھلکتا تھا۔ احمد رضا نے نظریں جھکا لیں۔

"اہلاً" وسہلاً "مرحبا!"

اسماعیل خان نے ہاتھ آگے بڑھایا' جسے احمد رضا نے عقیدت سے تھام لیا اور پھر آنکھوں سے لگا کر چھوڑ دیا۔

اسماعیل خان نے ایک ہاتھ سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دوسرے ہاتھ کے اشارے سے لڑکی کو اٹھنے کے لیے کہا تھا شاید...... دونوں لڑکیاں سر خم کر کے کمرے سے نکل گئیں۔

میکسی والی تینوں لڑکیاں خاص خادمائیں تھیں جو ہمہ وقت اسماعیل خان کے ساتھ رہتی تھیں جبکہ باقی چھ لڑکیاں اپنی ڈیوٹی ختم کر کے چلی جاتی تھیں۔ یہ بات اسماعیل خان کے ساتھ آخری ہونے والی میٹنگ میں رباب حیدر نے اسے بتائی تھی' جو اسماعیل خان کا مقرب خاص تھا۔

احمد رضا نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اسماعیل خان اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر کانچ کی نازک صراحی تھی جس میں ارغوانی رنگ کا کوئی مشروب تھا۔ کیا اسماعیل خان شراب پی رہے تھے۔ احمد رضا کے دل میں خیال آیا۔

"یہ شراب طہور ہے۔ خاص مشروب۔"

اسماعیل خان نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور مسکرائے۔

احمد رضا یکدم مرعوب ہوا۔ تو کیا وہ دلوں کا حال بھی جانتے ہیں۔

"دلوں کا حال تو صرف وہ جانتا ہے۔ ہم تو اس کے ادنیٰ بندے ہیں۔"

وہ ایک بار پھر اسے حیران کر رہے تھے۔

"یہ صرف مقربین خاص کے لیے ہے۔ ورنہ تم بھی اس کا ذائقہ چکھتے لیکن۔"

وہ مسکرائے ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔

"بہت جلد تم بھی ہمارے مقربین خاص میں شامل ہونے والے ہو...... میں تمہارے سر پر "ہما" کو منڈلاتے دیکھ رہا ہوں...... دولت' شہرت' عزت سب تمہارے قدموں میں ڈھیر ہونے والی ہے۔"

اس کا دل جیسے خوشی سے اڑانیں بھرنے لگا تھا۔ یہی سب تو وہ چاہتا تھا اور اس سب کی تو اسے خواہش تھی۔

"کب...... کب جناب؟" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"بہت جلد...... بہت جلد لیکن ابھی کچھ امتحان ہیں۔ ان سے گزرنا ہو گا پھر دولت تمہارے گھر کی لونڈی ہو گی اور شہرت تمہارے قدموں کے نیچے۔"

"کیسے امتحان؟" وہ ذرا سا پریشان ہوا تھا۔

"وقت کے ساتھ خود ہی واضح ہو جائے گا۔ ابھی تو ہم تمہیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تم پریشان نہ ہو۔ کوئی ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ رات کے اس پہر ہم سے تمہاری پریشانی دیکھی نہیں گئی۔ اس تھانیدار نے کیا کہا تمہیں۔" اور احمد رضا نے انہیں سب بتا ڈالا۔

ایک عجیب مسکراہٹ ان کے لبوں پر آئی تھی۔ جسے احمد رضا نے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس کے ذہن میں یہ آیا تھا کہ دلوں کا حال جاننے والا کیا نہیں جان سکتا کہ اس کی اس تھانیدار اور ایس پی سے کیا گفتگو ہوئی۔ وہ تو مرعوب سا بیٹھا تھا۔

"یہ تم نے اچھا کیا کہ اس مجلس کی تفصیل نہیں بتائی دراصل یہ ہمارے دشمن ہیں احمد رضا! جو الٹا سیدھا ہمارے خلاف اڑاتے رہتے ہیں۔ ان میں کچھ صحافی بھی شامل ہیں۔ یہ سب خود ہی نابود ہو جائیں گے۔ تم دیکھنا ایک روز ان کا انجام برا ہو گا۔ ہو سکتا ہے آئندہ بھی وہ تمہیں بلائیں لیکن تم انہیں اس ملاقات کے بارے میں ہرگز مت بتانا۔ یوں بھی ہم صبح یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"آپ چلے جائیں گے تو؟" احمد رضا گھبرایا۔

"گھبراؤ نہیں۔ تم ہمیشہ ہمارے رابطے میں رہو گے۔ تمہیں منتخب کر لیا گیا ہے اور بہت جلد تمہیں ایک خوشخبری سنائی جائے گی۔"

احمد رضا مرعوبیت اور ممنونیت سے جھک سا گیا۔

اسماعیل نے اپنا دایاں ہاتھ سائیڈ ٹیبل پر بنے ہوئے ایک بٹن پر رکھا تھا۔ دور کہیں گھنٹی بجی تھی اور وہی لڑکی جس نے اپنا نام الوینا بتایا تھا' اندر آئی۔ اسماعیل خان نے ہاتھ ذرا سا اونچا کیا۔ لڑکی نے ان کے سامنے سر تھوڑا سا جھکایا اور پھر احمد رضا سے مخاطب ہوئی۔

"آیئے جناب!"

احمد رضا اٹھا تو اسماعیل نے اپنا دایاں ہاتھ آگے

بڑھایا۔ یہ یہاں کا دستور تھا کہ اسماعیل خان کے سب مرید جب رخصت ہوتے تو ان کے ہاتھ پر بوسہ دیتے تھے۔ احمد رضا نے بھی اسماعیل کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور الوینا کے پیچھے بیڈ روم سے باہر نکل گیا۔

الوینا گاڑی تک اسے چھوڑنے آئی تھی لیکن واپسی کے سفر میں وہ اس کے ساتھ نہ تھی۔ جب وہ اپنی گلی میں داخل ہوا پانچ بج رہے تھے۔ گلی میں ویسی ہی خاموشی تھی اور مکین گہری نیند سو رہے تھے۔ ابھی فجر کی اذان میں وقت تھا۔ وہ جس طرح گیا تھا اسی انداز میں ذرا سی کوشش سے وہ اپنے کمرے کے ٹیرس پر موجود تھا۔ جتنی پھرتی سے وہ بچپن میں شیڈز پر پاؤں رکھ کر گڈیاں لوٹنے چھتوں پر چڑھتے تھے' آج وہ پھرتی نہیں تھی مگر پھر بھی وہ کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اسے عنقریب خوش خبری ملنے والی تھی۔

وہ خوش خبری کیا تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا لیکن جب وہ اپنے بیڈ پر لیٹا تو اس کی آنکھیں خوش رنگ خوابوں سے بھری ہوئی تھیں۔

دولت کے ڈھیر اور شہرت کی بلندی۔

وہ خواب میں بھی خود کو بلندیوں پر پرواز کرتے دیکھتا رہا تھا اور اس وقت بھی وہ بڑا حسین خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک شان دار گاڑی سے اتر رہا تھا۔ ٹی وی کیمرے کھٹا کھٹ اس کی تصویریں اتار رہے تھے کہ سمیرا نے دروازہ بری طرح دھڑ دھڑا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔

"کیا ہے؟" دروازہ کھول کر اس نے سمیرا کو گھورا۔

"یونیورسٹی نہیں جانا کیا؟"

اس نے مڑ کر گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔

"جلدی آؤ ابو انتظار کر رہے ہیں۔" وہ سر ہلا کر واپس مڑ گیا۔

یقیناً" جو بات ابو نے رات کو اس سے نہیں کہی تھی۔ اب اس سے کرنا تھی' ورنہ آٹھ بجے تک تو وہ آفس کے لیے نکل جاتے تھے۔

"خیر دیکھا جائے گا۔ میں کوئی بچہ نہیں ہوں کہ مجھے برے بھلے کی پہچان نہ ہو۔"

وہ سر جھٹک کر واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ جب کہ سمیرا کی نظریں اس کے گھٹنوں پر تھیں' جہاں اس کی پتلون پر مٹی لگی تھی جیسے رگڑ کھائی ہو۔ وہ حیران سی سیڑھیاں اترنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"ہوں!"

عبدالرحمٰن شاہ نے کروٹ بدل کر ہمدان کی طرف دیکھا' جو بیڈ کے قریب ہی کرسی پر بیٹھا کوئی میگزین دیکھ رہا تھا۔

"جی بابا جان!" اس نے میگزین بند کر کے ٹیبل پر رکھا۔

کہنیوں کے بل انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی تو تیزی سے اٹھ کر ہمدان نے انہیں سہارا دیا اور ان کے پیچھے تکیے رکھے۔

"ہومی!" تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے انہوں نے اس کی طرف دیکھا' "ایبک نے بہاول پور جا کر کوئی فون نہیں کیا؟"

"جی بابا جان! کل رات اس کا فون آیا تھا۔ آپ کی خیریت پوچھ رہا تھا۔"

"اور ..... اور عمو..... تمہاری پھپھو کے متعلق کیا بتایا اس نے؟" انہوں نے بے قراری سے پوچھا۔

"بابا جان! وہ بہت بہتر ہیں اب۔"

"ہومی.....!" وہ ذرا سے جھجکے۔

"تم تو بہاول پور جاتے رہتے ہو۔ عمو نے کبھی ہمارے متعلق کوئی بات کی؟"

"بابا جان! ان کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی بات ہوتی ہی نہیں..... وہ تو سارا ٹائم آپ کی' بابا کی' انکلز کی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ ایک ایک کا احوال پوچھتی ہیں۔"

"اچھا کبھی کوئی گلہ' کوئی شکوہ کیا اس نے؟"

"نہیں بابا جان! انہوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی۔"

"ہاں۔۔۔۔!" انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ "وہ تو بچپن سے ایسی ہی تھی۔ نہ کوئی گلہ نہ شکوہ' جو کہا مان لیا۔ کبھی اس نے ضد نہیں کی۔ حالانکہ زارا ضد کر لیتی تھی لیکن عمو نے کبھی ضد نہیں کی۔ ہاں اگر کبھی ڈانٹ بھی دیتی تو ہنس دیتی۔"

"اماں جان! آپ پر ڈانٹ بالکل بھی سوٹ نہیں کرتی۔" وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر انہیں منا لیتی۔ مجھے نہیں یاد کہ کبھی اس کی کسی بھائی یا بھابھی سے معمولی سی بھی رنجش ہوئی ہو پھر۔۔۔۔"

انہوں نے ایک نظر ہمدان پر ڈالی اور پھر بات نامکمل چھوڑ کر اندر آتے مرتضیٰ کو دیکھنے لگے۔

"کیا کہا ڈاکٹر نے۔ کب گھر جانا ہے مجھے؟"

"بابا جان! فی الحال تو ڈاکٹر نے گھر جانے کی اجازت نہیں دی۔ وہ کچھ روز مزید آپ کو انڈر آبزرویشن رکھنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر بھی انجیو گرافی کے لیے کہہ رہے ہیں۔"

"نہیں مرتضیٰ! یہ انجیو گرافی نہیں کروانی مجھے۔ موت تو اپنے وقت پر ہی آنی ہے۔"

"ٹھیک ہے بابا جان! انجیو گرافی ضروری ہوئی تو تب ہی کروائیں گے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ شانی ڈاکٹر عامر اور ڈاکٹر چودھری سے بھی مشورہ کر رہا ہے۔"

مرتضیٰ ان کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئے۔

"بیٹا! زندگی میں سب کچھ دیکھ لیا۔ اپنی اولاد اور پھر ان کی اولادوں کو۔ اللہ تم سب کو ہنستا بستا رکھے اور اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔ اور کتنا جینا ہے مجھے۔ بس ایک ہی حسرت ہے کہ مرنے سے پہلے ایک بار عمو کو دیکھ لوں۔ تمہاری ماں بھی اسی حسرت کو دل میں لیے چلی گئی اور میں۔۔۔۔ مرتضیٰ! مجھے عمو کے پاس لے چلو۔ ایک بار مجھے اس سے ملوا دو۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں۔ اب برداشت نہیں ہوتا۔"

"بابا جان! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" مرتضیٰ نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"جیسے ہی آپ کی طبیعت ٹھیک ہوتی ہے' میں آپ کو بہاول پور لے چلتا ہوں اور اگر ڈاکٹر نے سفر کی اجازت نہ دی تو میں خود جا کر لے آؤں گا عمارہ اور موی کو۔ آپ پلیز ٹینشن نہ لیں۔"

سارے بیٹوں میں سے مرتضیٰ ان کے زیادہ قریب تھے۔ اگرچہ مصطفیٰ بڑے تھے۔ پھر بھی وہ دل کی ہر بات مرتضیٰ سے ہی کہتے تھے۔ احسان چھوٹا ہونے کی وجہ سے ان کا لاڈلا تھا۔ بچپن میں قریب بھی تھا لیکن شادی کے بعد وہ قربت نہیں رہی تھی۔

ان کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"پتا نہیں شاید میں بھی تمہاری ماں کی طرح عمو سے ملنے کی حسرت لیے دنیا سے چلا جاؤں گا۔"

"نہیں بابا جان میں۔۔۔۔ میں کل ہی جا کر عمارہ اور موی کو لے آتا ہوں۔"

مرتضیٰ نے پھر انہیں یقین دلایا لیکن اندر آتے احسان نے رائے دی۔

"جو چیپٹر کلوز ہو چکا' اسے اب کھولنے کی کیا ضرورت ہے۔"

عبدالرحمٰن شاہ نے دکھ اور حیرت سے اسے دیکھا۔

"اور مجھے تو یہی بات ہے' ایک کا بھی گھر آنا پسند نہیں ہے۔ اگر وہ ہمدان کے ساتھ نہ آتا اور آپ نے اسے اجازت نہ دی ہوتی تو میں کبھی بھی اسے الریان میں گھسنے نہ دیتا۔"

بے حد تاسف سے اسے دیکھتے ہوئے عبدالرحمٰن شاہ نے سوچا۔ آخر ایسا کیا ہو گیا تھا جو احسان فلک شاہ کا اتنا مخالف ہو گیا تھا۔۔۔۔ حالانکہ موی تو الریان میں سب سے زیادہ احسان کے ہی قریب تھا۔ اپنے ہاسٹل جانے سے پہلے تک وہ اور شانی ایک ہی کمرہ استعمال کرتے تھے۔ کسی ویک اینڈ پر اسے آنے میں دیر ہو جاتی تھی تو سب سے زیادہ بے چین احسان شاہ ہی ہوتا۔

بہت ساری باتیں ان کے ذہن میں آ رہی تھیں۔ جن پر پہلے انہوں نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ انہوں نے احسان کی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور مرتضیٰ سے درخواست کی تھی۔

"مجھے لٹا دو بیٹا!"

مرتضیٰ نے اٹھ کر تکیے درست کیے اور انہیں سہارا دے کر لٹاتے ہوئے ایک سرزنش بھری نظر احسان پر ڈالی اور بے حد آہستگی سے اسے تنبیہہ کی۔

"شانی! تمہیں بابا جان سے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔"

احسان بنا جواب دیے کندھے اچکا کر کھڑا ہو گیا۔

"ڈاکٹر عامر ابھی تک آئے نہیں۔ میں انہیں دیکھتا ہوں۔ اگر آ چکے ہوں تو۔۔۔۔"

مرتضیٰ نے سر ہلا دیا۔ وہ تشویش سے عبدالرحمٰن شاہ کو دیکھ رہے تھے۔ جن کی آنکھیں بند تھیں لیکن پپوٹوں کی لرزش بتا رہی تھی کہ وہ سوئے نہیں ہیں۔

"بابا جان!" انہوں نے محبت سے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"عثمان آج شام کی فلائٹ سے آ رہا ہے۔"

"تم نے خوامخواہ انہیں اطلاع دی۔"

عبدالرحمٰن شاہ نے آنکھیں کھول کر مرتضیٰ کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ مرتضیٰ کو تکلیف ہوئی اور انہوں نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ کچھ بھی ہو وہ کل جا کر موی اور عمارہ کو لے آئیں گے۔

"انہیں آنا تو تھا ہی بابا جان! عادل کی منگنی کے سلسلے میں کچھ پہلے آ رہے ہیں۔"

"پریشان ہو رہے ہوں گے۔" عبدالرحمٰن شاہ نے آہستگی سے کہا۔

"نہ بتاتا انہیں تو اور ناراض ہوتے۔ دبئی میں تو ہیں۔ ان کا آنا کون سا مشکل ہے۔"

"چلو اچھا ہے' زندگی میں ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی مرتضیٰ!" اپنے بازو پر رکھے مرتضیٰ کے ہاتھ پر انہوں نے اپنا ہاتھ رکھا۔

"تمہیں کچھ علم ہے۔ یہ شانی، عمو اور موی کا اتنا مخالف کیوں ہے اور ایبک۔۔۔۔ اس بچے سے اسے کیا دشمنی ہے۔"

"معلوم نہیں بابا جان!" مرتضیٰ نے نظریں چرائیں۔

"اب مجھے اجازت دیں بابا جان! تین دن سے آفس نہیں گیا۔ بہت کام ہے۔۔۔۔ یہ ہومی ہے نا آپ کے پاس۔ میں ان شاءاللہ آفس کا کام نبٹا کر بہاول پور جا کر عمو کو لے آؤں گا۔"

انہوں نے انہیں تسلی دی۔

"وہ آ جائے گی تمہارے ساتھ؟" انہوں نے بچوں کے سے اشتیاق سے پوچھا۔

"کیوں نہیں بابا جان۔۔۔۔ ہومی سے پوچھیں نا' کتنا تڑپتی ہے وہ آپ کے لیے۔"

وہ جانے کے لیے مڑے تو عبدالرحمٰن شاہ نے پھر آواز دی۔

"مرتضیٰ! عاشی کو نہیں لائے تم۔ رات کہا تھا تم سے۔"

"بابا جان! ابھی ملاقات کے ٹائم میں سب گھر سے آئیں گے تو اس کی ماں لے کر آئے گی عاشی کو۔ ابھی تو وہ اسکول گئی ہوئی تھی۔"

"وہ ٹھیک تو ہے نا' اس کا بخار اتر گیا تھا۔"

"جی بابا جان! بالکل ٹھیک ہے اور آپ کے لیے نماز پڑھ کر روز دعا کرتی ہے۔"

عبدالرحمٰن شاہ کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ ہمدان کو بابا جان کا خیال رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے چلے گئے تو عبدالرحمٰن شاہ نے پھر آنکھیں موند لیں۔ عاشی انہیں بہت پیاری تھی۔ شاید یہ عاشی ہی تھی جس کے لیے اللہ نے انہیں زندگی دے رکھی تھی۔ ورنہ انہوں نے اتنا لمبا جی کر کیا کرنا تھا۔

عاشی ان کی زارا کی نشانی۔

عمارہ تو بہت دعاؤں کے بعد ملی تھی۔ چار بیٹوں کے بعد پہلی بیٹی سو انہوں نے عمارہ کے بہت لاڈ اٹھائے تھے لیکن زارا نے تو زبردستی اپنے حصے کی محبتیں وصول کی تھیں۔ وہ زبردستی ان کی گود میں بیٹھ جاتی۔ ضد کر کر کے اپنی بات منواتی۔ ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتی۔ روٹھ کر چلے جانے کی دھمکیاں دیتی۔

عمارہ کی شادی بیس سال کی عمر میں ہوئی تھی اور زارا کی شادی انہوں نے انیس سال کی عمر میں ہی کر

۔ حالانکہ مصطفیٰ اور مرتضیٰ نے مخالفت بھی کی
لیکن رشتہ ہی اتنا اچھا تھا اور سید ارسلان شاہ
کی دوستی بھی اتنی گہری تھی کہ وہ انکار کرہی
تے تھے۔ مجیب ہر لحاظ سے زارا کے قابل تھا۔
ایس کر کے وہ اعلا تعلیم کے لیے باہر جارہا تھا
ان شاہ انہیں اکیلے بھیجنا نہ چاہتے تھے۔ یوں
ی کے بعد مجیب کے ساتھ ہی امریکا چلی گئی
ہر سال صرف پندرہ دنوں کے لیے وہ دونوں
۔ یا کبھی کبھار مجیب زارا کو چھوڑ جاتا تو وہ تین
کر چلی جاتی۔ یہ زارا ہی تو تھی جس نے عمارہ
تعلق کرنے پر واویلا مچایا تھا۔
ب بھی آتی سب سے جھگڑتی۔ ان کا دل تو خود
ملنے کو ہمکتا تھا۔ اور ماں تو خیر ماں تھی اُسے
تو آنسو روکنے مشکل ہو جاتے۔
احسان تھا اور ایک مائرہ تھی۔
نہیں خیال آرہا تھا۔
یار کسی نہ کسی بہانے زارا کی ہر کوشش پر پانی
ے تھے۔
ض ہوتی..... روٹھتی اور پھر چلی جاتی۔
نے شادی کے سولہ سال بعد اسے اولاد کی
ا کی..... عاشی میں اس کی جان تھی۔ عاشی کی
ڈ اس نے پاکستان سیٹل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔
موت نے اسے مہلت ہی نہ دی۔ عاشی
سال کی تھی کہ وہ ڈاکٹروں کی غفلت کا شکار ہو
سولی پیٹ کے درد پر ڈاکٹر نے جو انجکشن لگایا۔
کا باعث بن گیا۔ اس کے انتقال کے صرف
بعد مجیب نے اپنی ساتھی ڈاکٹر سے دوسری
۔ ڈاکٹر زویا کو عاشی کا وجود گوارا نہ ہوا سو جب
ن شاہ کو پتا چلا تو وہ عاشی کو اپنے ساتھ لے
۔ مجیب نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔
سند تھا کہ زویا عاشی کو اپنے ساتھ رکھنے پر تیار
ں زارا کو تو موت نے ان سے جدا کردیا تھا
جیتے جی ان سے جدا ہو گئی تھی۔
وہ وقت پلٹنے پر قادر ہوتے۔ تو شاید وہ حالات
کو صحیح طریقے سے ہینڈل کرسکتے لیکن تب..... تب تو انہیں سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ سب اچانک کیسے اور کیوں ہو گیا۔

موی تو الریان کے ہر فرد کے دل میں ہوتا تھا پھر یہ اچانک اتنی دوریاں۔ اتنی طویل جدائیاں۔

وہ تو ہاسٹل جانے کے بعد بھی گویا "الریان" میں ہی رہتا تھا۔

انہوں نے کروٹ بدلتے ہوئے آنکھوں کے کونوں پر اٹکے ہوئے آنسو کو انگلی سے صاف کیا۔

موی نے تو کبھی کسی بات پر غصہ نہیں کیا تھا مگر مرتضیٰ کی شادی پر پہلی بار انہوں نے اتنے غصے میں دیکھا تھا۔ اور پہلی بار انہوں نے سوچا تھا عمارہ کا رشتہ موی کو دے کر انہوں نے غلط تو نہیں کردیا۔ ان کی عمارہ تو بڑی نازک دل ہے وہ بھلا موی کا اتنا غصہ برداشت کرپائے گی؟

وہ لوگ مرتضیٰ کی سسرال سے واپس آرہے تھے۔ چند بلاک چھوڑ کر ہی مرتضیٰ کی سسرال تھی۔ لڑکیاں مایوں کی رسم کرنے گئی تھیں۔ اگلے روز ہال میں مہندی کا فنکشن تھا۔ عمارہ اور زارا کی سہیلیاں رشتہ دار لڑکیاں سب ہی پیدل جارہی تھیں۔ ہنستی گاتی ہنسی مذاق کرتی۔

موی اور مصطفیٰ ان کے ساتھ تھے۔ عبدالرحمٰن شاہ اور مراد شاہ پیچھے تھے کہ اچانک انہوں نے دیکھا۔ موی نے ایک سفید کار کا دروازہ کھول کر کسی کو کھینچ کر باہر گھسیٹا تھا اور پھر موی کے مکے لاتیں گھونسے اس پر پڑ رہے تھے۔ مراد شاہ دل پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے۔

"عبدالرحمٰن! اسے روکو۔ منع کرو غصے میں اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔"

عبدالرحمٰن شاہ نے پیچھے سے جا کر انہیں اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا تھا مگر وہ.....

"چھوڑ دیں مجھے بابا جان..... زندہ نہیں چھوڑوں گا اس خبیث کو۔"

بہت مشکلوں سے انہوں نے قابو کیا تھا۔

یہ تو بعد میں مصطفیٰ نے انہیں بتایا تھا کہ وہ نشے میں تھا اور گاڑی ساتھ ساتھ لے کر چل رہا تھا۔ ایک دو بار اس نے کھڑکی کھول کر کوئی فقرہ بھی اچھالا تھا پھر جب ساری لڑکیاں مرتضیٰ کے سسرال والی گلی میں داخل ہو رہی تھیں تو اس نے گاڑی روک کر دروازہ کھولا اور عمارہ پر کوئی فقرہ اچھالا جو پھر موی بے قابو ہو گیا تھا۔

اس رات انہوں نے اسے سمجھایا تھا۔

"بیٹا! اپنے اندر صبر اور حوصلہ پیدا کرو۔ خدانخواستہ وہ بندہ مر مرا جاتا تو کیا کرتے ہم۔"

"جو بھی ہوتا بابا جان لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی ہمارے گھر کی خواتین پر بری نظر ڈالے۔ اگر آپ نہ ہوتے تو میں اسے مار ہی ڈالتا۔"

"اس شخص کی حرکت ہی ایسی تھی۔ کوئی بھی غیرت مند شخص برداشت نہیں کرسکتا تھا۔" عمارہ نے کہا تھا۔

مصطفیٰ، مرتضیٰ، عثمان، احسان سب ہی جوان خون تھے اور سب ہی کا خیال تھا کہ موی نے صحیح کیا۔ بلکہ مرتضیٰ نے تو اس کی پیٹھ بھی ٹھونکی تھی کہ صرف وہی جی دار ہے۔

اور پھر یہی غصہ ہمیشہ کے لیے جدائیاں دے گیا تھا۔

احسان نے اپنا گریجویشن مکمل کیا تو اس کے چند روز بعد موی نے بھی بی اے کی ڈگری لے لی تھی۔ تب ایک بار پھر وہ بے حد خوش ہوئے تھے۔

آج احسان کے ساتھ وہ بھی انجینئر بن کر یو ای ٹی سے فارغ ہوتا تو وہ دونوں کو اعلا تعلیم کے لیے باہر بھیج دیتے۔

ان کا خیال تھا کہ پہلے وہ انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کرے گا، پھر وہ عمارہ کی شادی کا سوچیں گے لیکن مراد شاہ نے ان سے شادی کی درخواست کردی تھی۔

"چچا جان! ابھی تو وہ پڑھ رہا ہے، ماسٹرز تو کرلے۔"

"ماسٹرز بھی کرتا رہے گا بیٹا! تمہاری چاچی دن رات بس ایک ہی راگ الاپتی ہے کہ اس کے سر پر سہرا سجا دیکھنا ہے۔ میں نے اپنی خواہش بیان کردی آگے تمہاری مرضی۔" وہ متذبذب تھے۔

تب مروہ نے زور دیا تھا کہ انہیں فلک شاہ اور عمارہ کی شادی جلد از جلد کردینا چاہیے۔ کیوں کہ مروہ کے سسرال میں کچھ لوگ انٹرسٹڈ ہیں موی میں۔

کتنی عجیب بات تھی کہ انہوں نے کبھی مروہ سے اس کے متعلق وضاحت نہیں چاہی مگر اس کے اصرار پر انہوں نے عمارہ اور موی کا نکاح کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ البتہ رخصتی عمارہ کے ایگزام کے بعد ہی طے پائی تھی۔

"بابا جان.....!" ہمدان نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ ماضی سے پلٹ آئے۔

"آپ کی دوا کا وقت ہو گیا ہے۔" انہوں نے کروٹ بدل کر ہمدان کی طرف دیکھا اور کہنیوں پر زور دیتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے۔

دوا کے بعد ہمدان نے انہیں لیٹنے میں مدد دی۔ وہ بہت دیر سے ان کا اضطراب اور بے چینی دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ آج بابا سے ضرور پوچھے گا کہ آخر ایسا کیا ہوا تھا کہ عمارہ پھپھو کے ساتھ سب نے تعلق ختم کرلیا۔ بہت عرصہ پہلے ماما نے اسے بتایا تھا کہ موی نے غصے میں قسم کھائی تھی کہ وہ اور عمارہ آج کے بعد اس گھر میں قدم نہیں رکھیں گے۔ بس اتنی سی بات۔

لیکن بات اتنی سی تو ہرگز نہیں رہی ہوگی۔ جب وہ اپنے کالج کے ساتھ تعلیمی ٹرپ پر بہاولپور گیا تھا اور مما نے اسے عمارہ پھپھو سے ملنے کی تاکید کی تھی۔ تب وہ عمارہ پھپھو، ایبک اور موی انکل کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا۔ البتہ مما پاپا سے بہت بار ان کا ذکر سنا تھا اور یہی پتا چلا تھا کہ موی انکل سے ناراضی کی وجہ سے وہ لوگ اپنی پھوپھو سے بھی نہیں مل سکتے اور وہاں پہلی بار وہ ایبک سے ملا تھا۔

ایبک فلک شاہ اس کا سگا پھوپھی زاد ہے..... وہ نوجوان شاعر جس کی شاعری کی پہلی ہی کتاب نے دھوم مچادی تھی اور تقریباً" کالج کے ہر لڑکے اور ہر لڑکی کے پاس اس کی کتاب تھی۔

شاعری کی کتاب کے فوراً" بعد ہی اس کا افسانوی مجموعہ بھی آگیا تھا اور اس کی سیل نے بھی ریکارڈ توڑ

دیے تھے۔ وہ خود بھی اس کے متاثرین میں سے تھا..... اور یہ جان کر تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی کہ اس کا یہ کزن چند دنوں بعد لاہور پنجاب یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے والا ہے۔

اور یہ عمارہ پھپھو کی خواہش تھی کہ وہ لاہور سے اپنی تعلیم مکمل کرے اور وہ بھی پنجاب یونیورسٹی سے۔

یوں ایبک سے اس کی قربت بڑھی تھی۔ اگرچہ وہ خود لمز سے ایم بی اے کر رہا تھا۔ جبکہ ایبک ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کر رہا تھا۔

وہ اکثر اس کے ہاسٹل چلا جاتا تھا۔ بہت سا وقت اس کے ساتھ گزارتا۔ کئی بار وہ چھٹیوں میں بہاولپور بھی چلا جاتا تھا۔ وہاں عمارہ پھپھو کے علاوہ انجی بھی تھی ..... نرم و نازک خاموش طبع۔ پتا نہیں کب اس کے دل میں انجی کا خیال آیا تھا اور کب اس نے انجی کے لیے سوچنا شروع کیا تھا۔ اسے تو احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ تو زارا پھپھو تھیں جنہوں نے اس کے دل کا چور پکڑا تھا..... وہ ان دنوں بہاولپور میں تھیں اور وہ ایبک کے ساتھ دو دن کے لیے عمارہ پھپھو سے ملنے آیا تھا۔ عمارہ پھپھو ہمیشہ کی طرح اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوئی تھیں اور مومی انکل نے زارا کو بتایا تھا۔

"جب سے ہومی نے آنا شروع کیا ہے عمارہ کے چہرے پر بھی سرخی نظر آنے لگی ہے۔ زارا! کچھ ایسا کرو کہ عمارہ کے سارے روٹھے رشتے ایک دن مراد پیلس میں زندگی کی لہر دوڑا دیں" اور اسی رات جب وہ زارا پھپھو کے ساتھ واپس لاہور آرہا تھا انہوں نے پوچھ لیا۔

"ہومی! تمہیں انجی پسند ہے نا۔" اور اس کی نظریں جھک گئی تھیں وہ زارا پھپھو کو جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ لیکن پھر..... وہ یکدم بے حد افسردہ ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا بابا جان سو گئے تھے۔

اور کتنی عجیب بات تھی کہ وہ دو سال لاہور میں رہا اور اس نے ایک بار بھی اسے الریان چلنے کو نہیں کہا تھا۔ شاید اس کے ذہن میں تھا کہ بابا جان اسے پسند نہ کریں اور احسان چاچو تو مومی انکل کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ انجی کے ذکر پر جس طرح بابا جان اور احسان انکل نے ردعمل ظاہر کیا تھا۔ اس کے بعد وہ ایبک کو "الریان" لانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن جب وہ اپنی تعلیم ختم کر کے واپس بہاولپور جا رہا تھا تو ماما نے بے حد افسردگی سے گلہ کیا تھا۔

"دو سال سے ایبک یہاں ہے۔ تم کسی روز اسے الریان ہی لے آتے۔ آخر یہ اس کے نانا کا گھر ہے اور ایبک پر تو الریان کے دروازے بند نہیں ہیں۔"

اور تب وہ بھاگا بھاگا کرنل شیر دل کی انیکسی میں پہنچا تھا۔ جہاں ایبک اپنا سامان پیک کر رہا تھا اور پھر "الریان" میں سب نے ہی اس کا بہت گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا تھا۔ سوائے راحیل احسان کے مگر عمر احسان تو باقاعدہ اس سے لڑا تھا کہ اس نے اب تک ایبک کو ان سب سے چھپائے کیوں رکھا۔ اور منیبہ شاہ کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ اس روز "الریان" میں موجود سب کچھ اس کے سامنے رکھ دے۔ بھری ہوئی ٹرالی بھی اسے کم لگ رہی تھی اور وہ بار بار اشارے کر کے حفصہ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے حفصہ کو سمجھ میں آیا تھا کہ اس کا اشارہ اس گجریلے کی طرف ہے جو مائرہ چچی نے بنایا تھا اور اس کے اشاروں کے جواب میں حفصہ نے بلند آواز میں بتایا تھا کہ وہ تو صبح ناشتے پر ہی ختم ہو گیا تھا۔ اور منیبہ بس حفصہ کو گھور کر رہ گئی تھی۔ اس روز کا تصور کرتے ہی ہمدان کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر غائب ہو گئی۔ اس نے ایک بار پھر جھک کر بابا جان کو دیکھا۔ وہ گہری نیند سو رہے تھے اور ان کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آرہی تھی۔ وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ اس کا جی چائے پینے کو چاہ رہا تھا۔ کینٹین میں کاؤنٹر پر چائے کا کہہ کر وہ ایک خالی ٹیبل کی طرف بڑھا اور کرسی کھینچ کر بیٹھنے ہی لگا تھا کہ کونے والی ٹیبل پر اریب فاطمہ کو بیٹھے دیکھ کر چونکا۔ وہ کونے والی ٹیبل پر تنہا بیٹھی تھی اور اس کے سامنے چائے کا کپ رکھا تھا لیکن وہ چائے نہیں پی رہی تھی۔

"کیا وہ بابا جان کی مزاج پرسی کو آئی ہے لیکن پھر

یہاں کیوں بیٹھی ہے؟"

ہمدان نے سوچا اور اس کی طرف بڑھ گیا۔

"فاطمہ! آپ یہاں؟" اریب فاطمہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"آج بھی آپ کالج سے یہاں آگئیں اور ادھر مونی نے پورے "الریان" کو ہلا کر رکھ دیتا ہے کہ فاطمہ گم ہو گئی۔"

اریب فاطمہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"نہیں! آج میں انہیں بتا کر آئی تھی۔ مجھے دراصل صبا سے ملنا تھا۔ اس نے کل گاؤں جانا ہے نا۔ اماں کی طرف میں نے کچھ چیزیں اور خط بھجوانا تھا۔"

"او اچھا!" ہمدان دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"صبا کچھ مصروف تھی' اس لیے میں یہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کر رہی تھی۔"

"آپ کی چائے تو ٹھنڈی ہو گئی ہو گی۔"

"میں نے منع بھی کیا تھا صبا کو لیکن وہ پھر بھی کہہ گئی چائے کا مگر میرا بالکل جی نہیں چاہ رہا۔"

تب ہی کینٹین والے لڑکے نے ہمدان کی چائے لا کر رکھی۔ ہمدان نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اریب فاطمہ کی طرف دیکھا۔ گندمی رنگت اور بے حد خوب صورت آنکھوں والی یہ لڑکی جسے الریان میں آئے بہت زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اور جو ابھی "الریان" کے لڑکوں میں سے کسی سے بھی بہت زیادہ بے تکلف نہیں تھی بلکہ وہ تو لڑکیوں سے بھی زیادہ بے تکلف نہیں تھی۔ یہ تو مونی تھی جو کھینچ کھینچ کر اسے سب کی محفلوں میں لاتی تھی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہمدان مصطفیٰ نے اعتراف کیا کہ اس لڑکی میں بلا کی کشش اور معصومیت ہے۔ اسے لگا' جیسے وہ اس کی موجودگی میں کچھ گھبرا رہی ہے۔ اس لیے چائے پیتے ہی وہ فوراً" کھڑا ہو گیا تھا۔

"اوکے فاطمہ! میں چلتا ہوں۔ بابا جان کو سوتا چھوڑ کر آیا تھا۔ کہیں جاگ نہ گئے ہوں۔ آپ اپنی صبا کا انتظار کریں۔"

اور اریب فاطمہ نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ یہ نہیں کہ ہمدان مصطفیٰ سے آج سے پہلے اس کی کبھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی' لیکن یوں اکیلے بیٹھنا نہ صرف یہ کہ اسے مناسب نہیں لگ رہا تھا بلکہ اسے خوف بھی آرہا تھا کہ کہیں کوئی یوں اسے ہمدان مصطفیٰ کے ساتھ اکیلے بیٹھے نہ دیکھ لے۔ کہیں ابا یا بھائی ادھر نہ آنکلیں۔

حالانکہ ابا اور بھائی تو رحیم یار خان سے بھی آگے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ جتنا عرصہ وہ مروہ مامی کے گھر رہی تھی۔ ابا صرف ایک یا دو بار اس سے ملنے آئے تھے اور دونوں بڑے بھائی تو ایک بار بھی نہیں۔

مروہ مامی نے اسے بیٹی بنا رکھا تھا اور یہ تب کی بات تھی' جب وہ صرف نو یا دس سال کی تھی اور گاؤں کے پرائمری اسکول میں چوتھی جماعت کی طالبہ تھی۔ جبکہ اسفند یار اور عظمت یار نے جو دونوں اس سے بڑے تھے' صرف آٹھ آٹھ جماعتیں پڑھی تھیں اور ابا کے ساتھ زمین داری سنبھالتے تھے۔ ابا کی خاصی بڑی زمین تھی۔ گھر میں روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ بڑی سی حویلی' مال' ڈنگر سب کچھ تھا لیکن ابا اور بھائیوں کے دل بہت چھوٹے تھے کہ وہ اس پر روپیہ خرچ کرنا غیر ضروری سمجھتے تھے۔ تعلیم یوں تو مفت تھی لیکن کسی کاپی' کتاب' قلم دوات پر معمولی رقم خرچ کرنا بھی انہیں گراں گزرتا تھا۔

دو روپے کی پنسل خریدنے پر بھی ابا گھنٹوں بڑبڑاتے رہتے اور اماں کو پیسے کی افادیت پر لیکچر دیتے ہوئے لڑکیوں کی تعلیم کو غیر ضروری قرار دیتے پھر اماں دوپٹے کے پلو سے بندھے دو میلے کچیلے نوٹ چپکے سے کھول کر اسے پکڑا دیتی تھیں۔ وہ تو نوٹ لے کر بھاگ جاتی تھی اور اماں کو ان دو چار روپوں کا حساب دینا پڑتا تھا۔ جو نہ جانے کن دقتوں سے انہوں نے ایسے ہی کسی موقع کے لیے سنبھال رکھے تھے۔ ایک بار اس نے سنا تھا۔ ابا پوچھ رہے تھے۔

"ہاں تو یہ چار روپے کہاں سے آگئے؟

میرے کرتے سے تو نہیں نکالے تھے؟

دودھ کے حساب میں تو ڈنڈی نہیں ماری؟

اچھا چینی منگوائی تھی اس میں سے بچے تھے تو پھر مجھے کیوں نہیں دیے واپس؟"

اور وہ دروازے کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھے یوں ہی ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔ نو سال کی عمر میں بھی اسے ابا کا اس طرح اماں سے پوچھ گچھ کرنا پسند نہیں آیا تھا اور شاید اس روز اماں نے بھی اسے باہر کھڑا دیکھ ہر روز سے زیادہ اپنی تذلیل محسوس کی تھی۔ اس روز کے بعد اس نے اماں کو فارغ وقت میں بستر کی چادروں اور تکیوں پر کڑھائی کرتے دیکھا تھا اماں ابا' عظمت اور اسفند کے گھر آنے تک مدھم روشنی میں کڑھائی کرتی رہتی تھیں۔ بیٹھک کے سوا باقی سب کمروں میں بہت مدھم روشنی کے بلب تھے۔ کیونکہ ابا کو بجلی کا بل دیتے ہوئے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ جب ان کے گاؤں میں بجلی آئی تھی تو وہ چند ماہ کی تھی۔ اماں نے ایک بار اسے بتایا تھا کہ ابا نے سب سے آخر میں بجلی کا کنکشن لیا۔

اسے بھی کھل کر استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی کہ بل آئے گا۔

اماں کے ہاتھ میں بہت صفائی تھی۔ ان کے پاس اکثر گھروں سے کام آنے لگا تھا۔ اماں سب سے کہتی تھیں۔ کڑھائی میرا شوق ہے۔ فارغ بیٹھا نہیں جاتا۔

ابا کا بھرم بھی تو رکھنا تھا۔

یوں اماں کے ہاتھ میں چار پیسے آنے لگے تو اماں کو ابا سے پیسے مانگنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ اب تو اماں اسے اور شہریار کو کبھی کبھی دو روپے بریک میں خرچ کرنے کے لیے بھی دے دیتی تھیں۔ دو روپے مٹھی میں دابے وہ اسکول کینٹین کی طرف جاتے ہوئے خود کو کوئی ملکہ یا شہزادی سمجھتی تھی۔

گاؤں میں لڑکیوں کا اسکول صرف پرائمری تک تھا۔

"تجھے پڑھنے کا شوق ہے ربا؟" ایک بار اماں نے پوچھا تھا۔ تو اس نے سر ہلا دیا تھا۔

"ہاں اماں! بہت زیادہ ۔۔۔ میں بہت زیادہ پڑھنا چاہتی ہوں ۔۔۔" تب اماں کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں اور انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر اس کی پیشانی چوم لی تھی۔

"میں تمہیں ضرور پڑھاؤں گی۔"

پھر اس نے اماں کو اکثر سوچ میں ڈوبے دیکھا تھا۔ پتا نہیں اماں کیا سوچتی تھیں۔

وہ چھٹیوں میں اماں کے ساتھ کبھی کبھار رحیم یار خان آتی تھی۔ چند دنوں کے لیے ۔۔۔ پھر ابا انہیں واپس بلا لیتے۔ حالانکہ اس کا دل نانو کے گھر میں بہت لگتا تھا نانو گھر میں اکیلی ہوتی تھیں۔ ان کا گھر اتنا بڑا بھی نہیں تھا۔ لیکن وہاں زندگی کی ہر سہولت تھی نانو ان کے لیے مزے مزے کے کھانے پکاتی تھیں۔ اماں بھی نانو کے ساتھ کچن میں گھسی رہتی تھیں اور وہ سوچتی تھی۔ یہاں تو اماں بریانی' فرائیڈ رائس اور چکن روسٹ سب بناتی ہیں اور وہاں صرف پتلے شوربے والا آلو گوشت یا کوئی بھی سبزی ڈال لیتی تھیں۔

شہریار نے ایک بار اسے بتایا تھا۔ ڈیرے پر ابا' عظمت بھا اور بھا اسفند شہر سے کڑاہی گوشت اور تکے منگواتے ہیں۔ ان دنوں بھی وہ شہریار اور اماں رحیم یار خان آئے ہوئے تھے۔ نانو بہت بیمار تھیں اور ابا نے ازراہ مہربانی اماں کو ان کی صحت یابی تک وہاں ٹھہرنے کی اجازت دی تھی۔ اسکول میں چھٹیاں تھیں اور وہ سوچتی تھی "کاش! یہ ساری گرمیاں یہاں ان ٹھنڈے کمروں میں سوتے گزریں۔"

شہریار کہتا تھا۔ "میں واپس جا کر ابا سے کہوں گا کہ وہ بھی بڑے کمرے میں اے سی لگوالیں۔"

اور اسے ہنسی آجاتی تھی۔ لیکن شہریار کو یقین تھا کہ ابا اس کی بات مان لیں گے کیونکہ وہ اسفند سے کہے گا اور ابا اسفند کی بات نہیں ٹالتے تھے۔

اور اگر ابا اس کی بات مان بھی لیتے۔ اے سی لگ بھی جاتا تو کیا ابا اے سی استعمال بھی کرنے دیتے؟ ہر کمرے میں پنکھا ہونے کے باوجود پوری گرمیاں ہاتھ کا پنکھا جھلتے جھلتے ان کے ہاتھ تھک جاتے تھے۔

اس نے یہ سوچا تو ضرور تھا لیکن شہریار سے نہیں کہا تھا۔ شہریار جو ابھی صرف چھ سال کا تھا' وہ اس کے چہرے پر مایوسی کے رنگ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کی

چمک رہی تھیں۔ وہ ابا کو اتنا نہیں جان سکا تھا' جتنا اس نے دس سال کی عمر میں جان لیا تھا۔

نانو کے گھر میں ہی پہلی بار وہ مروہ سے ملی تھی۔ وہ نانو کی بیماری کا سن کر آئی تھیں۔ اور انہیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئی تھیں۔

"اللہ زینب! یہ تمہاری بیٹی ہے۔ بالکل تمہارے جیسی ہے۔ مجھے یاد ہے جب میں بیاہ کر رحیم یار خان آئی تھی تو تم اتنی ہی تھیں۔ اپنی اماں کے ساتھ تم مجھے دیکھنے آئی تھیں اور کیسے پٹ پٹ آنکھیں جھپکاتے ہوئے فر فر انگریزی بول رہی تھیں۔ میں تو تمہارے ایکسنٹ پر حیران تھی۔ تم اتنی سی عمر میں کتنی پراعتماد تھیں۔ کتنے کانفیڈنس سے تم نے مجھ سے باتیں کی تھیں مگر تمہاری بیٹی ۔۔۔ یہ تو بڑی جھینپو سی لگ رہی ہے۔"

اور وہ جو اماں کے پیچھے چھپی ہوئی چپکے چپکے انہیں دیکھ رہی تھی' اور بھی شرما گئی تھی۔ انہوں نے اسے اماں کے پیچھے سے کھینچ کر اپنی بانہوں میں بھر کر بہت سارا پیار کیا تھا اور وہ لال چقندر ہو گئی تھی۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔

"سنو! تمہیں پتا ہے میرے تین بیٹے ہیں۔ بیٹی کوئی نہیں۔ تمہاری بیٹی کو دیکھ کر دل میں بیٹی کی حسرت پھر سے جاگ اٹھی ہے۔"

"تو بھابھی جان! اسے آپ ہی لے لیں۔"

اماں کی بات سن کر وہ حیران سی ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ اماں کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ تو کیا اماں سچ مچ اسے دے دیں گی ۔۔۔ اس نے سوچا مگر پھر خود ہی جواب بھی دے دیا تھا۔

"نہیں' اماں مذاق کر رہی ہوں گی۔"

پھر وہ ان دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر شہریار کو دیکھنے چھت پر چلی گئی تھی' پھر پتا نہیں ان دونوں میں کیا عہد و پیمان ہوئے تھے' اسے کچھ علم نہیں ہو سکا تھا۔ البتہ رات کو جب وہ اماں کے پاس لیٹی ہوئی منتظر تھی کہ اماں کہانی سنائیں تو اسے یکدم مروہ پھپھو کی بات یاد آئی اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"اماں! آپ جب چھوٹی تھیں تو انگریزی بولتی تھیں۔ مروہ مامی کہہ رہی تھیں نا۔ فر فر انگریزی بولتی تھیں۔ اماں! کیا آپ لندن سے آئی تھیں۔"

اماں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا مگر ان کی آنکھیں جھلملا گئی تھیں۔ اکثر اس کے کسی سوال پر اماں کی آنکھیں یوں ہی جھلملا جاتی تھیں اور اس کا سوال ان جھلملاہٹوں میں کہیں گم ہو جاتا تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اماں اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کسی گہری سوچ میں کھو گئی تھیں۔ تب نانو نے جو آنکھیں موندے لیٹی تھیں۔ آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تھا۔

"زینب! یہ تو نے مروہ سے کیا کہا اور کیوں؟ میں ہوں نا ادھر تو اریب کو اپنے پاس رکھوں گی۔ یہ پانچویں پاس کر لے نا تو میں خود اسے لے آؤں گی۔ تو کیوں فکر کرتی ہے' یہ ضرور پڑھے گی جتنا پڑھنا ہے۔"

"ہاں اماں! میں نے اسفند کے ابا سے بات کر لی تھی کہ اسے میں پانچویں کے بعد رحیم یار خان بھیج دوں گی اماں کے پاس۔"

اور اس کا دل جیسے بلیوں اچھلنے لگا تھا۔ وہ یہاں رہے گی نانو کے پاس۔ اس کے کتنے مزے ہوں گے ۔۔۔ اس نے سوچا وہ شہری کو بتائے لیکن شہری اماں کے دائیں طرف لیٹا آنکھیں بند کیے گہری نیند سو رہا تھا۔

"میں نے تو کتنا کہا تھا تجھ سے اسفی اور عظمت کو میرے پاس بھجوا دے۔ یہاں رہ کر پڑھ لیں گے۔"

"اماں! ان کا رجحان ہی نہیں تھا پڑھنے کا۔ اسفی کے وقت تو خیر اسکول ہی مڈل تک تھا لیکن عظمت کے وقت تو ہائی ہو گیا تھا۔ وہ دونوں تو بالکل اپنے باپ پر گئے ہیں۔"

"ہاں!" نانو نے بھی گہری سانس لی تھی۔

"وہی اٹھان۔ وہی قدیت' وہ سوچ فکر۔"

نانو اور اماں باتیں کرنے لگی تھیں۔ وہ کہانی سننے کی امید چھوڑ کر اپنے بستر پر آکر لیٹ گئی۔ اس روز خواب میں بھی وہ خود کو نانو کے گھر دیکھتی رہی تھی۔ نانو کے

پاس رہنے کے خیال سے وہ بہت خوش تھی اور اس نے دعا مانگی تھی۔ یا اللہ وہ جلدی جلدی پانچویں پاس کر لے۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ اس بار وہ نانو کے گھر آخری بار آئی ہے۔ اور آخری بار اپنی نانو کو دیکھ رہی ہے۔ آج کے بعد وہ نانو کے ہاتھ کے پکے مزے دار کھانے کبھی نہیں کھا سکے گی اور کبھی چھٹیوں میں آکر وہ اور شہری ٹھنڈے کمرے میں سخت گرمی میں اے سی لگائے ٹھنڈک کے مزے نہیں لوٹ سکیں گے۔

لیکن اماں شاید جانتی تھیں۔ شاید ڈاکٹر نے اماں سے کچھ کہا تھا' اس لیے تو انہوں نے مروہ مامی سے بات کرلی تھی۔ صرف تین دن بعد جب اسفند انہیں لینے آیا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"ابا کہہ رہے ہیں بہت رہ لیا' اب گھر چلیں۔ رحیم دودھ دوہتے ہوئے چالاکیاں کرتا ہے۔ ماسی زیناں لسی بلوتے ہوئے آدھا مکھن چٹ کر جاتی ہے۔ وہ ہر وقت گھر پر رہ کر نگرانی نہیں کر سکتے۔"

"ذرا صبر کر لے اسفی! اماں جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"مجھے تو ٹھیک ہی لگتی ہے۔" اسفند جز بز ہو رہا تھا۔

"اچھا ایک دن رک جائیں نے مروہ کو بلایا ہے' وہ کچھ دن اماں کے پاس رہ لے گی۔"

اس نے کبھی مروہ کو نہیں دیکھا تھا۔

اسفند کو رحیم یار خان رہنا کبھی اچھا نہیں لگا تھا لیکن وہ مجبوراً" رک گیا تھا۔ اسی رات نانو کا انتقال ہو گیا تھا۔ اماں بہت روئی تھیں۔ گھر آکر بھی اماں کے آنسو مہینوں نہیں تھمے تھے۔ اماں روتیں تو وہ بھی ان کے پاس بیٹھ کر رونے لگتی تھی..... ہولے ہولے اماں نے خود کو سنبھال لیا تھا..... اماں اکلوتی بیٹی تھیں۔ نہ کوئی بہن نہ بھائی۔

ابا' اسفند اور عظمت جا کر نانو کے گھر سے سارا سامان لے آئے تھے اور گھر کرائے پر چڑھا دیا تھا..... فریج' ٹی وی' اے سی سب..... فریج صرف گرمیوں میں استعمال کیا جاتا تھا اور وہ بھی صرف رات کو۔ صبح اٹھتے ہی ابا سب سے پہلے سوئچ آف کرتے تھے۔ سردیوں میں فریج کپڑے بیٹھک میں رکھ دیا گیا تھا..... ڈیرے سے آکر رات بارہ بجے تک اسفند اور عظمت ٹی وی دیکھتے تھے۔ کبھی کبھی ابا بھی دیکھ لیتے تھے۔

وہ جب پانچویں کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تو بہت اداس تھی۔ اب نانو نہیں تھیں اور اسے یہاں رہنا تھا اسی گھر میں..... وہ اماں کو بھری دوپہروں میں گرمی میں باہر برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھے کڑھائی کرتے دیکھتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی اماں منتظر نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتی تھیں جیسے انہیں کسی کا انتظار ہو اور ایسے ہی اداس دنوں میں ایک روز مروہ مامی آگئیں۔ ہنستی مسکراتی۔

اماں کے چہرے پر جو اتنے دنوں سے اضطراب چھایا ہوا تھا اور ایک انتظار کی سی کیفیت آنکھوں میں ٹھہری تھی یکدم ختم ہو گئی تھی۔ تو کیا اماں کو مروہ مامی کا انتظار تھا۔ اس نے سوچا تھا۔

اور پھر جتنے دن مروہ مامی وہاں رہی تھیں۔ اسفند' عظمت اور ابا ڈیرے سے جلد ہی گھر آجاتے تھے اور پھر بیٹھک سے اسفند اور عظمت کی ہنسی اور ابا کے قہقہوں کی آوازیں سن کر اسے بہت اچھا لگتا تھا۔

مروہ مامی کی شخصیت میں جانے کیا سحر تھا کہ ان دنوں ابا نے بھی اپنی جیب ڈھیلی کر دی تھی اور گھر میں فروٹ' چکن اور دوسری اشیا سب فراوانی سے آرہی تھیں۔

"آپ کے ہاتھ میں بڑا ذائقہ ہے بھابھی!" بریانی کھاتے ہوئے اس روز ابا نے تعریف کی تھی۔

زینب کے ہاتھ میں مجھ سے زیادہ ذائقہ ہے بھائی جان! اور بریانی پکانی تو میں نے زینب کی اماں جان سے ہی سیکھی ہے۔ لیکن آپ نے کبھی آزمایا ہی نہیں۔"

اور ابا صرف کھانس کر رہ گئے تھے۔ اس روز اماں نے اسے بتایا تھا کہ کل صبح اسے مروہ کے ساتھ جانا ہے اور وہیں رہ کر پڑھنا ہے۔ وہ اداس ہو گئی تھی۔

"نہیں میں آپ کو اور شہری کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ مجھے یہیں رہنا ہے آپ کے پاس۔ مجھے نہیں پڑھنا۔"

"رابو! یہ میری خواہش ہے کہ تم پڑھو۔ بہت سارا۔ میری تعلیم ادھوری رہ گئی تھی لیکن تم اپنی تعلیم مکمل کرو۔" ان کی آنکھیں جھلملا گئی تھیں۔

اور وہ ہمیشہ کی طرح اماں کی آنکھوں کی جھلملاہٹوں میں ڈوب کر ہار گئی تھی۔ اس روز پہلی بار اس نے اماں سے پوچھا تھا' انہوں نے کتنا پڑھا ہے۔ "جتنا نصیب تھا پڑھ لیا۔"

پتا نہیں' مروہ مامی اور ابا میں کیا باتیں ہوئیں لیکن اتنا ہوا کہ وہ مروہ مامی کے ساتھ رحیم یار خان آگئی تھی۔

مروہ مامی کے گھر میں ملازمین کے علاوہ صرف وہیں تھیں۔ ان کے شوہر ان کی ساس اور ان کے دو بڑے بیٹے ملک سے باہر تھے۔ ایک کی شادی ہو چکی تھی۔ اور دوسرے نے ابھی دو سال پہلے اپنی تعلیم مکمل کر کے جاب کی تھی جبکہ تیسرا لاہور میں پڑھ رہا تھا کسی کالج یا یونیورسٹی میں۔

شروع کے کچھ ہفتے وہ بے حد اداس رہی تھی لیکن پھر مروہ مامی اور اماں جان کی محبت سے وہ بہل گئی تھی۔ انکل بھی اس کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ اکثر اس کے لیے کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے لے آتے تھے۔ کبھی برگر' کبھی چاکلیٹ کبھی آئس کریم..... یہاں وہ بہت خوش تھی۔ وہ چھٹیاں ہونے سے ایک دن پہلے ہی سامان باندھ کر گاؤں جانے کو تیار ہو جاتی تھی۔ کبھی انکل اسے چھوڑ آتے اور کبھی اسفند اور عظمت میں سے کوئی اسے لینے آجاتا تھا۔ یوں اسی آنے جانے میں اتنے سال بیت گئے اور وہ بی اے میں آگئی پھر اسے یہاں الریان میں آنا پڑا تھا۔ لیکن مروہ پھپھو جاتے ہوئے اس کو کافی سارے پیسے دے گئی تھیں کہ اگر کبھی وہاں سے بھجوانے میں دیر سویر ہو جائے اور اسے ضرورت ہو تو وہ خرچ کر سکے۔ وہاں جا کر بھی انہوں نے ان چھ ماہ میں دو تین بار اس کے اکاؤنٹ میں رقم بھیجی تھی۔

اس کے اخراجات ہی کیا تھے۔ کھانا پینا سب الریان میں تھا۔ حتیٰ کہ منیبہ اور حفصہ سردیوں کی

شاپنگ کرنے گئیں تو اس کے لیے بھی سوٹ' جرسی اور شال لے آئی تھیں۔ سب ہی بہت مخلص اور محبت کرنے والے تھے۔ بالکل مروہ مامی کی طرح۔

اس نے اماں کے لیے گرم سوٹ اور شال خریدی تھی اور شہری کے لیے بھی کافی چیزیں لی تھیں۔ شہری اب میٹرک میں تھا۔ اسے شہری سے بہت پیار تھا جبکہ عظمت یار اور اسفندیار سے وہ بہت ڈرتی تھی۔

صبا کے یوں اچانک ملنے پر وہ بہت خوش تھی۔ پتا نہیں صبا کہاں رہ گئی تھی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا تو صبا کو آتے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا اور سب چیزیں صبا کے حوالے کرکے فوراً" ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اوکے صبا! میں اب چلتی ہوں۔۔۔ اور سنو! اماں سے کہنا میں کسی ویک اینڈ پر آؤں گی تمہارے ساتھ ان سے ملنے۔"

ہسپتال کے گیٹ سے نکلتے ہوئے اسے مائرہ آنٹی اور رابیل مل گئیں۔

"فاطمہ!" مائرہ آنٹی نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ رک گئی تھی۔

"السلام علیکم آنٹی!" اس نے انہیں سلام کیا۔

"ارے تم نے بابا جان کو دیکھنے آنا تھا۔ تو گھر سے ہمارے ساتھ آجاتیں۔ کالج سے اکیلی چلی آئیں۔" مائرہ اس کے دائیں کندھے پر لٹکے اس کے کالج بیگ کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ رحیم یار خان نہیں ہے لاہور ہے اور ابھی تمہیں لاہور کے راستوں کا بھی ٹھیک سے پتا نہیں۔ کہیں خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تو ہم مروہ کو کیا جواب دیتے۔"

"نہیں۔۔۔۔ وہ میں بابا جان سے کل بھی ملی تھی۔ آج تو میں صبا کے پاس آئی تھی۔" وہ گھبرا گئی تھی۔ "صبا ہمارے گاؤں کی ہے۔ بالکل ہمارے گھر کے ساتھ اس کا گھر ہے وہاں۔ یہاں ملازمت کرتی ہے۔"

اس نے وضاحت کی تو مائرہ نے بے حد معنی خیز نظروں سے رابیل کی طرف دیکھا' جو ناگواری سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اسے یوں مائرہ کا گیٹ کے پاس کھڑے ہو کر اریب فاطمہ سے باتیں کرنا بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"لو! ہم خوامخواہ ہی اس کے لیے فکر مند رہتے تھے کہ لاہور کے راستے اس کے لیے نئے ہیں لیکن یہ تو۔"

"یہاں سے میرا کالج نزدیک ہے۔ دو بار میں عمر کے ساتھ کالج سے یہاں آئی تو مجھے عمر نے بتا دیا تھا کہ کون سے نمبر کی وین یہاں آتی ہے اور یہاں سے کون سے نمبر کی ماڈل ٹاؤن جاتی ہے۔"

گھبرا کر وہ مزید وضاحت کرنے لگی تھی۔

"اور میں نے مونی کو بھی بتا دیا تھا کہ میں کالج کے بعد کچھ دیر کے لیے صبا کی طرف جاؤں گی۔"

تب رابیل احسان نے نخوت سے کہا تھا۔

"ماما! اب چلیں بھی۔ مجھے بابا جان سے مل کر پھر ایک دوست کی طرف بھی جانا ہے۔"

"اب تم گھر جاؤ گی یا۔۔۔" مائرہ کی انکوائری جاری تھی۔

"جی۔۔۔" اس نے جلدی سے کہا تھا۔ "گھر ہی جانا ہے مجھے۔"

پھر رابیل کو اندر کی طرف بڑھتے دیکھ کر مائرہ بھی اس کے پیچھے چل پڑی تو ایک اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے اریب فاطمہ نے گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیے تھے۔ الریان میں مائرہ آنٹی وہ واحد ہستی تھی' جن سے اس کی دور پار کی رشتہ داری بھی بنتی تھی لیکن مائرہ ہی وہ واحد ہستی بھی تھی جسے اریب فاطمہ کا الریان میں رہنا پسند نہیں آیا تھا۔

مائرہ اس کی اماں کی رشتے کی خالہ زاد بہن لگتی تھی اور شادی سے پہلے اماں اور ان کی بہت دوستی تھی۔ اماں نے ایک بار بتایا تھا۔ اماں کو اس بات سے بڑی تسلی تھی کہ مائرہ وہاں ہے کوئی مسئلہ ہوا تو اسے بتانا اور اریب فاطمہ نے پہلے ہی دن جان لیا تھا کہ وہ اپنا مسئلہ "الریان" کے ہر فرد سے ڈسکس کر سکتی تھی لیکن مائرہ سے نہیں۔ لیکن یہ بات اس نے اماں سے نہیں کہی تھی۔ وہ تو اس بات پر مطمئن تھیں کہ مروہ نہیں ہے تو مائرہ ہے نا یہاں اور وہ کوئی غیر تو نہیں! اس کا خیال رکھے گی۔

اور تب شہریار بہت ہنسا تھا۔

"ارے اماں! اتنے دور کی رشتہ داری' یہاں سگے چچا اور پھپھو نے کبھی حال احوال نہیں پوچھا تو وہ کیا آپی کا خیال رکھیں گی۔"

"کیوں کیا مروہ خیال نہیں رکھتی؟"

"مروہ مامی کی تو بات ہی اور ہے۔"

"مائرہ بھی تو مروہ کے خاندان میں گئی ہے۔ اس کی خوبو ہو گی اس میں اور رہے تمہارے چچا اور پھوپھی تو وہ تو تمہارا سارا ددھیال ہی بے مہرا ہے۔"

"تو آپ کو بے مہر اور خود غرض خاندان میں شادی ہی نہیں کرنا تھی۔"

"تو کیا شادی میری مرضی سے ہونا تھی۔ جھلا نہ ہو تو۔ جہاں اماں نے کردی' کرلی۔"

اماں کو بھی شہریار سے بہت پیار تھا۔ اسفند اور عظمت کی نسبت۔ ایک تو وہ سب سے چھوٹا تھا اور دوسرا پڑھائی میں بہت تیز۔

"لیکن اماں! آپ کو احتجاج تو کرنا چاہیے تھا نا۔" وہ یونہی شرارت کر رہا تھا لیکن اماں کی آنکھیں جھلملا گئی تھیں اور ان کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے تھے۔

اس روز اتنے سالوں بعد اس نے پہلی بار سوچا تھا کہ اماں کا ابا کے ساتھ واقعی کوئی میچ نہ تھا۔ پھر یہ شادی کیسے ہوئی تھی بھلا؟ وہی سید گھرانوں کا مسئلہ ہو گا۔

اس نے خود ہی تصور کر لیا تھا۔ ابا شکل و صورت کے اور پیسے کے لحاظ سے تو اچھے بھلے تھے۔ بس مزاج کے رنگ مختلف تھے۔ ابا کے تیز شوخ' چیختے چلاتے' آنکھوں میں چبھتے ہوئے اور اماں کے نرم' ہلکے دھیمے' دل میں ٹھنڈک پہنچانے والے۔

وہ اماں اور شہریار کے متعلق سوچتے ہوئے گیٹ سے نکل گئی تھی۔ مائرہ نے ایک نظر مڑ کر پیچھے دیکھا وہ جا چکی تھی۔ تب تیز تیز چلتے ہوئے وہ رابیل کے قریب آگئی۔

"تمہیں کیا جلدی تھی رابی! دو منٹ رک جاتیں۔"

"کیوں کیا آپ کی انکوائری مکمل نہیں ہوئی۔ جو باتیں رہ گئی ہیں۔ وہ گھر جا کر پوچھ لیجیے گا۔"

"توبہ ہے رابی! تم بھی نا۔۔۔ میں تو حیران ہو رہی ہوں۔ شکل سے کیسی بیوقوف لگتی ہے اور تن تنہا ہاسپٹل چلی آئی۔"

"بے وقوف تو خیر وہ بالکل نہیں مما! اس کا تعلیمی ریکارڈ بہت شاندار ہے۔"

عین اسی وقت رابیل نے کمرا نمبر 9 کا دروازہ ہلکا سا دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے ہی ہمدان صوفے پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ مائرہ نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔

"تم یہاں ہو ہومی!"

"ہاں جی۔۔۔ آپ بیٹھیں۔ بابا جان تو سو رہے ہیں۔"

"لیکن احسان تو کہہ رہے تھے تمہیں آج آفس بھیج کر وہ یا مصطفیٰ بھائی رہیں گے ہسپتال۔"

مائرہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا جبکہ رابیل ابھی تک کھڑی تھی۔

"جی لیکن میں نے منع کر دیا تھا۔ میں نے پہلے ہی چھٹی لے رکھی تھی۔"

"اچھا اور بابا جان کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

مائرہ اب ان کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن اس کے ذہن میں مسلسل اریب فاطمہ کا خیال آرہا تھا۔ یہ لڑکی جتنی معصوم دکھتی ہے' اتنی ہے نہیں۔ گھنی ہے' مروہ پھپھو کی طرح' آخر انہی کی تربیت ہے نا۔" یکایک اس کے ذہن میں کوندا سا لپکا تھا۔

"اریب فاطمہ ملی تھی گیٹ پر۔ بابا جان سے ملنے آئی ہوگی۔"

"نہیں تو۔ وہ یہاں اپنے گاؤں کی ایک لڑکی سے ملنے آئی تھی۔"

"تو تمہیں کیسے پتا چلا' جب وہ بابا جان کو دیکھنے آئی ہی نہیں۔"

"اوہ مما!" رابیل بے زار ہوئی۔ "اتنی انکوائری تو آپ نے اس سے کرلی تھی اب ہمدان سے پوچھنا ضروری ہے کیا؟"

ہمدان نے حیرت سے دونوں کو دیکھا۔

"نہیں! میں کینٹین چائے پینے گیا تھا۔ وہاں ملی تھی۔" ہمدان سادگی سے کہہ کر بابا جان کی طرف متوجہ ہوگیا جو غالباً" ان کی آوازیں سن کر جاگ گئے تھے اور اب آنکھیں کھولے مائرہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جو بابا جان کا حال پوچھنے کے بجائے یہ سوچ رہی تھی کہ اریب فاطمہ یقیناً" ہمدان سے ملنے آئی تھی۔

کمال ہے' انہیں پتا ہی نہیں چلا۔ گھر میں کب سے یہ چکر چل رہا ہے۔ رابیل اور ہمدان کے لیے تو بہت پہلے سے انہوں نے سوچ رکھا تھا۔ اب یہ لڑکی کہیں اسے پھانس ہی نہ لے۔

"ارے رابیل بیٹا! بیٹھ جاؤ کھڑی کیوں ہو۔"

بابا جان نے مائرہ کو گم صم دیکھ کر رابیل کو خود ہی مخاطب کیا تھا۔ جو پیشانی پر بل ڈالے مائرہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بابا جان کے بلانے پر وہ نادم سی ہو کر ان کا حال احوال پوچھنے لگی تھی۔

"السلام علیکم بابا جان! کیسی طبیعت ہے آپ کی۔"

"اللہ کا شکر ہے۔ بہت بہتر ہوں۔ یہ تمہارے پاپا اور تایا جان جو ہیں نا یہ ایسے ہی بیمار بنائے پڑے ہوئے ہیں۔"

انہوں نے ہمدان کے سہارے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا اور تب ہی دروازہ کھلا تھا۔

ہمدان نے اور انہوں نے ایک ساتھ ہی دروازے کی طرف دیکھا تھا۔

کھلے دروازے میں ایک اور اس کے ساتھ عمارہ کھڑی تھیں۔

"پھپھو جان!" ہمدان کے منہ سے نکلا۔

اور عبدالرحمٰن شاہ بے اختیار بانہیں پھیلاتے بیڈ سے اترے اور لڑکھڑا گئے۔ ہمدان نے انہیں سہارا دیا۔

"میری عمو......!"

اور اس سے پہلے کہ عمارہ جو دروازے پر ایک کا ہاتھ تھامے ساکت کھڑی تھیں بھاگ کر ان کے بازوؤں میں سماتیں۔ وہ بھربھری مٹی کے ڈھیر کی طرح ہمدان کے بازوؤں میں ڈھتے چلے گئے۔

انہیں بیڈ پر لٹا کر ہمدان پاگلوں کی طرح ان کی نبض ٹٹولنے لگا تھا اور پھر ان کے تیزی سے ٹھنڈے ہوتے جسم نے اسے ایسا حواس باختہ کیا کہ وہ ان کی کلائی چھوڑ کر ان کے سینے پر سر رکھ کر چیخ چیخ کر رونے لگا۔ تب دروازے میں ساکت کھڑے ایک کے جسم میں جنبش ہوئی تھی اور وہ عمارہ کا ہاتھ چھوڑ کر تیزی سے ان کی طرف لپکا اور ہمدان کا بازو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے اس نے پہلے ان کی کلائی پر نبض ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اس کے چہرے پر لحہ بہ لحہ پھیلتی مایوسی نے ہمدان کو اندر تک ہلا دیا۔ وہ تیزی سے عمارہ کو ایک ہاتھ سے پیچھے ہٹاتا ڈاکٹر کو بلانے باہر لپکا۔

جبکہ گہری مایوسی تلے ڈوبے دل کو بمشکل سنبھالتے ہوئے ایک انہیں مصنوعی سانس دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

شدید چاہ ہے تیری' تیری تمنا ہے
تو اس زمیں پہ مری آخری تمنا ہے

نہیں ہے خواب کوئی دوسرا تمہارے سوا
سو دیکھنے کو اسی خواب کی تمنا ہے

مرا تو ایک ہی دل ہے اور ایک ہی حسرت
تمہارے دل میں مگر دوسری تمنا ہے

ترا فراق کوئی داستاں ہے لکھی ہوئی
ترا وصال مری ان کہی تمنا ہے

نہ بیٹھتی ہے کہیں ٹک کے' نہ ٹھہرتی ہے
بطون خاک کوئی سرپھری تمنا ہے

برائے دل ہے یہ خواہش چراغ جلتا رہے
برائے جسم کوئی اور ہی تمنا ہے

سید کامی شاہ

عجیب سلسلۂ جستجو ہے
جہاں سے ختم ہو رہا ہے
وہیں پہ ایک اور کچھ شروع ہے
عجیب سلسلۂ جستجو ہے
مرے راستے منزلیں مانگتے ہیں
اور مری منزلوں کو راستوں کی آرزو ہے
عجیب سلسلۂ جستجو ہے
مجھے میرا آب مانگتا ہے
اور مری پیاس جو بہ جو ہے
عجیب سلسلۂ جستجو ہے
مری زندگی مجھے قتل کر رہی ہے
اور مری موت کو زندگی کی آرزو ہے
عجیب سلسلۂ جستجو ہے

ثروت زہرا

آنکھوں کو اب نگاہ کی عادت نہیں رہی
اب کچھ بھی دیکھنے کی ضرورت نہیں رہی

سچائیوں کی راہ بہت ہو گئی کٹھن
اس راستے پہ چلنے کی ہمت نہیں رہی

دشمن ہو، دوست ہو، کوئی اپنا کہ غیر ہو
ہم کو تو اب کسی کی بھی چاہت نہیں رہی

عرصہ ہوا کسی نے پکارا نہیں مجھے
شاید کسی کو میری ضرورت نہیں رہی

کانٹا سا ایک دل میں کھٹکتا ہے مستقل
پر دل کی بات کہنے کی عادت نہیں رہی

بشریٰ کبھی جو جاؤ وہاں عرض حال کو
کہنا کہ ہم پہ اب وہ عنایت نہیں رہی

بشریٰ ہاشمی

بات کرنے کی اجازت بھی نہیں چاہتے ہم
تھی جو حاصل وہ سہولت بھی نہیں چاہتے ہم

بارش لطف و کرم تو ہے بہت دور کی بات
اب تو کچھ حسب ضرورت بھی نہیں چاہتے ہم

تاب لا سکتے نہیں جیسے کسی چیستر کی اب
دشمنی چھوڑ، محبت بھی نہیں چاہتے ہم

چاہتے بھی ہیں تو چاہتے کیا ہیں تجھ سے
کبھی خود سے یہ وضاحت بھی نہیں چاہتے ہم

اپنی آواز کا ہی پھول کھلا دے کسی دن
تجھ سے اتنی سی مروت بھی نہیں چاہتے ہم

یہ شب و روز کسی اور کے ہیں اور تجھ سے
اس امانت میں خیانت بھی نہیں چاہتے ہم

کسی الجھن میں پڑے رہتے ہیں دن رات ظفر
اور اس کام سے رخصت بھی نہیں چاہتے ہم

ظفر اقبال

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ خوشبو

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اللہ تعالیٰ اپنے مومن، تنگ دست، سوال سے بچنے والے، بال بچوں والے بندے سے محبت فرماتا ہے۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"نادار مومن دولت مندوں سے آدھا دن یعنی پانچ سو سال پہلے جنت میں جائیں گے۔"

سنہرے اقوال،

- جو تم چاہتے ہو اُسے پانے کی خواہش کبھی نہ کرو۔ کیونکہ جب وہ تمہارے ہاتھ آئے گی تو اپنا روپ کھو دے گی، چاہے وہ چیز ہو یا کوئی انسان۔ (شیخ سعدیؒ)
- محبت ایسی شیرینی ہے جس کو چکھ لینے کے بعد دیر تک اس کا ذائقہ برقرار رہتا ہے۔
- محبت وہ کھیل ہے جس میں عقل ہار جاتی ہے۔ (مسولینی)
- جہاں عورت کا احترام ہوتا ہے، وہاں خدا بھی خوش ہوتا ہے۔ (منوشاستر)
- ایک عورت کی تعلیم کنبے کی تعلیم ہے اور مرد کی تعلیم صرف اُس کی تعلیم ہے۔ (نپولین)

صبا طارق۔ گوجرانوالہ

دوست دشمن،

- دوست تو آنکھوں میں بھی سماتے ہیں مگر دشمن آنگن میں بھی برداشت نہیں ہوتے۔
- دولت مند انسان کے دشمن اور علم والے انسان کے دوست بہت ہوتے ہیں۔
- دوست ہزار بھی کم ہیں اور دشمن ایک بھی زیادہ ہے۔
- جس شخص کی دوستی سے کچھ نفع نہ پہنچے، اُس کی دشمنی سے بھی کچھ نقصان نہ ہوگا۔
- دوست کو اپنے حال سے اتنا ہی واقف رکھو کہ اگر وہ دشمن ہو جائے تو نقصان نہ پہنچا سکے۔

نمرہ، اقرا۔ کراچی

علاج،

ایک ڈاکٹر فخر سے دوسرے ڈاکٹر کو بتا رہے تھے۔
"آخر کار میں نے مسز کمال کے لڑکے کا علاج کر ہی دیا۔ تمام ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔"
"کیا بیماری تھی اُسے؟" دوسرے ڈاکٹر نے پوچھا۔
"وہ دانتوں سے ناخن کترتا تھا۔ میں نے اسے ڈینٹسٹ کے پاس بھیج کر اس کے تمام دانت نکلوا دیے۔"

صائمہ نعیمی۔ کراچی

ہیرے،

ایک یہودی، ایک امریکی اور ایک برطانوی لندن کے ایک گرجے کی سیر کو گئے۔ وہاں اندرونی دیواروں پر جگہ جگہ بہت سے ہیرے لگے ہوئے تھے۔ تینوں جب گرجے سے باہر نکلے تو برطانوی نے کہا۔
"اُف کتنے خوب صورت ہیرے تھے دیوار پر۔ میرا دل چاہتا تھا، اُتار لوں۔"
امریکی نے کہا۔ "میں نے ہیرے اُتار بھی لیے ہیں۔"
"لیکن وہ اس وقت میری جیب میں ہیں۔" یہودی

نے اطلاع دی۔

نازش ریحان۔کراچی

شناخت

احمد ندیم قاسمی کی کسی عزیزہ نے اردو ایم اے کا امتحان دیا۔ پتا چلا کہ پرچے نمبر نگ کے لیے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے پاس گئے ہیں تو عزیزہ نے قاسمی صاحب سے فرمائش کی کہ صوفی صاحب سے سفارش کی جائے کہ نمبر لگاتے ہوئے ذرا ہاتھ ہولا رکھیں۔

چنانچہ قاسمی صاحب عزیزہ کو ساتھ لے کر صوفی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ صوفی صاحب علیک سلیک کے بعد اٹھ کر اندر چلے گئے اور کافی دیر تک اندر سے برآمد نہ ہوئے۔ قاسمی صاحب کو ان کی اس بے اعتنائی پر سخت تعجب ہوا اور افسوس بھی کہ چائے پانی کا پوچھا اور نہ آنے کا مقصد۔

بہرحال تھوڑی دیر بعد صوفی صاحب آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک پرچہ تھا۔ آتے ہی قاسمی صاحب سے معذرت کے بعد پوچھا۔

"کہو قاسمی صاحب! عزیزہ کو کتنے نمبر دے دوں؟"

قاسمی صاحب کو اس پر بہت حیرت ہوئی۔ صوفی صاحب سے دریافت کیا کہ آپ نے کیسے جان لیا کہ میں اسی سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔

اس پر صوفی صاحب بولے۔ "قاسمی صاحب! میرے پاس کل تینتیس پرچے دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ اکتیس حضرات آپ سے پہلے میرے پاس سفارش لے کر آ چکے ہیں، ظاہر ہے آپ اس آخری پرچے کے سلسلے میں ہی تشریف لائے ہوں گے۔"

"واہ! کیا بات ہے۔" قاسمی صاحب نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔

رضیہ طاہر۔کراچی

ضروری بات

ایک ادارے کے دفاتر چیمبرز کی تین منزلوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ دفتر کے اسٹاف کو کام کے سلسلے میں بار بار رابطے کے لیے جانا پڑتا تھا۔ اسٹاف کی اس تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے ادارے کے مالک نے تینوں منزلوں کے ہر کمرے میں انٹرکام لگوا دیے۔

ایک روز دوپہر کے وقت تیسری منزل کے کمرے میں ایک کلرک اپنی میز پر اونگھ رہا تھا۔ انٹرکام کی گھنٹی بار بار بج رہی تھی لیکن اس کی آنکھ نہیں کھلی۔ بالآخر دفتر کا جنرل منیجر کمرے میں داخل ہوا اور دھاڑتے ہوئے بولا۔

"اتنی دیر سے انٹرکام کی گھنٹی بجا رہا ہوں اور تم اطمینان سے سو رہے ہو۔ ریسیور اٹھاؤ۔ میں تم سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

کرن۔کراچی

بچے ہمارے عہد کے

چھ سالہ عمیر اپنی پانچ سالہ پڑوسن ہنی کے ساتھ بازار جا رہا تھا جب وہ سڑک پار کرنے لگے تو اچانک عمیر کو اپنی امی کی نصیحت یاد آئی کہ بچوں کو ہمیشہ ہاتھ پکڑ کر روڈ کراس کرنا چاہیے۔ اس نصیحت کے یاد آتے ہی عمیر نے کہا۔

"آؤ ہنی! میں تمہارا ہاتھ پکڑ لوں۔"

"ٹھیک ہے۔" ہنی نے کہا۔ "دیکھ لو عمیر! مگر یاد رکھنا کہ تم آگ سے کھیل رہے ہو۔"

خدیجہ سلیم۔کے ڈی اے

طبی نمک پارے

(1) مریض کا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"تمہیں کوئی خاص بیماری نہیں ہے۔ بس روزانہ دو کلومیٹر پیدل چلا کرو۔"

مریض کراہ کر بولا۔ "اور کتنا چلوں میں ڈاکٹر صاحب! میں چوکیدار ہوں۔ ساری رات علاقے میں گشت کرتا ہوں۔"

(2) ڈاکٹر صاحب! کیا میرا آپریشن کامیاب رہے گا؟"

"یہی دیکھنے کے لیے تو میں آپریشن کر رہا ہوں۔"

لائبہ، ایمن۔کراچی

خط کا جواب

مرزا غالب نے اپنے دوست کو دسمبر 1858ء کو آخری تاریخوں میں خط لکھا۔

دوست نے جنوری 1959ء میں پہلی یا دوسری تاریخ کو جواب دیا تو اس کے جواب میں اُن کو اس طرح لکھتے ہیں۔

"دیکھو صاحب! یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ 1858ء کے خط کا جواب 1859ء میں بھیجتے ہو اور مزا یہ ہے کہ جب تم سے کہا جائے گا تو کہو گے کہ میں نے دوسرے دن ہی جواب لکھ دیا ہے۔"

امبر گل۔ٹھڈو (سندھ)

دُکھ

اللہ تعالیٰ جس کو اپنا آپ یاد دلانا چاہتا ہے تو اسے دُکھ کا الیکٹرک شاک دے کر اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ دُکھ کی بھٹی سے نکل کر دوسروں کے لیے آدمی نرم پڑ جاتا ہے۔ پھر اس سے نیک اعمال خود بخود اور بخوشی سرزد ہونے لگتے ہیں۔ دُکھ تو روحانیت کی سیڑھی ہے۔ اس پر صابر و شاکر ہی چڑھ سکتے ہیں۔

(بانو قدسیہ کی کتاب "دست بستہ" سے انتخاب)

نوال افضل گھمن۔گجرات

نصیب والے

جھڑکیاں دینے والا، رعب جمانے والا، دھمکیاں دینے والا بھول چکا ہوتا ہے کہ وہ بھی انسان ہے۔ انسانوں پر رعب جمانے اور انہیں جھڑکی دینے کا کوئی حق نہیں۔ ہر نقلی استحقاق صرف غرورِ نفس کا دھوکا ہے اور غرور کسی انسان میں اس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک وہ بدقسمت نہ ہو۔ نصیب والے قسمت والے ہمیشہ عاجز و مسکین رہتے ہیں۔

(واصف علی واصف)

طاہرہ ملک۔پسرور

رُخِ زیبا

بیگم کی فرمائش جب حد سے بڑھ کر ضد کو چھونے لگی تو ان کے شوہر پھولے ہوئے منہ کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے انہیں کلفٹن لے گئے۔ ساحل کی بھیگی بھیگی ہوائیں بیگم کے مزاج پر اثر انداز ہوئیں۔ انہیں محبت میں آسمان سے تارے توڑ لانے والا محاورہ یاد آیا تو انہوں نے تاروں بھرے آسمان کو تکتے ہوئے، قدرے مخمور لہجے میں اپنے میاں سے کہا۔

"بتائیے... وہ کیا چیز ہے جسے آپ روز دیکھتے ہیں... دیکھتے ہی رہتے ہیں مگر توڑ نہیں سکتے۔"

شوہر کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ انہوں نے بلاتوقف کہا۔

"تمہارا منہ!"

عائشہ۔گوجرہ

ماچس

ایک صاحب ماہرِ نفسیات کے کلینک میں داخل ہوئے۔ کرسی پر بیٹھ کر تمباکو کا تھیلا نکالا اور تمباکو کو اپنے کان میں ٹھونسنے لگے۔ ماہرِ نفسیات نے کہا۔

"آپ کی اس حرکت سے ظاہر ہوتا ہے، آپ کو میری ضرورت ہے۔"

ان صاحب نے کہا۔ "جی ہاں! کیا آپ کے پاس ماچس ہوگی؟"

فوزیہ ثمر بٹ۔گجرات

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

نغمانہ بٹ ـــــــ لاہور

لب و حرف سے مرا اعتبار ہی اُٹھ گیا
ترے بعد مجھ سے کوئی دُعا نہیں ہو سکی

ماریہ سید واجد علی ـــــــ کراچی

شام کی دہلیز سے شمعیں اُٹھا کر لے گیا
کون ہے جو شہر کی رسمیں چُرا کر لے گیا
ہم تو اُٹھ آئے تھے اس کی بزم سے آزر مگر
پھر دل کم بخت باتوں میں لگا کر لے گیا

رابعہ منیر ـــــــ گوجرانوالہ

اِس مرصع نگار خانے میں
آنکھ بے منظری سے گزری ہے
کچھ دکھائی نہیں دیا، شاید
عُمر اندھی گلی سے گزری ہے

مصباح گل ـــــــ سرگودھا

ہر اک خواب کی تعبیر تھوڑی ہوتی ہے
محبتوں کی یہ تقدیر تھوڑی ہوتی ہے
سفر یہ کرتے ہیں ایک دل سے دوسرے دل تک
دُکھوں کے پاؤں میں زنجیر تھوڑی ہوتی ہے

گڑیا شاہ ـــــــ کہروڑ پکا

ماں کی مسکان، گڑیا، کھلونوں کا گھر
مجھ کو پھر سے مرا بچپنا چاہیے
ابر ہو، رات ہو اور تنہائی ہو
مجھ کو اس کے سوا اور کیا چاہیے

آسیہ جاوید ـــــــ علی پور چٹھہ

مجھے اکثر ستاروں سے یہی آواز آتی ہے
کسی کے ہجر میں نیندیں گنوا کر کچھ نہیں ملتا

عائشہ، تحریم ـــــــ گوجرہ

کوئی دستک کوئی آہٹ نہ شناسا آواز
خاک اُڑتی ہے در دل پہ بیاباں کی طرح

مریم شہباز ـــــــ کراچی

وہ جس سے رہا آج تک آواز کا رشتہ
بھیجے مری سوچوں کو اب الفاظ کا رشتہ

نمرہ اقرار ـــــــ کراچی

تو نے دیکھا ہے کبھو اس طرح کے اے صورت ماہ
ہاتھ دل پہ جو نہ رکھا تو ٹھہر جائے گا
دیکھنا ایک نہ ایک دن تیری خوشبو کا جمال
درد کی طرح رگ جاں میں اُتر جائے گا

نوال افضل گھمن ـــــــ گجرات

میرے تیر انداز پر ایسا وقت آنے کو ہے
اُس کے ہاتھوں میں فقط خالی کماں رہ جائے گی

مہک علی ـــــــ لاہور

پھر یوں ہوا کہ راستے یکجا نہ ہو سکے
وہ بھی انا پرست تھا میں بھی انا پرست

نرمین لودھی ـــــــ سرگودھا

غم جہاں ہو، غم یار ہو یا ہو تیر ستم
جو آئے، آئے ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

طاہرہ ملک ـــــــ پسرور

کتنا کم ظرف ہے وہ شخص
جسے اپنے حسن پہ غرور ہوتا ہے
کوئی کتنا ہی حسین ہو طاہر
نامکمل ضرور ہوتا ہے

ثانیہ یعقوب، فروا ـــــــ کبیر والا

عجب تماشا ہے مٹی سے بنے لوگوں کا ساگر
بے وفائی کرو تو روتے ہیں وفا کرو تو رُلاتے ہیں

سیدہ امیر اختر ـــــــ چندی پور

اور تو کچھ نہیں چاہیے مجھے تجھ سے اے زندگی
بس اک وہ شخص لوٹا دے جو مجھے تجھ سے بھی پیارا ہے

مریم رانا ـــــــ ٹنڈو جان محمد

خود اپنی ہی آواز سماعت پہ گراں ہے
کوئل سے کہو کانوں میں اب زہر نہ گھولے

ام کلثوم رائے ـــــــ پنجاب

محبت ہے تو چلتے ہیں سمندر کی مسافت پر
پھر اس کے بعد دیکھیں گے کنارا کون کرتا ہے

سدرہ سویٹی ـــــــ عبدالحکیم

جانے کس عمر میں بدلے گی یہ عادت اپنی
روٹھنا اُس سے تو اوروں سے اُلجھتے رہنا

مان جٹ ـــــــ عبدالحکیم

جسم میں درد کا بہانہ سا بنا کر
ہم ٹوٹ کے روتے ہیں تیری یاد میں اکثر

مدیحہ ـــــــ سرگودھا

یہ کیا خبر تھی کہ اک چہرے سے کتنے چہرے کشید ہوں گے
میں تھک گیا ہوں تمہارے چہروں کو آئینے میں سجا سجا کر
عجب تناسب سے ذہن و دل میں خیال تقسیم ہو رہے ہیں
مگر محبت سی ہو گئی ہے، تمہیں محبت سکھا سکھا کر

نوشین کنول ـــــــ ٹکال

محبت کا ازل سے ہے یہی شیوہ غالب
جو اس کو جان لے۔ یہ اُس کی جان لے

آسیہ جاوید ـــــــ علی پور چٹھہ

میں پا نہ سکا آج تک اس خلش سے چھٹکارا محسن
وہ مجھے جیت بھی سکتا تھا، مگر ہارا کیوں

فائزہ جبیں ـــــــ ٹکال

حرفِ تسلی تو اک تکلف ہے
جس کا درد، اسی کا درد، باقی سب تماشائی

ندا، نفصہ ـــــــ کراچی

مسکراہٹ، تبسم، ہنسی، قہقہے
سب کے سب کھو گئے، ہم بڑے ہو گئے

روبینہ شاہین ـــــــ ٹکال

یہ واجبات عشق ہم ہی پہ فرض کیوں
وہ بھی کچھ ادا کرے محسن محبت اسے بھی ہے

ناہید آفتاب ـــــــ گلاسکو

وہ جس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر سفر کیا تو نے منزلوں کا
تیری گلی سے نہ جانے کیوں آج سر جھکا کے گزر گیا وہ

ناز شمیم اختر ـــــــ راولپنڈی

نہ جانے کون سا آسیب دل میں بستا ہے
کہ جو بھی ٹھہرا وہ آخر مکان چھوڑ گیا

سانحہ ارتحال

معروف مصنفہ لبنیٰ عروج طویل علالت کے بعد اس دار فانی سے رخصت ہو گئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

لبنیٰ اچھی افسانہ نگار اور بہت اچھی شخصیت کی مالک تھیں۔ بہت ملنسار اور محبت کرنے والی۔ شادی کے بعد انہوں نے لکھنا کم کر دیا تھا۔ وہ بہت اچھی ماں بھی تھیں۔ انہوں نے اپنے تینوں بچوں کی بہترین تربیت کی۔ ان کے بڑے بیٹے محمد اطیب ملک ایئر فورس میں فلائٹ لیفٹیننٹ ہیں۔ دوسرے بیٹے محمد اسامہ ملک انجینئر ہیں۔ بیٹی منیٰ ظفر ڈاکٹر ہیں۔

لبنیٰ عروج کی وفات ان کے شوہر کمانڈر ظفر اقبال ملک اور ان کے بچوں کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے۔ ہم ان کے غم میں برابر کے شریک اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں، انہیں جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

قارئین سے لبنیٰ عروج کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

امت الصبور

خواتین کی ڈائری

غزالہ کنول کی ڈائری سے

اَن کہی باتیں اور اَن کہے جذبے کتنے خوبصورت ہوا کرتے ہیں۔ دل میں خواہشوں کا مینار سا کھڑا کر دیتے ہیں۔ وہ دن بڑے حسین ہوتے ہیں کہ جب زندگی کی حقیقتیں انسان پر پوری طرح آشکار نہیں ہوتیں کہ سچائی یہی ہے کہ زندگی کی حقیقتیں بہت تلخ ہوا کرتی ہیں۔ میری ڈائری میں تحریر ایک بہت ہی خوبصورت غزل آپ سب کی نذر۔

کچھ خوشی کے سائے ہیں، اور کچھ غموں کے ساتھ ساتھ
زندگی کٹ ہی گئی اُلجھنوں کے ساتھ ساتھ

آج تک اُس کی تھکن سے دُکھتا ہے یہ بدن
ایک سفر میں نے کیا تھا خواہشوں کے ساتھ ساتھ

کس طرح کھایا ہے دھوکا، کیا بتاؤں میں تمہیں
دوستوں کے مشورے تھے سازشوں کے ساتھ ساتھ

اس دفعہ ساون میں اُس کی یاد کے بادل رہے
اس دفعہ خوب رویا بارشوں کے ساتھ ساتھ

کاش پھر سے لوٹ آئیں، وہی بچپن کے دن
بھاگنا پھولوں کی خاطر تتلیوں کے ساتھ ساتھ

شہر کے کچھ لوگ میرے چاہنے والے بھی تھے
پھول مجھ کو لگ رہے تھے پتھروں کے ساتھ ساتھ

سونیا عباسی کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر محسن نقوی کی یہ غزل آپ سب بہنوں کے لیے۔

سورج کا خوف دل سے بھلا دینا چاہیے
اب اپنا سر سناں پہ سجا دینا چاہیے

یاروں سی کے دم سے ہیں مقتل کی رونقیں
قاتل کو زندگی کی دُعا دینا چاہیے

صحرا سجا رہا ہے بگولوں کا اک جلوس
سائے کو راستے میں بچھا دینا چاہیے

شب خوں نہ مار دے کہیں لشکر ہواؤں کا
شاخوں سے پنچھیوں کو اُڑا دینا چاہیے

یہ کیا کہ دوسروں کو سنائیں حدیثِ غم
اک روز خود کو ہنس کے رُلا دینا چاہیے

کرنوں کی بھیک مانگتی پھرتی ہے خلقِ شہر
اب وقت ہے کہ گھر کو جلا دینا چاہیے

محسن طلوعِ اشک دلیلِ سحر بھی ہے
شب کٹ گئی، چراغ بجھا دینا چاہیے

کہکشاں ارجمند کی ڈائری سے

انسان کی فطرت ایسی مجموعہ اضداد ہے کہ تمام عمر اسے اعتبار و بے اعتباری، توقعات و ناامیدی کے درمیان معلق رکھتی ہے۔ ایک لمحہ انسان کو رفعتِ سماوات سے آشنا کرا دیتا ہے تو دوسرا لمحہ خدشات کے پاتال میں لا پھینکتا ہے۔ سلیم کوثر کے پہلے مجموعے "خالی ہاتھوں میں ارض و سما" سے ایسی کیفیات کو آشکار کرتی ایک غزل۔

چلو یہ امتحان ماہ و سال ختم ہو گیا تو پھر
تو اس کے بعد بھی اگر ہمیں کہیں نہیں ملا تو پھر

یہ چاہتے ہو ساکنانِ شہرِ عشق میں رہو بسو
نہ راس آسکی تمہیں وہاں کی آب و ہوا تو پھر

کسے پکارتے ہو تم یہ راستوں کی اونچ نیچ میں
ذرا سنو! نہ آسکی جو لوٹ کر کوئی صدا تو پھر

میں تیرے دشمنوں سے تنہا جنگ آزما ہوں اب تلک
یونہی رہا جو تیری بے نیازیوں کا سلسلہ تو پھر

تجھے یقیں ہے آسماں زمین پر اُتر کے آگیا
جو کل کلاں کو تجھ پہ یہ کھلا کہ سب فریب تھا تو پھر

تجھے تو اپنے شجرۂ نسب پہ ناز ہے بہت یہاں
جو تو بھی اس سرائے آب و گل میں کھو گیا تو پھر

تمہیں سلیم کس قدر شکایتیں ہوا سے ہو گئیں
ہوا کو روک لو، چراغ تم سے پھر نہیں جلا تو پھر

سیدہ شوال رضا کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر عرفان صادق کی یہ خوبصورت غزل قارئین بہنوں کی نذر۔

کھلوں گا کیسے میں تجھ پر اے خوش جمال مرے
ابھی ہیں چاک کی مٹی میں خد و خال مرے

چراغِ جاں کو ہتھیلی پہ کیا دھرا میں نے
ہوا سے ہو گئے سب رابطے بحال مرے

وہ ایک لمحہ جو گزرا تھا تیری قربت میں
اس ایک لمحے میں بیتے ہیں ماہ و سال مرے

مرے خدا تجھے کچھ فرق تو پڑے گا نہیں
غبارِ وہم سے دن رات یہ نکال مرے

اسی لیے تو چراغوں کی صف میں شامل ہوں
سلگتے رہتے ہیں مجھ میں کئی خیال مرے

عجیب ضبط کا عالم ہے آج کل عرفان
لبوں پہ جمنے لگے ہیں سبھی سوال مرے

نادرہ خاتون

ہمارے نام

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

سعدیہ ندیم ۔۔۔ شیخوپورہ

"باجی! آپی چلی گئی ہیں۔" یہ وہ سفاک جملہ تھا جو 10 اگست کی رات گیارہ بجے پر میری سماعتوں سے ٹکرایا۔ فون کی بیل اٹھانے پر مجھے سننے کو ملا۔ یہ وہ جملہ تھا جو اپنی تلخ ترین حقیقت کے ساتھ مجھے ساکت کر گیا میری بارہ سالہ بیٹی مجھے تھپک تھپک کر بلاتی رہی اور آنکھوں میں آئے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے مجھے دلاسا دیتی رہی۔

یہ خبر میری عزیز از جان دوست "فرزانہ سہیل" کی موت کی خبر تھی۔ بہت سے قارئین اس سے متعارف ہوں گے کیونکہ لاکھ مصروفیت کے باعث بھی ہر رسالے میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی سلسلے میں موجود ہوتی تھی۔

ہماری دوستی کی ابتدا اعجابات رنگین (پنجاب یونیورسٹی) کے ہاسٹل نمبر 3 کے گیٹ پر ہوئی اور آخری ملاقات عمر ہسپتال کے کمرہ نمبر 4 میں درمیان میں ایک طویل عرصہ۔ ہماری تعلیم مکمل ہوئی۔ شادی، بچے، پرسکون زندگی، سب ہی کچھ ساتھ ساتھ چلتے ہماری دوستی کو ایک لمبا عرصہ گزر گیا کبھی ناراضی پیدا ہی نہیں ہوئی کیونکہ فرزانہ ہمیشہ سے دوستی کر کے نبھانا جانتی تھی۔ ابھی مارچ کے مہینے میں فون پر کہہ رہی تھی کہ سعدیہ اچھا سا سوٹ بھیجو، میرے کالج میں فنکشن ہے۔ اور میں بھی اپنے سارے کام پس پشت رکھ کے اس کا کام سب سے پہلے کرتی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ سے میری پسند کو ترجیح دیتی تھی۔ ہم دونوں کی ہی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے تھی مگر کالج جوائن کرنے کی وجہ سے فرزانہ کو تمام اشعار ازبر تھے۔ اور مجھے کبھی ضرورت ہی نہ پڑی۔ فون کرتا کہ فرزانہ صبح لائبہ کو فلاں ٹاپک پر تقریر لکھ کر بھیج دو اور بس بے فکر اور اگلی صبح TCS سے تقریر موجود۔

اپریل میں اس کی طبیعت کچھ خراب ہوئی مگر اس نے کوئی سیریس نہیں لیا بس یہی کہا کہ میرا وزن کم ہو رہا ہے۔ سب نارمل ہی تھا جون کے ماہ میں اپنی بہن کے آنے پر میں کچھ مصروف رہی۔ ایک دن فون کیا۔ اٹینڈ نہیں کیا۔ میں بہت حیران ہوئی۔ پھر میسج آیا کہ میں پنڈی میں ہوں اور میں سمجھتی رہی کہ وہ سیر کے لیے گئی ہے۔ کچھ دنوں بعد بات ہوئی تو فرزانہ کی آواز پہلے جیسی نہیں تھی۔ میں حیران کہ کیا ہوا!! اس نے بتایا کہ میں تو اتنی بیمار ہو گئی ہوں کہ مجھ سے چلا بھی نہیں جا رہا۔ اس نے بتایا کہ میرا Liver (جگر) کام نہیں کر رہا اور یہاں حکیم کو دکھا رہی ہوں۔ تب تو میں چپ رہی۔ بعد میں فون کر کے سمجھایا کہ حکیم کے علاج کو چھوڑ دو اور لاہور میں اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ اس نے ڈاکٹر کو دکھایا مگر اس کی صحت دن بدن گرتی چلی گئی۔ رمضان کے نویں دن مجھے اس کا پیغام موصول ہوا کہ میں عمر ہسپتال میں ہوں، شاید اللہ نے ہماری ملاقات کروانی تھی۔ وہی ملاقات آخری ٹھہری۔ اسے دیکھتے ہی میرے دل کو کچھ ہوا کہ وہ فرزانہ تو ہرگز نہیں ہے۔ جس کے ساتھ میں نے عائشہ صدیقہ ہال سے اورینٹل کالج کا سفر کیا تھا۔ جس کے ساتھ روم نمبر 68 میں بیٹھ کر لمبی لمبی بحثیں کیں۔ وہ دسمبر کی سرد شامیں اور گرمیوں کی تپتی دوپہریں گزاریں۔ وہ

اب سب یاد بن کر رہ گئی ہے۔ دوستوں سے بچھڑنے کا دکھ وہی سمجھ سکتا ہے جو اس کرب سے گزرا ہو۔ ایسا لگ رہا ہے کہ زندگی میں ایک خلا ابھر آیا ہے۔

اس کے بارے میں کیا لکھوں اس کا ذوق اچھا تھا۔ شوق بھی خوب تھے۔ سمجھ دار بھی تھی اور زود فہم بھی۔ بہت نرم دل اور نرم مزاج تھی۔ اللہ اس کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ اس کے پیارے بچوں اس کے میاں بہن کو صبر جمیل عطا کرے۔

ج: سعدیہ بہن! فرزانہ سہیل ہماری بہت اچھی بہت ذہین، باذوق قاری تھیں۔ بڑی باقاعدگی سے ہمارے تمام سلسلوں میں شرکت کرتی تھیں، پچیس تیس سال سے ہمارا ان کا ساتھ تھا۔ میاں چنوں سے ان کے خط ہمیں موصول ہوتے تھے تو لفافہ دیکھتے ہی ہمیں اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ فرزانہ سہیل کا خط ہے۔ ان کی وفات کی خبر سن کر دل کو عجب دھکا سا لگا ہے۔ اور ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے ہماری کوئی بہت عزیز دوست دنیا سے رخصت ہو گئی ہو۔ اتنی کم عمر میں اتنی زندہ دل، ذہین، باذوق ہستی کا دنیا سے رخصت ہو جانا بہت بڑا سانحہ ہے۔ ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ماجدہ سعید ۔۔۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

پہلے بات ہو جائے عنیزہ سید کے کوہ گراں تھے ہم جتنا معتبر نام اتنی معتبر منفرد تخلیق اتنا سحر انگیز ناول جو اپنے قاری کو حقیقت کی ایک ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں نظریں چرانا ناممکن۔ سعد ایک ایسا پرفیکٹ کردار حیران کن بھی اور متاثر کن بھی۔ اس کے ہر روپ میں چھپی ایک ان کہی پیاس ایک ان کہی تلاش۔ ماہ نور اور سعد دونوں ایک راستے کے مسافر، دونوں کی کھوج الگ۔ سارہ خان زندگی کی ایک سفاک حقیقت۔ کبھی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتی مایوسی تو کہیں بلندیوں کی جستجو روئے کھڑے کر دینا اس کردار میں شامل ہے۔ آپا رابعہ کا اللہ تعالیٰ سے اتنا قریبی لگاؤ اس کے ایمان کی مضبوطی روح کو سرشار کر دیتی ہے۔ کھاری کی معصومیت میں کہی ہوئی گہری باتیں سوچ کا ایک نیا در وا کرتی ہیں یہ سب کردار اپنی جگہ پر اتنے پرفیکٹ ہیں کہ اپنے طلسم میں جکڑ لیتے ہیں۔ جیناں کی ہتھ گاڑی سے لیا ہوا بچہ کھاری ہی لگتا ہے کہیں اینڈ پہ کھاری اور سعدیہ بہن بھائی ہی نہ نکل آئیں۔

صائمہ اکرم چوہدری کا سونے دیا کنگنا نے ہمیں قلم اٹھانے پر مجبور کیا جہاں آپ نے ہنسا ہنسا کر ہماری وکھیاں (پسلیاں) توڑیں وہاں آپ نے ہمارے نازک سے دل کو بھی توڑا۔ ساجد مسخرہ کی طرح اصل میں میرا تعلق بھی ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ہے ناں تو رضیہ بوٹی کی بے باکی پہ دل دکھی ہوا۔ ٹوبہ کے دونوں کرداروں کے ساتھ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ پھر بھی ناول پڑھنے کا مزا آگیا اتنی پر مزاح تحریر بہت دیر بعد ملی پڑھنے کو۔ اتنے ٹینشن زدہ ماحول میں اتنا پیارا ناول لکھنے پر بہت مبارک باد زمین کے آنسو نگہت سیما جی تو آتے ہی چھا گئیں کہ ہمارے آنسو بھی رکنے نہ دیے اتنی ساری محبتیں اور ان محبتوں میں یہ ایک چھوٹا سا لفظ انا اور اس میں اتنی طاقت کہ اتنی محبتوں کو ہرا دیتی ہے۔ ایک فلک شاہ کی ہیروئن یقیناً "رابیل احسان" ہے اریب فاطمہ کو محبت ہو گی لیکن اسے اپنی محبت کی قربانی دینا پڑے گی۔ میرے خواب لوٹا دو زبردست جا رہا ہے اریبہ کو شمشیر علی کی ہیروئن ہی ہونا چاہیے تھا۔ فرحت اشتیاق تو ہیں ہی دلوں کی ملکہ اس دفعہ قسط نہ دیکھ کر دل بہت برا ہوا۔ ناولٹ میں سارہ چوہدری کا گھر آنگن اور افسانوں میں راحت وفا کا دھریک کی چھاؤں نمبر ون پہ رہا۔ جس شمارے میں نایاب جیلانی کا ناول نہ ہو، وہ شمارہ ادھورا ہی لگتا ہے۔ بشریٰ سعید اتنی ناقابل فراموش تحریر لکھنے کے بعد آپ کہاں گم ہیں "سفال گر" کا لفظ لفظ ذہنوں پر ایسے نقش ہے کہ بھولنا بھی چاہیں تو بھلا نہ سکیں۔ آپ جیسی باصلاحیت ذہین رائٹرز کو زیادہ دیر گم نہیں رہنا چاہیے۔ در ثمن شادی کے بعد اتنی مصروف ہو گئیں کہ ایک شعر تک نہیں لکھا۔ میں تو ساری لڑکیوں کے والدین کو کہتی ہوں کہ اپنی بیٹیوں کو ڈائجسٹ پڑھنے سے مت روکیں یہ آپ کی بیٹیوں کی ہر جگہ ہر قدم پہ رہنمائی کرتا ہے۔ یہ آپ کی بیٹیوں کے بہترین مستقبل کی ضمانت ہے۔ آزمائش شرط ہے۔ اینڈ پہ ام ثمامہ کے لیٹر نے ہمیں خون کے آنسو رلا دیا جوان بھائی کی موت کا صدمہ کیا ہوتا ہے کوئی ہم سے پوچھے یہ سفاک موت ہنستی مسکراتی آنکھوں کو ویرانی کیسے بخشتی ہے یہ بستے ہوئے دلوں کو صحرا کیسے بناتی ہے جس کو لگے وہی جانے۔ بہرحال

اللہ تعالیٰ ام ثمامہ کے بھائی کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے ام ثمامہ کی فیملی کو اللہ تعالیٰ صبر جمیل اجر عظیم عطا فرمائے آمین۔

ج : پیاری ماجدہ! خوب صورت الفاظ میں آپ کا تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ آپ کی رائے متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

انیقہ انا..... چکوال

سرورق بہت پسند آیا۔ قدرے منفرد سا انداز لیے' نگہت سیما اور صائمہ چوہدری کافی عرصے کے بعد جلوہ گر ہوئیں۔

سب سے پہلے نگہت عبداللہ کو پڑھا۔ اس بار ہمیں اندازہ ہوا کہ تاجور خاصی حسین ہے۔ اب یہ "حسن" صرف مرد کو ہی کیوں دکھائی دیتا ہے؟ کبھی اریبہ اور سارہ کو نظر کیوں نہ آیا؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نگہت عبداللہ کے طرز تحریر کو کس سے تشبیہ دوں؟ سبک خرام ندی سے یا تند و تیز دریا سے۔ کیونکہ ناول وقت پڑھتے عجیب سے احساسات ہوتے ہیں جنہیں الفاظ کا روپ دینا مشکل سا لگتا ہے۔

"عنیزہ سید" کو غالباً "فیض احمد کی شاعری اور ادب (آرٹ) سے خاصا لگاؤ ہے۔ پہلے "دل من مسافر من" اور اب "کوہ گراں تھے ہم" سچ کہوں تو عنیزہ کے "دل من مسافر من" کے بعد ہی مجھے فیض کی شاعری سے حد درجہ لگاؤ پیدا ہوا۔ اور "کوہ گراں تھے ہم" "میری پسندیدہ ترین غزل ہے۔

نگہت سیما ایک لمبے عرصے بعد تشریف لائیں' خوش آمدید۔ پر یہ کیا "باقی آئندہ" "اف! مت پوچھیں کہ کتنی کوفت ہوئی اور احمد رضا اور ایبک شاہ کے کردار پڑھ کر اندازہ ہو رہا ہے ناول بہت لمبا چلے گا..... اور یہ اسماعیل نامی بندہ جانے کیا قیامت ڈھانے لگا احمد رضا پر..... اور ایبک کی جوڑی رانیل سے ہی بنے گی یہ تو پکا ہے۔ بابا جان کی سوچ سے پہلے ہم سمجھ چکے تھے کہ جو لڑکی کہانی کے ہینڈسم سے ہیرو سے خواہ مخواہ کا بغض پال لے' وہی آخر میں گوڈے گوڈے محبت میں ڈوبتی ہے (ہاہاہا..... اکثر یہی تو ہوتا ہے) بہرحال! اپنے تمام تر اندازے ایک طرف۔ اگلی قسط کا انتظار ایک طرف.....

صائمہ اکرم کا ناول اگرچہ بہت مزاحیہ تھا۔ پر اب اس قسم کا مزاح کچھ خاص نہیں بھاتا اخلاقیات کو برملا چیلنج کرتا ہوا۔

افسانوں میں اس بار ایلیا کا افسانہ کچھ خاص پسند نہ آیا۔ محض زبان بند کرکے گھر کے دو بااثر افراد کے لڑائی جھگڑے دیکھتے رہنا کہاں کی دانش مندی ہے؟ مرد تو بااختیار ہی اچھے لگتے ہیں۔ ویسے یہ تو ماننا پڑے گا کہ عورت اچھے خاصے مرد کو کاٹھ کا الو بنا دیتی ہے (ہاہاہا) سب سے اچھا افسانہ مجھے "آنگن کی چھاؤں" لگا تھوڑے سے درگزر اور فراخدلی سے گھر امن کا گہوارہ ہی تو بن جاتا ہے۔ دھریک کی چھاؤں بھی ان ہی جذبات کی عکاس تھی۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سب ہی افسانے تقریباً "ساس' بہو کے گرد گھومتے نظر آئے اور پورا کا پورا شمارا مجھے پسند آیا۔ بس ثمرہ بخاری کو بہت یاد کیا جاتا ہے۔ کافی عرصہ ہوا انہوں نے اندرون پنجاب کی تاریخ پر کچھ نہیں لکھا۔

ج: انیقہ! کافی عرصہ بعد آپ نے یاد کیا' بہت خوشی ہوئی۔ پہلے تو آپ ہر ماہ باقاعدگی سے ہمیں خط لکھتی تھیں اور دوسرے سلسلوں میں بھی حصہ لیتی تھیں۔ کئی کہانیاں بھی شائع ہوئیں آپ کی؟ اب لکھنا کیوں چھوڑ دیا۔ تفصیلی تبصرہ اچھا لگا۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

نازش حمید..... نوشہرو کینٹ

بہت محنت سے میں نے ناول لکھا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ مجھے کہانی آپ کے ڈائجسٹ میں بھیجنے کا طریقہ بتایا جائے اور یہ بھی بتائیں کہ پہلے ایک قسط بھیجوں یا پورا ناول بھیجوں۔ آپی پلیز یہ بھی بتایئے گا کہ خواتین ڈائجسٹ میں کہانی شائع کرانے کے لیے کوئی شرائط وغیرہ تو نہیں ہوتیں۔

ج : خواتین ڈائجسٹ میں کہانی شائع کرانے کے لیے صرف ایک ہی شرط ہے کہ کہانی معیاری ہو۔ آپ پوری کہانی ایک ساتھ بھیجیں قسط نہ بجوائیں۔ کہانی بھجوانے کا طریقہ یہ ہے۔ آپ کہانی کو لفافے میں ڈالیں۔ لفافے پر پتا لکھیں اور ڈاک خانہ جاکر ارجنٹ میل سروس کے ذریعے ہمیں بھجوادیں پتا یہ ہے۔

خواتین ڈائجسٹ 37۔ اردو بازار کراچی

سندھو اجن..... سانگھڑ

میں ایک سال سے خواتین ڈائجسٹ کی خاموش قاری ہوں۔ مجھے مطالعہ کا بہت شوق ہے آپ کے سارے ناول بہت اچھے ہوتے ہیں۔ خاص طور "میرے خواب لوٹادو' جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" بہت پسند ہے۔

ج: پیاری سندھو! آپ کا خط شامل اشاعت ہے آپ کا بھجوایا ہوا شعر بھی شعروں کے سلسلے میں شامل کرلیا گیا ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کا شکریہ۔

ظہیرہ ملک..... چونڈہ سیالکوٹ

شعاع اور خواتین کی بہت سی تحریریں پڑھیں' سب ہی زبردست ہوتی ہیں' میں پچھلے سات سال سے باقاعدگی سے پڑھ رہی ہوں ہر تحریر لاجواب ہوتی ہے۔ میری پسندیدہ رائٹرز میں فرحت اشتیاق' عمیرہ احمد' نگہت سیما' راحت جبیں' نمرہ احمد' سائرہ رضا' عنیزہ سید' کنیز نبوی شامل ہیں اس ماہ کا رسالہ بھی لاجواب تھا۔ خط لکھنے کی بنیادی وجہ ام ثمامہ کا خط تھا۔ ام ثمامہ کے بھائی کی اچانک موت کا پڑھ کر حد سے زیادہ دکھ ہوا۔ اللہ ان کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا کرے اور ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ اس ماہ سکندر اور لیزا کو بڑا مس کیا۔ مجموعی طور پہ رسالہ زبردست تھا لیکن سکندر کے بغیر مزہ نہیں آیا۔

ج: پیاری ظہیرہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ اس ماہ سکندر اور لیزا شامل ہیں۔ سعدیہ امام اور ہمایوں سعید کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کرلی ہے جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ

سحرش خان بھٹو..... میرپور بھٹو لاڑکانہ

ستمبر کا خواتین ملا... اور ٹائٹل دیکھ کر جی خوش ہو گیا مگر یہ کیا جناب پورا ماہ انتظار کرو اور پھر جب اللہ اللہ کرکے ڈائجسٹ ہاتھ میں آئے تو پسندیدہ تحریر ہی غائب ویل' مگر ہمیں فرحت آپی سے ایک بات کہنی ہے اور وہ یہ کہ ہم یوں تو آپ کی تحریروں کے فین ہیں مگر کبھی کبھار آپ کے قلم کا انداز ہمیں شاکڈ کر دیتا ہے۔ آپی آپ تو ہیں ہی بیسٹ سو اس لیے آپ سے التماس ہے کہ اپنے انداز کو محتاط ہی رہنے دیں اور اب چلتے ہیں نگہت آپی کے "زمین کے آنسو" کی طرف بہت اچھا لکھا نگہت آپی ویل ڈن۔ اور آپ کا ہیرو بہت اچھا لگا۔ مجھے ایبک فلک شاہ نائس کردار تراشا ہے۔

ج : سحرش! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ معذرت کے ساتھ ہمیں آپ سے اتفاق نہیں ہے۔ فرحت نہ صرف بہت محتاط انداز میں لکھتی ہیں بلکہ الفاظ کا انتخاب بھی بہت سوچ سمجھ کر بہت خوب صورتی کے ساتھ کرتی ہیں۔ البتہ جب حقائق کو سامنے لانا ہو تو مجبوری ہوتی ہے۔ ام مریم کا کردار واضح کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان واقعات کو لکھا جاتا جو سکندر کی دربدری کا سبب بنے۔

ایمن..... ہری پوری ہزارہ

"جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" بہت اچھا جا رہا ہے۔ مستقل سلسلوں میں "کرن کرن روشنی" میرا موسٹ فیورٹ ہے۔ انٹرویوز میں فنکاروں کے ساتھ ساتھ نیوز اینکرز اور دیگر سماجی شخصیات کا انٹرویو بھی شامل کریں۔ دیگر مستقل سلسلوں میں "رنگا رنگ پھول" بہت پسند ہے

سدرہ داؤد..... ٹھٹھہ کالونی

اس ماہ کا ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ اگست کا بھی بہت زبردست ٹائٹل تھا۔ مجھے اگست کا ڈائجسٹ اور ستمبر کا دونوں ساتھ ملے چونکہ کوئی لانے والا گھر میں ہوتا نہیں اگست کی کہانیوں نے تو ساری چھپی اداسی دور کردی خاص کر "آنگن میں اترے چاند" نے جس طرح یہ بھائی رہتے ہیں' ٹھیک اسی طرح ہم بہنیں بھی۔ اپنا بتاتی چلوں مجھے میرے انکل نے (Adopt) کیا ہے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں۔ پہلے ہم جوائنٹ فیملی میں رہتے تھے میرپور خاص میں بعد میں ابو نے (جن کے پاس رہتی ہوں گود لیا) کی ٹرانسفر ٹھٹھہ میں ہو گئی ہم یہاں آگئے تو جب ہم ساتھ رہتے۔ ہم چھ بہنیں خوب ہنسی مذاق کرتے ایک دوسرے کو چھیڑ کر ہونگ کرتے میں ٹیچر ہوں۔ فرحت اشتیاق کا جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" تو بہرحال میں پڑھتی ہوں اس کے بعد دوسری کہانیاں صائمہ اکرام چودھری کا "سونے دیا کنگنا" ہاہا! میں پڑھتی جاؤں اور قہقہے پہ قہقہہ۔ جب حنا کا ٹیکسٹ اس کے ابے کے نمبر پہ لگا اس ٹائم مزا آگیا رضیہ بوٹا کو بھی خوب سوجھی۔ کالج آکر اپنی روایت پینڈو پن

بھول گئی۔

ج : پیاری سدرہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ہمیں بھی ہنسی مسکراتی کہانیاں پسند ہیں لیکن سنجیدہ کہانیوں کا بھی اپنا لطف اور مزا ہوتا ہے زندگی کا ایک رخ یہ بھی تو ہے اور کہانیاں تو زندگی کا آئینہ ہوتی ہیں۔

جن کتابوں کے بارے میں آپ نے لکھا ہے۔ وہ آپ کو ہمارے ادارے سے مل جائیں گی ۔ آپ 021-32216361 پر فون کرلیں۔ وہ آپ کو قیمت اور دیگر تفصیلات سے آگاہ کردیں گے۔

سحر خان ۔۔۔ کوئٹہ

پتا نہیں کتنے مہینوں سے محترمہ نگہت سیما صاحبہ کی تحریر کا انتظار تھا اور نگہت سیما جی آپ کی کہانیاں' انداز تحریر ہر جملے میں چھپی سچائی اور رگوں تک سرایت کرجانے والا دکھ۔ آپ کا ہونا ہی محبت ہے اور پھر نگہت جی آپ کی کسی بھی تحریر کو پڑھتے ہوئے آنکھ کا بہنے لگنا کچھ بھی تو انہونا نہیں۔ "باروفا" سے لے کر "زمین کے آنسو" تک جتنی بھی تحریریں پڑھیں۔ ہر بار انوکھا سرور پایا' چاہے وہ عشق کے حقیقی کے حوالے سے ہو یا عشق مجازی یا پھر وطن کی محبت' آپ کے جملوں کی ٹھنڈی' میٹھی پھوار' جذبات کو گرماتی قزح' رویوں کی سردی گرمی اور رشتوں کا ٹوٹنا بننا انوکھا تال میل' وہ کیا بات ہے جو آپ کی تحریر میں نہیں۔

عنیزہ سید صاحبہ آپ کا ناول ہمیشہ کی طرح معلومات کا وسیع ذخیرہ سمیٹے ہوئے ہے مگر کیا اختر' سعد' ماہ نور کے کردار بابا ہدایت اللہ' فراز اور مبینہ کلثوم سے مشابہ نہیں یا پھر مجھے ہی ایسا لگا ہو گا لیکن بہرحال اس سے پہلے کبھی بھی مجھے سرکس کے متعلق اس قدر معلومات نہیں تھیں' آپ کے جملوں کی گہرائی اور گاڑھا فلسفہ یقیناً" آپ ہی کے قلم کا شاہکار ہے۔

نگہت عبداللہ صاحبہ کیا حساس سی نرم دل سارہ واقعی سمیر کے لیے اتنی کٹھور اور سنگ دل ہے اور اجلال رازی کو وہ سب اس وقت یاد کیوں نہیں آیا جب اس کی محبت سمندر کی گہرائیوں کو ناپنے چلی تھی۔ بہر طور چونکہ کہانی ابھی باقی ہے تو یقیناً" جلد ہی آپ کی تحریر کا نکھار اور خوب صورتی سامنے ہوگی۔

سارا پرچہ اور سرورق بے حد اچھا لگا اور ادارے کے سب ہی ممبران ہوں یا کراچی اور کراچی میں بسنے والے سب ہی لوگ' زمینی فاصلے اس وقت تک معنی نہیں رکھتے کہ جب تک دل ایک رہیں۔ ہر دن آپ لوگوں کا دکھ دل کی گہرائیوں تک پایا اور ہر رات آنسو بہائے ہیں لیکن ہم دیکھیں گے جب ظلم کا تختہ الٹے گا اور امن کا سورج ابھرے گا۔ ان شاء اللہ حالیہ سانحہ کراچی کے بارے میں کیا لکھوں' کتنے لوگ آگ کا رزق ہوئے۔ افسوس۔

پیاری سحر! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ اگرچہ کہ آپ نے صرف تین کہانیوں کے بارے میں لکھا۔ لیکن خوب صورت الفاظ میں کیا گیا جامع تجزیہ اچھا لگا۔

اس امید پر ہی زندہ ہیں کہ اس شہر نارساں میں کبھی امن کا سورج طلوع ہو گا اور ظالم اپنے کیفر کردار کو پہنچیں گے ۔ حالیہ سانحہ کراچی کے بارے میں ابھی تک صحیح رپورٹ سامنے نہیں آئی ہے۔ غیر ملکی نشریاتی ادارے اسے تخریب کاری اور بھتہ خوری کا نتیجہ قرار دے رہے ہیں۔

حکومت کا فرض ہے کہ صحیح حقائق سامنے لائے لیکن حکومت اگر اپنے فرائض ادا کرتی تو ایسی نوبت ہی کیوں آتی ۔ ہم صرف اللہ سے دعا کر سکتے ہیں۔ بے شک وہ جاننے اور سننے والا ہے۔

سیدہ امبر اختر ۔۔۔ چندی پور

رسالہ تو واقعی اچھا ہے لیکن مجھے اس میں کچھ کمی محسوس ہوئی۔ ایسا سلسلہ تو ضرور ہونا چاہیے جس میں قارئین اپنے آپ کو متعارف کرواسکیں۔ خواتین سے وابستہ قارئین کو ایک دوسرے کو جاننے کا موقع ملے گا۔ اور کوئی ایسا سلسلہ بھی ضرور ہونا چاہیے جس میں ہم اپنے پیاروں اور فرینڈز کو پیغامات بھیج سکیں خواتین کی رائٹر زبردست لکھتی ہیں سو ڈیر رائٹر میری دعا ہے کہ زور قلم اور زیادہ۔

ج : پیاری امبر! خواتین کی محفل میں خوش آمدید اور دعائیں۔ "میری خاموشی کو بیاں ملے" یہ سلسلہ ہم نے قارئین کے تعارف کے لیے ہی شروع کیا ہے اور اس میں قاری بہنیں اپنی تعلیم' مشاغل اور دیگر دلچسپیوں کے بارے میں لکھتی ہیں۔ شاید آپ کی نظر سے اس لیے نہیں گزرا کہ آپ نے ابھی پڑھنا شروع کیا ہے۔

پیغامات کے سلسلے کے لیے معذرت۔ یہ سلسلہ صرف چند قارئین کے لیے ہی دلچسپی کا باعث ہو گا۔ یعنی ان

قارئین کے لیے جنہوں نے پیغامات ارسال کیے اور وہ قارئین جن کے نام پیغامات بھجوائے گئے۔ عموماً" ان پیغامات میں دوستوں کی امتحان میں کامیابی، شادی جنم دن یا دیگر خوشی کے موقعوں کی مبارک باد دی جاتی ہے۔ جس کی بنا پر یہ سلسلہ یکسانیت کا شکار ہو جاتا ہے۔

شاہدہ ظفر.....

ستمبر 2003ء کا خواتین پڑھا اور بشریٰ سعید کی "رقص جنوں" نے ایسا متاثر کیا کہ خواتین کے گرویدہ ہو گئے اس وقت سے خواتین کی اور ہماری مثال یک جان دو قالب والی ہو گئی۔ اگرچہ گاؤں میں رسالہ 10 تاریخ سے پہلے نہیں ملتا۔ تھوڑا سا تبصرہ اپنے رائٹرز کے بارے میں بشریٰ سعید کی "سفال گر" نمرہ احمد کی "مصحف" ثروت نذیر کی "میں عبدالقادر ہوں" جیسی کہانیاں جذبہ دین کو ابھارنے کے ساتھ ساتھ ایمان کو مضبوط کرتی ہیں۔ رفعت ناہید سجاد کا انداز تحریر سب سے منفرد ہے۔ فرحت اشتیاق کبھی کولمبیا یونیورسٹی کی سیر کراتی ہیں اور کبھی روم کے مشہور مقامات کی منظر کشی ایسی زبردست کہ گویا ہم خود وہیں ہوں۔ نایاب جیلانی کی ہر تحریر پہلے سے بڑھ کر ہوتی ہے عنیزہ سید عام موضوعات سے ہٹ کر لکھ رہی ہیں۔ بہت اچھا لکھ رہی ہیں باقی سب افسانہ نگار بھی جن میں عنیقہ محمد بیگ، تنزیر نبوی، عفت سحر پاشا، صباحت یاسمین، عائشہ فیاض، ام مریم، ثمینہ عظمت علی اور باقی سب رائٹرز اچھا لکھتی ہیں۔

ج : پیاری شاہدہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ 2003ء سے آپ کا خواتین سے اتنا گہرا تعلق ہے۔ آپ نے ہمیں اس سے پہلے خط نہیں لکھا۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا اور خواتین کے تازہ شمارے کے بارے میں بھی لکھیے گا۔

سدرہ خان جتوئی.....غازی پور ضلع رحیم یار خان

ہماری رائٹرز نے جس طرح معاشرتی دلکی حقیقت سے روشناس کرایا ہے اس طرح شاید ہی کوئی ٹی وی چینل یا ادارہ کر سکے۔ گرد و پیش سے بے خبر ڈائجسٹ کا مطالعہ کرتے ہوئے میں اس وقت چونکتی ہوں جب لائٹ چلی جاتی ہے یا پھر کسی کام کے سلسلے میں میرے نام کی پکار بادولت کے کانوں سے ٹکراتی ہے۔ کہانیوں پر اور باقی سلسلوں پر تبصرہ اس لیے نہیں کر رہی کہ شاید ہمارے تبصرے میں کوئی کمی بیشی رہ جائے اور کوئی تنقیدی پہلو نظر نہ آجائے جس کی وجہ کسی کی دل آزاری ہو۔ ہر سلسلہ کسی غلطی سے مبرا اور کامیابیوں سے مزین ہوتا ہے۔

ج : پیاری سدرہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ نے اتنے مشکل مراحل سے گزر کر خط پوسٹ کیے اور وہ شائع نہ ہو سکے۔ اب آپ ہمیں باقاعدگی سے خط لکھیں۔ ضرور شائع ہوں گے ان شاء اللہ۔ خواتین کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ ہر سلسلے پر اپنی تفصیلی رائے دیں اور پسند ناپسند کے بارے میں بلا تکلف لکھیں۔ تنقید اور تعریف ہمارے لیے یکساں اہمیت رکھتی ہے۔

تہنیت خان، مومنہ خان..... عمر کوٹ

نگہت عبداللہ "میرے خواب لوٹا دو" بہت زبردست لکھ رہی ہیں اور پلیز سمیر کے ساتھ کچھ برا نہیں کرنا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ سمیر کی شادی تاجور سے ہو گی اور اریبہ ایک نامحرم کے ساتھ اتنے آرام سے کیسے رہ رہی ہے نہ اس کو کسی چیز کا ڈر ہے نہ خوف راحت جبیں نے بھی بہت اچھا اینڈ کیا اور عائزہ خان اور اینکر بیرسٹر احتشام امیر الدین کا انٹرویو بھی ضرور ضرور شامل کریں۔

ج : پیاری تہنیت اور مومنہ! اریبہ آرام سے نہیں رہ رہی ہے۔ شمشیر نے اسے اغوا کیا ہے اور اس کے ساتھ رہنا اس کی مجبوری ہے البتہ وہ مطمئن ضرور ہے کیونکہ اسے اندازہ ہو چکا ہے کہ شمشیر برا آدمی نہیں ہے اور اس کی عزت محفوظ ہے۔

آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ عائزہ کا مختصر انٹرویو شعاع میں دستک کے سلسلے میں پچھلے ماہ یعنی ستمبر کے شمارے میں شامل تھا۔

خبریں وبریں

تبصید نشاط

تبدیلی مبارک

انسان فطرتاً" تبدیلی پسند واقع ہوا ہے۔ یکسانیت سے بہت جلد اکتا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ تھوڑے تھوڑے عرصے بعد اردگرد کے ماحول اور برتنے کی چیزوں میں تبدیلی کرتا رہتا ہے اور اگر یہ فطرت کچھ زیادہ ہی تنگ کرے تو وہ اپنے سے وابستہ ہر چیز ہی بدل ڈالتا ہے..... حتیٰ کہ شریک حیات بھی۔ یقین نہیں تو معروف اداکار، کمپیئر اور ڈائریکٹر اظفر علی ہی کو دیکھ لیں۔ ایک جگہ ٹکنا تو جیسے موصوف نے سیکھا ہی نہیں۔ کبھی اداکاری کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی کمپیئرنگ۔ ڈائریکشن اور پروڈکشن کا شعبہ بھی ان کی دست برد سے محفوظ نہیں۔ شعبے بدلتے بدلتے خیر سے موصوف نے اب شریک حیات بھی بدل ڈالی ہے۔ معروف ڈراما سیریل "ہم سفر" کی سارہ یعنی اداکارہ نوین وقار ان کی نئی ہم سفر ہیں۔ نوین اور اظفر علی اس شادی پر بے حد خوش ہیں۔ یہ شادی باقاعدہ رسومات کے ساتھ نہایت دھوم دھڑکے سے انجام پائی ہے۔ اس شادی پر ایک دلچسپ تبصرہ آیا کہ نوین ڈراما "ہم سفر" میں سارہ بن کر جو کچھ نہ کر سکیں وہ انہوں نے نوین کی حیثیت میں کر ڈالا۔

اظفر علی نے اپنی پہلی بیوی سلمیٰ حسن کو طلاق دے دی ہے۔ ان دونوں کی شادی نو برس قبل ہوئی تھی۔ دونوں کے دو بچے بھی ہیں۔ واضح رہے کہ سلمیٰ اور اظفر کی شادی بھی پسند کی شادی تھی۔ سلمیٰ نے اس خبر پر کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے۔ وہ صدمے کی سی

کیفیت میں ہیں۔ (ڈراما "ہم سفر" میں سارہ نے خودکشی کرلی تھی۔ سلمٰی سوچ رہی ہوں گی کہ کاش! وہ سین حقیقی ہی ہوتا۔)

ریوڑیاں

ماضی میں کہا جاتا تھا کہ فن کسی کی میراث نہیں۔ تاہم آج ہم دیکھتے ہیں کہ فنکاروں کے بچوں کو ورثے میں کچھ اور ملے یا نہ ملے، فن ضرور ملنے لگا ہے۔ معروف اداکارہ و گلوکارہ سلمٰی آغا نے آج سے تقریباً تیس برس قبل فلم "نکاح" سے بالی ووڈ میں قدم رکھا۔

تاہم کوئی خاص پذیرائی نہ ملنے کے سبب ان کے قدم واپس لوٹ گئے۔ آج ان کی بیٹی ساشا آغا ان کے ادھورے خوابوں کو تکمیل دینے والی بولی ووڈ جا پہنچی ہیں۔ ساشا ایش راج کے بینر تلے بننے والی فلم "اورنگ زیب" میں کام کررہی ہیں۔ ان کے ہیرو ارجن کپور ہیں۔ بھارتی میڈیا ساشا آغا کے بھارتی فلموں میں کام کرنے کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ ایک بھارتی چینل نے اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے "ریوڑیاں بانٹنے" کا عمل قرار دیا ہے۔

یہ پہلا موقع نہیں ہے۔ اس سے قبل بھی بھارتی میڈیا اور فنکار ہمارے فنکاروں کے خلاف زہر اگلتے رہے ہیں۔ صرف پاکستانی ہی نہیں، بلکہ وہ وہاں کے مسلمان فنکاروں کے خلاف بھی بیان بازی کرتے رہتے ہیں۔ جیسے حال ہی میں گلوکارہ لتا منگیشکر نے عظیم گلوکار محمد رفیع کی کردار کشی کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ رائلٹی کے معاملے پر اختلاف کے بعد لتا نے محمد رفیع کے ساتھ گانا گانے سے انکار کردیا تھا۔ پھر محمد رفیع کے معافی نامہ تحریر کرنے کے بعد انہوں نے ان کے ساتھ گانے گائے۔ تاہم ان کے دل سے محمد رفیع کے لیے کبھی کڑواہٹ نہیں گئی۔ محمد رفیع کے بیٹے نے لتا کے اس دعوے کی تردید کی ہے کہ رفیع صاحب نے انہیں کبھی کوئی معافی نامہ بھی لکھا تھا۔

(لتا جی! رائلٹی کے تنازعے پر گانے سے انکار کرنا تو ایک بہانہ ہی تھا، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ محمد رفیع جیسے گلوکار کے ساتھ دو گانے گانا کوئی آسان بات نہیں۔)

الٹا پیسہ

اکثر پروڈیوسروں سے بات کی جائے تو وہ فنکاروں کے ناز نخروں سے نالاں ہی نظر آتے ہیں۔ انہیں شکوہ رہتا ہے کہ شوبز کی شاہراہ پر فنکاروں خصوصاً فنکاراؤں کے ناز نخروں کا ٹریفک رواں دواں رہتا ہے جس کے پہیوں کی زد میں اکثر پروڈیوسر اور ڈائریکٹر آتے رہتے ہیں۔ مگر جناب! کبھی کبھی پیسہ الٹا بھی چل پڑتا ہے۔

نعیمہ گرج ایک عرصے سے شوبز سے وابستہ ہیں۔ فن کو کسی کی میراث نہیں سمجھا جاتا۔ تاہم نعیمہ کو فن ورثے میں ملا ہے کہ ان کے والد گرج بابو بھی خاصے معروف اداکار تھے۔ چند سال پہلے کی بات ہے، نعیمہ کو ایک ڈرامے میں اہم کردار کی پیش کش ہوئی۔ نعیمہ خوش ہوگئیں۔ انہوں نے اتنے اچھے کردار کے لیے منتخب کرنے پر پروڈیوسر کا شکریہ بھی ادا کیا۔ جب پروڈیوسر نے انہیں اسکرپٹ دیا تو نعیمہ گرج نے پروڈیوسر سے کردار کے متعلق ساری تفصیلات معلوم کیں۔ کردار کا تعلق ایک مخصوص طبقے سے تھا، سو اس کے لیے کپڑے بھی مخصوص طرز کے چاہیے تھے۔ نعیمہ نے پروڈیوسر سے کہا۔

"یہ ڈریسز میرے پاس نہیں ہیں۔ آپ کہیں تو تیار کرالوں؟"

پروڈیوسر نے کہا۔ "ہاں! بنوالیں۔"

نعیمہ نے نہایت زور و شور سے تیاری شروع کردی اور جلد ہی کپڑے سلنے بھی دے دیے۔ اس سارے عرصے میں نعیمہ مذکورہ پروڈیوسر سے مسلسل رابطے میں رہیں تاکہ کپڑے پروڈیوسر کی مرضی کے عین مطابق تیار ہوں۔ اس دوران نعیمہ کو ایک سیریل کی پیش کش ہوئی، تاہم نعیمہ نے یہ سوچ کر انکار کردیا کہ کہیں دونوں ڈراموں کی شوٹنگ کی تاریخیں متصادم نہ ہو جائیں۔ لباس تیار ہوگئے۔ نعیمہ شوٹنگ کا انتظار کرنے لگیں۔ کچھ روز گزر گئے تو نعیمہ نے معلومات کے لیے پروڈیوسر کو فون کیا، مگر ان کا فون ریسیو نہیں کیا گیا..... اور پھر ایسا مستقل ہونے لگا۔

کچھ عرصے بعد نعیمہ کو دیگر ذرائع سے معلوم ہوا کہ مذکورہ سیریل میں ان کی جگہ کسی اور فنکارہ کا انتخاب کر لیا گیا ہے اور شوٹنگ بھی شروع ہو چکی ہے۔ نعیمہ گرج کو باپ سے فن ہی نہیں وضع داری بھی ورثے میں ملی ہے۔ سو انہوں نے نہ کوئی واویلا کیا اور نہ ہی کوئی گلہ۔ صبر شکر کر کے خاموش ہو رہیں۔

کچھ ادھر ادھر سے

عام سی صحافتی اخلاقیات ہوتی ہیں کہ اگر کوئی شخص موجود نہیں یا وہ کسی الزام کا جواب نہیں دے سکتا تو زبان درازی کرنے والے کو روک دیا جاتا ہے کہ آپ ایسی بات نہ کہیں۔ لیکن کون سے آداب اور کیسی اخلاقیات، یہاں تو پورے پورے پروگرام دشنام طرازوں کے لیے وقف ہو چکے ہیں جو چنڈو خانوں کی زبان میں بے ننگ و نام گالیاں دے رہے ہیں اور دبے چلے جارہے ہیں۔

(عرفان صدیقی..... نقش خیال)

☆ پختون ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ رزق حلال کے حصول کے لیے نہایت معمولی اور پر مشقت کام کرتا ہے۔ بوٹ پالش کرنا، چھریاں، چاقو تیز کرنا، کڑی دھوپ میں روڑی کوٹنا، بھٹے فروخت کرنا، غرض کہ ہر وہ کام جسے دیگر لوگ اپنے معیار سے گرا ہوا سمجھتے ہیں۔ پختون رزق حلال کے لیے وہ سب کام کرتا ہے۔

(مستنصر حسین تارڑ..... کارواں سرائے)

☆

سانحہ ارتحال

حبیب آئل ملز پرائیویٹ لمیٹڈ کے جناب تنویر حسن رضائے الٰہی سے رحلت فرما گئے۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ دلی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ جناب تنویر حسن مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور بلند درجات عطا فرمائے اور مرحوم کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

خواتین اور باورچی خانے کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ ہے۔ باورچی خانے میں رونق ہو تو گھر کے افراد خوش نظر آتے ہیں۔ ایک صاف ستھرا کچن، خاتون خانہ کی خوش سلیقگی کا مظہر ہے۔
خواتین ڈائجسٹ میں قارئین کی شرکت کے لیے ہم اس ماہ کے کچن کے حوالے سے ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں، سوالات یہ ہیں۔
1- کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ "پسند ناپسند، غذائیت، گھر والوں کی صحت"۔
2- گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں، کھانے کا وقت ہے۔ کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار کرکے تواضع کر سکیں۔
3- کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے، آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟
4- صبح کا ناشتہ ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ ناشتے میں کیا بناتی ہیں؟ ایسی خصوصی چیز کی ترکیب جو آپ اچھی بناتی ہیں۔
5- گھر سے باہر کھانا کھانا فیشن بنتا جارہا ہے، آپ مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟ (1) جب کوئی لے جائے (2) کسی کی سالگرہ پر (3) یا کسی خوشی کے موقع پر۔
6- کھانا پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مدنظر رکھتی ہیں؟
7- اچھا پکانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟
8- کچن کی کوئی ٹپ، جو دینا چاہیں؟
ان سوالات کے جواب بھجوا کر آپ بھی اس سلسلہ میں شرکت کر سکتی ہیں، ساتھ ایک عدد تصویر بھی بھجوائیں۔

آپ کا باورچی خانہ

نوشین فاطمہ

(1)۔ کھانا پکاتے ہوئے میں اپنے گھر والوں کی پسند ناپسند کو اولیت دیتی ہوں۔ خصوصاً" بچوں کی پسند کو کیونکہ میری بیٹیاں چند مخصوص کھانے مثلاً" نہاری بریانی اور آلو گوشت وغیرہ ہی کھاتی ہیں۔ سبزیوں کو تو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتیں۔ لہٰذا میں ان کی پسند کے کھانے بنا کر چھوٹے چھوٹے باکسز میں فریز کردیتی ہوں۔ گو کہ یہ غذائیت کے اعتبار سے تو درست نہیں لیکن مجبوری ہے کہ روز صرف بچوں کے لیے بریانی یا نہاری وغیرہ بنانا ممکن نہیں۔
(2) عموماً" ہمارے گھر جو بھی مہمان آئیں، زیادہ تر آدھ پون گھنٹے کے لیے ہی آتے ہیں، لیکن اگر مہمانوں کو کھانا سرو کرنا ہو تو ہم لوگ چکن بروسٹ، کچے قیمے کے کباب، شامی کباب یا اگر سردیاں ہیں تو فش کو مسالا لگا کر رکھتے ہیں تاکہ وقت ضرورت فرائی کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ ایک ایسی ڈش جو میرے گھر والوں کو بہت پسند ہے اور تقریباً" بیس منٹ میں تیار ہو جاتی ہے، وہ چکن جلفریزی ہے جس کی ترکیب حاضر خدمت ہے۔

چکن جلفریزی

اجزا :

چکن بون لیس	(کیوبز میں کٹی ہوئی)
پیاز، ٹماٹر، شملہ مرچ	تینوں چیزیں دو دو عدد لے کر کیوبز میں کاٹ لیں
مسالا بنانے کے لیے اشیا:	
آئل	ایک کپ
پیاز (سلائس میں کٹی ہوئی)	ایک بڑی یا دو چھوٹی
ٹماٹر	دو عدد
ادرک، لہسن	دو چائے کے چمچے
لیموں	ایک عدد
دھنیا	ایک چھوٹی گڈی
نمک، مرچ	حسب ضرورت
گرم مسالا پسا ہوا	حسب ضرورت

ترکیب :

چکن کو آئل میں فرائی کرلیں۔ جب گولڈن کلر کی ہو جائے تو شملہ مرچ اور کیوبز میں کٹی ہوئی پیاز ڈال کر فرائی کرلیں۔ چکن اور سبزیوں کو نکال کر علیحدہ رکھ دیں اور اسی آئل میں سلائس کی ہوئی پیاز ڈال کر فرائی کرلیں۔ جب گولڈن براؤن ہو جائے تو ٹماٹر اور ادرک لہسن ڈال کر بھونیں اور نمک مرچ ڈال دیں۔ جب مسالا تیل چھوڑ دے تو فرائیڈ چکن اور سبزیاں ڈال دیں اور کیوبز میں کٹے ہوئے ٹماٹر ڈال کر دو تین منٹ مزید بھونیں اور چولہا بند کرکے پسا ہوا گرم مسالا، کترا ہوا ہرا دھنیا اور لیموں کا رس ڈال دیں۔ سادہ چاولوں یا نان کے ساتھ سرو کریں اور مہمانوں سے داد سمیٹیں۔
(3) کچن حقیقتاً" عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ میں کھانا پکانے کے دوران استعمال ہونے والی اشیا ساتھ ساتھ اپنی جگہ پر واپس رکھتی جاتی ہوں اور کاؤنٹر ضرور اچھی طرح صاف رکھتی ہوں۔
(4) صبح کا ناشتا ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے، لیکن نرمی، سختی ہر طرح سے سمجھانے کے باوجود میری بیٹیاں بختاور اور کشمالہ ناشتا بالکل نہیں کرتیں، لہٰذا صبح سب سے پہلے اٹھ کر ان کے لیے گھر کے بنے ہوئے اسنیکس مثلاً" فرنچ فرائز، فرنچ توس وغیرہ ناشتے کے متبادل کے طور پر ان کو اسکول ساتھ دیتی ہوں۔ باقی گھر کے تمام افراد ناشتا اپنی اپنی پسند کے مطابق کرتے ہیں جو زیادہ تر انڈا، توس جیسے سادہ ناشتے پر مشتمل ہوتا ہے، البتہ چھٹی والے دن اہتمام سے حلوہ پوری کھائی جاتی ہے جو بازار سے آتی ہے۔
(5) باہر کھانا کھانے کا پروگرام بہت کم بنتا ہے۔ ہمارے گھر میں تمام بڑے گھر میں ہی کھانا کھانا پسند کرتے ہیں۔ بریانی اکثر باہر سے منگوالی جاتی ہے۔ بچوں کو ہوٹل جانے کا چسکا ہے، لیکن وہاں پر بھی وہ کھانے کم، انجوائے کرنے زیادہ جاتے ہیں لہٰذا جب بھی باہر جانے کا پروگرام بنتا ہے، بچوں کے پرزور اصرار پر ہی بنایا جاتا ہے۔
(6) بالکل! کھانا پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے ہمارے گھر میں موسم کو مدنظر رکھا جاتا ہے مثلاً" بھاپ اڑاتا گرماگرم سوپ سرما کی سرد راتوں کا مزا دوبالا کردیتا ہے۔ اس کے علاوہ سرما کی دھند بھری صبحوں میں من بے اختیار پراٹھا کھانے کو کرتا ہے۔ ساون کی شاموں میں گرما گرم چائے کا مگ اور بچوں کی فرمائش پر پکوڑے جل تھل موسم کو مزید رنگین بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح گرما کی کڑکتی دوپہروں میں پلاؤ کے ساتھ اچار کھانے کو من مچل اٹھتا ہے۔
(7) بالکل! اچھا پکانے کے لیے محنت کی قائل ہوں چاہے وہ چائنیز ہو یا ہمارے روایتی پکوان، برگرز ہوں یا سادہ سے دال چاول۔ میں ہر چیز کو مکمل لوازمات کے ساتھ تیار کرتی ہوں مثلاً" برگرز کے ساتھ فرنچ فرائز اور کولڈ ڈرنک، کھانے کے ساتھ اچار اور سلاد، دال چاول کے ساتھ ٹماٹر کی چٹنی وغیرہ۔ اگر کھانا اہتمام کے ساتھ بنایا جائے تو زیادہ رغبت کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔
(8) اوون کے اوپر لگے چولہوں کا گولڈن کلر وقت کے ساتھ ماند پڑنے لگتا ہے، لیکن اگر ان کو لیموں کے چھلکے والے پانی میں چند گھنٹے بھگو دیا جائے اور پھر لیموں کے چھلکے کے ساتھ ہی رگڑا جائے تو ان کی چمک میں اضافہ ہوتا ہے۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

فرائیڈ ڈرم اسٹک

اجزا :

چکن لیگ پیس	آٹھ عدد
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
کٹی ہوئی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
فوڈ کلر (پیلا)	ایک چٹکی
پسا زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
پسی سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

لیگ پیس کو کانٹے کی مدد سے اچھی طرح گود لیں۔ ایک بڑے پیالے میں تمام مسالا مکس کریں اور لیگ پیس پر اچھی طرح لپیٹ کر دو گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ پھر تھوڑے تیل میں ہلکی آنچ پر فرائی کرلیں۔ نیچے والے حصے پر چاندی کے ورق لپیٹ کر کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

عربی چکن بجی

اجزا :

ثابت مرغ	ایک عدد
دہی	ایک کپ
لہسن ادرک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
سرکہ	چار کھانے کے چمچے
پسی سیاہ مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
ثابت زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
سونف	ایک چائے کا چمچہ
انار دانہ	ایک چائے کا چمچہ
ثابت سرخ مرچ	آٹھ عدد
امچور	ایک چائے کا چمچہ
کالا نمک	دو چٹکی
چھوٹی الائچی	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

ایک پیالے میں ثابت زیرہ، سونف، ثابت سرخ مرچ، انار دانہ، امچور، کالا نمک اور چھوٹی الائچی پیس کر بجی مسالا تیار کرلیں۔ مرغ دھو کر خشک کرلیں اور چھری سے کٹ لگا دیں۔ ایک پیالے میں دہی کے ساتھ لہسن ادرک پیسٹ، سرکہ، پسی مرچ اور نمک مکس کرکے مرغ پر اچھی طرح لگائیں اور رکھ دیں۔ دو گھنٹے بعد گہرے پیندے والی پتیلی میں ڈال کر آدھے گھنٹے تک ڈھکن ڈھک کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ پانی خشک ہوجائے تو نکال کر اس پر اوپر والا بجی مسالا ڈال کر پہلے سے گرم اوون میں پانچ منٹ تک بیک کریں یا آگ پر سینک لیں۔ مزے دار چکن بجی تیار ہے۔

نان

اجزا :

میدہ	چار کپ
دودھ	ایک کپ
انڈا	ایک عدد
دہی	دو کھانے کے چمچے
مکھن	دو کھانے کے چمچے
چینی	دو کھانے کے چمچے
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
سفید تل	چار چائے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

میدے کو نمک اور بیکنگ پاؤڈر ملا کر چھان لیں۔ اب اس میں چینی، انڈا، دودھ اور دہی ملا کر گوندھ لیں۔ خیال رکھیں گوندھا ہوا میدہ زیادہ سخت ہو نہ زیادہ نرم۔ گوندھے ہوئے میدے پر تھوڑا سا تیل لگا کر ایک گھنٹے کے لیے گیلے کپڑے سے ڈھانک کر رکھ دیں۔ چار کپ میدے میں تقریباً" آٹھ نان بن سکتے ہیں۔ آپ اس حساب سے آٹا لے کر پیڑے بنائیں۔ ہاتھ سے بڑا کریں۔ درمیانی حصوں کو زیادہ دبائیں اور کناروں کو قدرے موٹا رکھیں۔ اوپر تل چھڑک دیں۔ اگر اوون ہے تو اسے 200 ڈگری فارن ہائیٹ پر گرم کرکے رکھیں۔ اگر نہیں ہے تو کسی بڑے پتیلے میں بڑے اور چکنے پتھر گرم کرکے پتیلے کو خوب دہکالیں۔ اس میں دوسرے برتن میں رکھیں۔ تندور پر بھی لگائے جاسکتے ہیں۔ دونوں طرف سے خستہ اور بھورے ہوجائیں تو اوپر مکھن لگا کر پیش کریں۔

فنگر فش

اجزا :

مچھلی	آدھا کلو
ادرک لہسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
سرخ پسی مرچ	دو چائے کے چمچے
چاول پسے ہوئے	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

مچھلی کو صاف کرکے تین سے چار انچ لمبائی میں کاٹ لیں۔ ادرک لہسن پیسٹ میں نمک اور لیموں کا رس ملائیں۔ فنگر فش کو اس آمیزے میں ڈال کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پسے ہوئے چاولوں میں سرخ مرچ ملا کر رکھ لیں۔ پھر چاولوں میں لپیٹ کر گہرے تیل میں تلیں۔ سنہری ہوجائیں تو ٹشو پیپر پر نکال لیں تاکہ فالتو تیل جذب ہوجائیں۔ ٹماٹو کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

عدنان

ازدواجی اور نفسیاتی الجھنیں

ہر ماہ جو خطوط موصول ہوتے ہیں ان میں اکثر شادی شدہ عورتوں کا یہ مسئلہ ہوتا ہے۔ ان کا شوہر ان کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ ان کی طرف سے لاپروا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ باہر کی دنیا میں مردوں کو مختلف انداز کے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ اور ان میں الجھ کر وہ بیوی سے لاپروا ہو جاتا ہے اور بیوی میں وہ دلچسپی نہیں لیتا جس کی وہ بجا طور پر مستحق ہے۔

لیکن..... اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی کہوں گا اگر آپ کا شوہر آپ کی ذات میں دلچسپی نہیں لے رہا تو اس کی پچاس فیصد ذمے دار آپ بھی ہیں ---- شادی ہونے کے بعد لڑکی یہ سمجھتی ہے کہ میرے شوہر کا فرض ہے کہ میرے لیے کما کر لائے۔ مجھے اچھا گھر اور گھر کی آسائشیں مہیا کرے۔ جواباً" وہ گھر کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھتی ہے۔ کھانا' کپڑوں' جوتے اور دیگر چیزوں کا خیال رکھتی ہے اور سمجھتی ہے کہ شوہر کو خوش ہونا چاہیے کہ وہ وفا شعار بیوی ہے اور شوہر کو گھر کا سارا آرام میسر ہے لیکن وہ بھول جاتی ہے کہ میاں بیوی کے درمیان تعلق کا ایک جذباتی پہلو بھی ہے۔ جو بہت اہم ہے۔

شادی کے بعد عموماً" عورتیں گھریلو کاموں میں لگ کر اپنی ذات سے لاپروا ہو جاتی ہیں' ان کا خیال ہوتا ہے اگر شوہر ان سے محبت کرتا ہے تو وہ خواہ کیسی بھی نظر آئیں' اس کی پروا نہ کرے گا۔ یہ رویہ سراسر غلط ہے۔ مرد خواہ عمر کے کسی حصے میں (بلکہ مرد ہی کیا عورتیں اور بچے بھی) ہو' خوب صورتی اسے متاثر کرتی ہے۔ اس لیے مناسب بناؤ سنگھار اور صاف ستھرا لباس بہت ضروری ہے۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ بہت قیمتی کپڑے پہنے جائیں یا بھاری میک اپ کیا جائے۔ لیکن صاف ستھرے لباس اور مناسب میک اپ سے اپنے اندر کشش پیدا کریں تاکہ دیکھنے والے پر خوشگوار تاثر پیدا ہو۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ شوہر کو یہ احساس دلایا جائے کہ وہ آپ کے لیے اہم ہے۔ گھر کے کاموں اور دیگر مصروفیات میں سے کچھ وقت اس کے لیے ضرور نکالیں۔ آپ کی ذرا سی توجہ اسے تازہ دم کردے گی۔

☼ ☼ ☼

کم ہمتی' تنگ مزاجی' غصہ' خوف اور دل شکستگی بھی ایک طرح کا ڈپریشن ہے۔ ان میں غصہ اور تنک مزاجی زیادہ ڈپریشن کے زمرے میں نہیں آتے۔ لیکن پھر بھی بعض دوسری باتیں مل کر یعنی اپنی کم ہمتی کی وجہ سے زبردستی کا غصہ' بات بات پر تلخی اور تنک مزاجی کو بھی ایک طرح کا ڈپریشن ہی سمجھنا چاہیے۔ اس سے نجات حاصل کرنا قطعی طور پر آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ ارادے باندھنا ہمت کرنا اور اس پر عمل کرنا ڈپریشن کو شکست دینا ہے ..... اور ایک واضح شکست دینے کا مطلب ہے کہ آپ نے ڈپریشن پر فتح حاصل کرلی اور اپنی زندگی کو کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار کرلیا۔

ڈپریشن سے نجات کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ خود کو مصروف رکھیں۔ دوسروں میں دلچسپی لیں۔ ان سے محبت کریں' محبت کرنے والے لوگوں کو اپنے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ وہ دوسروں کی خوشیوں میں اپنی خوشیاں تلاش کرتے ہیں۔ اور ان کے دل ہمیشہ سچی خوشی سے سرشار رہتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

ف جہاں

اس تمام معاملے میں سراسر آپ قصوروار ہیں۔ آپ کے شوہر سے غلطیاں ضرور سرزد ہوئی ہیں لیکن شروع سے آپ کا رویہ ان کے ساتھ ٹھیک نہیں تھا' شادی سے پہلے آپ نے شادی سے انکار کیا۔ لیکن آپ کی شادی ان سے ہو گئی تو آپ کو سمجھوتا کرلینا چاہیے تھا۔ آپ لکھتی ہیں کہ انہوں نے آپ کو خرچ سے تنگ رکھا' دوسری طرف آپ کا کہنا ہے کہ وہ آپ کی بیوہ بہن' ان کے چھ بچوں اور آپ کی والدہ کا خرچ بھی اٹھاتے ہیں۔ (وجہ آپ نے نہیں لکھی..... کیوں؟)

"A" صاحب جو آپ کو بہن کہتے ہیں' وہ آپ کے پاس تنہا اسپتال میں رہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کا ان سے ملنا جلنا رہا۔ غصے اور مزاج کی تیزی کے باوجود آپ کے شوہر نے کبھی ان پر شک نہیں کیا اور اس ڈھیل کا آپ نے فائدہ اٹھایا' طلاق آپ نے خود ضد کرکے' اصرار کرکے لی۔ خود ان کے آفس جاکرلی پھر کچھ مفتیوں نے آپ کو فتویٰ بھی دیا کہ طلاق نہیں ہوئی لیکن آپ بضد رہیں اور حلالہ کرنے کے لیے اس شخص کو منتخب کیا جسے آپ بھائی کہتی رہی تھیں۔ اب آپ کا کہنا ہے کہ آپ کے دل میں ان صاحب کی شدید محبت پیدا ہو چکی ہے۔ آپ اپنے بیٹوں کو بھی تمام حالات بتا چکی ہیں لیکن کوئی فیصلہ نہیں کرپا رہی ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ آپ نہ تو اپنے شوہر کا پیسہ چھوڑنا چاہتی ہیں اور نہ اپنی محبت' اسی لیے کشمکش کا شکار ہیں۔ ورنہ آپ کی والدہ کا مشورہ بھی غلط نہیں ہے۔ درحقیقت نہ آپ اپنے شوہر کی وفادار ہیں نہ اپنے محبوب کی' ان حالات میں' میں آپ کو یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ آپ خود فیصلہ کریں یا تو اپنے دل کو سمجھائیں اور اپنے جذبات کی قربانی دے دیں۔ یا اپنے شوہر کا پیسہ چھوڑ کر اپنے حلالہ والے بھائی نما شوہر کے ساتھ تنگی ترشی میں گزارہ کریں

آخر میں دعا ہی کرسکتا ہوں کہ ہمارے ہاں کے مرد اور خواتین طلاق کی جو صحیح شرعی صورت ہے یعنی ایک ماہ کے وقفے سے تین طلاقیں اس پر عمل کریں' نہ کہ ایک ساتھ تین طلاقیں کیونکہ اس طرح طلاق نہیں ہوتی' ویسے تو ہمارے ہاں عائلی قوانین بھی ہیں' اس سلسلے میں ان سے مشورہ کیا جاسکتا ہے۔

حنا

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ ایک صحیح اور مثبت سوچ رکھنے والی لڑکی ہیں اور شروع سے ہی آپ کا سوچنے کا انداز درست رہا۔ اس شخص کے بارے میں جو آپ کی رائے ہے۔ اس سے میں کلی طور پر اتفاق کرتا ہوں۔ اس نے پہلے اس لڑکی سے شادی کی پھر اسے طلاق دے دی اور آپ سے کہتا ہے کہ آپ سے محبت کی وجہ سے طلاق دی' اسے اگر اس لڑکی سے نباہ نہیں کرنا تھا تو شادی نہ کرتا۔ انکار کردیتا۔ اور انکار کرنے کے بے شمار طریقے ہیں۔ کوئی وہ دودھ پیتا بچہ تو تھا نہیں کہ اس کے ہاتھ میں ٹافیاں دے کر یا کھلونا دے کر اس کی شادی کردی گئی۔ وہ مجرم ہے۔ اس نے ایک لڑکی سے شادی کرکے اس پر طلاق کا دھبہ لگا کر' اس کے ساتھ دس ماہ زندگی گزار کر ایک ظلم کیا ہے۔ اگر وہ اپنے آپ میں طلاق دینے کی ہمت پیدا کرسکتا ہے تو شادی سے انکار تو بہت ہی آسان بات تھی۔

میں تو کہتا ہوں کہ چاہے اس نے آپ کی وجہ سے اسے طلاق دی ہو۔ پھر بھی یہ ناقابل معافی جرم ہے۔ مجھے آپ کو مشورہ تو یہی دینا چاہیے تھا کہ کہ ایسے شخص سے آپ ہرگز شادی نہ کریں لیکن میں اس کا فیصلہ آپ پر ہی چھوڑ دیتا ہوں۔ آپ چاہیں تو اسے معاف کردیں۔ بہرحال آپ کی سوچ کی میرے دل میں بڑی قدر ہے۔

☼

امت الصبور

بیوٹی بکس

سیما ناز..... راولپنڈی

س: پچھلے ماہ کے شمارے میں آپ نے پھٹکری والے نسخے کا ذکر کیا تھا۔ وہ نسخہ کیا ہے۔ پلیز بتا دیں میرے چہرے پر بہت دانے ہیں۔ میری جلد بھی چکنی ہے۔

ج: آپ نے اپنے دانوں کے بارے میں یہ نہیں لکھا کہ وہ کس قسم کے دانے ہیں۔ عموماً" چکنی جلد پر مہاسے ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ مہاسے ہیں تو آپ کو جلد کی صفائی کا بہت خیال رکھنا ہو گا۔ عام صابن کے بجائے میڈیکیٹڈ صابن استعمال کریں تو بہتر ہے۔ اس کے علاوہ زیادہ چکنائی والی تلی ہوئی اور بیکری کی اشیا بالکل نہ کھائیں۔

پھٹکری والا نسخہ یہ ہے۔ دن میں دو بار چہرہ صاف پانی اور صابن سے دھو کر تولیہ سے خشک کر لیں۔ اب سفید پھٹکری کا ایک ٹکڑا گیلا کر کے چہرے پر ملیں۔ اس سے مہاسے بہت جلد ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

دیا..... برمنگھم

س: باجی! تین سال سے میری ناک پر جھائی ہے۔ جو کہ تین چار وائٹننگ فیشل کرانے پر سامنے آئی میں نہیں جانتی کہ یہ فیشل کرانے سے آئی یا پہلے سے جلد میں موجود تھی لیکن پہلے میری جلد مکمل صاف تھی۔ اس کے بعد میں نے پاکستان میں ایک بیوٹیشن کی بنائی ہوئی کریم استعمال کی لیکن اس سے میری ناک کی جلد الرجک ہو گئی۔ ناک پر سرخ دانے ابھر آئیں تو مجھے وہ چھوڑنی پڑی' پھر کچھ عرصے بعد میں نے بیٹنو ویٹ اور آر جی کریم مکس کر کے لگائیں تو پھر جلد الرجک ہو گئی۔ باجی! اب تو میں کچھ بھی لگانے سے ڈرتی ہوں کہ یہ نہ ہو ساری ناک خراب ہو جائے۔ جھائی شروع میں اتنی کالی نہیں تھی مگر اب مکمل طور پر کالی ہو گئی ہے۔ جبکہ باقی کی جلد گوری ہے۔ میک اپ سے بھی نہیں چھپتی۔ کوئی ایسا طریقہ بتائیں کہ میں خود گھر پر کر سکوں۔

ج: دیا! ہم پہلے بھی کئی بار اس کالم میں لکھ چکے ہیں کہ چہرے پر یہ کریمیں مکس کر کے نہ لگائی جائیں۔ اس سے وقتی طور پر تو رنگ صاف ہو جاتا ہے لیکن بعد میں جلد سیاہ پڑ جاتی ہے اور بہت سے لوگوں کے جھائیاں پڑ جاتی ہیں۔ آپ کی جلد بہت حساس ہے۔ آپ فی الحال اس پر کچھ نہ لگائیں۔ ایک سادہ سا ماسک لکھ رہی ہوں۔ یہ ہفتہ میں تین دن لگائیں۔ جلد ہی خوشگوار اثرات ہوں گے۔

ایک انڈے کی سفیدی لے کر اچھی طرح پھینٹ لیں' یہاں تک کہ وہ جھاگ جھاگ ہو جائے' پھر اس میں ایک چمچہ لیموں کا رس اور ایک چمچہ شہد ملا لیں۔ اس آمیزہ کو چہرے پر لگائیں۔ بیس منٹ بعد منہ دھو لیں۔

جلد کے لیے وٹامن سی بہت مفید ہے۔ کینو کا موسم آنے والا ہے۔ کینو کھائیں۔